راہ اور رہنما کی پہچان

مولف:
آیۃ اللہ مصباح یزدی

ناشر: مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

یہ کتاب برقی شکل میں نشرہوئی ہے اور شبکہ الامامین الحسنین (علیہما السلام) کے گروہ علمی کی نگرانی میں تنظیم ہوئی ہے

راہ اور رہنما کی پہچان

مولف: آیۃ اللہ مصباح یزدی

مترجم: سید ضرغام حیدر نقوی

مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت و ظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچہ و کلیاں رنگ و نکھار پیدا کرلیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ و راہ اجالوں سے پرنور ہوجاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت و قابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ و موسس سرورکائنات حضرت محمد مصطفی ﷺ غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم و آگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمۂ حق و حقیقت سے سیراب کردیا، آپ کے تمام الٰہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے 23 برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمراں ایران و روم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑگئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت و عمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہبِ عقل و آگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھودیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غلبہ حاصل کرلیا۔

اگرچہ رسول اسلام ﷺ کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیرووں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہوکر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کردی گئی تھی، پھر بھی حکومت و سیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء و دانشور دنیائے اسلام کو تقدیم کئے جنھوں نے بیرونی افکار و نظریات سے متاثر اسلام و قرآن مخالف فکری و نظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگین تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشتپناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام و قرآن اور مکتب اہل بیت علیہم السلام کی طرف اٹھی اور گڑی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکری و معنوی قوت واقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب و کامراں زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین وبے تاب ہیں، یہ زمانہ علمی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھاکر انسانی عقل و شعور کو جذب کرنے والے افکار و نظریات دنیا تک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہل بیت کونسل) مجمع جہانی اہل بیت نے بھی مسلمانوں خاص طورپر اہل بیت عصمت و طہارت کے پیرووں کے درمیان ہم فکری و یکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تاکہ موجودہ دنیائے بشریت جو قرآن و عترت کے صاف و شفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق و معنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان و ولایت سے سیراب ہوسکے، ہمیں یقین ہے عقل و خرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیت عصمت و طہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوت و رسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدو خال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق و انسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خون خواروں کی نام نہاد تہذیب و ثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کو امن و نجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی و تحقیقی کوششوں کے لئے محققین و مصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین و مترجمین کا ادنیٰ خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج و اشاعت کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، آیۃ اللہ مصباح یزدی کی گرانقدر کتاب راہ اور رہنما کی پہچان کو فاضل جلیل مولانا سید ضرغام حیدر نقوی نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں، اسی منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنیٰ جہاد رضائے مولیٰ کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

مقدمہ

قرآنی تعلیمات کے ذیل میں کی گئی گذشتہ بحثوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ خدا وند عالم نے اپنے ذاتی صفات کے تقاضوں اور اپنی فیاضیت اور رحمانیت کی بنیاد پر اس دنیا کو پیدا کیا ہے اور جیسا کہ بعض آیات شریفہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس مادی دنیا کی تخلیق انسان کی خلقت کا مقدمہ ہے اسی وجہ سے انسان اشرف مخلوقات اور خداوند عالم کی بارگاہ میں مکرم ہے اور وہ خصوصیت جس کی بنا پر انسان، مخلوقات کے سب سے بلند درجہ پر فائز ہو سکتا ہے وہ انسان کا "مختار" ہونا اور اس کے مقدمات فراہم کرنا ہیں۔

یعنی چونکہ انسان "خدا وند عالم کی عطا کردہ قوت و توانائی کی بنیاد پر "ایک ایسی مخلوق ہے جو مختلف راستوں میں سے اپنی پسند کے کسی بھی راستے کا انتخاب کر سکتا ہے اور اس پر خدا کی طرف سے فرائض عائد کئے جا سکتے ہیں اور اگر خدا وند عالم کے معین کردہ فرائض پر گامزن ہو تو کمال کے سب سے اونچے درجہ پر فائز ہو کر دائمی سعادتوں اور لذتوں کو حاصل کر سکتا ہے۔

پس انسان کی سب سے اہم خصوصیت اسکا اختیار و انتخاب کا حاصل ہونا ہے اور جس راہ پر وہ چل رہا ہے انسان نے آزادانہ طور پر خود منتخب کی ہے۔

اسی طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ دنیاوی زندگی آخرت کی زندگی کا مقدمہ ہے۔یعنی زندگی کے اس مرحلہ میں انسان اپنے اختیار اور انتخاب کے ذریعہ اپنی راہ منتخب کرتا اور اپنی سرنوشت تحریر کرتا ہے اور زندگی کے اس مرحلہ کے بعد ابدی زندگی کا مرحلہ آنا ہے جس میں وہ اس دنیا میں انجام دیئے گئے اعمال کے نتیجوںسے بہرہ مند ہوتا ہے۔

انسان اپنی زندگی کے لئے صحیح راستہ منتخب کر سکے اس کے لئے توارادہ، فیصلے کی قوت اور اس رجحان کے علاوہ ہو جو خداوند عالم نے اس کی فطرت میں قرار دئے اور افعال کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے وسائل مہیا کئے ہیں ایک اور اہم شرط بھی ضروری ہے اور وہ صحیح راستہ کی پہچان ہے۔ درحقیقت آزادانہ انتخاب اس وقت ممکن ہے کہ جب انسان مختلف راستوں کی پہچان رکھتا ہو اور ان کے نتائج سے بھی آگاہ ہو۔

ہم انسان شناسی کی بحث میں اس بات کی طرف اشارہ کرچکے ہیں کہ انسان کے لئے مختلف قسم کی پہچانیں ممکن ہیں جو چیز تمام انسانوں میں عام ہیں حواس خمسہ اور عقل کی راہنمائی میں حاصل شدہ پہچان ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا خداوند عالم نے یہ دو وسیلے جو تمام انسانوں کے اختیار میں دیئے ہیں صحیح راستہ کے انتخاب کے لئے ضروری معلومات اورپہچان حاصل کرنے کے لئے کافی بھی ہیں یا نہیں ؟ دوسرے الفاظ میں جو انسان اپنا ہرقدم یہ سوچ کر اٹھاتا ہو کہ اسے ابدی سعادت کی راہ ہموار کرنا اور آخری منزل کمال تک پہنچنا ہے تو اس کو اپنا ہرقدم اٹھانے کے لئے کچھ چیزوں سے آگاہ ہونا پڑے گا۔ توکیا جن معلومات کی انسان کو اپنی زندگی کے ہر مرحلہ اور ہرقدم پر ضرورت پڑتی ہے وہ حواس و عقل کے راستہ سے حاصل ہوتی ہیں یا نہیں ؟

دو طریقوں سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کا راستہ منتخب کرنے کے لئے حس و عقل کافی نہیںنہیں ان دونوں طریقونکو بیان کرنے سے پہلے ہم حواس اور عقل کے ادراک اور ان کے دائرہ کارکی وضاحت کردینا ضروری سمجھتے ہیں :

حسی اور عقلی ادراک

احساسات کا دائرہ

یہ ادراک ظاہری حواس یعنی آنکھ ناک کان وغیرہ کے ساتھ مادی دنیا کے ارتباط تعلق سے حاصل ہوتا ہے ۔ اس ادراک کا دائرہ بہت زیادہ محدود ہے صرف وہ چیزیں ہم سے تعلق پیدا کرتی ہیں (وہ بھی اپنے رابطہ کی حدتک اور جب تک یہ رابطہ برقرار رہتا ہے) احساس کے دائرے میں آتی ہیں دکھائی دینے اور سنائی دینے والی چیزیں مختصریہ کہ جو معلومات ہم محسوسات کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں وہ یقینا ہماری زندگی کے لئے مفید اور ضروری ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ آخری ہدف تک پہنچنے کے لئے یہ کس حدتک مؤثر ہوسکتی ہیں ؟ یہ تو صرف کسی حدتک ہماری مادی زندگی سے متعلق کچھ رابطوں کی توجیہ کرسکتی ہیں کہ ہم کیا کھائیں کیا پئیں کیا کیا پہنیں بولیں اورکس سے کس طرح گفتگو کریں ۔

محسوسات کا دائرۂ کار محدود ہونے کی وجہ سے اس سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ ہم اس کے ذریعہ زندگی کی صحیح راہ اس کے تمام پہلوئوں کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں ۔

عقل کا دائرہ

عقل، خود اپنی جگہ (بیرونی تجربوں سے قطع نظر) جو کچھ بھی سمجھتی ہے کچھ کلیات ہیں اور بس یعنی عقل صرف بنیادی حقیقتوں یا بدیہیات اولیہ کو درک کرتی ہے اور اس پہچان کی کیفیت میں پائے جانیوالے اختلاف نظر کے باوجود اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عقل فقط کچھ اصول اور کلیات مفاہیم اور ان کے مابین ارتباط کو بیان کر سکتی ہے اور یہ کلیات بذات خود زندگی کی راہ معین و مشخص کرنے میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کرتے۔مثال کے طور پر آپ (اجتماع نقیضین محال ہے) یا (ہر معلول علت کا محتاج ہوتا ہے) یا اسی طرح مشہور و معروف مثال کہ کل جزء سے بڑا ہوتا ہے کو مد نظر رکھئے تو اس طرح کے تمام عقلی اصول اور کلیات بذات خود زندگی کی راہ جاننے پہچاننے یا معین کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔ اس طرح کی معلومات کا زیادہ سے زیادہ یہ فائدہ ہے کہ خالص فلسفی قسم کے مسائل (جیسے خداوند عالم کے وجود) کو ثابت کر سکتی ہیں۔

البتہ ادراک کی دوسری قسمیں بھی پائی جاتی ہیں جو حواس و عقل کی باہمی مدد سے حاصل ہوتی ہیں۔جن کو ہم (تجربات) کا نام دے سکتے ہیں یعنی ہمارے حواس ایک چیز کو محسوس کرتے ہیں اور ہماری عقل ان پر کام کرتی ہے ایک چیز کو دوسرے سے الگ کرتی، ہر ایک کو شامل کرتی ہے، تجزیہ و تحلیل کرتی اور ان سے نئے نتائج نکالتی ہے۔ ہماری دنیاوی زندگی کیلئے ان سب کا ہونا ضروری ہے ہم ان سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں لیکن موجودات کی مخصوص علتیں حواس اور عقل کے ذریعہ پہچانی جاتی ہیں۔ہمیں حس سے کام لینا چاہیے عقل بھی محسوسات سے فائدہ اٹھائے اور ان کا تجزیہ کرے تاکہ ان کی روشنی میں آخر کار ہم کسی علمی نتیجے تک پہنچیں چنانچہ مروجہ اصطلاح میں علمی قوانین و اصول یعنی علوم تجربی اسی طریقہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ تھی حواس اور عقل اور ان کی باہمی (مدد) سے حاصل ہونے والے نتیجہ کے بارے میں مختصر توضیح جو ہم نے قلمبند کردی۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہیں گے کہ کیا یہ معلومات جو صرف حواس یا صرف عقل یا ان دونوں کی باہمی مدد سے حاصل ہوتی ہیں زندگی کی صحیح راہ تمام پہلوئوں اور شعبوں کے ساتھ تمام زمان و مکان میں سمجھانے کے لئے کافی ہے یا نہیں؟

جیسا کہ ہم نے عرض کیا دو طریقوں سے اس چیز کا اثبات کر سکتے ہیں کہ یہ معلومات صحیح راہ کی پہچان کے لئے کافی نہیں ہیں۔

تجربہ کی راہ

یعنی اس ناتوانی کو تجربہ کے ذریعہ اورحواس و عقل کی مدد سے ہم اس تفصیل کے ساتھ ثابت کر سکتے ہیں کہ ہزاروں سال ہو گئے کہ انسان روئے زمین پر پیدا ہوا اور زندگی بسر کر رہا ہے ۔ بہت زیادہ قدیم زمانہ سے کوئی دقیق اطلاع دستیاب نہیں ہے لیکن تقریبا دو ہزار یا پانچ سو سال پہلے تک انسانی ہاتھوں کی مرتب کردہ تاریخ اور افکار و نظریات کتابی شکلوں میں موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ دانش وروں نے بڑی زحمتوں اور کوششوں سے کام لیکر اپنے حواس اور عقل سے استفادہ کر تے ہوئے مختلف مسائل کو سمجھا ہے اور ان کو علمی مسائل ، حقوق و فرائض کے قوانین ، اخلاقی اصول اور اسی طرح کے دوسر ے مسائل کی صورت میں بیان کیا ہے سائنسی علوم کے میدان میں روز بہ روز کافی ترقی ہوئی ہے اور آج ان ہی دانش وروں کی تحقیقات کے سایہ میں مادی دنیا کے بہت سے لا معلوم حقائق ہمارے لئے کشف ہو چکے ہیں اور ہم آسانی سے ان کو پہچا ن سکتے ہیں اور ان میں اکثر مسائل اتنے واضح روشن اور قابل فہم ہیں کہ ان مسائل میں بہت کم اختلاف واقع ہوتا ہے لیکن عملی مسائل میں "زندگی بسر کرنے کے طور طریقہ" معیار و اقدار اور مادی دنیا سے مافوق متافیزیک یا الٰہیات کے مسائل میں مسئلہ اسکے برعکس ہے بہت سے انسانی معاشروں میں بے پناہ مبہم مسائل موجود ہیں اور شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کے اکثر علمی حلقے مادیت سے مافوق' الٰہیات کے مسائل کو کوئی اہمیت نہیں دیتے کیونکہ وہ ان کو حل کرنے سے عاجز ہیں ۔

لیکن ہماری بحث کی اساس وبنیاد ان علوم پر قائم ہے جو روش و رفتار اور اخلاقی اقدار و معیارات سے تعلق رکھتے ہیںکہ انسا ن کو اپنی زندگی میں کس طرح کام کرنا چاہیئے اور وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ اپنے روابط کس طرح استوار کرے ؟ وغیرہ ---

یہ مسائل انسانوں کے درمیان ہمیشہ موضوع بحث رہتے ہیں اور ان مسائل کو حل کرنے میں بہت زیادہ فکری توانائیاں صر ف کی گئی ہیں لیکن جیساکہ ہمارے علم میں ہے تاریخ کے کسی بھی مرحلہ میں دانشمندوں کے افکار ان مسائل میں نہ صرف متحد اوریکساں نہیں ہو سکے بلکہ ان میں روز بہ روز اختلاف بڑھتا ہی گیا ہے آج جبکہ انسان علم ودانش کے بہت سے علمی مدارج طے کر چکا ہے صاف دکھائی دیتا ہے کہ ماہرین ہمیشہ زندگی بسر کرنے کے کچھ قوانین بناتے ہیں لیکن جلد ہی معمولی غور و فکر کے بعد ان قوانین کی خرابی ان پر ظاہر ہو جاتی ہے

اور وہ ان قوانین میں ردو بدل اور اصلاح میں لگ جاتے ہیں ۔ جو بھی قانون بنتا ہے اس پر پہلے کچھ ترمیمی نوٹ لگتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد اس قانون کو ہی کلی طور پر ختم کردیا جاتا ہے ۔ اعمال، رفتار اور اقدار و معیارات کے بارے میں انسانی افکار کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسان اپنے علم ودانش کی طویل تاریخ میں ابتک ان مسائل کو حل نہیں کر سکا ہے اور یہ تجربہ اس طرح کے مسائل حل کرنے میں حواس و عقل کی ناتوانی کا واضح نمونہ ہے ۔

عقل و ہوش کی ناتوانی کے اثبات کی یہ تجرباتی راہ ہے لیکن یہ راہ بہت زیادہ اطمینان بخش اور یقینی نہیں ہے۔ اسلئے کہ اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ شاید آیندہ صدیوں میں ہزار دو ہزار سال بعد انسان اس میدان میں اتنی ترقی کر لے اور کسی یقینی علم تک پہنچ جائے ۔

2۔دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حواس و عقل کا جائزہ لیں اور ان کی کارکردگی کی کیفیت کو دیکھیں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ کیا حواس وعقل کی مدد سے زندگی کے تمام مسائل کو حل کر سکتے ہیں یا نہیں ؟

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ حواس کے ذریعہ ہم چیزوں کے ظاہر کو وہ بھی مخصوص زمانہ اور جگہ پر محدود حالات کے ساتھ ہی دیکھ پاتے ہیں بنا بریں حواس کسی بھی صورت میں خود اپنی جگہ اقدار ومعیار کے حامل مسائل کو "خاص طور سے انسان کے عمل ورفتار کا آخرت کے نتیجوں سے کیا رابطہ ہے". بیان کرنے کی قدرت وصلاحیت نہیں رکھتا ۔ عقل بھی تن تنہا اس طرح کے مسائل بیان کرنے سے عاجز ہے عقل کے نزدیک ثابت شدہ مسلّمات کی تعداد بھی بہت زیادہ محدود ہے ہر روز بلکہ ہر گھنٹے مختلف انسانوںکے ساتھ اپنے ساتھ ،خداوند عالم کے ساتھ ، اپنے اہل خاندان اور معاشرہ والوں کے ساتھ سیکڑوں طرح کے تعلقات پیش آتے ہیں جن میں سے ہر ایک کیلئے ایک مستقل حکم ہونا چاہئے ۔ مسلمات عقلیہ بہت محدود ہیں اور ان تمام تعلقات اور مسائل کے احکام کو بیان نہیں کر سکتے۔

اسی طرح عقل و حواس کی باہمی مدد سے اگرچہ انسان کی معلومات کا دائرہ وسیع ہوجاتا ہے لیکن اس کا دائرہ بھی انسان کے تجربہ کی حدتک ہی محدود ہے ہم مادی موجودات کے سلسلے میں تجربہ کرسکتے ہیں ان کی مادی علتوں کی شناخت کر سکتے ہیں لیکن مادی پہلوئوں سے مافوق چیزوں کو تجربہ اور آزمائش میں نہیں لا سکتے کہ ہم مادہ کے ساتھ غیرمادی چیزوں کے تعلقات کو بھی تجربہ کے ذریعہ ثابت کرسکیں اور ایک آخری بات جو ان سب سے زیادہ اہم ہے (اور ہماری گفتگو کی بنیاد بھی وہی ہے) اس دنیا سے ابدی دنیا کے رشتے کو سمجھنا ہے ۔ہمارے پاس آخرت کی موجودات کی معرفت کا کوئی راستہ نہیں ہے آخرت میں ظاہر وآشکا رہو نے والی موجودات کی تن تنہا حواس کے ذریعہ پہچان کی جاسکتی ہے نہ عقل کے ذریعہ اور نہ ہی ان دونوں کی مدد سے اس دنیا کے حقائق ہم پر روشن ہو سکتے ہیں اور جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ ہماری یہ زندگی آخرت کی زندگی میں کس طرح مؤثر ہو سکتی ہے اور آخرت کی سعادت کے ساتھ ہمارے کن اعمال کا رابطہ مثبت اور کن اعمال کا رابطہ منفی ہے اس وقت ہم اپنی زندگی صحیح طریقہ سے نہیں گذار سکتے اور نہ ہی اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے صحیح منصوبہ بندی کر سکتے ہیں یہ سب منصوبہ بندی اور اقدار و معیارات عمل اور اسکے نتیجہ کے درمیان رشتے کا تعین ہونے کے بعد ہی طے ہو سکتے ہیں اور جب تک ہم اس رابطہ کو نہ سمجھ لیں اس وقت تک یہ نہیں کہہ سکتے کہ (یہ کام کرنا چاہیئے اور وہ کام نہیں کرنا چاہیئے) ہم اس بحث کو اپنے مقام پر عرض کر چکے ہیںکہ (یہ چاہیئے اور وہ نہیں چاہیئے) یہ باتیںکسی کام اور اسکے نتیجے کے درمیان رابطہ کے ذریعہ ہی معلوم ہوتی ہیں جب تک ہم نتیجہ نہ جانیں اور نتیجہ کے وجود میں اس کام کی تاثیر کا تجربہ نہ کرلیں اسوقت تک ان کے بارے میں کوئی حکم نہیں جاری کرسکتے اور مجموعی طورپر چونکہ آخرت کی دنیااور اس دنیا سے اس کے روابط حواس اور عقل کے دائرے سے خارج ہیں ہم ان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیںکر سکتے اور نہ ہی اس دنیا وی زندگی کے لئے کوئی منصوبہ اورپروگرام ترتیب دے سکتے۔

اب جبکہ ہم سمجھ گئے کہ تنہا عقل و حواس زندگی کیلئے کسی ایسی دقیق منصوبہ بندی سے عاجزہیں کہ (جس کے تحت آخرت کی کامیابی اور ابدی کمال وسعادت حاصل ہو سکے)تو اب ہم اس میں ایک اور مقدمہ کا اضافہ کرتے ہیں اور وہ یہ :

جس خدانے انسان کو اِن محدود عقل و فہم اورر خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا ہے کہ جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں اُسی نے اِس کے لئے ابدی سعادت تک خود اپنے اختیاری اعمال کے ذریعہ پہنچنے کا فیصلہ بھی کیاہے اب اگر وہ اس کے لئے لازم علم و شناخت اس کے اختیارمیں نہ دے تو اس کا فعل لغو اور عبث کہا جائیگا ۔

ہم گذشتہ بحثوں سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ خداوند عالم نے انسان کو اس دنیا میں بھیجا کہ وہ اپنے اختیاری عمل و رفتار کے ذریعہ اپنا ابدی انجام تحریر کرے اور اختیاری اعمال صحیح پہچان اور معرفت پر منحصرہیں جبکہ عام حالات میں اسطرح کی معرفت اورپہچان انسانی عقل و فہم کے ذریعہ حاصل نہیںہو سکتی دو سرے لفظوں میں خدا نے ایک طرف تو انسان کو انتخاب کی قوت دی تاکہ وہ اپنے علم و معرفت کے ذریعہ اپنا راستہ خود منتخب کر لے اور دو سری طرف صحیح راستہ منتخب کر نے کے لئے ضروری پہچانیں اسکے اختیار میں نہیں دی ہیں ۔

ایک آسان مثال کے ذریعہ مطلب یوں سمجھئے کہ:اگر کوئی کسی کو اپنے گھر پر مہمان کرے اور بہت زیادہ اصرار کے ساتھ کہے کہ آپ کو ہر حال میں آنا ہے یہاں تک کہ اس کو دھمکی بھی دے کہ اگر نہ آئے تو آپ کو جواب دینا پڑے گا لیکن اسکو اپنے گھر کا راستہ نہ بتائے ایڈریس نہ دے اور کہدے کہ گھر آپ خود تلاش کرلیجئے گا کہ یہ مکان کس شہر میں ہے ؟وہاں جانے کے لئے کس سواری کی ضرورت پڑے گی ؟کچھ مشخص ومعین نہیں ہے کہ کس شخص سے سوال کرنا ہے؟میں یہ سب کچھ نہیں جانتا لیکن آپ کو دعوت میں ضرور آنا ہے تو یہ دعوت ایک احمقانہ دعوت کہی جائے گی اگر انسان کو کسی مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس مقصد تک اس کو خود اپنے علم واختیار کے ساتھ پہنچنا ضروری ہے تو ضروری نشانیاں بھی اس کے اختیار میں دیا جانا لازم ہے ۔آپ کو بہشت میں پہنچنا ہے آپ کو ہم نے جنت کے لئے آخرت کی بے انتہا رحمتوں کیلئے خلق کیا ہے ہمارا ہدف و مقصد یہی ہے لیکن ہم وہاںتک پہنچنے کے راستے کی کوئی نشان دہی نہیں کریں گے آیا میں اگر خود غورو فکر کروں تو سمجھ جائو نگا؟جی نہیں کیا میں کسی سے پو چھوں تو بتا سکتا ہے ؟ جی نہیں ۔ہم صرف اتنا جانتے ہیں کے تمھیں وہاں تک پہنچنا ہے اس طرح کا فعل عبث اور احمقانہ ہے ۔

بنا براین حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ ضروری علم بہ شناخت تمام انسانوں کیلئے فراہم کردے کوئی راستہ معین کردے کہ انسان اس راستہ کی بنیادپرہدف اور اس تک پہنچنے کی کیفیت جان لے اور یہ راستہ وحی اور نبوت کے علاوہ اور کوئی را ستہ نہیں ہو سکتا ۔پس اس تفصیل کی بنیا دپر ایک ایسی راہ کی ضرورت ہے جو عام افراد کی پہنچ سے با ہر ہے ثابت ہوجاتی ہے ۔

اب سوال یہ ہے کہ خدا نے کیا یہ راستہ سب کے اختیار میں قرار دیدیا ؟جی نہیںاس لئے کہ اگر یہ راستہ سب کے اختیار میںقرار دیدیا جاتا تو ہم اور آپ بھی اس سے بے خبر نہ ہوتے ۔ جس وقت بھی چاہتے عالم بالا کیلئے ایک ٹیلیگراف کرکے معلوم کر لیا کرتے کہ ہمیںکیا کرنا چاہئے ؟لیکن ہم کو معلوم ہے کہ انسانوں کی استعداد میں کمی کی وجہ سے اس طرح کا رابطہ تمام انسانوں کیلئے میسر نہیں ہے۔لہذا حکمت الٰہی خود تقاضا کرتی ہے کہ انسانوں کو اس طرح خلق کرے کہ ان کے درمیان کچھ افراد ایسے ہوں کہ ان کے ذریعہ خداوند عالم لوگوں کو حقائق سے آگاہ کرکے زندگی بسر کرنے کا دستورالعمل معین و مشخص کردے ۔

اہم بات

ہم نے انسانی عقل و فہم کی کوتاہی کے جن دو راستوں کا تذکرہ کیا نتیجہ کے اعتبار سے فرق کرتے ہیں ۔ اگر صرف پہلا راستہ ہوتا تو ہم اس سے قطعی طور پر جو نتیجہ اخذ کر سکتے تھے یہ تھا کہ خداوند عالم نے چونکہ تمام انسانوں کو سعادت کے لئے پیدا کیا ہے اور انسان ہزاروں سال سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور تجربہ بتاتا ہے کہ عام ادراک کے ذریعہ اس باریک راستہ کو نہیں پہچانا جا سکا ۔ پس خدا کی حکمت تقاضا کرتی ہے کہ ابتک ان انسانوں کے لئے کوئی دوسری راہ مقرر کر دی ہو لیکن بعد کے لئے کیا ہوگا ؟ کیونکہ یہ احتمال پایا جاتا ہے کہ بعد میں انسان کی عقل کامل ہوجائے اور وہ آہستہ آہستہ خود ہی راستہ کو سمجھ لے اور یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کے مستقبل کے لئے نبوت کی ضرورت کو قطعی دلیل کے ذریعہ ثابت نہیں کر سکتے ۔ ہم اسی حد تک نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اب تک انسان کی عقل ناقص تھی اور یہ محال ہے کہ خداوند عالم اربوں انسانوں کو جنہیں اس نے تاریخ کے طویل دور میں ابتک پیدا کیا ہے کسی رہنما کے بغیر چھوڑ دے ۔ یہ حکمت الٰہی کے خلاف ہے لیکن بعد کے لئے کیا ہو ؟ کیا اب اس دلیل میں کوئی کشش نہیں رہ گئی ؟ کیونکہ گذشتہ تجربہ کی بنیاد پر مستقبل کے لئے یقین کے ساتھ پیشینگوئی نہیں کی جا سکتی کہ مستقبل میں بھی انسانوں کی عقل کمال تک نہیں پہنچ پائے گی کہ لوگ زندگی کیلئے کوئی دقیق منصوبہ بندی حاصل کر سکیں ۔ اس مقام پر ایک شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ ممکن ہے ایک زمانہ میں انسان کی عقل کامل ہوجائے جیساکہ بعض لوگوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کی خاتمیت اور اسلام کے ناسخ ہونے کے بارے میں کہا ہے: چھٹی صدی عیسوی تک انسان کی عقل ناقص تھی وہ اس بچہ کے مانند تھا جس کو ہاتھ پکڑ کر قدم قدم چلایا جائے اور حقیقت میں وہی اس بچہ کی پرورش کرنے والی دایہ کے مانند تھے جن کا کام مدد کرنا تھا تاکہ وہ زندگی کے مرحلے قدم بہ قدم طے کر سکے لیکن چھٹی صدی عیسوی میں انسان کی عقل کامل ہوگئی اور اس کے بعد وحی کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہی لہٰذا اس کو حکم دیا گیا کہ اپنے پیروں پر خود کھڑے ہوجاؤ اب تمہیں اپنی زندگی کی راہ خود مشخص و معین کرنا چاہئے اس وجہ سے اب کسی نئے پیغمبر کے آنے کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے ۔

جی ہاں اگر ہم اس طرح استدلال کریں کہ ابتک چونکہ انسان کی عقل کامل نہیں ہوئی تھی تو یہ احتمال مستقبل کے لئے دیا جا سکتا تھا البتہ اس طرح کا نتیجہ حتی اس مقدمہ کے ساتھ اخذ کرنا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ چھٹی صدی عیسوی سے آج تک جب چودہ صدیاں گذر چکی ہیں اب بھی عقل کی ناتوانی اور نارسائی واضح ہے اور بہت سے شکوک و شبہات (سوائے ان کے کہ جنھوں نے نوراور وحی سے راہ زندگی حاصل کی ہے) انسان کے لئے پہلے کی طرح اب بھی موجود ہیں۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ کچھ گروہ اور زیادہ ضلالت و گمراہی میں ڈوب چکے ہیں یہاں تک کہ اخلاق اور قدروں کے لحاظ سے سابقین کی بہ نسبت تنزل کا شکار ہو چکے ہیں اورر اگر زوال نہیں کیا ہے تو کوئی نمایاں ترقی بھی نہیں کر سکے ہیں۔ بہر حال یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاںتک تاریخ بتاتی ہے انسان کی عقل زندگی کی صحیح منصوبہ بندی کے لئے ہمیشہ ناتواں اور ناکافی رہی ہے بس حکمت الٰہی اقتضاء کرتی ہے کہ ان تمام ادوار میں وحی کے ذریعہ انسان کی رہنمائی کرے۔

لیکن کسی بھی حال میں آئندہ کے لئے اس برہانِ تجربی کی اساس پر نہیں کہا جاسکتا کہ یقینی طور پر مستقبل میں بھی انسان کی عقل کامل نہیں ہوسکے گی شاید سو صدیوں بعد کے لئے کوئی شخص یہ احتمال دے کہ میرے خیال میں انسان کی عقل کامل ہو جائیگی اور وہ زندگی کے مسائل درک کرلے گا اور اختلافات ختم ہوجائینگے لیکن ہم مستقبل کی سو صدیوں بعد کے لئے پیشین گوئی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اس احتمال کی وجہ سے ہم آئندہ کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اگرچہ ہم کو مستقبل میں کسی نئے نبی کی آمد اور وحی کے نازل ہونے کی ضرورت نہ ہو اوریہی آسمانی کتاب جس کو خداوند عالم نے آخری نبی پر نازل فرمایا ہے قیامت تک انسانوں کی ہدایت کے لئے کافی ہو لیکن اس احتمال کا نقصان یہ ہے کہ اُس کے تحت ممکن ہے ایک انسان کی عقل کامل ہو جائے اور وہ تعبّد کی مدد کے بغیر اپنی راہ کا بذات خود انتخاب کرسکے۔

لیکن ہم نے انسانی ادراک سے استفادے کی جس دوسری روش کی طرف اشارہ کیا ہے اس کے تحت ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ انسان کبھی بھی نہ تو وحی سے بے نیاز تھا اور نہ ہی آئندہ بے نیاز ہوسکے گا کیونکہ زندگی صحیح طور پر گزارنے کی منصوبہ بندی اس شرط پر موقوف ہے کہ ہم اپنے اختیاری اعمال کا رابطہ آخرت میں ان کے نتیجوں کے ساتھ جانتے ہوں اورعقل و حواس کبھی بھی ان رابطوں کو صحیح طور پر کشف نہیں کر سکتے۔ اسلئے کہ یہ انسانی تجربہ کی دسترس سے باہر ہے۔ پس عقل و فہم کی ناتوانی معلوم کرنے کی راہ کی بنیاد پر پورے یقین کے ساتھ ہمیشہ کے لئے (چاہے وہ ماضی کی بات ہو یا حال یا مستقبل کی) یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اگر وحی کا وسیلہ نہ ہو اور اس کے نتائج انسان کے اختیار میں نہ ہوں تو خداوند عالم کا فعل یعنی انسان کی تخلیق لغو اور بے کار ہو جائیگی۔

حقیقت میں یہ سب سے یقینی اور قطعی دلیل ہے جو نبوت کی ضرورت پر قائم کی جا سکتی ہے ۔ فلاسفہ اور اسلامی متکلّمین نے دوسری دلیلیں بھی نقل کی ہیں جو ان کی کتابوں میں درج ہیں چونکہ ہماری نظر میں یہ دلیل سب سے زیادہ محکم اور قابل یقین ہے لہذا ہم اسی دلیل پر اکتفاء کرتے ہوئے دوسری دلیلوں کے بیان سے قطع نظر کرتے ہیں ۔

قرآن کریم میں رسولوں کے مبعوث ہونے اور کتابوں کے نازل کرنے کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے ان سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان سے بھی اسی دلیل کا استنباط ہوتا ہے منجملہ یہ دلیل:

(رُسُلاً مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلیٰ اللهِ حُجَّة بَعْدَالرُّسُلِ)[1]

ہم نے بشارت اورڈرانے والے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا تاکہ اُس کے بعد لوگوں کے لئے خدا کے مقابل کوئی حجت باقی نہ رہ جائے" ۔

یعنی اگر پیغمبر مبعوث نہ کئے گئے ہوتے تو لوگ یہ احتجاج کر سکتے تھے کہ ہمارے گمراہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ہم خداوند عالم کے احکام سے ناواقف تھے لیکن انبیاء علیہم السلام کے آنے کے بعد اُن پر حجت تمام ہو گئی۔

اورہم اس آیت سے اسی دلیل کا استنباط کرتے ہیں:

اگر عقل و حواس اور ان دونوں کی باہمی کارکردگی صحیح راستہ کو پہچاننے میں کافی ہوتی تو جب لوگ احتجاج کرتے ہوئے کہتے:

"ہم نہیں جانتے تھے کہ وہ راستہ غلط اور یہ راستہ صحیح تھا"۔

خدا یہ فرما سکتا تھا کہ "میں نے تو عقل اور صحیح راستہ کو منتخب کرنے کے وسائل تمہارے اختیار میں دیدئے تھے"۔

تو اُن کے لئے یہ کہنے کا امکان ہوتا: ہم سب کو تحقیق و جستجو کا موقع نہیں مل سکا ۔

1۔ سورۂ نساء آیت165۔

اور پھر اُن کو جواب دیا جاتا : جس طرح بعض دانشمندونّنے مادی امور میں تحقیق کی اور دوسروں نے انُ کی تحقیقات سے استفادہ کیا تم بھی صحیح راستہ کی شناخت کے لئے بہتر کام کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ خدا وند عالم فرماتا ہے :"جب تک ہم پیغمبر کو نہ بھیج دیں حجت تمام نہیں ہو سکتی " خود یہ جملہ اس بات کا شاہد ہے کہ قرآن کی رو سے انسان کا فہم وادراک عام حالات میں زندگی کے صحیح راستہ کو پہچاننے کے لئے کافی نہیں ہے ۔

دوسری آیات میں بھی اسی طرح کا مضمون ہے منجملہ یہ کہ:ہم نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا، کتابوں کو نازل کیا تاکہ لوگ یہ نہ کہہ دیں :

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

(لَولَاْ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلاًفَنَتَّبِعَ آیَا تِکَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَذِلَّ وَنَخْزَیٰ)[1]

" اگر رسولوں کو ہم نہ بھیجتے اور کتابیں نازل نہ کرتے لوگ احتجاج میں کہہ سکتے تھے خدایا تو نے کوئی نبی کیوں نہ بھیجا ؟ اگر بھیجا ہوتا تو ہم اس ذلت و خواری میں مبتلا نہ ہوتے"۔

در حقیقت یہ حکمت الٰہی کے خلاف احتجاج ہے یعنی تو نے جو ہم کو پیدا کیا تیرا ہدف یہ تھا کہ ہم اس ذلت ورسوائی میں پڑ جا ئیں ؟ یہ تو حکمت کے خلاف ہے ۔تو اگر نہیں چاہتا تھا کہ ہم زبردستی ذلت ورسوائی میں گرفتار ہوں تو تجھ کو معلوم تھا کہ ہماری عقل راستہ کی شناخت کیلئے کافی نہیں ہے ۔پس تو نے پیغمبر کیوں نہ بھیجا جو ہم کو اس بد بختی سے چھٹکارا دلاتا ۔قرآن کامل طور پر اس احتجاج سے واقف تھا لہٰذا قرآن کریم کہتا ہے کہ ہم نے پیغمبر کو مبعوث کیا تاکہ تم اس طرح کی باتیں نہ بنا سکو یعنی اگر پیغمبر نہ بھیجتے تو تم کو اس طرح کی باتیں بنانے کا حق تھا ۔یہ حق ہونا کس صورت میں ممکن ہے ؟ اسی صورت میں کہ جب انسان کی سمجھ عام حالات میں شناخت کے لئے کافی نہ ہو۔

پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کی رو سے انسان کے حواس اور عقل زندگی کی راہ کا صحیح تعیین کرنے کیلئے کافی نہیں ہیں اور صرف وحی اور نبوت کے ذریعہ انسان کی زندگی سے اس کمی اور نقص کو رفع کیا جاسکتا ہے اور اسی صورت میں تخلیق کی الٰہی غرض و غایت پوری ہو سکتی ہے۔

چونکہ اس رسالے میں ہم "راہ کی شناخت "پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں ۔ لہٰذا ہمارے لئے وحی ونبوت اور اُن کے متعلقات کے بارے میں تفصیلی بحث ضروری ہے کیونکہ صحیح راستہ کی شناخت صرف"وحی "کے ذریعہ ممکن ہے کسی بھی اور راہ سے اس کا امکان ہے۔

1۔ سورۂ طٰہ آیت134۔

نبوّت قرآن کی نگاہ میں

قرآن کریم میں نبوت اور اس سے متعلّق مسائل کے بارے میں بہت سی آیتیں ہیں ظاہر ہے ہم ان تمام آیتوں پر تحقیقی بحث نہیں کر سکتے لہٰذا ان آیات میں کی گئی اہم بحثوں کا ہی ہم نے انتخاب کیاہے اور حسب ضرورت ان مباحث سے متعلق آیات کی وضاحت کریں گے تو آئیے سب سے پہلے بعثت انبیاء علیہم السلام کے اہداف و مقاصد پر گفتگو کرتے ہیں۔

بعثت انبیاء علیہم السلام کے مقاصد

تشریعی ہدایت (الٰہی رہنمائی)

در اصل قرآن کریم میں نبوّت کا مسئلہ انسان کی خلقت کے ساتھ ہی بحث میں آیا ہے کیونکہ اس دنیا میں انسان کی زندگی کی بنیاد الٰہی (اور مذہبی) رہنمائی پر قائم ہوئی ہے ۔اس دنیا میں انسان کی خلقت کے مقصد کو دیکھتے ہوئے اس بات کو قبول کرنا واضح ہے ۔جب ہمیں معلوم ہو گیا کہ انسان کو عالمِ مادہ میں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اس کی اپنی پسند کا ایک راستہ اسکے سامنے ہو اور وہ اپنے پورے اختیار سے اپنی تقدیر کی بِنا رکھے تو ظاہر ہے خدا کی جانب سے ہی اس کے سامنے ایک ایسا راستہ ہونا چاہئے کہ جس کے دو پہلو ہوں ایک پہلو کمال کا ہو اور دوسرا پہلو نقص کا ایک کی انتہاء کا میابی و نجات پر ہو اور دوسرے کا اختتام ناکامی و بد بختی پر تا کہ اپنے آزادانہ انتخاب کے ذریعہ انسان اُن میں سے ایک کو چُن لے ۔

قرآن کی بعض آیات سے پتہ چلتاہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جس وقت زمین پر آئے اسی وقت ان پر وحی ہوئی کہ جب خدا کی جانب سے تمہاری رہنمائی ہو تو اس کو قبول کرنا ۔اگر قبول کیا اور اس پر عمل کیا تو نجات مل جائے گی اور اگر مخالفت کی تو بد بخت ہو جائو گے قرآنِ کریم میں ارشاد ہوتا ہے :

(قُلنَااهْبِطُوْامِنهَا جَمِيْعاً فَاِمّاياْتِيَنَّكُم مِنّيْ هُدًى) [1]

"اور جب آدم سے کہا کہ بہشت سے نکلو (تو ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا تھا) کہ اگر تمہارے پاس میری طرف

1۔ سورۂ بقرہ آیت 38۔

سے ہدایت آئے تو (اُس کی پیروی کرنا)"۔

کیونکہ اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو پیروی کر کے نجات پا جائو یا مخالفت کر کے بد بخت ہو جائو۔

(فَمَن تَبعَ هُدَایَ فَلَا خَوف عَلَیْهِم وَلَاهُمْ یَحْزَنُونَ وَالَّذِینَ کَفَرُوْاوَ کَذَّ بُوْابِآیٰتِنَااُولٰئِکَ اَصحَابُ النَّارِهُمْ فِیهَا خَالِدُونَ)[1]

"جو لوگ میری ہدایت پر چلیں گے اُن پر (قیامت میں) نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ رنجیدہ ہونگے اور جن لوگوں نے انکار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ دوزخ میں پڑے رہینگے"۔

یعنی زمین پر آدم کی آمد کے آغاز سے ہی اُن پر یہ بات روشن کر دی گئی تھی کہ آپ کے سامنے دو راستے ہوں گے اور خدا کی طرف سے رہنمائی کی جائیگی۔

اسی سے ملتی جلتی یہ آیت بھی ہے:

(قَا لَ اهْبِطَامِنْهَاجَمِیْعاً)

"(آدم و حوّا سے خطاب ہے) کہ دونوں جنّت کو چھوڑ دو اور زمین پر چلے جائو"۔

اور ممکن ہے یہ خطاب حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس سے ہو کیونکہ اِس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: (بَعضُکُم لِبَعْضٍ عَدُوّفَاِمَّا یَا تِیَنَّکُم مِنِّیْ هُدًی فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَا یَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی)[2]

"تم میں سے ایک ایک کا دشمن ہے پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو (تم اس کی پیروی کرنا کیونکہ) جو شخص میری ہدایت پر چلے گا نہ تو وہ گمراہ ہوگا اور نہ مصیبت میں پھنسے گا"۔

اسی طرح سورۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

(یٰبَنِیْ آدَمَ اِمَّایَاتِیَنَّکُم رُسُل مِنکُم یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُم آیاتِی فَمِنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَاخَوْف عَلَیْهِم وَلَاهُمْ یَحْزَ نُوْ نَوَالَّذِیْنَ کَذَّبُوابِ۫ایٰتِنَاوَاسْتَکْبَرُوْاعَنْهَااُولٰئِکَ اَصْحَابُ النَّارِهُمْ فِیْهَا خَالِدُوْنَ)[3]

"اے اولادِ آدم جب تم میں سے ہی (ہمارے) پیغمبر آئیں اور تم سے ہمارے احکام بیان کریں (تو ان کی اطاعت کرنا کیونکہ) جو لوگ پرہیز گار بن گئے اور نیک کام کیا ان کے لئے قیامت میں نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ آزردہ

1۔ سورۂ بقرہ آیت 38۔39۔2۔ سورۂ طہٰ آیت123۔3۔ سورۂ اعراف آیت35،36۔

خاطر ہونگے اور جن لوگوںنے ہماری آیت کو جھٹلا دیا اور اُن سے سرتابی کربیٹھے وہی لوگ جہنمی ہیں اور اُس میں ہمیشہ رہینگے "۔

خطاب تمام انسانوں سے ہے اس آیت کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ کوئی یہ نہ سوچ لے کہ مذکورہ خطاب صرف آدم و حوّا یا ابلیس سے مخصوص تھا ۔دوسرے لوگوں سے اسکا کوئی تعلّق نہیں ہے یہاں خطاب اولاد آدم سے ہے۔ سورۂ بقرہ میں "فَمَنْ تَبِعَ" آیا تھا 'سورۂ طہ اور سورۂ نور میں (فَمَنِ اتَّبَعَ) تھا ۔یہاںاسکا مصداق "فَمَنِ اتّقٰی وَاَصْلَحَ" بیان کیا جا رہا ہے ۔

لہٰذا وحی ونبوّت کے ذریعہ الٰہی ہدایت کا مسئلہ ایک ایسی چیز ہے جو خلقت میں مضمر اور شامل ہے اور اسکے بغیر روئے زمین پر انسان کی رہائش ممکن نہیں ہے کیونکہ ایسا ہونا حکمتِ الٰہی کے خلاف ہے ۔اس چیز کے پیش نظر خدا نے ہر آبادی اور ہر قوم کے لئے ایک پیغمبر بھیجا :

(وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلاَ فِیْهَا نَذِیْر)[1]

تو اب اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں بھی یا جس شہر میں بھی کچھ لوگ آباد ہوں وہاں ایک پیغمبر ہونا چاہئے یا یہ کہ ہر زمانہ میں ایک پیغمبر ہونا ضروری ہے تاکہ زمانی اعتبار سے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ایک دوسرے سے متصل رہے یا اس کی کوئی اور صورت ہے ؟ قرآن نے اس بارے میں صاف صاف کچھ نہیں کہا ہے صرف لفظِ امت کا استعمال ہوا ہے ۔قرآن میں لفظِ امت کے بہت وسیع معنی ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لفظِ امت اپنے علمی معنی میں معاشرے کے مترادف ہے لیکن ایسا نہیں ہے قرآن میں لفظِ امت اس کے قطعِ نظر کہ اس جگہ صرف ایک فرد کے لئے استعمال ہوا ہے اور کبھی وقت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جن موارد میں اسکا انسانوں کی ایک جماعت پر اطلاق ہوا ہے اس کے موارد استعمال کے لحاظ سے قدر مشترک صرف جماعت اور گروہ کا مفہوم ہے ۔مثال کے طور پر قرآن تمام انبیاء علیہم السلام کو ایک امت شمار کرتا ہے(اِنَّ اُمَّتُکُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً) جبکہ ان سب کے درمیان وقت ،مقام نیز اقتصادی اور سیاسی تعلّقات کے لحاظ سے اشتراک نہیں پایا جاتا ۔

بہر حال قرآن میں امت گروہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ ہر امت کے لئے ایک پیغمبر ضروری ہے مطلب کیا ہے ؟[2]

1۔ سورۂ فاطر آیت24۔

2۔مزید معلومات کے لئے ملاحظہ فرمائیں:معاشرہ اور تاریخ قرآن کی نظر میں۔

ہم دقیق طور پر اسکے معنی معین نہیں کر سکتے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد انسانوں کا ہر وہ گروہ ہے جو دوسرے انسانوں سے جدا ہوا اور ان کے روابط اسطرح کے نہ ہوںکہ اِن کی معلومات اُن تک منتقل ہو سکے ایسے میں ظاہر ہے اُن میںسے ہر گروہ الگ الگ رہنما کا محتاج ہوگا لیکن اگر لاکھوں انسان دسیوں صدی کے دوران ایسے تعلقات کے حامل ہوںکہ ان کی معلومات ایک دوسرے تک منتقل ہوں ان پر اگر کوئی کتاب نازل ہو اور اُن کے درمیان باقی رہے تو یہ سب امّتِ واحدہ شمار ہوں گے اس آیت میں بھی جو کہا گیا ہے:

(وَ اِنْ مِنْ اُمَّة اِلّا خَلَا فِیْها نَذِیْر)[1]

"کوئی امّت ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی نبی نہ ہو"۔

یہ ظاہر یہی معنی مراد لئے گئے ہیں لیکن یہ کہ ہم مبعوث ہونے والے تمام انبیاء علیہم السلام کو نہیںپہچانتے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بعض روایات میں آیاہے کہ انبیاء علیہم السلام ایک لاکھ چوبیس ہزار ہوئے ہیں اب روایات کے معتبر ہونے یا نہ ہونے سے یہاں ہم کو کوئی مطلب نہیں ہے۔بہر حال ایک بڑی تعداد میں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے ہیں اور قرآنِ مجید میں تقریباً پچیس انبیاء علیہم السلام کا نام ذکر ہوا ہے باقی انبیاء معروف نہیں یہاں تک کہ اُن کے نام بھی معلوم نہیں ہیں۔ سورۂ فاطر کی اِس آیت کے مطابق ہم اجمالی طور پر یہ بات جانتے ہیں کہ مذکورہ معنی میں ہر امت میں ایک نبی رہا ہے ہم نے نبوّت کی ضرورت پر جو دلیل پیش کی تھی اور عرض کیا تھا کہ اُس دلیل کو قرآن کی تائید حاصل ہے اس سے نبوت کی ضرورت اور اسی کے ضمن میں انبیاء علیہم السلام کا مقصد معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح سے ہم نے ثابت کر دیا کہ انسان کو چونکہ خود ہی آزادانہ طور پر سعادت یا شقاوت کا راستہ اختیار کرنا ہے اسلئے اُس کے لئے دونوں راستوں کی شناخت ضروری ہے اور انسان کی عقل اور حواس صحیح یا غلط کی شناخت کے لئے کافی نہیں ہے لہٰذا ایک اور راہ جس کا نام ہم نے وحی رکھا ہے ہونا چاہئے ورنہ انسان صحیح راستہ نہیں پہچان سکے گا اور پھر ظاہر ہے اس بارے میں جواب دِہ نہیں ہوگا اورچونکہ خدا نے انسان کو اس لئے خلق فرمایا کہ وہ ذمہ داری قبول کرے یعنی خود انتخاب کرے تاکہ اپنے اعمال کے نتیجہ تک پہنچ سکے اس لئے خدا نے شناخت کی کوئی راہ بھی ضرور معیّن کی ہو گی ۔ چنانچہ اس دلیل کے مطابق پہلا مقصدیہ سمجھ میں آتا ہے کہ انسانوں کو صحیح اور غلط کی شناخت ہونا چاہئے تاکہ جو بھی

1۔ سورۂ فاطر آیت24۔

جس راستہ کا انتخاب کرے سمجھ بوجھ کر انتخاب کرے دوسرے الفاظ میں اُس پر حجت تمام ہو چکی ہو ۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم میں بہت سی آیات پائی جاتی ہیں منجملہ یہ آیت:

(رُسُلاً مُبَشِّرِیْنَ ومُنْذِ رِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْ نَ لِلنَّاسِ عَلَی اللَّهِ حُجَّة بَعْدَ الرُّسُلِ وَکَا نَ الله عَزِیْزاً حَکِیْماً)[1]

"اور ہم نے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے پیغمبر بھیجے تاکہ خدا کے سامنے لوگوں کے پاس کوئی حجت نہ رہ جائے اور خدا توبڑا ہی عزیز و حکیم ہے"۔

خاص طور سے آیت کے ذیل میں خداوند عالم نے جو فرمایا ہے: (وَکَا نَ الله عَزِیْزاً حَکِیْماً) اس سے واضح ہوتا ہے کہ اتمام حجت حکمت الٰہی کا لازمہ ہے یہ تقریباً وہی بات ہے جس کا ہم نے اپنے استدلال میں ذکر کیا تھا کہ حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ نبوت کا راستہ انسان کے لئے کھلا رہے ۔ اسی سے ملتی جلتی ایک اور آیت ہے(البتہ یہ آیت جن کا ہم ذکر کررہے ہیں بعض میں مخاطب ایک مخصوص قوم ہے یا کہیں کہیں اہل کتاب سے خطاب ہے یا مشرکین مکہ مخاطب ہیں لیکن مضمون سب کا ایک ہی ہے)

(اَنْ تَقُوْلُوْااِنَّمَااُنْزِلَ الْکِتَا بُ عَلَیٰ طَائِفَتَیْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ کُنَّاعَنْ دِ رَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِیْنَاَوْتَقُوْلُوْالَوْاَنَّااُنْزِلَ عَلَیْنَاالْکِتَابُ لَکُنَّااَهْدَیٰ مِنْهُمْ)[2]

ہم نے نبی کو کتاب کے ساتھ بھیجا کہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ کتاب خدا تو بس صرف دو ہی گروہوں (یہود و نصاری) پر جو تم سے پہلے تھے نازل ہوئی ہے اور ہم تو ان کے پڑھنے (پڑھانے) سے بے خبر تھے یا یہ نہ کہنے لگو کہ اگر ہم پر بھی کتاب (خدا) نازل ہوتی تو ہم ان لوگوں سے بہتر طور پر راہ راست طے کرتے"۔

اگر ہم نے تمہارے لئے پیغمبر نہ بھیجا ہوتا توتم کہہ سکتے تھے کہ خدا نے یہودیوں کے لئے پیغمبر بھیجا اور انھوں نے راہ حق کو جان لیا تھا اگرچہ ان میں سے اکثر گمراہ ہوگئے عیسائیوں کا بھی یہی حال ہوا اگر خدا نے ہمارے لئے پیغمبر بھیجا ہوتا تو ہم اس سے بہتر طور پر راہ حق کی پیروی کرتے اسی لئے ہم نے تمہارے لئے بھی پیغمبر بھیجا تاکہ تمہارا بھی امتحان لیا جاسکے ۔

1۔ سورۂ نساء، آیت 165 ۔

2۔ سورۂ انعام آیت 156 و157 ۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن میں ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ لوگوں نے پیغمبر کی بعثت سے پہلے قسم کھا رکھی تھی کہ اگر خدا ہمارے لئے کوئی پیغمبر بھیجے تو ہم اس کی پیروی کرینگے اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں زیادہ ہدایت یافتہ ہوجائیں گے :

(وَاَقْسَمُوْابِاللہ جَھْدَ اَیْمَا نِھِمْ)

معلوم ہواکہ وہ لوگ پہلے سے خدا پر عقیدہ رکھتے تھے اور انھوں نے بہت بھاری بھاری قسمیں کھا رکھی تھیں :

(وَاَقْسَمُوْابِاللہ جَھْدَ اَیْمَا نِھِمْ)

اور انھوںنے بڑی سختی سے قسمیں کھا رکھی تھیں:

(لَئِنْ جَا ئَ ھُمْ نَذِ یْر لَیَکُوْ نُنَّ اَھْدَیٰ مِنْ اِحْدَ ی الْاُمَمِ)

"کہ اگر ان کے درمیان کوئی ڈرانیوالا (پیغمبر) آئیگا تو وہ دوسری تمام امتوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہونگے"۔

(فَلَمَّاجَائَھُمْ نَذِیْرمَاْزَادَھُمْ اِ لَّانُفُوْراً)[1]

"پھر جب ان کے پاس ڈرانے والا (رسول) بھیج دیا تو اس کی اتباع اور حمایت کے بجائے اور زیادہ اس سے دور بھاگنے لگے "۔

پس معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا ایک مقصد لوگوں پر حجت تمام کرنا رہا ہے ایک اور آیت میں اہل کتاب سے خطاب ہے :

(یَااَھْلَ الْکِتَابِ قَدْجَائَکُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ عَلَیٰ فَتْرَۃٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْامَاجَائَ نَامِنْ بَشِیْرٍوَّلَانَذِیْرٍفَقَدْجَا ئَکُمْ بَشِیْر وَّ نَذِ یْروَاللہُ عَلَیٰ کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْر)[2]

" اے اہل کتاب جس وقت پیغمبروں کی آمد رکی ہوئی تھی ہمارا رسول تمہارے پاس آیاکہ تم پر حق آشکار کردے اور تم یہ نہ کہہ سکوکہ ہمارے درمیان کوئی خوشخبری دینے والا یا عذاب خدا سے ڈرانے والا (نبی) نہیں آیا ہے تمہارے درمیان خوشخبری دینے والا اورڈرانے والا (پیغمبر) آچکا ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے"۔

البتہ اہل کتاب خود کو ایک نبی کا پیرو سمجھتے تھے لیکن اس انتظار میں تھے کہ ایک اور پیغمبر آجائے شاید اس وحی کی بنیاد پر ان کا یہ انتظار تھا جو پہلے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہو چکی تھی اور ان کو آخری نبی کی بشارت دی جا چکی تھی :

1۔ سورۂ فاطر آیت 42۔

2۔ سورۂ مائدہ آیت19۔

(بِرَسُوْلٍ یَا تِیْ مِنْ بَعْدِیْ اسْمُهٗ اَحْمَدُ)[1]

"ایک پیغمبر کی کہ جن کا نام احمد ہو گا اور میرے بعد آئیں گے "۔

میں تم کو بشارت دیتا ہوں بہر حال یہ لوگ اس بات کے منتظر تھے کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے اور یہ اسلئے تھا کہ تمہارے پاس یہ کہنے کا بہانہ نہ رہے چونکہ پیغمبر نہیں آیا اسلئے ہم گمراہ ہو گئے اس لئے کہ کتاب میں تحریف ہو چکی تھی یا گذشتہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات ہم تک نہیں پہنچی تھیں ۔ایک اور نبی کی ضرورت تھی یا یہ کہ چونکہ ہم سے وعدہ کیا گیا تھا اس لئے ہم اس کے منتظر تھے اور جب وہ نہ آیا تو ہم شک میں پڑ گئے تم ایسی باتیں نہ کر سکو اس لئے : (فَقَدْ جَائَکُمْ بَشِیْر وَنَذِیْر)

"تمہارے درمیان ایک ڈرانے والا اوربشارت دینے دالا(رسول)آچکا ہے"۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے :

(وَ لَوْاَ نَّااَھْلَکْنٰھُمْ بِعَذَابٍ مِنْ قَبْلِهِ لَقَالُوْارَبَّنَالَوْلَا اَرسَلْتَ اِلَیْنَارَسُوْلاً فَنَتَّبِعَ یٔ ایَا تِکَ مِنْ قَبَلِ اَنْ نَذِ لَّ وَنَخْزٰی)[2]

"اور اگر ہم ان کو رسول کے آنے سے پہلے ہی عذابِ ہلاکت میں بتلا کر دیتے تو ضرور کہتے کہ اے ہمارے پالنے والے تو نے ہمارے پاس (اپنا) رسول کیوں نہیں بھیجا کہ ہم اپنے ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے ہی آیتوں کی پیروی کر لیتے "۔

خدا نے لوگوں کو اس لئے خلق فرمایا تھا کہ وہ اپنے اختیار کے ذریعہ صحیح راستہ یا غلط راستہ کا انتخاب کریںاور اگرغلط راستہ کو انتخاب کیا تو اپنے اعمال کی سزا پائیںپس غلط راستہ انتخاب کرنے والوں پر عذاب تو نازل ہونا ہے لیکن اگر ہم پیغمبر بھیجنے سے پہلے ہی اُن پر عذاب نازل کرتے تو وہ کہہ سکتے تھے کہ ہم اچھے اور برے راستہ کو نہیں پہچان سکے تو نے پیغمبر کیوں نہیں بھیجا ؟ کہ وہ ہماری ہدایت کرتا ؟یا ہم غفلت میں بتلا تھے تو تونے کسی کو کیوں نہیں بھیجا کہ وہ ہم کو غفلت سے بیدار کرتا ؟لہٰذا اس طرح کے بہانوں کے سدّباب کے لئے انبیاء علیہم السلام کا بھیجا جانا ضروری ہے ۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے :

(وَمَاکُنَّا مُعَذِّ بِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلاً)[3]

1۔سورۂ صف آیت6۔

2۔سورۂ طٰہٰ آیت134۔

3۔سورۂ اسراء آیت15 ۔

"اور ہم جب تک کسی رسول کو بھیج کر اتمام حجت نہ کر دیں کسی پر عذاب نہیں کیا کرتے "۔

یہ آیات اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ نبوت کا ایک مقصد کم سے کم اتمام حجت کر کے عذر کی راہیں بند کرنا ہے ۔

لوگوں کی تعلیم

اسی طرح دوسری آیات بھی ہیں جن میں بیان ہوا ہے کہ پیغمبر کو بھیجا گیا کہ وہ لوگو ں کو اُن چیزوں کی تعلیم دیں جو وہ نہیں جانتے اور اسکا نتیجہ بھی تقریبا یہی ہے یعنی جس چیز کو خود لوگ اچھا سمجھتے ہیں اُس پر عمل کریں چاہے کوئی پیغمبر مبعوث نہ بھی ہوا ہو ۔اسی لئے حتی جن محروین تک پیغمبروں کی دعوت تبلیغ نہیںپہنچی ہے وہ بھی اپنی عقل کے مطابق جواب دہ ہیں ۔بہر حال نبوت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ لوگ جن باتوں کو نہیں جانتے یا خود نہیں سمجھ سکتے ان کو سکھایا جائے ارشاد ہوتا ہے :

(وَ یُعَلِّمُکُمْ مَاْ لَمْ تَکُوْ نُوْا تَعْلَمُوْنَ) [1]

"اور تم کو وہ باتیں بتائے جن کی تمہیں (پہلے سے)خبر (بھی) نہ تھی "۔

اور سورئہ نساء میں ارشاد ہوتا ہے :

(وَ عَلَّمَکَ مَاْ لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ)[2]

"اور جو باتیں تم نہیں جانتے تھے تمہیں سکھا دیں "۔

یہ آیتیں بھی تقریباًاسی مفہوم کی تائید کرتی ہیں ۔

تحریفات کی اصلاح

بعض آیات سے کچھ دوسرے مطالب بھی معلوم ہوتے ہیں جو شاید تمام انبیاء علیہم السلام کے لئے نہ ہوں شاید اصل بحث میں وارد ہونے سے پہلے تمہید کے طور پر ان کا ذکرنا مناسب نہ ہو فرض کیجئے کہ خدا نے ایک پیغمبر بھیجا اور کچھ لوگو ں کو راہ حق کی ہدایت کی پھر کچھ زمانہ گزرنے یا کسی اور وجہ سے اس پیغمبر کی تعلیمات میں تحریف کردی گئی اور جو چیز لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ تھی اب ممکن ہے وہی گمراہی کا باعث ہو اور ہم نے تو خود اپنے زمانے میں بہت سے

1۔ سورئہ بقرہ آیت 151 ۔

2۔ سورئہ نساء آیت113۔

ایسے نمو نہ دیکھے ہیں ۔وہ انجیل جو خدا کی طرف سے جناب عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی آج اس کا کوئی ایک حصہ بھی اصل شکل میں موجود نہیںہے۔شاید دنیا کے تمام کتب خانوں میں انجیل کا ایک بھی اصل نسخہ نہ مل سکے ۔جو کچھ ہے وہ ان لوگوں کی تحریر ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں کے نام سے جانے جاتے ہیں جبکہ اُن افراد کی طرف موجودہ انجیلوں کی نسبت بھی یقینی نہیں ہے ۔ان مختلف انجیلوں کا لہجہ اور طرز تحریر کسی تاریخی کتاب کی طرح ہے مثلاً فلاں دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے شاگردوں کے درمیان آئے اور یہ کہا اور انھوں نے سوال کیا اور آپ نے یہ جواب دیا وغیرہ وغیرہ ۔

ظاہر سی بات ہے کہ یہ وہ کتاب نہیں ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اسی کتاب میں ایسے مطالب ہیں جو عقل کے بھی خلاف ہیں اور آسمانی شریعتوں کا جن باتوں پر اتفاق ہے اسکے بھی خلاف ہیں اس میں شرک کی باتیں بھی ہیں اور آسمانی کتابوں کے متفقہ احکام میں تحریف بھی ہوئی ہے لہٰذا یہ وہ بات ہے جسکا امکان موجود ہے (ادل دلیل علی امکان الشی وقوعہ) (یعنی کسی شئ کے ممکن ہونے کی محکم ترین دلیل اُسکا واقع ہونا ہے) لہٰذا ممکن ہے خدا کسی پیغمبر کو بھیجے اُن لوگوں کو حق کا راستہ بھی بتادے اُن پر کوئی کتاب بھی نازل کردے اور بعد میں اُس کتاب میں تحریف ہو جائے ۔ایسی حالت میں بھی یہ لوگ اُن لوگوں کی طرح ہیں کہ جن کے درمیان کوئی پیغمبر اور کتاب نہ آئی ہو ۔ضرورت ہے کہ کوئی پیغمبر آئے اور کم سے کم اُن تحریفات کی اصلاح کرے ۔اب چاہے نئی شریعتیں آئیں یا نہ آئیں یہ ایک الگ مسئلہ ہے لیکن لوگوں کو انحراف وگمراہی سے نکال کر حق کی طرف دعوت دینا خود اپنی جگہ نئے نبی کی آمد کی ایک معقول وجہ ہے ۔

دینی اختلاف کا بر طرف کرنا

بعض آیات اس مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اہل کتاب کے علماء نے کچھ مطالب لوگوں سے چھپا رکھے تھے اور لوگوں سے نہیں بیان کرتے تھے یہ وہ اختلافات تھے جو علمائے اہل کتاب نے خود اپنے مفادات کی خاطر ایجاد کئے تھے یہ چیز بھی سبب بنتی کہ خدا کوئی پیغمبر بھیجتاتاکہ وہ ان اختلافات کو رفع دفع کر کے لوگوں کے سامنے حق کی نشاندہی کرے سورۂ مائدہ میں ارشادہوتا ہے :

(يَآهْلَ الْكِتَابِ قَدْجَائَكُمْ رَسُوْلُنَايُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًامِّمَّا تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُوْاعَنْ كَثِيْرٍ) [1]

1۔سورۂ مائدہ (آیت 15 ۔

"اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا پیغمبر آچکا ہے تاکہ (کتاب خدا) کی بہت سی اُن باتوں کو جنہیں تم چھپایا کرتے تھے تمہارے سامنے صاف صاف بیان کردے اور تمہاری بہت سی خطاؤں کو درگذر کردے"۔

تم نے آسمانی کتاب کے بہت سے مطالب چھپا رکھے تھے واضح ہے کہ اُن میں ایسے علماء موجود تھے جو جانتے تھے اور لوگونکو نہیں بتاتے تھے البتہ دوسری آیات بھی ہیں جو دلالت کرتی ہیں یہ لوگ کچھ چیزیں خود لکھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ خدا کی جانب سے ہے۔قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

(فَوَیْلٌ لِلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتَابَ بِاَیْدِیْهِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْ نَ هٰذَامِنْ عِنْدِاللّٰهِ)[1]

"پس وائے ہوان لوگوں پر جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں لوگوں سے کہتے پھرتے ہیں کہ یہ خدا کے یہاں سے آئی ہے"۔

اور سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:

(یُحَرِّفُوْ نَ الْکَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ)[2]

"یہ لوگ کلام کو ان کے اصل مقام سے ادھر ادھر کردیتے ہیں"۔

اہلِ کتاب کے بہت سے علماء کا یہی کام تھا وہ یہی کیا کرتے تھے۔قرآن فرماتا ہے پیغمبر اسلئے آئے ہیں کہ اُن حقائق کو آشکار کریں جن کو تم نے چھپا رکھا تھا خداوند عالم فرماتا ہے:

(کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللہ النَّبِیِّیْنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِ رِیْنَ وَاَنزَلَ مَعهُمُ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَااخْتَلَفُوْافِیْهِ وَمَااخْتَلَفَ فِیْهِ اِلَّاالَّذِیْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَاجَائَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ بَغْیاً بَیْنَهُمْ فَهَدَی اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْالِمَااخْتَلَفُوْافِیْهِ مِنَ الْحَقّ بِاِذْ نِهِ وَاللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَشَآئُ اِلٰی صِرَاطٍ مُسْتَقِیْمٍ)[3]

"لوگ ایک امت کی شکل میں تھے پس خدا نے (نجات کی) خوشخبری دینے والے اور (عذاب سے) ڈرانے والے پیغمبروں کو بھیجا اور اُن پیغمبروں پر برحق کتاب بھی نازل کی تاکہ جن باتوں میں لوگ جھگڑتے تھے (کتاب خدا اسکا فیصلہ کردے) لیکن سوائے اُن لوگوں کے کہ جن کو کتاب دی گئی تھی اور جن پر حجت آشکار ہوچکی تھی

1۔سورۂ بقرہ آیت79۔

2۔سورہ نساء آیت 46۔

3۔سورۂ بقرہ آیت213۔

صرف آپس میں حسد کے سبب (اُن کے بارے میں اختلاف کیا) ورنہ کسی اور نے ان میں اختلاف نہیں کیا اور خدا نے اپنی مہربانی سے ایمان داروں کو وہ راہ حق دکھا دی کہ جن میں ان لوگوں نے اختلاف کر رکھا تھا اور خدا جس کو چاہتا ہے راہ راست کی ہدایت کر دیتا ہے"۔

اس آیۂ شریفہ میں بہت زیادہ بحث کی گنجائش ہے۔بہت سے ایسے نکتہ ہیں جو پہلی نگاہ میں مبہم نظر آتے ہیں کہ ان کے بارے میں بحث کی ضرورت ہے منجملہ (كَا نَ النّاسُ امَّةً وَاحِدَةً) یقیناً ایسے زمانے کی طرف اشارہ ہے کہ جب لوگ ایک امت تھے ۔یہاں یہ سوال پیش آتا ہے کہ امت واحد سے کیا مراد ہے ؟کیا اعتقاد کے لحاظ سے لوگ ایک تھے یا کسی اور لحاظ سے ؟مثلاً جگہ اور مقام کے اعتبار سے ،یا ایسے لوگ تھے کہ جن کی زندگی میں سادگی اوریکسانیت پائی جاتی تھی اور اگر مراد وحدتِ عقیدہ ہے تو آیا وہ لوگ حق پر تھے یا اُن کے اعتقاد باطل تھے ؟

علاّ مہ طبا طبائی طاب ثراہ نے بعد کے جملہ کو قرینہ قرار دیکر اس جملہ کے بارے میں یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ لوگ ایک سیدھی سادی یکساں زندگی بسر کرتے تھے جناب آدم علیہ السلام کے روئے زمین پر بسنے کے ابتدائی ایّام میں ہی کچھ لوگ ایسے تھے جن کی اولادیں بھی تھیں اور وہ بالکل سادہ زندگی بسر کیا کرتے تھے پیچیدہ قسم کے معاشرتی مسائل نہیں پائے جاتے تھے کہ اختلاف کا سبب بنتے اور اگراختلاف تھے بھی تو شخصی اختلاف تھے ۔

بہر حال علامہ طبا طبائی(رضوان اللہ علیہ) نے اس طرح کا خیال ظاہر کیا ہے لیکن احتمال ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ سب لوگ عقیدہ کے لحاظ سے ایک عقیدہ حق پر قائم رہے ہوں یعنی ایک ایسا زمانہ گذرا ہو کہ جب سب موحد ہوں اور اپنے انبیاء علیہم السلام اور پیغمبر منجملہ حضرت آدم علیہ السلام کی باتوں پر عمل کرتے رہے ہوں اب اگر کچھ لوگ مخالفت کرتے بھی رہے ہوں گے تو یہ مخالفت ہرامت میں ہوتی ہے لیکن مسلک میں اختلاف نہ رہا ہوگا ایک توحیدی مسلک تھا جو حضرت آدم انسانوں کے لئے لائے تھے اور معاشرے کا مسلک ومذہب وہی تھا پھر یہ زمانہ ختم ہوگیا مختلف مذاہب ومسالک وجود میں آئے شرک آلود مسالک، مختلف مذاہب وجود میں آجانے کے بعد جب معاشرہ میں حق گم ہوگیا تو اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ دوسرے پیغمبر مبعوث ہوں خود حضرت آدم نبی تھے لیکن ایک مدت گزر گئی مثلاً ایک ہزار سال ، اس وقت ایک ہزار سال بھی کچھ نہیں تھے روایت میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی عمر تقریباًنوسو سال تھی ۔ ایک نسل گزر گئی اور لوگ بھی حضرت آدم علیہ السلام کے دین پر رہے پھر اس کے بعد مثلاً دوسرے ہزارے میں جب حضرت آدم علیہ السلام دنیا سے تشریف لے گئے تو لوگوں میں کچھ اختلافات پیش آئے اور شرک آلود مذاہب وجود میں آگئے : فَبَعَثَ اللہُ النَّبِیّیِنَ "خدا نے حضرت آدم علیہ السلام پر اکتفاء نہ کی اور انبیاء علیہم السلام کو بھیجنا شروع کردیا :

" (ثُمَّ اَرْسَلْنَارُسُلَنَا تَتْرَا) "۔[1]"خدا نے یکے بعد دیگرے پیغمبروں کو بھیجا تا کہ لوگوں کے درمیان پیش آنے والے اختلافات برطرف ہوجائیں"۔ (فَبَعْثَ اللہ النَبِیّیْنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ وَاَنْزَلَ مَعْھُمُ الْکِتَابَ) [2]

"پھر اللہ نے بشارت دینے اور ڈرانے والے نبیوں کو بھیجا اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی"۔ شاید اس آیت کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو کتاب نہیں ملی تھی بلکہ زبانی تبلیغ کیا کرتے تھے اور لوگوں کے درمیان کوئی مدوّن کتاب نہیں تھی ۔ اس کے بعد کے دور میں جب لوگوں کے درمیان اختلافات وجود میں آئے تو خدا نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا اور ان پر کتاب نازل فرمائی یعنی وحی شدہ متن جو لوگونکے درمیان محفوظ رہا ۔ یہ بات کہ جناب آدم پر الہام ہوا کہ لوگوں کو حج پر جانے کیلئے کہئے (کیونکہ نہج البلاغہ میں ہے کہ حج خلقتِ آدم علیہ السلام کے آغاز سے تھا) اور لوگ چونکہ جانتے تھے کہ حضرت آدم علیہ السلام پیغمبر ہیں اور ان پر وحی ہوتی ہے لہذا عمل کرتے تھے لیکن بعد میں جب اختلافات وجود میں آئے تو ایک ایسے متن کی ضرورت پیش آئی جو لوگوں کے درمیان محفوظ رہے نوشتے کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں اور اس کی عبارتیں محفوظ رہیں کتاب کیوں نازل کی ؟ خدا وند عالم فرماتا ہے :(لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ)"تاکہ جن باتوں میںلوگ جھگڑا کرتے تھے کتاب خدا اُن کے اختلافات ختم کردے اور اپنا فیصلہ سنادے"۔ (وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ)" لوگوں میں اختلاف کے علاوہ خود کتاب کے بارے میں بھی اختلاف رونما ہوا ، کن لوگوں نے اختلاف کیا؟ اُن لوگوں نے جو عمداً کتاب میں تحریف کیا کرتے تھے : (بَغْياً بَيْنَهُمْ) ظلم و ستم اور سرکشی کی بنیاد پر دین خدا میں اختلافات ایجاد کیا کرتے تھے ۔ ظاہر ہے وہ اپنے مفاوات کی خاطر ایسا کیا کرتے تھے ۔ (فَھَدَی اللّٰہُ الّذِ یْنَ آمَنُوالَمَااخْتَلَفُوْافِیْہِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِہ وَاللّٰہُ یَھدِیْ مَنْ یَّشَاءُ اِلَیٰ صراطٍ مٌستَقِیم)"تب خدا نے ایمان داروں کو راہ حق دکھادی جس میں ان لوگوں نے اختلاف ڈال رکھا تھا اور خدا جس کو چاہے راہ راست کی ہدایت کرتا ہے"۔ اس آیت کو شاہد قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ جب خدا کے دین میں اختلاف ہوا تو یہ اختلافات کی موجودگی اس بات کا سبب بنی کہ کوئی دوسرا پیغمبر مبعوث کیا جائے جو اس اختلاف کو برطرف کردے وہ اختلاف جو ایک پیغمبر کے چلے جانے اور امت کے درمیان موجود نہ رہنے کی بناء پر وجود میں آتا تھا ۔ اگرچہ یہ اختلاف سرکشی کا نتیجہ تھا اور کچھ لوگ یہ کام عمداً کیا کرتے تھے لیکن خدا دوسرا پیغمبر اپنے لطف و کرم کی بناء پر بھیج دیتا کہ بعد کی نسلیں گمراہ نہ ہوں ۔ انبیاء علیہم السلام کے وجود کے سلسلہ میں قرآن کریم سے اور بھی حکمتوں اور مصلحتوں کا پتہ چلتا ہے چنانچہ عقل کی بنیاد پر ان میں سے کچھ (حکمتوں کا) پتہ چلایا جا سکتا ہے ۔ اب ہم قرآن مجید سے معلوم ہونے والی بعض حکمتیں بیان کرتے ہیں :

1۔ سورۂ مومنون آیت 44۔

2۔ سورۂ بقرہ آیت213۔

قضاوت

جیسا کہ خود قرآن کریم سے پتہ چلتا ہے انبیاء کے وجود کا ایک فائدہ یہ تھا کہ وہ اصل حکم اور قانون پہنچانے کے علاوہ اس حکم کے مصادیق بھی معین فرما دیتے تھے اور لوگوں کے درمیان رونما ہونے والے اختلافات کے فیصلے فرماتے تھے (اب سوال یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام اسی طرح کے تھے یا بعض انبیاء علیہم السلام ایسے تھے)

حضرت داؤد علیہ السلام ان ہی انبیاء علیہم السلام میں سے ہیں جو منصب کے اعتبار سے خدا کی جانب سے لوگوں کے مابین اختلاف کے فیصلے کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔

اور بظاہر یہ کام بعض انبیاء علیہم السلام سے ہی مخصوص رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

(یٰدَاوُدُاِنَّاجَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِیْ الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ)[1]

"اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں (اپنا) خلیفہ قرار دیا پس تم لوگوں کے درمیان حق کی بنیاد پر ٹھیک فیصلے کیا کرو"۔

پیغمبر اکرم ﷺ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

(اِنَّااَنْزَلْنَااِلَیْکَ الْکِتَا بَ بِا لْحَقّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّا سِ بِمَا اَ رَاکَ اللهُ وَ لَا تَکُنْ لِلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْماً)[2]

1۔ سورۂ ص آیت 26۔

2۔ سورۂ نساء آیت105۔

"ہم نے اس کتاب کو تم پر بر حق طور پر اس لئے نازل کیا ہے کہ جس طرح خدا نے تمہاری ہدایت کی ہے اسی طرح لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور خیانت کرنے والوں کے طرفدار نہ بنو"۔

واضح ہے کہ یہاں پر حکومت اور فیصلہ سے مراد اختلافات کے سلسلہ میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا ہے۔

حکومت

بعض انبیاء علیہم السلام منصف اور قاضی کی حیثیت سے اونچا مقام رکھتے تھے یعنی باقاعدہ طور پر معاشرہ اور حکومت کے سر براہ تھے اور لوگوں پر ان کی اطاعت کرنا فرض تھا۔ قرآن کی ایک آیت میں مجموعی طور پر کہا گیا ہے کہ ہم نے ہر پیغمبر کو لوگوں کے درمیان اس لئے بھیجا کہ لوگ ان کی اطاعت کریں۔ لہٰذا جو پیغمبر بھی جس چیز کے لئے دعوی کرے کہ یہ خدا کی جانب سے ہے اور اس پر عمل کا حکم دے لوگوں پر اس کی بات ماننا ضروری ہے۔ اگر وہ لوگوںسے کہے

کہ میں انصاف کرنے کے لئے بھیجا گیا ہوں تو لوگوں کے لئے قبول کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ کہے کہ میں لوگوں کے حاکم کے عنوان سے آیا ہوں سیاسی اور معاشرتی امور میں میری پیروی کرو تو لوگوں پر اس کی پیروی ضروری ہے مجموعی طور پر ہر پیغمبر جس آبادی میں بھیجا گیا ہو (اس کی نبوت ثابت ہو جانے کے بعد) خدا کی طرف سے بس جو بھی دعویٰ کرے لوگوں پر اس کا قبول کرنا لازم ہے: (وَمَاأَرْسَلْنَامِنْ رَسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِإِذْنِ اللہ)[1]

"اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس واسطے کہ خدا کے حکم سے لوگ اس کی اطاعت کریں"۔

اگر ایسا ہو کہ لوگ خود فیصلہ کریں کہ نبی کی کونسی بات خدا کی طرف سے ہے اور کونسی بات اپنی طرف سے ہے اور اس کے یہاں بعض حالات میں یہ احتمال ہو کہ وہ جھوٹ بھی بول سکتا ہے تو یہ امر مقصد کے خلاف ہو گا اور اس پر اعتماد نہیں رہے گا۔ لہٰذا جب نبی کی نبوت ثابت ہو جائے تو لامحالہ طور پر بے چون وچرا اس کی اطاعت کرنی چاہئے مگر یہ کہ وہ خود یہ کہے کہ میں یہ بات اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں، اب اگر وہ یہ دعویٰ کرے کہ اس کو خدا کی طرف سے کوئی منصب دیا گیا ہے تو لوگوں کو اس کی بات بہر حال ماننا چاہئے۔ یقیناً بعض مقامات پر بعض انبیاء علیہم السلام نے خود حکومت اپنے ہاتھ میں نہیں لی ہے بلکہ خدا کی جانب سے انھوں نے کسی اور شخص کی حکومت کی تائید کر دی ہے۔ چنانچہ روایات کی روشنی میں بنی اسرائیل کے کچھ افراد اپنے

1۔ سورۂ نساء آیت64۔

نبی صموئیل کے پاس آئے اور آکر کہا:

(ابْعَثْ لَنَا مَلِكاً نُقَا تِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)[1]

"ہمارے واسطے ایک بادشاہ مقرر کیجئے تاکہ ہم راہِ خدا میں جہاد کریں"۔

ظاہر ہے خود صموئیل نبی بادشاہ نہیں تھے۔ورنہ لوگ ان سے یہ نہ کہتے کہ خدا سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کردے، معلوم ہوا کہ ہر پیغمبر خدا کی طرف سے حکومت کا حامل نہیں ہوتا، البتہ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ خدا کی طرف سے حکومت کے حامل تھے اسی طرح گذشتہ انبیاء علیہم السلام میں بھی بعض انبیاء علیہم السلام منجملہ حضرت سلیمان حکومت کے حامل تھے۔ قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ ہم نے ان کو ملک عطا کیا۔ رسولِ خدا ﷺ کے بارے میں بہت سی دلیلیں ہیں خود قرآن کریم میں یہ جملہ موجود ہے:

(اَلنَّبِيُّ اَوْ لَىٰ بِا لْمُؤْمِنِيْنَ)[2]

"یعنی نبی مومنین کی جانوں پر ان سے زیادہ حق رکھتے ہیں"۔

اس کے علاوہ بھی کئی مقامات ہیں مگر فی الحال ان کا بیان بحث سے خارج ہے۔ لہٰذا نبوت کے ثانوی مقاصد میں سے ایک مقصد جو بعض نبوتوں میں محقق ہوا یہ تھا کہ زمین پر ایک حکومت حقہ قائم کریں کہ جس کے سایہ میں لوگوں کی دنیا اور آخرت دونوں کی اصلاح ہو جائے۔

انبیاء علیہم السلام کی رسالت کے ذیل میں جو سیاسی مقاصد مدنظر قرار دیئے گئے ہیں ان کی ایک مثال جناب موسیٰ کا واقعہ ہے کہ جہاں انھوں نے فرعون کو عبادت الٰہی کی دعوت دی اور ضمنی طور پر فرمایا: (فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ) یہ آپ کے اغراض و مقاصد میں سے ایک امر تھا جس کی آپ نے فرعون سے پہلی ہی ملاقات میں وضاحت کرتے ہوئے کہہ دیا: اے فرعون میں تیری طرف خدا کا رسول بن کر آیا ہوں۔ (فَاَرْسِلْ مَعِي بَنِيْ اِسْرَا ئِيْلَ)

"بنی اسرائیل کو میرے ہمراہ کردے"۔ لوگوں کو آزادانہ زندگی بسر کرنے کے لئے ایک ظالم حکمراں کے تسلط سے نکال کر دوسری سرزمین پر لیجانا ایک سیاسی اور اجتماعی کام ہے اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کے مقاصد کا ایک حصہ تھا اور قرآن کریم کی آیات سے مکمل طور پر یہ بات واضح ہے:

1۔ سورۂ بقرہ آیت 246۔

2۔ سورۂ احزاب آیت 6۔

(وَقَالَ مُوْسٰى يٰافِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلمِنْ رَّبِّ الْعٰا لَمِيْنَحَقِيْقعَلٰى اَنْ لَّآ اَقُوْ لَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّكُمْ فَاَ رْسِلْ مَعِىَ بَنِىْ اِسْرَآئِ يْلَ)[1]

"اور موسیٰ نے (فرعون) سے کہا اے فرعون میں یقیناًپروردگار عالم کی جانب سے رسول ہوں مجھ پر واجب ہے کہ خدا کے بارے میں سچ کے سوا (کوئی بات)نہ کہوں میں تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح و روشن معجزہ لیکرآیا ہوں پس بنی اسرائیل کو میرے ہمراہ کردے"۔

یاددہانی

قرآن کریم سے نبوت کے جن فوائد بلکہ اغراض و مقاصد کاپتہ چلتا ہے ان میں سے ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ لوگ جن چیزوں کو سمجھ سکتے ہیں یا وہ جن باتوں کو مبہم انداز میں سہی تھوڑا بہت سمجھتے ہیں ان کو یاددہانی کے لئے ایک توجہ دلانے یا سمجھانے والے کی ضرورت ہے جو ان کو ادھوری یا نامفہوم بات پوری طرح سمجھا سکے اور قرآن کریم کے الفاظ میں لوگ غفلت سے نکل کر باخبر وآگاہ ہوجائیں۔

قرآن کریم میں خود قرآن کریم کے لئے اور بہت سی دوسری آسمانی کتابوں کے لئے جو ذکر،ذکریٰ، تذکرہ، اور مذکر کی مانند الفاظ استعمال ہوئے ہیں،اسی موضوع کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ذکر، یاددہانی کوکہتے ہیں یعنی وہ بات جس کو انسان جانتا ہے لیکن مکمل طورپریا اس کا ایک حصہ بھول گیا ہے یا بے توجہ ہوگیا ہے اس کو یاددلانا اورظاہر ہے انتخاب میں علم اسی وقت مؤثریا مفید ہوتا ہے جب اس کی طرف انسان متوجہ ہو ممکن ہے معاشرہ کچھ ایسے حالات کا شکار ہوجائے کہ جس کے سبب یہ غفلت عام ہوجائے اور معاشرہ کی فضا ایسی شکل اختیار کرلے کہ انسان کے ذہن سے یہ مسائل بالکل نکل گئے ہوں اور لوگوں کا اپنے آپ ان کی طرف متوجہ ہونا بھی میسر نہ ہو۔ ایسے مقام پر انبیا ٔعلیہم السلام کا کام لوگوں کو اس غفلت سے نکالنا ہے۔ اسی بارے میں نہج البلاغہ کے اس مشہور و معروف جملہ میں اشارہ ہے:

(لِيَسْتَادُوْهُمْ مىْ ِثَاقَ فِطْرَتِهِ وَ يُذَ كِّرُوْهُمْ مَنْسِيَّ نِعْمَتِهِ)[2]

"ان سے فطرت کے عہد وپیمان پورے کرائیں اور انھیں بھولی ہوئی اللہ کی نعمتیں یاددلائیں"۔

1۔سورۂ اعراف آیت 104۔105۔

2۔نہج البلاغہ خطبہ اول درذکر اختیار الانبیاء علیہم السلام۔

خدا کی معرفت اور خدا کی بندگی ایک فطری امر ہے لیکن لوگ اس سے غافل ہو جاتے ہیں بہت سی چیزوں کو لوگوں کی عقل درک کرتی ہے لیکن یہ عقل ڈھیروں خواہشات نفسانی کے اندر دفن ہو کر رہ جاتی ہے۔ انبیاء کا کام یہ ہے کہ ان مدفون عقلوں کو ابھار کر سامنے لائیں:

(وَ یَحْتَجُّوْا عَلَیْهِمْ بِالتَّبْلِیغِ وَ یُثِیْرُوْا لَهُمْ دَفَا ئِنَ الْعَقُوْلَ)[1]

"اور تبلیغ یعنی رسالت الٰہی کے ذریعہ لوگوںپر حجت تمام کریں اور ان کی مدفون عقلوں کو باہر نکالیں"۔

اور یہ وہ مسئلہ ہے جس کی طرف ہم متوجہ کرنا چاہتے ہیں یعنی الٰہی رسالت اور تبلیغ کے ذریعہ لوگوں پر حجت تمام کیا جانا نبوت کے اہداف میں شامل ہے معلوم ہوا یاددہانی یعنی لوگوں کو غفلت سے نکالنا ، اور فطری طورپر لوگ جن چیزوں کو درک کرتے ہیں یا جن چیزوں کی وہ اپنی عقل کے ذریعہ شناخت پیدا کرتے ہیں اُن کی طرف توجہ دلانا انبیاء علیہم السلام کے فرائض میں ہے اور انبیاء کے وجود سے ہی یہ تمام فوائد وابستہ ہیں۔

ڈرانا اور خوشخبری دینا

قرآنی آیات سے ایک اور یہ نکتہ سمجھ میں آتاہے کہ کبھی کبھی انسان کسی چیز کو جانتا ہے یہانتک کہ اس کی طرف توجہ بھی ہوتی ہے لیکن عمل کا جذبہ نہیں ہوتا۔ اس صورت میں انسان کو کسی محرک کی ضرورت ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام "منذر"(ڈرانے والے)اور بشِّر(بشارت دینے والے) کے عنوان سے یہ کام انجام دیتے ہیں اور لوگوں کو ابھارتے اور جذبہ پیدا کرتے ہیں اور ان کی سوئی ہوئی خواہشوں کو بیدار کرتے ہیں۔ ہر انسان عذاب سے ڈرتا ہے یہاں تک کہ اس کا معمولی ترین احتمال بھی مؤثر ہے اگرچہ عملی طورپر لوگوں میں اس کا اثر دکھائی نہیں دیتا لیکن جب پیغمبر آکر آخرت کے عذابوں کی تفصیل بیان کرتا ، اور بہشت کی نعمتوں کا شمار کراتا ہے یہ ڈرانا اور بشارت دینا لوگوں کے ، خواہشات کو عملی اور علم کو آگاہی میں بدل دیتا ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا تھا انسان کی روح میں دو کارخانے کام کرتے ہیں : ایک عقل و بصیرت اور دوسرے خواہش و رغبت ۔ انبیاء علیہم السلام خوف اور بشارت یعنی خداوندعالم کی نعمتوں کی خوشخبری اور اس کے عذاب کی طرف سے خبردار کرکے انسان کی خواہشات و رجحانات کو مہمیز کرتے ہیں۔

اگر آپ قرآن کریم کی تحقیق و مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آیات کا ایک بڑا حصہ چاہے وہ پیغمبر اسلام ﷺ

1۔ نہج البلاغہ خطبہ اول در ذکر اختیار الانبیاء علیہم السلام۔

کی زبانی ہو یا پچھلے انبیاء علیہم السلام کی زبان سے نقل کئے ہوئے ہوں سب انذار و بشارت سے متعلق ہیں یعنی ان میں آخرت کے عذاب اور آخرت کی نعمتوں کا ذکر ہے قرآن کریم میں یہ مسائل اتنی اہمیت کے حامل ہیں کہ پیغمبر کو (نذیر) کہا گیا ہے سورئہ فاطر میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَ اِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْر)[1]

"کوئی امت نہیں ہے مگر یہ کہ ان کے درمیان ڈرانے والا "نذیر" ضرور آیا ہے"۔

یہ نبی کی سب سے نمایاں صفت ہے اور مکمل طور پر اس کی ضرورت کا احساس کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ معاشرہ میں کوئی ایسا ہونا چاہئے جو لوگوں کو مستقبل کے خطروں سے آگاہ کرتا رہے۔ مختصر یہ کہ آپ نے مذکورہ آیات میں مشاہدہ کیا کہ ان میں بشّر اور منذر کی صفت بار بار دہرائی گئی ہے:

(رُسُلاً مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ) اور (فَبَعْثَ اللہ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ)۔

قرآن کریم میں خود چند مقامات پر پیغمبر اکرم ﷺ کے اوصاف میں بھی "بشیر" اور "نذیر" آیا ہے پس معلوم ہوا کہ یہ بھی نبوت کا ایک ہدف ہے۔

ظلم اور برائی سے مقابلہ

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے سلسلہ میں جن اغراض و مقاصد کا پتہ چلتا ہے، علمی طور پر اس ظلم اور برائی سے مقابلہ بھی ہے جو ان کے زمانہ میں رائج رہے ہیں۔ قرآن کریم سے جیسا کہ پتہ چلتا ہے کہ جس قوم کے درمیان بھی کوئی پیغمبر مبعوث ہوا ہے ان کے درمیان ضرور کوئی بد عنوانی یا مخصوص برائیاں رائج رہی ہیں اگرچہ کسی استثناء کے بغیر تمام انبیاء کا ایک بنیادی ہدف لوگوں کو خدائے واحد کی بندگی کی طرف دعوت دینا رہا ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

(وَلَقَدْ بَعَثْنَافِيْ كُلِّ اُمَّةٍرَسُوْلاً اَنِ اعْبُدُ وْااللهَ وَاْجْتَنِبُوْاالطَّاغُوْت)[2]

یعنی "اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول ضرور بھیجا کہ خدا کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچے رہو"۔

لیکن اس معمولی ہدف کے ساتھ کہ جس کا ایک کلی عنوان خدا کی عبادت اور اس کے تمام احکام "کرو اور نہ کرو" کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے ہر پیغمبر نے اپنے زمانہ میں رائج برائیوں کی اصلاح کو بنیاد قرار دیا ہے مثال کے طور پر جہاں حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعہ کا ذکر ہے وہیں:

1۔ سورئہ فاطر آیت 24۔

2۔ سورئہ نحل آیت 36۔

(وَزِنُوْابِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ)[1]

"اورجب کچھ(تولنا ہوتو) بالکل صحیح ترازوسے تولاکرو"۔

اور(وَلَاتَبْخَسُوْاالنَّاسَ اَشْيَائَ هُمْ)[2]

"اور لوگوں کوان کی(خریدی ہوئی)چیزیں کم نہ دیا کرو "کابھی ذکر اس کے ساتھ موجود ہے یاجب حضرت لوط علیہ السلام مبعوث ہوئے تو ان کے زمانہ میں ایک خاص برائی رائج تھی جس کا انھوں نے مقابلہ کیا،قرآن کریم میں اس طرح کے نمونہ بہت ہیں یہ اس چیزکی علامت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اہداف میں سے ایک ہدف اپنے زمانہ کی برائیوں سے مقابلہ کرنا بھی رہاہے۔

لوگوں کو توحید اور معادکی طرف متوجہ کرنا

ہم نے اس بحث کے آغاز میں اس بنیادپر ضرورت نبوت کی دلیل قائم کی تھی کہ انسان اپنے اختیار کے ساتھ کمال وارتقاء کے لئے پیدا کیاگیا ہے اور وہ اس دنیا میں اپنے اچھے اور برے اعمال کے ذریعہ آخرت میں اپنے لئے سعادت یاشقاوت فراہم کرتا ہے پس اس کو اس دنیا میں انجام دئے جانے والے اپنے افعال کے اخروی نتائج کے ساتھ رابطے سے آگاہ ہوناچاہئے تاکہ وہ اچھے یا برے اعمال آزادانہ طورپر اختیار کرسکے دوسرے لفظوںمیں اس کیلئے اس چیزکا جاننا ضروری ہے کہ کون سے کام اچھے ہیں کہ ان کوانجام دے سکے اور کونسے کام برے ہیں کہ ان کو انجام نہ دے اورچونکہ انسان کی عقل دقیق طورپر ان رابطوں کو معلوم نہیں کرسکتی لہذا حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ وہ بشرکیلئے اس علم تک پہنچنے کے لئے کوئی راہ مقررفرمائے اور وہ راہ وہی وحی اور نبوت کی راہ ہے۔

اس کے بعدکی بحث میں ہم نے عرض کیا تھاکہ قرآن کی آیات کریمہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر خدا انبیاء علیہم السلام کو نہ بھیجتا تو لوگوں پر حجت تمام نہ ہوتی اور ہم نے اس ذیل میں کہا تھا چونکہ انسان کی عقل،خیروشرکی شناخت کیلئے کافی نہیں ہے اور وہ کہہ سکتے تھے کہ ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ ہمیں کون سے کام نہیںانجام دینا چاہئیں اور کون سے کام انجام نہیں دینا چاہئیں۔

بحث کے ضمن میں ہی ایک اورنکتہ بھی واضح ہوگیا جس کی بنیادپر ہم "نبوت کی ضرورت"پر دوسری دلیل قائم کرسکتے ہیں اور وہ نکتہ یہ ہے کہ:کبھی کبھی انسان حتیٰ ان مسائل میں کہ جہاں انسان کی عقل اس کودرک کرنے کے لئے

1۔سورۂ اسراء آیت 35۔

2۔سورۂ اعراف آیت85۔

کافی ہے۔ بعض عوامل کی وجہ سے غفلت کا شکار ہوجاتا ہے مثال کے طور پر وجود خدا اور توحید کے اثبات کے لئے انسان کی عقل کافی ہے لیکن کبھی کبھی سماجی حالات ایسے ہوتے ہیں کہ انسان اپنی عقل کے استعمال سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے یعنی معاشرہ کی فضاء وہ شکل اختیار کر لیتی ہے کہ انسان اس حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے اور اپنی عقل اس بارے میں کہ توحید حق ہے یا نہیں، استعمال نہیں کرتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو کم و بیش سبھی افراد مانتے ہیں۔ فرض کر لیجئے کہ کسی گھرانے میں ایک ایسا بچہ پیدا ہو کہ جس نے جب سے اپنی آنکھیں کھولیں اپنے ماں باپ کو بتوں کی پرستش کرتے دیکھا اور جب مدرسہ میں داخل ہوا تو وہاں بھی اس کو شرک آمیز تعلیم دی گئی۔ ظاہر سی بات ہے کہ کوئی مذہب اپنے مذہب کی حقانیت کی دلیل کے لئے بہت سی غلط باتیں بیان کر سکتا ہے اور ان غلط باتوں سے بچہ کا ذہن جب مانوس ہو گیا ہو اور معاشرہ کی فضا نے بھی اس کی مدد کی ہو اور توحید و خدا پرستی کی بحث بھی بالکل اس کے کان سے نہ ٹکرائی ہو، تو ان تمام حالات میں ایک انسان کا مشرک ہو جانا انہونی بات نہیں ہے اس کے ذہن میں ممکن ہے یہ سوال ہی پیدا نہ ہو کہ کیا یہ راستہ حق کا ہے یا باطل؟

اسی طرح ہم نے معاد کے بارے میں بھی عرض کیا تھا کہ عام طور سے معاد یا قیامت کے اثبات کیلئے انسان کی عقل کافی ہے لیکن اگر کوئی شخص ایسے ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہو کہ آخرت کی زندگی کے نام سے بالکل اس کے کان آشنا نہ ہوں اور وہ اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہی نہ ہوا ہو، جو کچھ بھی اس نے دیکھا، سُنا، اور پڑھا ہو وہ سب محض دنیای زندگی اور اس کی لذتوں سے مربوط ہو، یا وہ عقل کو عام طور پر اپنی معاشی حالت سدھارنے اور اجتماعی امور کو انجام دینے میں لگائے رہا ہو تو ظاہر ہے ایسے شخص کو خود بخود عالم آخرت کی فکر نہیں ہوگی اور اگر کبھی خیال آیا بھی تو ممکن ہے اس کے ذہن میں اس قدر شکوک پیدا کر دیئے جائیں کہ وہ اس پر یقین ہی نہ کر سکے پس یہاں تک کہ ان امور میں بھی کہ جہاں انسان اپنی عقل سے بذات خود دلیل قائم کر کے حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ کبھی کبھی حالات اس طرح کے ہو جاتے ہیں کہ انسان کی عقل کا فائدہ باقی نہیں رہتا اور ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ دو مسئلے یعنی توحید اور معاد (اللہ اور قیامت پر ایمان) ادیان کے سب سے اہم مسائل ہیں۔ اگر کسی کے لئے حل نہ ہو پائیں تو وہ مجموعی طور پر آخرت کی کامیابی کے لئے کوئی راستہ نہیں نکال سکے گا اور اس طرح کے مسائل میں ہمارا مشاہدہ یہی ہے کہ کبھی کبھی معاشرہ کے حالات کی وجہ سے انسان ان سے غافل ہو جاتا ہے۔

اس بناء پر جس اللہ نے انسان کو آخرت کی کامیابی کے لئے پیدا کیا ہے ،(وہ کامیابی جو اللہ اور آخرت پر ایمان کے ذریعے ملتی ہے)اس کو یہ بھی علم ہے کہ انسانوں کے سامنے کچھ ایسے حالات پیش آجاتے ہیں کہ وہ اُن مسائل کو کلی طور پر بُھلا دیتا ہے لہٰذا اس طرح کے حالات میں حکمت الٰہی کا یہ تقاضا ہے کہ کچھ ایسے مصلحین اور تعلیم دینے والے اور یاددہانی کرانے والے افراد بھیجے جو لوگوں کو اُن باتوں کی طرف متوجہ کریں جن کی فطرت گواہی دیتی ہے اور عقل جن باتوں پر دلالت کرتی ہے اگرچہ وہ ان باتوں سے غافل ہی کیوں نہ ہوگئے ہوں ۔

مولائے کائنات کے کلام میں یہ جملے "یذَکِّرُوْھُمْ مَنْسِیَّ نِعْمَتِہِ"""انھیں اللہ کی بھولی ہوئی نعمتیں یاد دلائیں "، وَیُثِیْرُوْا لَھُمْ دَفَائِنَ الْعُقُوْلِ""اور ان کی مدفون عقلوں کو باہر نکالیں" ممکن ہے اسی بات کی نشاندہی کر رہے ہوں یعنی کبھی کبھی انسانوں کی عقلیں خواہشات ، شکوک و شبہات اور معاشرتی ماحول کے پردوں میں دفن ہوجاتی ہیں اور کسی کام کی نہیں رہ جاتیں ۔ اس طرح کی عقل کا وجود یا عدم کوئی فرق نہیں کرتا وہ عقل رکھتے ہیں لیکن اُن کی عقل ان کو نور نہیں بخشتی ایسے حالات میں بھی لازم ہے کہ خدا اپنی حکمت متعالیہ کی بنیاد پر پیغمبروں کو مبعوث فرمائے تاکہ وہ لوگوں کو اس غفلت سے نجات دلائیں اور ان پر یہ مسئلہ واضح کر دیں کہ خدا ایک اور اکیلا ہے تم اپنی عقلوں کی طرف رجوع کرو اور اس بارے میں غور و فکر سے کام لو یا اگر لوگ شکوک و شبہات میں بتلا ہوں تو اُن کے شبہات دور کردیں ہم اس طریقہ سے بھی نبوت کی ضرورت پر دلیل قائم کر سکتے ہیں اس دلیل کا پہلی دلیل سے فرق یہ ہے کہ پہلی دلیل میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ کچھ باتیں انسان کو جاننا چاہیئے تھا لیکن جان نہیں سکتا تھا لیکن یہاں اس چیز پر زور دیا گیا ہے کہ لوگوں کو ان باتوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے کہ جن سے وہ غافل ہیں۔

جب ہم قرآن کریم کی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے اہداف و مقاصد میں ان دو چیزوں پر زور دیا گیا ہے ہم نے انبیاء علیہم السلام کو اس لئے مبعوث کیا کہ وہ لوگوں کو توحید کی دعوت دیں حالانکہ توحید خود عقل کے ذریعہ ثابت ہوتی ہے اور قرآن نے بھی توحید پر عقلی دلیلیں دی ہیں ۔ پھر بھی خداوند عالم فرماتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد لوگوں کو توحید کی دعوت دینا ہے اور اسی طرح دوسرے مقام پر فرماتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا ہدف و مقصد لوگوں کو معاد کی طرف توجہ دلانا تھا ۔ ہم اس سلسلہ میں بھی قرآن کریم کی بعض آیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔

(وَلَقَدْ بَعَثْنَافِیْ کُلِّ اُ مَّةٍ رَسُوْلاً اَنِ اعْبُدُوْااللہ وَاجْتَنِبُوْاالطَّا غُوْ ت)[1]

"اور ہم نے ہر امت میں ایک (نہ ایک)رسول اس بات کے لئے ضرور بھیجا کہ خدا کی عبادت کرو اور طاغوت سے دور رہو "۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے :

1۔ سورۂ نحل آیت 36۔

(وَمَاۤاَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَسُوْلٍ اِ لَّا نُ ُوْحِیْ اِلَیْہِ اَنَّہٗ لَااِلٰہَ اِ لَّا اَنَافَاعْبُدُوْنِ)[1]

"اور (اے رسول) ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس پر وحی کردی کہ بس میں ہی اللہ ہوں پس تم میری ہی عبادت کرو"۔

ان آیات سے بخوبی یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ لوگوں کو اللہ کی عبادت کی دعوت دینا انبیاء علیہم السلام کے اہم فرائض میں سے تھا قرآن کریم نے بہت سے مسائل میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات ذکر کئے ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں سرفہرست اسی مسئلۂ توحید کو قرار دیا گیا ہے کہ صرف اور صرف خدائے وحدہ لا شریک کی عبادت کیا کرو: مَا لَکُمْ مِنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ"۔

اسی بات کو بیان کرنا مقصود ہے کہ عقیدۂ توحید اگرچہ فطری ہے اور اس پر عقل بھی دلالت کرتی ہے پھر بھی انسان اپنے مخصوص (معاشرتی) حالات میں گھر جانے کے بعد اس سے غافل ہو جاتے ہیں اسی لئے ضروری ہے کہ انبیاء علیہم السلام بھیجے جائیں تاکہ وہ لوگوں کو ان کا یہ بھولا ہوا سبق یاد دلائیں معاد یا قیامت سے متعلق بھی بہت سی آیات ہیں منجملہ یہ آیت:

(یُلْقِیْ الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہِ عَلَیٰ مَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِہِ لِیُنْذِرَیَوْمَ التَّلاَ قِ)[2]

"خدا اپنے نبیوں میں سے جس پر چاہتا ہے روح کو نازل کرتا ہے تاکہ وہ پیغمبر (لوگوں کو) قیامت کے دن سے ڈرائے"۔

بہرحال قیامت اور عالم آخرت کے متوقع خطروں کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا بھی پیغمبروں کے اہداف میں شامل رہا ہے۔

1۔ سورۂ انبیاء آیت 25۔

2۔ سورۂ مومن (غافر) آیت 15۔

پیغمبروں کا بشر ہونا

نبوت کی ضرورت کی دلیل اس چیز پر دلالت کرتی ہے کہ (عقلی راستہ کے علاوہ جو سب کی دسترس میں ہے) کوئی ایسی راہ ہو جو ابدی سعادت اور شقاوت تک پہنچنے کا راستہ بتائے لیکن یہ راہ دوسری تمام خصوصیات کو بیان نہیں کرتی یعنی یہ دلیل نبوت اور وحی کی کیفیت بیان نہیں کرتی کہ کیا ہر فرد پر وحی ہو سکتی ہے ؟ کیا نبی کو بھی ہر حال میں انسانوں کی ایک فرد ہونا چاہیئے ؟ کیا ہر معاشرے یا ہر شہر میں ایک پیغمبر ہونا ضروری ہے ؟ یہ دلیل ان جزئیات کی وضاحت نہیں کرتی البتہ خارجی قرائن کے ذریعہ یہ چیزیں سمجھی جا سکتی ہیں لیکن دقیق طور پر یہ جزئیات خود اس دلیل سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے ۔

قرآن کریم نے ان مسائل کے بارے میں بحث کی ہے منجملہ قرآن کریم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ نبی کو ہر حال میں بشر ہونا چاہیئے اور ضمنی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان براہ راست خداوند عالم سے رابطہ بر قرار کرکے خیر و شر کا علم اس سے حاصل نہیںکر سکتا ایک طرف تو یہ کہ تمام انسان نبی نہیں ہو سکتے اور دوسری طرف نبی کو انسانوں کے درمیان سے ہی مبعوث ہونا چاہیئے ۔ یہ بات عام طور پر لوگوں کی بہانہ بازیوں کے جواب میں بیان کی گئی ہے یعنی قرآن کریم فرماتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام مبعوث کئے جاتے تھے تو لوگ ان کی دعوت قبول نہ کرنے کیلئے بہانے کیا کرتے تھے منجملہ کہا کرتے تھے کہ "اگر خدا ہماری راہنمائی ہی کرنا چاہتا ہے تو اچھا ہوتا کہ وہ ہماری راہنمائی کے لئے کسی فرشتہ کو بھیج دیتا" یا وہ کہا کرتے تھے : جب تک ہم خدا کو نہ دیکھ لیں گے ایمان نہیں لائینگے ۔ یا یہ کہا کرتے تھے : اگر خدا ہماری ہدایت کرنا چاہتا ہے تو وہ نبی کے ہمراہ کسی فرشتہ کو بھی بھیجتا کہ ہم بھی اس فرشتہ کا دیدار کرتے اور اسی طرح کی باتیں، اسی طرح قرآن کلی طور پر فرماتا ہے : تمام قومیں انبیاء علیہم السلام سے کہا کرتی تھیں : آپ بھی ہمارے ہی جیسے بشر ہیں اور ہم اپنے ہی جیسے بشر کی پیروی نہیں کر سکتے اور یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن کریم فرماتا ہے : (پیغمبر کو ہر حال میں انسان ہی ہونا چاہیئے) اور یہ خداوند عالم کی سنت ہے کہ وہ ہمیشہ انسانوں کے درمیان سے کسی کو رسالت کیلئے منتخب کرتا ہے ۔ فرشتہ عام انسانوں کے سامنے ظاہر نہیں ہو سکتا ہاں ایک وقت ہے جب تمام انسان ملک کا دیدار کر سکتے ہیں لیکن یہ وہ وقت ہے کہ جب انسان کا آخری وقت آجاتا ہے یعنی اس پر موت کی نشانیاں ظاہر ہو جاتی ہیں اور وہ عالم ملکوت کی طرف کوچ کرنے لگتا ہے ۔

ان آیات سے ہم یہ مطلب اخذ کرتے ہیں کہ نبوت منتخب انسانوں کو ہی ملنا چاہیئے ورنہ تمام انسانوں پر وحی نازل نہیں ہو سکتی ۔اس لئے کہ ان کی روح اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ رابطہ قائم کرسکیں لیکن اگر خدا کی طرف سے انسانوں کے درمیان کوئی ایسی شخصیت نہ ہوتو حکمت خدا باطل ہو جائیگی اور انسان کی خلقت کا ہدف پورا نہیں ہو سکے گا ۔معلوم ہوا خداوند عالم کو خلقت کی شرطوں کو اس طرح فراہم کرنا چاہیئے کہ انسانوں کے درمیان کوئی اس قابل ہوکہ جس پر اپنی وحی نازل کرکے دوسروں تک پہنچا سکے ۔قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے :

(وَقَالُوْالَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَک)[1]

" لوگ کہتے کہ اس (نبی) پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں نازل کیا گیا "۔

یقیناپیغمبر پر فرشتہ اور ملک نازل ہوتے تھے لیکن ان قوموںکا مقصد یہ تھاکہ فرشتے اس طرح کیوں نہیں نازل ہوتے کہ ہم بھی ان کو دیکھ سکیں ۔

قرآن کریم ان کے جواب میں فرماتا ہے :

(وَ لَوْاَ نْزَلْنَا مَلَکاً لَقُضِیَ الْاَمْرُثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ)[2]

"حالانکہ اگر ہم فرشتہ بھیج دیتے تو (انکا)کام ہی تمام ہوجاتا (اور)پھر انھیں (اس طرح کے سوال کرنے کی) مہلت ہی نہ ملتی "۔

یعنی لوگوں کی زندگی اور فرشتوں کے دیدار کے درمیان ایک تکوینی رابطہ موجود تھا عام لوگ زندگی کے عام حالات میں فرشتہ کا دیدار نہیں کرسکتے فقط موت کی صورت میں ہی انکا دیدار ممکن ہے اگر ہم فرشتہ کو اس طرح نازل کرتے کہ یہ لوگ بھی اس کو دیکھیں توان کو موت آجاتی اور انکا قصہ ہی تمام ہوجاتا اور پھر بعثت اورہدایت کا ہدف باطل ہوجاتا چونکہ ہمارا مقصد ان کو راہ و راستہ سے آشنا کرانا تھا کہ وہ راستہ پہچان لیں اور اسکے بعد اپنے انتخاب کے مطابق عمل کریں ۔اگر یہ قرار ہوتا کہ فرشتہ نازل ہو اور یہ لوگ اس کو دیکھ کر مرجائیں تو اس صورت میں بعثت کا ہدف

1۔سورۂ انعام آیت 8۔

2۔سورۂ اانعام آیت8۔

ختم ہوجاتا اور ان کے نزول کی ضرورت پوری نہ ہوتی ۔

اس کے بعد قرآن کریم فرماتا ہے :اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ لوگ اس حالت میں فرشتہ کا دیدار چاہتے ہیں تو یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ فرشتہ انسانی شکل میں مجسم ہوکر سامنے آئے لیکن اگر فرشتہ انسانی شکل وصورت میں ان کے سامنے ظاہر ہوتا تو یہ لوگ یہی کہتے کہ تم بھی ہماری طرح کے انسان ہو معلوم ہوا یہ لوگ فرشتوں کو ان کی حقیقی صورتوں میں دیکھنا چاہتے تھے اور یہ فی الحال ان کیلئے ممکن نہیں تھا ۔دوسرے لفظوں میں قرآن فرماتاہے کہ اس مسئلے کی دو صورتیں ہیں : اول یہ کہ تم فرشتہ کو اس کی حقیقی صورت میں دیکھنا چاہتے ہو جس کی تم میں فی الحال قابلیت نہیں پائی جاتی کیونکہ اگر تم اس کو دیکھ لوگے تو تمہارا دم نکل جائیگا اور اگر انسان کی شکل وصورت میں دیکھو گے تو تمہاری دل کی مرادپوری نہیں ہوگی لہٰذا فرشتہ کا دیدار ہونا ممکن نہیں ہے ۔ البتہ بعض مخصوص انسان اپنی قابلیت کے تحت وحی کے واسطہ سے فرشتہ سے رابطہ قائم کرسکتے ہیںکہ جس کی تم میں قابلیت نہیں پائی جاتی ۔

اس کے بعد کی آیت میں قرآن کریم اعلان کرتا ہے :

(وَلَوْجَعَلْنَا هُ مَلَکاً لَجَعَلْنَا هُ رَجُلاً وَلَلَبَسْنَاْ عَلَیْهِمْ مَاْیَلْبِسُوْنَ)[1]

"اور اگر ہم فرشتہ کو نبی بنا کر بھیجتے تو (آخر)اس کو بھی انسانی صورت میں بھیجتے تو گویا ہم بھی ان کو اسی شبہ میں بتلا کر دیتے کہ جس کے یہ مرتکب ہوئے ہیں"۔

اور دوسرے مقام پر قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے :

(قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَ فِی اللّٰهِ شَکٌ فَا طِرِالسَّمٰوٰتِ وَالْاَ رْضِ)[2]

"ان کے پیغمبروں نے (ان سے) کہا کہ خدا کے بارے میں کہ جس نے سارے آسمان وزمین کو پیدا کیا شک کیا جا سکتا ہے ؟"

۔

ان کے جواب میں لوگ کہتے تھے:(قَا لُوْااِنْ اَنْتُمْ اِلّاٰ بَشَرمِثْلُنَا)

"تم بھی تو بس ہمارے ہی جیسے آدمی ہو"۔

1۔ سورئہ انعام آیت9۔

2۔ سورئہ ابراہیم آیت10۔

(لَومَاتَأْتِيْنَابِالْمَلَٰئِكَةِ اِ نْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ)[1]

"اگر تم اپنے دعوے میں سچّے ہو تو فرشتوں کو ہمارے سامنے کیوں نہیں لا کر کھڑا کرتے"۔

یعنی فرشتوں سے ہماری ملاقات کیوں نہیں کراتے ؟

خدا وند عالم ان کے جواب میں فرماتا ہے :

(مَا نُنَزِّلُ المَلَا ئِكةَ اِلّاَ بِالْحَقِّ وَمَاكانُوْااِذاًمُّنْظَرِيْنَ)[2]

"ہم فرشتوں کو نہیں بھیجا کرتے مگر یہ کہ حق کے ساتھ اور اس وقت اُن کو (ہدایت ہوتی ہے) کہ (جان بچانے کی) مہلت بھی نہ دیں"۔

ملائکہ کا نازل کرنا کوئی کھیل نہیں ہے بلکہ اس کے لئے کچھ شرطوں کا ہونا ضروری ہے اگر ہم فرشتوں کو ان کی نگاہوں کے سامنے کھڑا کردیں تو پھر وہ اس دنیا میں زندہ ہی نہیں رہ سکتے اور ان کو اس دنیا میں رہنے کی مہلت نہیں ملے گی۔

قرآن کریم میںؔ ارشاد ہوتا ہے:

(وَمَامَنَعَ النَّاسَ انْ يُؤْمِنُوْااِذْجَاءَ هُمُ الهُدَىٰ اِلّاَانْ قَالُوْااَبَعثَ اللّٰهُ بَشَرًارَسُوْلًا)[3]

"اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آچکی تو اُن کو ایمان لانے سے اس کے سوا اور کسی چیز نے نہ روکا کہ وہ کہنے لگے کہ کیا خدا نے آدمی کو رسول بنا کر بھیجا ہے"۔

خدا وند عالم ان کے جواب میں ارشاد فرماتا ہے :

(قُلْ لَوْكَانَ فِی الاَرْضِ مَلاَئِكة يَمْشُوْنَ مُطمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَاعَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَآئِ مَلَكاً رَسُوْلاً)[4]

"اے رسول تم کہدو کہ اگر زمین پر فرشتے (بسے ہوئے) ہوتے جو اطمینان سے چلتے پھرتے نظر آتے تو ہم ان لوگوں کے پاس فرشتہ ہی کو رسول بنا کر نازل کرتے"

ایک دوسرے مقام پر کفار کا قول قرآن نقل کرتا ہے :

1۔ سورۂ حجر آیت 7۔

2۔ سورۂ حجر آیت 8۔

3۔ سورۂ اسراء آیت 94۔

4۔۔ سورۂ اسراء آیت 95۔

(وَقَالُوْامَالِ هٰذَ اَالرَّسُوْلِ یَاکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الاَسْوَاقِ لَوْلَااُنْزِلَ اِلَیْهِ مَلَک فَیَکُوْنَ مَعَهُ نَذِیْراً) [1]

"اوران لوگو ںنے (یہ بھی) کہا کہ یہ کیسارسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے اس کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں نازل ہو اتا کہ وہ بھی اس کے ساتھ (خدا کے عذاب سے) ڈرائے "۔

یہ سب (لو تا تینا با لملائکه) کی مانند ہے یعنی نبی کے ساتھ ایک فرشتہ آئے کہ جس کو دیکھ سکیں البتّہ اسکے علاوہ بھی وہ بہت باتیں کیا کرتے تھے جو ہماری بحث سے تعلق نہیں رکھتیں۔

خدا وند عالم ان کے جواب میں فرماتا ہے:

(وَمَااَرْسَلنَا قَبْلَکَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَیَاْکُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ یَمْشُوْنَ فِی الْاَسْوَاقِ وَجَعَلْنَا بَعضَکُم لِبَعْضٍ فِتْنَةً اَتَصْبِرُوْنَ وَکَانَ رَبُّکَ بَصِیْراً) [2]

"اور (اے رسول)ہم نے آپ سے پہلے پیغمبر نہیں بھیجے مگر یہ کہ سب کے سب ہی آپ کی ہی مانند کھانے کھا تے تھے اور بازا رو ں میں چلتے پھرتے تھے اور ہم نے آپ میں سے بعض کو بعض کے لئے سببِ آزمائش بنایا کہ خدا کی طاعت میں آیا آپ لوگ صبر کرتے ہیں (یا نہیں) اور آپ کا پروردگار بڑا دیکھنے والا ہے"۔

انسان اس دنیا میں امتحان کے لئے پیدا کیا گیا ہے جب اس کے لئے کسی چیز کا حق ہوناثابت ہو جا ئے تو اس کا امتحان اس طرح ہوتا ہے کہ کیا وہ حق کو قبول کرتا ہے یا خواہشاتِ نفسانی کی وجہ سے قبول نہیں کرتا ؟

ہم نے پیغمبروں کو بھیج کر اپنی حجت تمام کردی ،لوگو ں کے لئے ان کا پیغمبر ہونا ثابت ہو جاتا ہے تو اس وقت ان کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہی جنس کے ایک انسان کی اطاعت کرتے ہیں یا اُن کا جذبۂ تکبران کو اطاعت سے روک دیتا ہے (وَجَعَلنَا بَعَضَکُم لِبَعْضٍ فِتْنَۃً)آپ تمام لوگ انسان ہیں لیکن بعض انسانو ں کا بعض انسانوں کے ذریعہ امتحان ہوتا ہے پیغمبرو ں کا امتحان بھی اس طرح ہوتا ہے کہ جب لوگ ان کی دعوتِ تبلیغ کو نہیں مانتے تو وہ آیا تبلیغ سے دست بردار ہو جا تے ہیں؟ یا تبلیغ کو جاری رکھتے ہیں ۔اور صبر کرتے ہیں :(اَ تَصبِرُونَ وَکَانَ رَبُّک بَصِیْراً) ۔

ارشاد خدا وندی ہے :

1۔ سورۂ فرقان آیت 7۔8۔

2۔ سورۂ فرقان آیت 20۔

(وَمَآاَرْسَلْنَا قَبْلَکَ اِلَّارِجَالاً نُوحِیْ اِلَیْهِمْ فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْ نَ)[1]

"اور (اے رسول) ہم نے آپ سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا کہ ان کے پاس وحی بھیجا کرتے تھے تو اگر تم لوگ خود نہیں جانتے ہو تو عالموں سے پوچھ لو"۔

یہود و نصاریٰ اور دوسری قوموں سے سوال کرو کہ ان کے انبیاء علیہم السلام انسان تھے یا نہیں؟ اہل خبرہ اور امت کے دانشوروں سے سوال کرو تو وہ تم کو بتلائیں گے کہ گذشتہ انبیاء علیہم السلام بھی انسان تھے ۔

سورۂ انبیاء میں ارشادفرماتا ہے :

(وَمَاجَعَلنَاهُم جَسَداً لا یَاکُلُونَ الطَّعَامَ وَمَاکَانُواخَالِدِینَ)[2]

"اور ہم نے ان (پیغمبروں) کے بدن بیجان نہیں بنا ئے تھے کہ انھیں کھا نے پینے کی احتیاج نہ ہو اور نہ وہ (بدن سے آزاد روح تھے) کہ ہمیشہ زندہ رہیں"۔

سورۂ فرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَقَالَ الَّذِیْنَ لَایَرجُو نَ لِقائَنَالَولَا اُنْزِلَ عَلَیْنَاالْمَلَائِکَۃُ اَوْنَرٰی رَبَّنَالَقَدِ اسْتَکْبَرُوافِی اَنفُسِهِم وَعَتَوْعُتُوّاًکَبِیْرًاَیَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلَائِکَۃَلاَ بُشْرٰی یَومَئِذٍ لِلْمُجْرِمِیْنَ وَیَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا)[3]

"اور جو لوگ (قیامت میں)ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ آخر فرشتے ہمارے پاس کیوں نہیں آتے ؟پروردگار کو(کیوں نہیں) دیکھتے ؟ان لوگوں نے دراصل اپنے کو(بہت) بڑا سمجھ لیا اور بڑی سرکشی پر اتر آئے (حالانکہ)جس دن یہ لوگ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن گنہگارونکو کچھ خوشی نہ ہوگی وہ فرشتوں کو دیکھ کر کہیں گے دوررہو "۔

(ذٰلِکَ بِاَنَّهُ کَانَتْ تَا تِیْهِمْ رُ سُلُهُمْ بِالْبَیِّنَا تِ فَقَالُوْا اَبَشَر یَهْدُوْنَنَا فَکَفَرُوْا وَتَوَلَّوْاوَاسْتَغْنَی اللّٰهُ وَاللّٰهُ غَنِیّ حَمِیْد)[4]

"یہ اس وجہ سے ہے کہ جب ان کے پاس ان کے پیغمبر کھلے معجزے لیکرآ ئے تھے تو کہتے تھے کہ کیا (ہمارے جیسے) آدمی ہمارے رہبر بنیں گے ؟ پس (یہ کہہ کر) کافر ہوگئے اور منھ پھیر بیٹھے توخدا نے بھی (ان کی) پروانہ کی اور

1۔ سورۂ انبیاء آیت 7۔

2۔ سورۂ انبیاء آیت 8۔

3۔ سورۂ فرقان آیت 21۔23۔

4۔ سورۂ تغابن آیت6 ۔

خدا تو ہر اک سے بے نیاز اور سزاوار حمد ہے"۔

یہاں قرآن نے کلی طور پر تمام قوموں کا حال نقل کیا ہے کہ جب انکے درمیان انبیاء علیہم السلام مبعوث کئے جاتے تھے تو وہ کہا کرتے تھے: (اَبَشَر یَهْدُ وننَا) کیا بشر ہماری ہدایت کرے گا؟

(فَكَفَرُواوَتَوَلّوا) وہ (نبیوں) کا انکار کرتے اور روگردانی اختیار کر لیتے تھے جبکہ (خود) خدا ان سب سے بے نیاز ہے ۔حکمتِ خدا کا تقاضا بس اتنا ہی ہے کہ وہ ان کے درمیان انبیاء علیہم السلام مبعوث کر کے ان پر اپنی حجت تمام کر دے۔خدا کو اس بات پر اصرار نہیں ہے کہ ان کو ہر حال میں انبیاء علیہم السلام کی اتباع کرنی ہوگی (کیونکہ)خدا کو ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے (وَاسْتَغْنَىَ الله والله غَنِیّ حَمِید) حکمتِ خدا کا تقاضا بس اس قدر ہے کہ ان کے لئے راستہ کی وضاحت کردے تاکہ وہ اپنے اختیار اور خواہش سے راہِ حق یا راہِ باطل کو منتخب کر لیں۔

یہاںتک کہ ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے آیات کلی طور پر تمام انبیاء علیہم السلام کے بارے میں تھیں لیکن بہت سے مقامات پر ہر نبی کے لئے الگ الگ بھی مطلب بیان ہوئے ہیں کہ ان کی قوم والوں نے اس نبی کے مقابل اسی طرح کی باتیں کہی ہیں منجملہ حضرت نوح علیہ السلام کے سلسلہ میںخداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

(فقَالَ الْمَلَاُ الَّذِ یْنَ كَفَرُوْامِنْ قَوْمِهِ مَاهٰذَآ اِلَّابَشَر مِثْلُكُمْ یُرِ یْدُ اَنْ یَتَفَضَّلَ عَلَیْكُمْ وَلَوْشَاءَ اللّٰہُ لَاَنْزَلَ مَلٰئِكَةً مَاسَمِعْنَابِهٰذَافِیْ آبَائِنَاالْاَوَّلِیْنَ)[1]

"ان کی قوم کے سرداروں نے جو کافر تھے کہا کہ یہ بھی تو بس تمہارے ہی جیسا انسان ہے (مگر) اس کی خواہش ہے کہ تم پر برتری حاصل کرلے (ورنہ) اگر خدا (پیغمبر نبی بھیجنا چاہتا) تو فرشتوں کو نازل کرتا ہم نے تو (کبھی) ایسی بات اپنے باپ داداؤں کے سامنے نہیں سنی تھی"۔قوم نوح علیہ السلام اس سلسلہ میں شاید سچ کہتی چونکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ تک اتنا فاصلہ ہوگیا تھا کہ لوگوں کو ماسبق انبیاء علیہم السلام کی کوئی دقیق خبر نہیں تھی لیکن بعد کی قوموں کے لئے یہ باتیں بالکل صحیح نہیں تھیں اور ایسا نقل بھی نہیں ہوا ہے کہ بعد والی قوموں نے یہ کہا ہو کہ ہم نے اس طرح کی باتیں نہیں سنی ہیں۔اسی طرح قومِ نوح کے سردار قوم والوں سے کہتے تھے:

(اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُل بِهِ جِنَّة فَتَرَبَّصُوْا بِهِ حَتّٰی حِیْن)[2]

1۔سورۂ مومنون آیت24۔

2۔سورۂ مومنون آیت 25۔

"در حقیقت اس آدمی (حضرت نوح) پر جنون طاری ہے لہذا کچھ دن حالات کا انتظار کر لو"۔

دوسری آیت میں ایک اور پیغمبر کی زبانی (البتہ اس پیغمبر کا نام ذکر نہیں کیا گیا ہے) قرآن نقل فرماتا ہے:

(وَقالَ الْمَلاُ مِنَ قَوْمِه الذین کَفَرُوْا وَکَذَّ بُوْابِلِقَائِ الآخِرَةِ وَا تْرَفْنَهُمْ فی الحَیٰوةِ الدُّ نْیَامَاهٰذا اِلَّابَشَرمِّثْلُکُمْ یَأکُلُ مِمَّا تَأکُلُوْنَ مِنْهُ وَیَشْرِبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ وَلَئِن اَطَعْتُمْ بَشَراً مِّثْلَکُمْ اِ نَّکُمْ اِذاً لَّخٰسِرُوْنَ)[1]

"اور ان کی قوم کے چند سرداروں نے جو کافر تھے اور (روز) آخرت کی حاضری کو بھی جھٹلاتے تھے اور دنیا کی (چند روزہ) زندگی میں ہم نے انھیں عیش اور نعمت بھی دے رکھی تھی (قوم والوں سے) کہہ دیا یہ تو بس تمہارے ہی جیسا آدمی ہے جو چیزیں تم کھاتے ہو یہ بھی کھاتا ہے اور جو چیزیں تم پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے اور اگر تم لوگوں نے اپنے ہی جیسے آدمی کی اطاعت کر لی تو تم ضرور گھاٹے میں رہو گے"۔

حضرت صالح علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم فرماتا ہے کہ ان کی قوم نے اُن سے کہا:

(قَالُوْااِنَّمَآاَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ مَااَنْتَ اِلّابَشَر مِّثْلُنَا)[2]

"وہ لوگ بولے کہ تم پر تو بس جادو کر دیا گیا ہے (کہ ایسی باتیں کرتے ہو) تم بھی تو آخر ہمارے ہی ایسے آدمی ہو"۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں بھی اسی طرح کی باتیں ملتی ہیں کہ ان کی قوم نے اُن سے کہا:

(قَالُوْااِنَّمَآاَنْتَ مِنَ المسَحَّرِیْنَوَمَااَنْتَ اِلَّابَشَرمِثلُنَا وَاِن نَظُنُّکَ لَمِنَ الکَاذِبِینَ)[3]

"وہ لوگ کہنے لگے تم پر تو بس جادو کردیا گیا ہے (کہ ایسی باتیں کرتے ہو) اور تم بھی تو ہمارے ہی ایسے آدمی ہو اور ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو"۔

خداوند عالم قرآنِ کریم کے سورۂ یس میں ایک واقعہ اس طرح نقل فرماتا ہے:

(وَاضْرِبْ لَهُم مَثَلاً اَصحَا بَ القَرْ یَةِ اِذْجَآئَ هَاالْمُرْسَلُوْنَ اِذْاَرسَلْنآاَلَیهِمُ اثْنَینِ فَکَذَّبُوْهُمَافَعَزَّزْنَابِثَا لِثٍ فَقَالُوااِنَّآاِ لَیکُم مُرسَلُونَ قَالُوْامَاۤاَنْتُمْ اِلّا بَشَرمِثْلُنَا)[4]

1۔ سورۂ مومنون آیت33،34۔

2۔ سورۂ شعراء آیت 153۔154۔

3۔ سورۂ شعراء آیت 185و186۔

4۔ سورۂ یس آیت 13۔14۔15۔

"اور (اے رسول) تم (ان سے) مثال کے طور پر ایک آبادی کا قصہ بیان کرو کہ جب وہاں (ہمارے) پیغمبر آئے اس طرح کہ پہلے ہم نے ان کے پاس دو پیغمبر بھیجے تو ان لوگوں نے دونوں کو جھٹلایا، تب ہم نے ایک تیسرے (پیغمبر) کو (ان دونوں کی) مدد کے لئے بھیجا تو ان تینوں نے کہا ہم تمہارے پاس (خدا کے) بھیجے ہوئے (آئے) ہیں تو وہ لوگ کہنے لگے کہ تم لوگ بھی تو بس ہمارے ہی جیسے آدمی ہو اور خدا نے کچھ نازل نہیں کیا ہے تم سب کے سب بالکل جھوٹے ہو"۔

روایات میں ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ملک شام کے شہر انطاکیہ میں پیش آیا جو اَب ترکی میں ہے۔

بہر حال، قرآنِ کریم میں ہے:

(اِذْجَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِن بَينِ اَيدِيهِمْ وَ مِن خَلْفِهِم اَلَّاتَعْبُدُوْاِلَّااللّٰہ)[1]

"کہ ہم نے ان کے پاس ان کے سامنے اوران کے بعد (مختلف صورتوں سے مختلف شہروں میں) انبیاء بھیجے جو (یہ خبر لے کر) آئے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو"۔

تو لوگوں نے ان کے جواب میں کیا کہا ؟

(قَالُوْالَوْشَاءَ رَبُّنَالَاَنْزَلَ مَلٰئِكَةً فَاِنَّابِمَآاُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُوْنَ)

"کہنے لگے اگر ہمارا پروردگار چاہتا تو فرشتے نازل کرتا پس جس بات پر تم لوگ مبعوث کئے گئے ہو ہم اسے نہیں مانتے"۔

قرآن کریم کا ان سے سوال ہے:

(هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا اَن يَاتِيَهُمُ اللّٰهُ فِی ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰئِكَةُ وَقُضِیَ الْاَمْرُوَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُ مُورُ)[2]

"کیا وہ لوگ اسکے منتظر ہیں کہ سفید ابر کے سائبانوں (کی آڑ) میں خدا (عذاب کے فرشتوں کے ساتھ) ان پر ظاہر ہو اور سب جھگڑے تمام کردے حالانکہ کل امر خدا کی ہی طرف پلٹنے ہیں"۔

1۔ سورۂ فصلت آیت 14۔

2۔ سورۂ بقرہ آیت210۔

جی ہاں !اس طرح کا انتظار حقیقتا موجود تھا جیسا کہ اس سے قبل کی آیات میں بھی بیان ہو چکا ہے کہ ان کا کہنا تھا :جب تک ہم خدا کو نہ دیکھ لیں گے ایمان نہیں لائیں گے اور ہم پر ملائکہ کیوں نہیں نازل ہوتے ؟! قرآن کریم نے اسی کا ذکر کیا ہے :

(هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاانْ تَاتِيَهُمُ الْمَلٰئِكَةُ اَوْيَاتِيَ رَبُّكَ اَويَا تِيَ بَعضُ آيَا تِ رَبِّكَ يَوْ مَ يَاتِى بَعْضُ آيَا تِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْساًاِيْمانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبلُ اَوْكَسَبَتْ فِى اِيمَانِهَاخَيْراً قُلِ انْتَظِرُوْااِنَّامُنْتَظِرُوْنَ)[1]

"آیا یہ لوگ صرف اس کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا اس سے بالا تر خود پروردگار کی آمد کے منتظر ہیں ؟پروردگار کی کچھ نشانیاں دیکھنا چاہتے ہیں (آخر کیونکر سمجھا یا جائے) حالانکہ جس دن تمہارے پروردگار کی بعض نشانیاں آجائینگی۔۔۔"۔

"یقینا اللہ کی نشانیاں تکوینی ہوں یا تشریعی کائنات کی تخلیق اور کتاب و نبوّت کی صورت میں معجزے کے طور پر بہت زیادہ ہیں لیکن وہ لوگ ان کے خواہاں نہ تھے بلکہ وہ ایسی نشانیاں چاہتے تھے جو دنیا کو بدل ڈالے اور دنیا میں کوئی بنیادی اثر رونما ہو جائے "۔

(یَومَ یَاتِی بَعضُ آیاتِ رَبِکَ لَایَنفَعُ تو جس دن خداوند عالم کی بعض ایسی نشانیاں ظاہر ہونگی اس دن جو ایمان نہیں لائے ہیں ان کا ایمان لانا ان کیلئے کوئی فائدہ نہ پہنچائے گا مثال کے طور پر اگر عذاب ہونے لگے اور وہ لوگ عذاب نازل ہوتے وقت ایمان لائیں تو کیا فائدہ ؟! جیسے فرعون نے غرق ہوتے وقت کہا تھا: (آمَنتُ بِمَا آمَنَت بِہ بَنُوا اِسرَائیل)فرعون کو جواب دیا گیا :اب ؟اب ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے؟ (یَومَ یَاتِی بَعضُ آیاتِ ربِکَ۔) اگر اس طرح کی نشانیاں ظاہر ہونے لگیں تو لوگوں سے اختیار سلب ہو جائے گا اور پھر زبردستی کا ایمان کس کام کا ہوگا ؟اسی طرح اگر کار خیر انجام نہ دیا جائے اور اس طرح کی صورت دیکھنے کے بعد کار خیر انجام دیں تو اسکا کوئی فائدہ نہیں۔ (اَوکَسَبَت فِی اِیمَانِھَاخَیرا) اس کے بعد فرماتا ہے (قُلِ انتَظِرُوا)"کہد یجئے اپنے نشہ میں پڑے رہو اور انتظار کرو ہم بھی انتظار کرتے ہیں"۔

قرآنِ کریم میں ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے :

1۔ سورۂ انعام آیت158۔

(هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَأْوِيْلَهُ يَوْمَ يَا تِيْ تَاْوِيْلُهُ يَقُوْلُ الَّذِ يْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَائَتْ رُسُلُ رَبِّنَابِالْحَقِّ فَهَلْ لَنَامِنْ شُفَعَائَ فَيَشْفَعُوْالَنَآاَوْنُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِ یْ كُنَّا نَعْمَلُ قَدْخَسِرُوْااَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَاكَانُوْايَفْتَرُوْنَ)[1]

اس آیت میں ایک اور تعبیر ہے !کیا وہ تاویل قرآن کے ظاہر ہونے کے علاوہ کسی اور چیز کے منتظر ہیں ؟ ہم نے تاویلِ قرآن کی بحث میں پہلے عرض کیا تھا کہ اس آیت اور اس کے مشابہ آیات میں تاویل قرآن کے حقیقی مصادیق وہ مطالب ہیں جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں توکیا وہ حقیقت ِقرآن کے ظہور کے منتظر ہیںٰیعنی جب قرآن فرماتا ہے کہ قیامت ہے ،عالمِ آخرت ہے ، ملائکہ ہیں توکیا یہ لوگ خود قیامت یا ملائکہ کو دیکھ کر ان پر ایمان لانا چاہتے ہیں ؟جبکہ جس دن قرآن کی بیان کردہ یہ حقیقت ظاہر ہوگی اور ان مطالب کے مصادیق محقّق ہوں گے کسی کے لئے ایمان لانے کاوقت باقی نہ رہ جائے گا ۔

اس وقت جو لوگ ان حقائق کو بھولے ہوئے تھے اور ایمان نہیں لائے تھے وہ کہیں گے:(قدجَائت رُسُلُ رَبِّنَابِالحَقِّ) ہاں پیغمبر جو کچھ فرماتے وہ بالکل سچ فرماتے تھے اب ہم کیا کریں!(فَھَل لَنَا مِن شفعاء فَیَشفَعُوالَنَا اَو نُرَدُّ فَنَعمَل غَیرَالَذِی کُنَّا نَعمَل)

ظاہر ہے ان کی موت کے وقت تاویل قرآن ظاہر ہوگی وہ کہیں گے کہ کیا ہم کو دنیا میں واپس پلٹایا جاسکتا ہے پتہ چلا جس دن تاویل قرآن ظاہر ہوگی وہ ان کی موت کا دن ہوگا یہی وہ دن ہوگا کہ جب وہ حقائق کہ جن کا وعدہ کیا گیا ہے اور جو لوگوں کی آنکھوں سے غائب رہی ہیں ظاہر ہونگی اور وہ خود ان کا مشاہدہ کریں گے اور کہیں گے (قَد خَسِرُوا اَنفُسَھم)ہم اپنے جی سے ہار چکے ہیں اب ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں رہا ہم نے اپنی زندگی کھودی ، بہت نقصان اٹھایا (وَضَلَّ عَنھُم مَاکَانُوْا یَفتَرُونَ) انھوں نے جن کو خدا کا شریک قرار دیا تھا ، اور خدا پر افتراء وبہتان باندھے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ ہماری شفاعت کریں گے ہم کو خدا کے عذاب سے بچالیں گے اب وہ خودمشاہدہ کریں گے کہ یہاں کسی بت کا کوئی نشان نہیں ہے کسی کا کوئی بس نہیں چلتا۔خدا کا حکم ہے جو نازل ہو رہا ہے اور اس سے بھاگنے کی کوئی جگہ بھی نہیں ہے ۔

قرآنِ کریم میںٛایک جگہ اور ارشاد ہوتا ہے :

(هَلْ يَنظُرُونَ اِلّآاَن تَاتِيَهُمُ المَلٰئِكَةُ اَوْيَاتِيَ اَمرُرَبِّکَ كَذَا لِکَ فَعَلَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ)

1۔سورۂ اعراف آیت 53۔

(وَمَاظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَٰكِنْ كَانُوْاانفُسَهُم يَظْلِمُوْنَ)[1]

"کیا یہ (اہل مکہ) اسی بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے (قبض روح کے لئے) آجائیں یا تمہارے پروردگار کا حکم آپہنچے جو لوگ ان سے پہلے گذرے ہیں وہ بھی ایسی باتیںکرتے تھے اور خدا نے ان پر (ذرا بھی) ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود (کفر کی وجہ سے) اپنے اوپر ظلم کرتے رہے"۔

پس نتیجۂ بحث یہ نکلا کہ: خدوند عالم کی حکمت اگرچہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ عقل کے علاوہ کسی دوسرے طریقہ سے انسانوں کی ہدایت کرے لیکن ہدایت کی یہ راہ بعض ایسے انسانوں کی استعداد اور قابلیت پر منحصر ہے کہ (جن کو خدا پہچانتا ہے) خدا ان افراد کو بھیجے کہ لوگ ہدایت یافتہ ہو جائیں۔

(وَاللہ اَعلَمُ حَیثُ یَجعَلُ رِسَالَتَہُ) (خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کہاں قرار دے)۔

1۔ سورۂ نحل آیت33۔

معجزہ

معجزہ کی ضرورت

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے حواس وعقل کے ذریعہ جو معلومات حاصل کرتا ہے اس سے زیادہ معلومات اس کو حاصل ہو تو اب یہ معلومات لا محالہ کسی غیر معمولی طریقہ یعنی وحی اور نبوت کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہیں اور یہ ثابت ہوجانے کے بعد تمام انسان حامل وحی ہونے کی صلاحیت و استعداد بھی نہیں رکھتے مجبورا کچھ ہی افراد پر وحی نازل ہوگی اور دوسرے افراد با واسطہ طور پر ان سے استفادہ کریں گے اب یہ مسئلہ درپیش ہے کہ ہم کو یہ کیسے معلوم ہو کہ کس شخص پر وحی ہوئی ہے ؟کیونکہ وحی کوئی قابل محسوس چیز نہیں ہے کہ جب کسی پر نازل ہوتو دوسرے افراد بھی اس کا مشاہدہ کریں اور سمجھ لیں کہ فلاں شخص پیغمبر ہے لہٰذا کوئی ایسا طریقہ ہونا چاہیئے کہ جس سے ہم سمجھ جائیںکہ یہ شخص دوسروں سے ممتاز ہے اور حامل وحی ہونے کی استعداد رکھتا ہے اور خدا نے بھی اس پر وحی نازل کی ہے ۔یہاں جوجواب دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس پر خدا کی کوئی نشانی ہونی چاہیئے یعنی اس شخص کے رفتار وکردار واعمال اس چیز کی نشاندہی کرتے ہوں کہ وہ خدا سے رابطہ رکھتا ہے تو اس وقت قاعدہ (حکم الا مثال فیما یجوزوفیما لا یجوز واحد) کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح وہ اس سلسلے میں خدا سے رابطہ رکھتا ہے اس کے مثل دوسرے تمام امور میں بھی رابطہ رکھتا ہوگا ۔ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کے پاس کوئی معجزہ ہونا چاہیئے جس سے لوگ سمجھ سکیں کہ پیغمبر خدا سے ربطہ خاص کے تحت وہ افعال انجام دے سکتا ہے جو دوسرے انسان انجام نہیں دے سکتے اور یہ معجزہ اس کو خداوند عالم نے عطا کیا ہے ۔اس وقت ان کی سمجھ میں آجائے گا کہ یہ شخص خدا سے رابطہ رکھتا ہے اور وہ اس (پیغمبر)کی باتوں کو قبول کر لیں گے ۔

اس بارے میں کچھ مسائل زیر بحث آتے ہیں :

1۔ معجزہ کیا ہے ؟

2۔کیا معجزہ عقلاً ممکن ہے ؟

3۔کیا معجزہ قانون علت کے ساتھ سازگار ہے ؟یا میل کھاتا ہے؟

4۔کیا پیغمبر کے لئے صاحب معجزہ ہونا ضروری ہے یا پیغمبر پر خدا کا محض ایک فضل ہے ؟

5۔کیا تمام انبیاء صاحب معجزہ تھے یا معجزہ بعض انبیاء علیہم السلام کے لئے مخصوص تھا ؟

6۔کیا صاحب معجزہ انبیاء علیہم السلام ابتدا سے ہی معجزہ دکھلاتے تھے یا جب ان سے معجزہ کا مطالبہ کیا جاتا تھا تو معجزہ دکھلاتے تھے ؟

7۔کیا معجزہ نبوت کی قطعی دلیل ہے یا عوام الناس کو قانع کرنے کے لئے ہے ؟

8۔کیا انبیاء علیہم السلام معجزہ دکھلانے کے سلسلے میں لوگوں کا ہر مطالبہ قبول کرلیا کرتے تھے یا بعض مطالبوں کو قبول کرتے تھے اور بعض کورد فرمادیا کرتے تھے اور اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے ؟

9۔کیا انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی اور صاحبِ معجزہ ہو سکتا ہے یا نہیں ؟

10۔ انبیاء علیہم السلام اور غیر انبیاء کے معجزات کے بارے میں قرآن کے بیانات (اگر غیر انبیاء کے لئے صاحبِ معجزہ ہونا قبول کرلیا جائے) یہ وہ مسائل ہیں جن کا الگ الگ ایک سر سری جائزہ لینے کی ضرورت ہے :

معجزہ کی حقیقت

بغیر کسی شک و شبہ کے معجزہ ایک غیر معمولی عمل ہے جو عادت کے خلاف ظاہر ہوتا ہے چاہے یہ کام خارجی دنیا سے تعلّق رکھتا ہو یا خبر کی صورت میں سامنے آئے خبر دینا بھی ممکن ہے دنیا کے عام دستور کے خلاف غیر معمولی ذرائع سے ہو۔

لیکن معجزہ کی حقیقی تعریف میں صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ بھی بہت سے افراد مل سکتے ہیں کہ جنھوں نے غیر معمولی کام انجام دیئے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جیسے ریاضت کش مرتاض اور جادو گر وغیرہ جو غیر معمولی کام انجام دیتے ہیں لیکن ان کے یہ افعال معجزہ نہیں ہیں ۔ اس لئے معجزہ کی تعریف میں یہ بھی بڑھانا چاہیئے کہ وہ غیر معمولی کام کہ جو عادت کے خلاف ظہور رہو خدا کی طرف سے ہونا چاہیئے اور چونکہ ہم کو یہ معلوم نہیں کہ کونسا عمل خدا کی طرف سے ہے اور کونسا عمل خدا کی طرف سے نہیں ہے ۔ معجزہ کے لئے کچھ علامتیں مدّ نظر رکھی گئی ہیں:

1۔ معجزہ کسی بھی بڑی طاقت سے مغلوب نہیں ہوتا، عالمِ طبیعت یعنی دنیا میں بہت زیادہ علّت و معلول یا اسباب و اور مسبّب موجود ہیں۔ ایک علّت کسی شئے کے وجود میں ممکن ہے موثر ہو لیکن اس سے زیادہ قوی کوئی دوسری علّت کمزور علّت پر غالب آکر اس کے اثر کو روک سکتی ہے۔ مثال کے طور پر آگ کاغذ کو جلا دیتی ہے لیکن اگر آگ پر پانی ڈالا جائے تو خود آگ بجھ جاتی ہے اس مقام پر ایک علّتِ مادی دوسری علّت پر غالب آجاتی ہے۔ عالمِ فطرت میں ایسے سیکڑوں بلکہ ہزاروں اسباب و مسبّبات ہیں جو دوسرے اسباب سے مغلوب ہو جاتے ہیں لیکن معجزہ وہ ہے جس پر کوئی بھی علّت غالب نہیں آسکتی نہ تو کوئی دنیاوی چیز اس کو باطل کر سکتی، نہ اسکے اثر کو زائل کر سکتی اور نہ ہی اس کو روک سکتی اور نہ ہی کوئی مادیّت سے ما وراء عمل اس میں کوئی خلل اندازی کر سکتا فرض کیجئے کوئی مرتاض یا جادو گر بہت زیادہ ریاضت و مشقّت کے ذریعہ ایسی طاقت پیدا کر لے کہ وہ غیر معمولی کام انجام دینے لگے مثال کے طور پر ہاتھ کے اشارے سے چلتی ٹرین (ریل) روک دینے کی قوّت رکھتا ہو تو بھی اس طرح کی طاقتیں کبھی معجزہ کے سامنے ٹک نہیں سکتیں۔ کوئی بھی مادّی یا مادّیت سے ما وراء انسانی طاقت نہ معجزہ کے اثر کو بے کار کر سکتی ہے اور نہ ہی اس کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ یہ امارات میں سے ہے کہ یہ کام، خدا کا کام ہے۔ ایک جادو گر ہاتھ کے اشارے سے چلتی ہوئی ریل کو روک سکتا ہے لیکن ممکن ہے دوسرا اس سے بڑا جادوگر اس جادوگر کے جادو کو توڑ کر ایک اشارہ سے ریل گاڑی کو چلا دے یا شروع میں ہی جب وہ ریل کو روکنا چاہتا ہو یہ اسکے اس جادو کو باطل کردے اور ایسا ہونا محال نہیں ہے کیونکہ جس کی طاقت زیادہ ہوتی ہے وہ غالب آجاتا ہے اور کمزور کو مغلوب کر دیتا ہے لیکن معجزہ میں کوئی بھی بڑی سے بڑی طاقت معجزہ کے عمل میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ کیونکہ وہ طاقتیں اگر انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی اور ہیں تو وہ خداوند عالم کی قدرت اور ارادہ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں اور اگر بالفرض کوئی اور پیغمبر اس میں خلل اندازی کرنا چاہے گا تو یہ بھی اللہ کے امر کو توڑنے کے مترادف ہوگا اس لئے کہ جب خدا اپنی حکمت کے ذریعہ کسی پیغمبر کے یہاں معجزہ ظاہر کرنا چاہے گا تو کسی نہ کسی حکمت کے تحت ہوگا وہ حکمت کے بغیر معجزہ ظاہر نہیں کرتا اب اگر کوئی دوسرا پیغمبر آکر اس پیغمبر کے معجزہ کو روکنا چاہے تو اس سے خود خدا کے منشاء کی خلاف ورزی لازم آتی ہے جو ایک نبی کے لئے بعید ہے نتیجتاً معجزہ کبھی بھی کسی عامل سے مغلوب نہیں ہو سکتا۔

2۔ معجزہ سیکھا اور سکھایا نہیں جاسکتا، معجزہ کوئی سیکھنے کی چیز نہیں ہے کہ کوئی پڑھکریاد کرلے اور نہ ہی معجزہ میں ریاضت اور مشقت کی ضرورت ہے کہ کوئی زحمتیں اٹھاکر صاحب معجزہ بن جائے بلکہ یہ ایک الٰہی عطیہ ہے وہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے لیکن دوسرے غیر معمولی کام جو بعض افراد انجام دیتے ہیں وہ سیکھے اور سکھائے جاسکتے ہیں اور جب تک وہ افراد ریاضت کرتے رہیں گے ان سے نتیجہ حاصل کرتے رہیں گے ۔۔یہ سب اپنی ریاضت سے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان کے کام خدائی کام نہیں ہیں اس کے بر عکس (تعلیم و تعلّم یادنیوی اسباب سے مغلوب ہوئے بغیر) معجزہ کاظہور اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ امر خدا کے حکم سے ہے ۔اسی بناء پر اگر اس طرح کے کسی انسان کا تعارف کرایا جائے اور لوگ اس کی زندگی سے واقف ہوں کہ ا س نے اس کام کے لئے نہ کوئی ریاضت کی ہے نہ کسی سے پڑھا ہے اور نہ ہی کسی استاد سے سیکھا ہے اور وہ معجزہ دکھلائے تو لوگ آسانی سے قبول کرلیتے ہیں کیونکہ یہ قدرت الٰہی سے رونما ہوا ہے ۔بر فرض لوگوں کے درمیان کوئی نا آشنا پیغمبر ہو (کیونکہ پیغمبر ہمیشہ اپنی ہی قوم کے درمیان سے مبعوث کئے جاتے تھے اور لوگ ان کو اچھی طرح پہچانتے ہوتے تھے اور ان کی پوری زندگی لوگوں پر آشکار ہوا کرتی تھی پھر بھی فرض کرلیجئے کہ) لوگ نہیں جانتے کہ اس پیغمبر نے کسی سے سیکھا اور پڑھا لکھا ہے یا نہیں تو لوگ اس کے معجزہ کا توڑ کرنے والوںسے مدد حاصل کرکے مقابلے کرسکتے ہیں کہ کوئی اس پر غالب آسکتا ہے یا نہیںاگر کوئی غالب آجائے تو معجزہ معجزہ نہیں ہوسکتا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ فرعون کے جادوگر جس کے مقابلہ پر آگئے تھے اور انھوں نے دیکھ لیا کہ وہ سب مغلوب اور بے بس ہیں ۔۔یہ سب اس بات کی نشانی ہے کہ یہ انسان کا کام نہیںہے بلکہ انسان کے بس سے باہر ہے ۔

لہٰذا مجموعی طورپر ہم کہہ سکتے ہیں: (معجزہ وہ غیر معمولی فعل ہے جو قدرت الٰہی کے پر تو میں انجام دیا جاتا ہے اور معجزہ کی دو علامتیں ہیں:

1۔ کسی سے سیکھ کر یا سکھاکر حاصل نہ ہوا ہو۔

2۔ کسی بھی دوسری قوت سے مغلوب نہ ہو۔

کچھ سوالوں کے جوابات

1۔ سوال: کیا معجزہ نبوت کے دعوے سے وابستہ ہے یا نہیں؟

یہ انبیاء علیہم السلام سے مخصوص نہیں ہے، انبیاء علیہم السلام کے علاوہ دوسرے افراد بھی معجزہ دکھلا سکتے ہیں؟ یقینا ہم اس موضوع پر بعد میں تفصیلی بحث کریں گے لیکن یہاں اجمالی طور پر اتنا عرض کردینا چاہتے ہیں کہ معجزہ کے لئے دو اصطلاحیں ہیں: اگر چہ لفظ معجزہ قرآنی اصطلاحوں میں سے نہیں ہے بلکہ معجزہ کا لفظ علمائے اصول دین کے درمیان رائج رہا ہے لیکن انکے درمیان بھی معجزہ کے لئے دو اصطلاحیں رائج رہی ہیں۔

1۔ معجزہ کی وہ شکل جو خاص معنی میں انبیاء علیہم السلام سے مخصوص ہے اور نبوّت کے دعوے سے وابستہ ہے۔

2۔ معجزہ کی وہ شکل جو عام معنی میں ہے اور جس کی ہم ائمہ علیہم السلام کی طرف نسبت دیتے ہیں کہ وہ اگرچہ پیغمبر نہیں تھے لیکن وہ خدا کی اجازت سے معجزے انجام دیا کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ غیر نبی کی طرف سے معجزہ کی نسبت ادّعائے نبوّت کے ساتھ برابر نہیں ہے اس بناء پر جب ہم معجزہ کو نبوّت کی دلیل کے عنوان سے پیش کرتے ہیں تو اس کی خاص اصطلاح مدّ نظر ہوتی ہے یعنی جو کچھ پیغمبر اپنی نبوّت کی دلیل کے عنوان سے پیش کرتا ہے اور جب ہم اس کو غیر انبیاء سے منسوب کرتے ہیں تو اس کے عام معنی مراد ہوتے ہیں یعنی ہر وہ غیر معمولی کام جو قدرت الٰہی کے پرتو میں (الٰہی منصب) نبوّت یا امامت کو ثابت کرنے کے لئے انجام دیا جاتا ہے چاہے وہ فعل کسی نبی کے ذریعہ انجام پائے یا کسی غیر نبی کے ذریعہ انجام دیا جائے۔

2۔کیا معجزہ عقلی طور پر ممکن ہے یا نہیں؟

کچھ افراد کہتے ہیں کہ معجزہ عقلی طور پر ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ قانون علیت کے خلاف ہے یعنی یہ مسئلہ دوچیزوں میں منحصر ہو جاتا ہے کہ یا تو ہم قانون علّیت کو تسلیم کریں اور معجزہ کا انکار کر دیں یا معجزہ کو قبول کریں اور قانون علیت کو تسلیم نہ کریں ۔یہ افراد کہتے ہیںکہ قانون علیت کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر معلول کی مخصوص علّت ہوتی ہے جو اس کے وجود یا ظہور کا سر چشمہ قرار پاتی ہے مثلاً حرارت کا سرچشمہ آگ ہے ۔اس بناء پر یہ کہنا درست نہیں ہو گا کہ حرارت یا (گرمی) برف سے پیدا ہوتی ہے۔اسی طرح گھاس کا اگنا، خودزندگی کا وجود، انسان کا زندہ ہونا، مرنا، بیمار ہونا اور شفا پانا ان تمام عوارض یا معلولوں کا سرچشمہ ان کی مخصوص علّتیں ہوتی ہیں ۔اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ کوئی چیز علت و معلول کے اس قانون کے بغیر وجود پاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم قانونِ علّیت کو تسلیم نہ کریں اس سلسلہ میں سادہ اندیشی کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں جو بحث کے قابل نہیں ہیں ۔مثال کے طور پر کہتے ہیں کہ یہ ایک استثنائی مسئلہ ہے یعنی ہم قانون علیت کو قبول کرتے ہیں لیکن یہ اس سے آزاد اور مستثنیٰ ہے یہ ایک عامیانہ سی بات ہے کیونکہ اگر قانون علیت ایک عقلی قانون ہے تو اس میں استثناء کا سوال نہیں پیدا ہوتا ۔اس لئے ہم اس طرح کے جوابوں سے قطع نظر کرتے ہیں ۔ ان جوابات کی کوئی علمی حیثیت نہیں ہے ۔

پس معترض کا کہنا یہ ہے کہ آپ نے جو معجزہ کی تعریف کی ہے اس سے قانون علیت کا ٹوٹنا لازم آتا ہے اور قانون علیت کا ٹوٹ جانا اس کے معتبر نہ ہونے کے برابر ہے یعنی اگر ایک جگہ بھی استثناء یا جداگانہ مسئلہ کی بات کی گئی تو اس سے ثابت ہوگا کہ علیت و معلولیت کا وجود ضروری ہی نہیں ہے جبکہ قانون علیت کے کچھ فروعات ہیں (اور منجملہ ان کے ایک فرع کا لازم و ضروری ہونا بھی ہے) یعنی کسی معلول کا اپنی علت تامّہ کے بغیر متحقق ہونا محال ہے تو اب آپ جو کہتے ہیں کہ ایک جگہ آگ گلزار بن گئی یعنی بغیر پانی کے آگ بجھ گئی اور آگ کی جگہ بغیر بیج ڈالے گلستان تیار ہوگیا تو اس کا مطلوب یہ ہوگا کہ قانون علیت ٹوٹ گیا اور آگ کے اندر سے بھی پھولوں کا کھلنا ممکن ہے اور اس سے قانون علّیت سے کسی مسئلہ کے استثناء کا مطلوب قانون علّت کی ضرورت کا انکار ہے۔یعنی اپنی علّت تامّہ کے بغیر پھول کھل اٹھیں یا دوسری جانب آگ کی علّت تامّہ جلانا ہے لیکن وہ نہیں جلاتی یعنی وہ اپنی علت تامّہ سے منفک (جدا)ہوجاتی ہے ۔اس کا صاف سا مطلب قانون علّیت کا انکار ہے ۔

شاید اسی وجہ سے (اشاعرہ) نے قانون علّیت کا انکار کرتے ہوئے کہا تھا :(جس چیز کو ہم علّت سمجھتے ہیں۔ خدا کی سنّت ہے ہم یہ جو دیکھتے ہیں کہ چراغ کے جلتے ہی کمرہ میں روشنی ہوجاتی ہے تو چراغ جلنے اور کمرہ میں روشنی ہونے کے درمیان کسی طرح کا رابطہ نہیں ہے بلکہ یہ خدا کی سنّت ہے جو اس طور پر جاری ہے کہ جب آپ چراغ جلائیں گے توکمرہ میں روشنی کرے گا) لہٰذا معجزات اور غیر معمولی امور کے بارے میں اشاعرہ کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں اور وہ کہتے ہیں :کسی طرح کی علّیت کا وجود نہیں ہے بلکہ ایک فعل خدا کی سنّت کے خلاف انجام پایا ہے اور خلاف سنت کام انجام پانا محال نہیں ہے ،اب تک خدا کی سنت رہی ہے کہ اس طرح کی رفتار اپنائے لیکن بعض مواقع پر وہ سنّت کے خلاف بھی عمل کرتا ہے ۔

بنا براین اشاعرہ نے اس اعتراض کے جواب میں اس قضیہ کی دو شقوں میں سے ایک شق کو قبول کر لیا اور وہ علیت حقیقی کا انکار ہے ۔ان کے مقابل کچھ افراد قانون علیت کو قبول کرتے ہیں اور معجزات کا انکار کرتے ہیں یعنی قرآن میں بیان ہونے والے معجزات کی مختلف طریقوں سے تاویل کیا کرتے ہیں (چنانچہ مختلف بحثوں کے ضمن میں ہم نے ان کے طریقۂ کار کے بارے میں اشارہ کیا ہے)مثال کے طور پر انھوں نے بنی اسرائیل کے دریا سے پار ہو جانے کی دریائے نیل کے جزر و مد سے تاویل کی ہے اور اسی طرح سے دوسری چیزیں بھی بیان کی ہیں ان لوگوں نے بھی ان دو شقوں میں سے اس کو قبول کیا ہے کہ معجزہ کوئی چیز نہیں ہے اور قرآن کریم میں جو کچھ اس بارے میں بیان ہوا ہے وہ مجاز اور استعارہ کے طور پر بیان ہوا ہے اور معجزہ کا عقیدہ رکھنا در اصل خرافات ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

صحیح جواب کیا ہے؟!

صحیح جواب یہ ہے کہ قانون علیت اپنی جگہ باقی ہے اور استثناء کی بھی گنجائش نہیں ہے ۔ معجزہ بھی ایک ایسی حقیقت ہے جو قانون علیت سے منافات نہیں رکھتا اس کو یوں سمجھئے :

قرآن (جیسا کہ ہم نے توحید کی بحث میں بیان کیا ہے)قانون علیت کو پوری طرح تسلیم کرتا ہے ۔ اس طور پر کہ نہ تو دوسری چیزوں کے طول میں خدا کی فاعلیت کا انکار کرتا اور نہ ہی اس سے معجزات اور خلاف عادی افعال کی نفی لازم آتی ۔ہم یہاں مجمل طور پر اشارہ کر دیں کہ قانون علیت کے دو معنی ہیں :

1۔کوئی بھی معلول علت کے بغیر وجود میں نہیں آتا ہر معلول علت کا محتاج ہے۔قدر متیقن علت فاعلی کا محتاج ہوتا ہے اور اگر معلول مادی ہو تو علت مادی اور صوری کا بھی محتاج ہے اور اگر کام کرنے والا کوئی حکیم ہے تو علت غائی بھی ضروری ہے۔بہر حال بحث علت فاعلی سے ہے اور ہر معلول کے لئے علت فاعلی ضروری ہے اس قانون کو کوئی توڑ نہیں سکتا اس کے ایک بدیہی معنی ہیں کہ اگر ایک چیز اپنے آپ وجود میں نہیں آتی تو لا محالہ کسی اور نے اس کو وجود بخشا ہے لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام چیزیں عام اسباب یا علتوں کے ذریعہ ہی وجود پائیں بلکہ یہ قانون صرف اتنا کہتا ہے کہ ہم ہر معلول کے لئے ایک علّت کے قائل ہوں اور اسی طریقہ سے ہم اس پوری دنیا کے وجود سے خدا کے وجود کا یقین حاصل کرتے ہیں ۔علیّت خدا اس لئے ہے کہ دنیا معلول ہے دنیا کا وجود محتاج ہے اور بغیر علّت کے وجود نہیں پا سکتا ۔

2۔قانون علیت کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہم معلول کی ایک خاص علت بیان کریں کہ اس معلول کے وجود کے لئے اس علت کا ہونا حتمی اور ضروری ہے یقینا کلی طور پر علت و معلول کے درمیان سنخیت پائی جاتی ہے لیکن عقل بغیر تجربہ کے کبھی بھی ایک وجود کے لئے کوئی ایک ایسی علت مقرر نہیں کرسکتی کہ جس پر وہ وجود منحصر ہوعام طور پر اشیاء کی مخصوص علتیں تجربوں کے ذریعہ معین کی جاتی ہیں ۔

عام طور پر اس لئے کہا گیا ہے کہ ممکن ہے کوئی غیب کے ذریعہ سمجھ لے)اور تجربہ بھی کسی وجود کی مخصوص منحصر علت کو ہر گز تمام زمانوں میں ہر جگہ ثابت نہیں کرسکتا کیونکہ انسان کا تجربہ محدود ہے ہم سیکڑوں اورہزاروں تجربے بھی کر ڈالیں تب بھی عقل کہتی ہے کہ ممکن ہے یہ وجود کسی اور ایسے طریقہ سے بھی حاصل ہوجائے کہ جس کا علم ہم نہیں رکھتے شاید ہزاروں سال تک انسان یہ سوچتا رہا کہ حرارت آگ کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں ہوسکتی اور شاید آگ کے کشف ہونے سے پہلے وہ اس فکر میں رہا ہو کہ آفتاب کے علا وہ کسی اور چیز سے حرارت حاصل نہیں ہو سکتی لیکن جب آگ کا انکشاف ہوا تو معلوم ہوا کہ اس سے بھی حرارت حاصل ہو تی ہے اور آج دوسرے متعدد طریقوں سے حرارت پیدا کی جا رہی ہے۔بہت سے کیمیائی عمل ورد عمل سے حرارت پیدا کر دیتے ہیں ۔دو چیزوں کے ٹکرانے یا رگڑنے یا حرکت دینے سے حرارت پیدا ہو تی ہے اور ممکن ہے اس کے علاوہ دوسرے طریقہ سے بھی حرارت پیدا ہوتی ہو جس کو ہم نہیں جانتے۔معلوم ہوا تجربہ کبھی بھی ہر زمانہ اورہر جگہ کے لئے علت منحصرہ کا اثبات نہیں کرتا ۔

اب اگر لوگ خیال کرتے ہوں کہ ایک فرشتہ کے وجود کی ایک مخصوص علّت ہے اور پھر اسکی کوئی اور نئی علّت معلوم ہو جائے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ قانون علّیت ٹوٹ گیا ؟ایک وجود کے لئے کوئی نہ کوئی علّت ہونے کا قانون تو بدیہی تھا لیکن کسی مخصوص علّت کی نشاندہی نہیں کر رہا تھا ۔صرف اتنا بتا رہا تھا کہ کوئی معلول بغیر علّت کے وجود میں نہیں آسکتا لیکن وہ علّت کیا ہے قانون علّیت نے نہیں بتا یا تھا ؟جب ایک نئی علّت پتہ چلی تو ہم سمجھ گئے کہ پہلے والی علّت (علّت منحصرہ) نہیں تھی بلکہ اس معلول کے لئے اس علّت کی جگہ اُس علّت سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے ۔

اب اگرہم یہ تسلیم کر لیں کہ بیمار ہمیشہ دوا کھانے سے ہی صحتیاب نہیں ہوتا بلکہ اس کے دوسرے طریقہ بھی ہو سکتے ہیں تو اس سے قانون علّیت نہیں ٹوٹتا ۔ایک بے جان پیکر کے جاندار جسم میں بدلنے کا ایک فطری طریقہ یہ ہے کہ وہ جاندار کے جسم کا حصّہ بن جائے اور نطفہ یا بیج کی شکل اختیار کرے اور پھر ایک جاندار میں تبدیل ہو جائے ۔ اب اگر کوئی اور طریقہ بھی ہو کہ جس سے ایک بیجان وجود جاندار میں تبدیل ہو جائے تو اس سے قانون علیت نہیں ٹوٹتا بلکہ اس کو ایک نئی علَّت کا انکشاف کہا جائے گا ایسی صورت میں نئی علّت کی دو صورتیں ہیں :ایک تو یہ کہ وہ علّت علمی انکشافات کی مانند صرف مادی ہو جو مثلاًآواز اور تصویر کی منتقلی کے طریقوں کی صورت میں رونما ہوا کرتی ہے اور ہر ایک اس سے فائدہ اٹھاتا ہے ۔یہ وہ مادی اور قدرتی علّتیں ہیں جن کا علم پہلے نہیں تھا اور اب ان کی شناخت ہوئی ہے لیکن کبھی کبھی علّتیں تحصیل کے قابل ہوتی ہیں اور کچھ لوگ ان کو حاصل بھی کر لیتے ہیں لیکن وہ علّتیں مادّی علّتوں کے مثل نہیں ہوتیں ۔جیسے وہ نفسانی قوّتیں جو اہل ریاضت حاصل کرتے ہیں وہ بھی عالم مادیّت میں ایک وجود کی پیدائش کے لئے ایک علّت اور سبب ہے لیکن خود علّت کوئی مادی وجود نہیں رکھتی بلکہ ایک غیر مرئی نفسیاتی عمل ہے اور اس سے بھی قانون علّیت کا ٹوٹنا لازم نہیں آتا بلکہ ایک نئی علّت کا انکشاف ہے ۔ہاں بس ایک مادی وجود کے لئے ایک غیر مادی علّت ہے ۔ ان سب سے بالاتر ایک معنوی علّت ہے جو قابل تحصیل اور سیکھنے سکھانے کی چیز نہیں ہے بلکہ خالص الٰہی عطیہ ہے وہ بھی ایک طرح کی علت ہی ہے چنانچہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک پیغمبر نے مردہ کو زندہ کردیا تو اس کا مطلب ہے کہ خداوند عالم نے ایک قوت اس پیغمبر کو عطا کی تھی اور پیغمبر نے خدا کے اذن سے اس قدرت کا استعمال کیا تھایہی قدرت ایک علت ہے کیونکہ ایک نئی چیز کے وجود ،مردہ کے زندہ ہونے اور مریض کے صحتیاب ہونے میں موثر ہوئی ہے ۔

پیغمبر نے خداوند عالم کی عطا کردہ اس نفسانی قوت کا استعمال کیا ہے جو خدا نے اس کو عطا کی ہے لیکن وہ سیکھنے سکھانے کی چیز نہیں ہے اور نہ ہی دوسروں کی اس تک رسائی ہو سکتی ہے لیکن بہر حال وہ ایک علت ہے لہٰذا خلاصئہ جواب یہ ہوا :

معجزہ کا تسلیم کرنا قانون علیت کا نقض نہیں ہے بلکہ مادی موجودات کے لئے ایسی علت کا تسلیم کرنا ہے جو مادی علتوں کی جنس سے نہیں ہے بلکہ ایک معنوی علت ہے جو پروردگار نے اپنے لطف کے تحت عطیہ کے طور پر پیغمبر کی ذات میں ودیعت کی ہے اور وہ قابل تعلیم و تعلم بھی نہیں ہے ۔

3۔کیا انبیاء علیہم السلام کا صاحب اعجاز ہونا ضروری ہے ؟

یہ بات تو واضح ہوگئی کہ معجزہ کسے کہتے ہیں اور یہ کہ معجزہ قانون علیت سے کوئی تناقض نہیں رکھتا اور اعجاز آمیز امور کا ظہور محال نہیں ہے نہ محال ذاتی ہے اور نہ محال وقوعی، محال ذاتی اس لئے نہیں ہے کہ اس فرض سے تناقض لازم نہیں آتا اور محال وقوعی اس لئے نہیں ہے کہ اس کی علت کا متحقق ہونا ممکن ہے چنانچہ معجزہ کے فرض کرنے کا مطلب کسی علت کے بغیر معلول کا فرض کر لینا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے معلول کے وجود کو ہم نے تسلیم کیا ہے کہ جس کی علت سے ہم واقف نہیں ہیں اور یہ عقلا محال نہیں ہے ۔

اب سوال پیش آتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا صاحب اعجاز ہونا ضروری ہے یا نہیں ؟اگر خدا تمام انبیاء کو معجزہ کے بغیر ہی بھیج دیتا تو نہ کوئی اعتراض کرتا اور نہ ہی الٰہی غرض فوت ہوتی اور نہ ہی حکمت الٰہی کے خلاف ہوتا ۔

جی ہاں بعض حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ جب انبیاء علیہم السلام کی دعوت حق ہے اور ان کی تعلیمات انسان کی عقل اور فطرت کے موافق ہے تو ایسی صورت میں جیسے ہی وہ لوگوں کے درمیان سے مبعوث کئے گئے اور انھوں نے حق باتیں بیان کیں لوگوں کو قبول کرلیناچاہئے اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے کہ لوگ محسوس کریں کہ یہ باتیں غیب کے ذریعہ غیر معمولی ذرائع سے پہنچی ہیں۔فرض کیجئے کہ کوئی شخص پیغمبر کی نبوت پر اعتقادنہیں رکھتا لیکن اس کی تعلیمات کے مطالب کو تسلیم کرتا ہے ۔

پیغمبر کہتا ہے : سچ بولو

وہ کہتا ہے: ہاں سچ بولنا اچھی بات ہے ہم یہ بسر وچشم قبول کرتے ہیں ہمیشہ سچ بولیں گے۔

پیغمبر نے کہا: اپنی لڑکیوں کو قتل نہ کرو۔

وہ کہتا ہے: ہاں صحیح ہے۔ اپنے بچوں کو قتل نہیں کرنا چاہیئے۔

پیغمبر کہتا ہے: خدا کے سامنے سر جھکائو۔

وہ کہتا ہے: بالکل ٹھیک ہے۔ خداوند عالم نے ہم سب کو پیدا کیا ہے اس کے بدلے ہم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے ہم اس کی پرستش کرنے کو تیار ہیں۔

پیغمبر نے کہا: روزہ رکھو۔

وہ کہتا ہے: ہاں روزہ صحت وتندرستی کے لئے مفید ہے۔ پوری رضا و رغبت کے ساتھ ہم روزہ رکھیں گے۔

بنا براین چونکہ انبیاء علیہم السلام کے تمام دستورات و احکامات عقل اور فطرت کے مطابق ہیں اور لوگ ان کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کے سامنے غیر معمولی افعال انجام دینے کی ضرورت کیا ہے؟

گویا معترض یہ کہنا چاہتا ہے کہ بالفرض معجزہ کا امکان پایا بھی جاتا ہو تو اس کی ضرورت کیا ہے؟ معجزہ ممکن ہونے کی صورت میں خدا نے کسی کو معجزہ دیدیا ہو تو یہ اس پر خداوند عالم کا فضل واحسان ہے ورنہ اتمام حجت معجزہ پر موقوف نہیں ہے۔

جواب: اس طرح سے سوچنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت عقل وفطرت کے موافق ہے لیکن کیا تمام انسان تمام صورتوں میں اس مطابقت کو سمجھتے یا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں؟

اگر تمام صورتوں میں تمام انسان اس قدر آسانی سے عقل وفطرت کی تعلیمات کو سمجھ لیا کرتے تو پھر پیغمبر کو مبعوث کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی لوگوں کی ہدایت کے لئے عقل ہی کافی ہوتی ہاں کچھ کلیات ہیں مستقلات عقلیہ جو عقل کے نزدیک مسلمات میں شمار ہوتے ہیں اور اس سے ملتی جلتی چیزیں موجود ہیں جن کو آسان دلیلوں کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے اور کسی حد تک عقل درک کرتی ہے جیسے:

(وَزِ نُوْا بِالْقِسْطَا سِ الْمُسْتَقِيْمِ ذَ الِکَ خَیْرٌوَاَحْسَنُ تَاوِیْلاً)

"اور جب کچھ بیچنا ہوتو با لکل صحیح ترازو سے تو لا کرو (ہر گز کم نہ تولنا)یہی(طریقہ)بہتر ہے اور انجام (بھی اسکا)اچھا ہے"۔

اس کو توتمام لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کی دعوتِ تبلیغ میں سب کچھ اس کے مثل نہیں ہے در اصل نبیونکو مبعوث کرنے کی ضرورت بھی اس لئے پیش آئی کہ جن چیزوں کو عقل نہیں سمجھتی انبیاء علیہم السلام ان چیزوں کو انسانوں کو سمجھائیں اللہ کے احکام کا فطرت کے مطابق ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام انسان اس مطابقت کو خود درک کر لیں گے مثال کے طور پرکیا تمام لوگ بذات خودیہ سمجھ سکتے ہیں کہ صبح کی نماز دو رکعت کیوں ہے ؟نہیں ایسا نہیں ہے اگر ہم ساٹھ سال تک بھی اپنے ذہن پر زور ڈالتے رہیں آخر تک ہم نہیں سمجھ سکتے کہ صبح کی نماز کیوں دو رکعت ہے ؟ اور کس دلیل کے تحت صبح کی تین رکعت نماز پڑھنا باطل ہے ؟اور اس کے بر عکس مغرب کی نماز تین رکعت کیوں ہے ؟ اس چیز کو عقل نہیں سمجھ سکتی اس بنا پر انبیاء علیہم السلام کی ہربات کو تمام لوگ عقلی طورپر نہیں سمجھ سکتے لہٰذا ان کو لا محالہ حکم خدا کے طور پر سمجھنا ہوگا انبیاء علیہم السلام کی دعوت تبلیغ میں بہت سی باتیں جو سمائی ہوئی ہیں اسی طرح کی ہیںاور انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کرنے کی اصل ضرورت یہی تھی کہ جن چیزوں کو لوگوں کی عقل درک نہیں کرتی وہ آکر ان کو سمجھائیں۔اس طرح کی چیزوں کو تمام لوگ اپنی عقل کی روشنی میں کیسے تسلیم کرسکتے ہیں؟ہاں ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کے ہماری عقل اس چیز کو محسوس کرتی ہے کہ اگر اس نے انبیاء علیہم السلام کے حکم پر عمل کیا تو اس کے بدلے میں جو انھوں نے وعدہ کئے ہیں اور ثواب وعذاب کے جو احتمالات ہیں ان میں ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے لیکن احتیاط کا مسئلہ اس سے الگ ہے کہ عقل اس کے وجود کو اس طرح سمجھ لے کہ صحیح معنی میں اس کے لئے حجت تمام ہوجائے کہ اگر یہ کام انجام نہ دیا تو یقینا مواخذہ کیا جائے گا اس کو عقل نہیں سمجھ سکتی ۔

بنا بر این تمام لوگوں پر انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ خدا کی حجت تمام ہو جانے کے لئے خدا کی ایک ایسی نشانی کا ہونا ضروری ہے اگر وہ نشانی نہ ہو تو تمام لوگوں پر خدا کی حجت تمام نہ ہو۔کیونکہ بہت سے مسائل ایسے ہیںکہ جن کا صحیح ہونا عقل بشر درک نہیں کرسکتی اور اس کے لئے خدا کی حجت تمام نہیں ہوتی ۔

نتیجہ کے طور پر انبیاء علیہم السلام کی تمام دعوت ِتبلیغ لوگوں کے لئے ثابت اور لازم ہونے اور ان پر حجت تمام ہوجانے کے لئے ضروری ہے کہ پیغمبر کی نبوت کو وہ سمجھ لیں اور پیغمبر کو سمجھنا اس چیز پر موقوف ہے کہ ان کے پاس نبوت کی کوئی نشانی ہو اور وہ نشانی خدا کی طرف سے ہو جو عام طور پر لوگوں میں نظر نہ آتی ہو۔جب لوگ پیغمبر کے پاس اس طرح کی کسی نشانی کا مشاہدہ کریں گے تو فوراَ سمجھ جائیں گے کہ جس وحی کا یہ پیغمبر ادّعا کررہا ہے وہ بھی خدا کی طرف سے ہی ہو جیسے تمام عقلاء اپنی زندگی میں اپنی نشانیاں کام میں لاتے ہیں ۔اگر کوئی شخص آپ کے پاس آکر یہ کہے کہ (میں آپ کے پاس فلاں شخص کا یہ پیغام لیکر حاضر ہوا ہوں کہ آپ فلاں چیز مجھکو دیدیجئے)

توآپ اس سے یہی سوال کریں گے کہ :آپ کے پاس فلاں شخص کے پاس سے آنے کا کیا ثبوت ہے ؟

اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا کوئی خط یا کوئی نشانی ہونا چاہیئے یا وہ کوئی ایسی چیز جانتا ہو جسکا اس شخص کے علاوہ اور کسی کو علم نہ ہو یا اس پیغام رساں کے ہاتھ میں کوئی ایسی چیز ہو جو فلاں شخص سے مخصوص ہو اگر اس طرح کا کوئی ثبوت پیغام بر کے پاس مل جا ئے تو ظاہر ہے کہ اس کا فلاں شخص سے رابطہ ثابت ہو جائیگا ۔بہر حال نشانی طلب کرنے کا مقصد پیغام کی صداقت کا پتہ چلانا ہے لیکن اگر پیغام بر کے پاس کوئی ثبوت نہ ہو تو پیغام رساں کے پیغام کو قبول کرنا لازم نہیں ہے حتی کہ اگر آپ نے امانت اس کے سپرد کردی تو خود اس کے ذمہ دار ہوں گے ۔خدا جب پیغمبر کو لوگوں کے درمیان مبعوث کرتا ہے تو وہ لوگوں سے جان، مال ،افکار،عقائد اور ایک لفظ میں پوری ہستی کا طالب ہوتا ہے ۔یہ سب خدا کے اموال ہیں جو انسانوں کے پاس امانت کے طور پر ہیں اب اگر کوئی شخص آکر یہ کہے کہ یہ سب کچھ مجھے دیدو اپنی جان فلاں جگہ قربان کردو اپنا مال فلاں جگہ خرچ کردو کیونکہ یہ سب خدا کی امانتیں ہیں تو جب تک ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ شخص خدا کا پیغمبر ہے ہم اس کو یہ چیزیں دینے کا حق نہیں رکھتے ۔ اسی لئے نبی کے پاس کوئی الٰہی نشانی ہونا چاہئے اور یہ ایک فطری امر بھی ہے اور اسی لئے قرآن کریم میں بہت سی قوموں سے نقل ہوا ہے کہ جب ان کے درمیان انبیاء علیہم السلام مبعوث کئے جاتے تھے تو وہ ان سے نبوّت کی نشانی کا مطالبہ کیا کرتے تھے :

(فَأْتِ بِآيَةٍ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ)[1]

"اگر آپ سچّے ہیں اور خدا کے نبی ہیں تو آپ کے پاس کوئی نشانی ہونا چاہئے"۔

اس بناء پر انبیاء علیہم السلام کا صاحب اعجاز ہونا ضروری ہے 'جب تک ان کے پاس نبوّت کی نشانی نہ ہو اسوقت تک لوگوںپر حجت تمام نہیںہو سکتی ؟

4۔ اب سوال یہ ہے کہ: کیا تمام انبیاء علیہم السلام صاحب معجزہ تھے یا معجزہ بعض انبیاء علیہم السلام سے مخصوص تھا ؟

تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ پھر تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت ِتبلیغ کیسے قابل تسلیم ہوگی اور لوگو ں پر کیسے حجت تمام ہوگی؟

ہمیں ان سوالات کا کہیں عقلی اعتبار سے اور کہیں قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں جائزہ لینا چاہئے ۔

ابتک ہماری بحث عقلی تھی ۔ہم اجمالی طور پر پہلے عرض کئے دیتے ہیں کہ کوئی ایسی آیت کہ جس میں صاف طور پر یہ بیان کیا گیا ہو کہ ہر پیغمبر صاحب معجزہ تھا ہم کو قرآن ِکریم میں نہیں مل سکی اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام صاحب اعجاز نہیں تھے اس لئے کہ (دلیل کا نہ ملنا وجود کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے) 24 یا 25 انبیاء علیہم السلام کے علاوہ بقیہ انبیاء علیہم السلام کے نام کا قرآن میں کوئی تذکرہ نہیں ہے جبکہ نبی ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں تو بقیہ انبیاء علیہم السلام کے اسمائے گرامی کا قرآن میں ذکر کیوں نہیںآیا ؟اس سے بڑھکر یہ کہ قرآن کریم میں جن انبیاء کا ذکر ہے ان کی تمام خصوصیات کا بیان ہوا ہو، لازم نہیں ہے ۔کچھ کو صاحب ِمعجزہ کہا ہے اور کچھ کے بارے میں صاحبِ اعجاز ہونے کا بیان نہیں ہے ۔ معلوم ہوا کہ صرف قرآن کا بیان نہ کرنا ان کے صاحب معجزہ نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ عقلی طور پر ہر پیغمبر کا صاحب اعجاز ہونا ثابت کرسکتے ہیں ؟ یا نہیں ۔ ممکن ہے، کچھ انبیاء علیہم السلام صاحب معجزہ نہ ہوں اور اس میں عقلی طور پر کوئی حرج بھی نہ ہو ، نبوّت کی ضرورت پر ہماری دلیل یہ تھی کہ اگر معجزہ نہ ہوگا تو لوگو ں پر حجت تمام نہیں ہوگی۔یہ دلیل آیا تمام انبیاء علیہم السلام کے لئے ہے یا نہیں ؟ فرض کیجئے کہ ایک نبی آیا اور معجزہ بھی ساتھ لایا اور ثابت ہوگیا کہ وہ نبی ہے اب اپنے بعد والے پیغمبر کا وہ تعارف کرائے اور کہے کہ میں دنیا سے جانے والا ہوں میرے بعد فلاں شخص نبی ہے، توکیا اس آنے والے

1۔ سورۂ شعراء آیت 154۔

پیغمبر کے لئے بھی معجزہ پیش کرنے کی ضرورت ہے؟ بظاہر اس کو معجزہ دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ جس طرح اس سے پہلے نبی کی نبوّت ثابت ہوئی تھی جو کچھ بھی وہ خدا کی طرف سے بھیجے جانے کا ادّعا کرے گا اس کا صحیح ہونا ثابت ہو گا اگر نبی ہونا، جو کچھ اس پر وحی ہوئی ہے خدا کی طرف سے قبول کئے بغیر ہو تو معجزہ کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس لئے کہ معجزہ جو کچھ خداوند عالم نے اس پر نازل کیا ہے اس کی حقّانیت کی نشانی کے طور پر ہی پیش کیا جاتا ہے (اب اگر فرض کیجئے کہ بعض چیزیں وہ اپنی طرف سے بیان کرتا ہے تو ان کا اتّباع ضروری ہے یا نہیں؟ یہ دوسرا مسئلہ ہے لیکن اس حد تک یقینی ہے کہ جو باتیں وہ خدا کی طرف سے ہونے کا ادّعا کر رہا ہے ان کو تسلیم کرنا چاہئے اور حجت تمام ہے ورنہ ہر لفظ کے لئے تو معجزہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر اگر ایک پیغمبر خدا کی طرف سے معجزے لیکر آئے اور وہ یہ اعلان کرے کہ میں خدا کی طرف سے تمہارے درمیان بھیجا گیا ہوں اور لوگ بھی سمجھ جائیں کہ اس کا خداوند عالم سے ارتباط ہے تو اس صورت میں اگر وہ پیغمبر اگلے دن کہتا ہے کہ فلاں حکم خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے تو اس کو مان لینا چاہئے اب ہر حکم کے لئے تو وہ معجزہ پیش نہیں کرے گا اسی طرح اگر اپنے بعد خدا کی طرف سے آنے والے کسی پیغمبر کا تعارف کرائے تو کیا عقل کی رو سے بعد میں آنے والے پیغمبر کا بھی صاحب معجزہ ہونا ضروری ہے؟

معلوم ہوا کہ بعض حالات میں بغیر معجزہ کے بھی لوگوں کے لئے حجت تمام ہو جانا ممکن ہے اگرچہ یہ حجت بھی در اصل کسی سابقہ معجزہ پر ہی قائم ہے کیونکہ اس سے پہلے کے نبی کی نبوّت معجزہ کے ذریعہ ثابت تھی اور اسی کے توسّط سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی نبوّت کا اثبات ممکن ہوا ہے یا ایک ہی وقت میں کئی انبیاء علیہم السلام ہی ہوئے ہیں ان میں سے کسی ایک کا صاحب معجزہ ہونا کافی ہے اب وہی اگر دوسرے انبیاء علیہم السلام کی بھی تصدیق فرمادے تو ان کی نبوّت ثابت ہو جائیگی۔ حضرت لوط اور حضرت ابراہیم علیہما السلام ایک ہی زمانہ میں تھے اور دونوں پیغمبر بھی تھے جب حضرت ابراہیم کی نبوّت ثابت ہو گئی اگر آپ یہ فرمادیں کہ حضرت لوط علیہ السلام بھی پیغمبر ہیں تو لوگوں پر حجت تمام ہوجائیگی اور الگ سے ان کو معجزہ دکھلانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ یا یہ آیت جس میں خدا فرماتا ہے:

(اِ ذْاَرْسَلْنَا اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا) [1]

"اس طرح کہ ہم نے دو رسولوں کو بھیجا تو ان لوگوں نے جھٹلادیا"۔

توجیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ ان دو آدمیوں کو حضرت عیسی بن مریم نے بھیجا تھا چنانچہ حضرت عیسیٰ کی نبوّت ہی دلیل کے لئے کافی تھی اور آیت میں بھی یہ نہیں ہے کہ ان دونوں نے کوئی معجزہ پیش کیا ہو البتّہ یہ ان کے

1۔ سورۂ یس آیت14۔

صاحب اعجاز نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے ۔ ممکن ہے وہ معجزہ لیکر آئے ہوں لیکن آیت میں بیان نہ کیا گیا ہو لیکن اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوّت ثابت تھی اور آپ ہی نے ان دونوں حضرات کا پیغمبر کے عنوان سے تعارف کرایا تھا تو ان کی نبوّت بھی (کوئی مخصوص معجزہ پیش کئے بغیر) ثابت ہو جائیگی اور لوگوں پر حتی آئندہ نسلوں کے لئے بھی حجت تمام ہو جائیگی یعنی جب گزشتہ انبیاء علیہم السلام اپنے بعد آنے والے کسی نبی کا اس طرح تعارف کرائیں کہ مثلاً سو سال بعد ایک نبی آئیگا اور اس کی خصوصیات کو اس طرح بیان فرمادیں کہ کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہ جائے تو کیا پھر بھی اس نبی کو معجزہ پیش کرنے کی کوئی ضرورت ہے ؟جی نہیں !اگر گزشتہ نبی کی نبوّت ثابت ہو چکی تھی اور جن افراد کے درمیان اس کو بھیجا جانا تھا ان تک یہ خبر پہنچ چکی تھی اور اس کے خصوصیات بھی اس طرح بیان کردئے گئے تھے کہ ان میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی تو پھر اس آنے والے نبی کے لئے اپنی نبوّت کی دلیل میں معجزہ دکھلانے کی ضرورت نہیں رہ جائیگی ۔ہاں اگر وہ ان افراد کے درمیان بھیجا گیا ہو کہ جن پر گزشتہ نبی کی نبوّت ثابت نہ ہو اور اس کا معجزہ اور اس کی خبر ان تک نہ پہنچی ہو تو یہ لوگ معجزے کے مطالبہ کا حق رکھتے ہیں، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ نے حضرت محمّد مصطفیٰ ﷺ کے آنے کی خبر پہلے سے دیدی تھی ۔چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی خصوصیات انھوںنے اس طرح بیان کردی تھیں :

(يَعْرِفُوْنَهُ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبنائَهُم ۚ)[1]

"وہ جس طرح اپنے بچوں کو پہچانتے تھے (اسی طرح) وہ پیغمبر کو بھی جانتے اور پہچانتے تھے"۔

(وَكَانُوْامِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا)[2]

"اور ان کے مبعوث ہونے سے پہلے بشارت دیا کرتے تھے کہ یہ پیغمبر آنے والا ہے اور ہمارے دین کی تائید کرنے والا ہے"۔

تو کیا اس طرح کے لوگوں کو حق ہے کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوّت ثابت نہ ہونے اور ان پر حجت تمام نہ ہونے کی بات کریں ؟ہاں جن لوگوں کے لئے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی نبوّت ثابت نہیں تھی تو ظاہر ہے حضرت رسول خدا کی نبوّت بھی ثابت نہیں ہوگی یا گزشتہ انبیاء علیہم السلام نے جو بشارتیں دی تھیں ان تک نہ پہنچی ہوں تو ان کے لئے حجت تمام نہ ہوگی ۔جہاں تک یہودیوں اور عیسائیوں کا سوال ہے (خاص طور پر جو آپ کے

1۔ سورۂ بقرہ آیت146۔

2۔ سورۂ بقرہ آیت 89۔

اوصاف سے پوری وضاحت کے ساتھ آگاہ تھے) حجت تمام ہو چکی تھی اور نبی اکرم ﷺ کو ان کے سامنے معجزہ پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

معلوم ہوا لوگوں کے لئے کسی نبی کی نبوّت معجزہ کے بغیر بھی صرف دوسرے انبیاء علیہم السلام کی بشارتوں اور پیشین گوئیوں کے ذریعہ ثابت ہو جانا ممکن ہے۔ لہذا ہر پیغمبر کے لئے یقینی طور پر معجزہ ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں پائی جاتی۔ عقل صرف اتنا کہتی ہے کہ جہاں (تمام حجت معجزہ پر ہی موقوف ہو معجزہ کا پیش کرنا ضروری ہے لیکن اس کو تمام انبیاء علیہم السلام کے لئے کلیہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

معجزہ قرآن کی روشنی میں

ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں کہ عقلی طور پر یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ لوگوں پر حجت تمام کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام کے پاس خدا کی طرف سے کوئی نشانی ہونی چاہیئے اسی لئے کہتے ہیں کہ پیغمبر کے لئے صاحب ِ معجزہ ہونا ضروری ہے ،جب تک اتمام حجت معجزہ پر موقوف ہو پیغمبر کا صاحبِ اعجاز ہونا یقینا ضروری ہے لیکن اگر اتمام حجت معجزہ پر موقوف نہ ہو تو پھر معجزہ کی ضرورت پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے لہٰذا اجمالی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ انبیاء کو صاحبِ اعجاز ہونا چاہیے۔آئیے اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ معجزہ کے بارے میں قرآن کیا فرماتا ہے ؟

سب سے پہلی بات تو یہ کہ جس معنی میں ہم لفظِ معجزہ کا استعمال کرتے ہیں قرآن میں استعمال نہیں ہوا ہے ، قرآن میںلفظ معجزہ یقینی طور پر کہیں نہیں آیا ہے لیکن اس سے ملتے جلتے الفاظ مثلاً لفظ (معجز) آیا ہے لیکن جس معنی میں ہم استعمال کرتے ہیں اس سے وہ معنی مراد نہیں، قرآن میں معجزہ کے بجائے کلمہ (آیت) استعمال ہوا ہے یعنی قرآن میںبہت سے مقامات پر کلمہ (آیت) سے مراد معجزہ ہے۔قرآنی مفہوم سے آشنائی اور لفظ (آیت) کے استعمال کی جگہ جاننے کے لئے کہ کن مقامات پر کلمہ (آیت) معجزہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ہم قرآن میں لفظ آیت کے استعمال کے بارے میں تھوڑی سی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں:

آیت

لغت میںآیت علامت پہچان اور نشانی کو کہتے ہیںخواہ وہ نشانی قابلِ مشاہدہ ہو یعنی آنکھوں میں سما جانے والی ،پُر کشش اور جاذب نظر ہو اور کسی بات کی علامت یا نشانی ہو خواہ وہ نشانی عقلی ہو۔قرآن کی زبان میں دنیا کے تمام موجودات اللہ کی نشا نیا ں ہیں۔یعنی ان کے بارے میں غور وفکر کرنے سے انسان خداوند عالم کی ذات اور اس کے صفات علم ، قدرت، حکمت اور عظمت وغیرہ کی طرف متوجّہ ہوجاتا ہے اور ایک ذرا سی گہری نظر کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ ہر چیز کا وجود "آیت" ہے۔ کیونکہ وجود ایک رابطہ ہے اور اگر اس کو صحیح طور سے محسوس کیا جائے تو اس کے پرتو میں واجب الوجود خدا کا وجود مشاہدہ کیا جاسکتا ہے دوسرے لفظوں میں چونکہ تمام مخلوقات میں خدا کا جلوہ ہے جو لوگ باطنی بصیرت کے حامل ہیں اور جن کی نگاہوں میں معرفت کی روشنی ہے ان جلووں کے پس منظر میں متجلّی صاحبِ جلوہ کا دیدار کر سکتے ہیں لیکن ظاہر ہے سب کی آنکھوں میں اتنا دم کہاں ہو سکتا ہے، حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں :

(مارأيتُ شيئاالا ورايت اللہ قبلہ)

"میں نے کوئی شئے نہیں دیکھی مگر یہ کہ اس سے پہلے اللہ کا نظارہ کرلیا"۔

قرآن میں کلمہ آیت کے استعمال کے مقامات

آیت کے اس گہرے عرفانی مفہوم سے قطع نظر "آیت" کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ انسان اس کے بارے میں سوچتا ہے، اس میں ایک اور وجود کا مشاہدہ کرتا ہے کہ یہ اسی کی ایک نشانی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

(وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِيْ السَّمٰوٰتِ وَا لْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَاوَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ)[1]

"آسمانوں اور زمین میں کس قدر نشانیاں ہیں جن سے یہ لوگ گذرتے ہیں اور ان سے منھ پھیرے رہتے ہیں"۔

یعنی اگر ان موجودات میں ایک ایک کے بارے میں غور وفکر کریں تو خدا کے وجود اور اس کی صفات تک پہنچ جائینگے لیکن توجّہ نہیں کرتے، منھ موڑ کر گذر جاتے ہیں۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

(وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا وَهُمْ عَنْ آيَا تِهَا مُعْرِضُوْنَ)[2]

"اور ہم ہی نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا پھر بھی یہ (کافر) لوگ اس کی نشانیوں سے منھ پھیرے ہوئے ہیں)"۔

یعنی کائنات اور اس کی فضائوں میں پھیلی موجودات کے بارے میں غور و خوض نہیں کرتے کہ ان موجودات کے پرتو میں ان کو پیدا کرنے اور قائم وباقی رکھنے والے پروردگار کو دیکھ سکیں اور اس کی معرفت حاصل کریں۔

اسی طرح بہت سی آیات میں خداوند عالم نے کائنات کی موجودات کا ذکر کیا ہے اور ان آیات کے ذیل میں

1۔ سورئہ یوسف آیت 105۔

2۔ سورئہ انبیاء آیت 32۔

کہا ہے:

(اِنَّ فِیْ ذَا لِکَ لَآ یَا تٍ لِقَوْ مٍ یَتَفَکَّرُ وْ ن) (َ، (یعۡقِلُوۡنَ ،یُوْ مِنُوْ نَ))

"یعنی اہل فکر، اہل عقل اور اہل ایمان کے لئے ان میں (اللہ کی) نشانیاں ہیں"۔

لہذا اس معنی میں لفظ آیت کا تمام موجودات اور مخلوقاتِ خدا پر اطلاق ہوتا ہے۔

کبھی قرآن نے ان میں سے موجودات کو خاص طور پر توجہ کا مرکز قرار دیا ہے اور لوگوں کو ان پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے اور ان سے مخصوص نتائج نکالے اور پیش کئے ہیں چنانچہ سورۂ یس میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَآیَۃ لَھُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَۃُ اَحْیَیْنَا ھَاوَاَخْرَجْنَاھَامِنْھَاحَبّاًفَمِنْہُ یَاکُلُوْنَ)[1]

"اور ہماری قدرت کی ایک دلیل یہ ہے کہ ہم مردہ زمین زندہ کردیتے اور اس سے دانہ اُگاتے ہیںپس اسے یہ لوگ کھایا کرتے ہیں"۔اسی سورے کی ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

(وآیَۃ لَّھُمُ اللَّیْلُ نَسْلَخُ مِنْہُ النَّھارَ فَاِذَاھُمْ مُّظْلِمُوْنَ)[2]

"اور ان کے لئے ایک اور دلیل رات ہے جس سے ہم دن (کا اُجالا) کھینچ لیتے ہیں تو اس وقت یہ لوگ اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں"۔

پھر ایک اور آیت میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

(وَآیَۃ لَّھُمْ اَنَّاحَمَلْنَاذُرِّیَّتَھُمْ فِی الفُلْکِ المَشْحُوْنِ)[3]

" اور ان کے لئے (میری قدرت کی) ایک اور دلیل یہ ہے کہ ان کے بچوں کو (انبار سے) لدی ہوئی کشتی میں سوار کردیا"

یا سورۂ روم میں مخصوص موجودات کو بنیاد قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

(وَمن آیاَته کَذَا 000وَمن آیا ته کَذَا)[4]

1۔ سورۂ یس آیت33۔

2۔ سورۂ یس آیت 37 ۔

3۔ سورۂ یس آیت41۔

4۔ سورۂ روم آیت24،21۔

وہ موجودات کہ جن کے بارے میں اگر انسان فکر کرے تو فوراً پروردگار عالم کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے ۔ معلوم ہوا کہ مندرجہ بالا تمام آیات میں جو لفظ "آیت" یا "آیات" کا استعمال ہوا ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی یہ تمام موجودات خداوند عالم کی نشاندہی کرتی ہیں یا یہ کہ وہ خدا کی نشانی ہیں ۔

"آیت" کے مصادیق میں آیات تشریعی (یعنی قرآنی آیات) کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن مفہوم کے اعتبار سے اُن میں فرق نہیں ہے کیونکہ دونوں کے ایک ہی معنی "نشانی" ہیں ۔جی ہاں جو باتیں انبیاء علیہم السلام پر خداوند عالم کی جانب سے وحی کی صورت میں نازل ہوئی ہیں ان کو بھی قرآن نے آیت کہا ہے اس لئے کہ کلام متکلم کی نشاندہی کرتا ہے ۔کلام کی خصوصیتیں متکلم کی خصوصیات بتاتی ہیں یہی وجہ ہے اس نے انبیاء علیہم السلام پر جو باتیں وحی فرمائی ہیں ان کو اپنی آیات کہا ہے ۔قرآن میں ارشاد خداوندی ہے :

(هُوَالَّذی اَنزَلَ عَلَیکَ الکتَا ب منهُ آیات مُّحکَمَات هُنّ اُمُّ الکتَاب وَاُخَرُ مُتَشَابِهَا ت)[1]

"(اے رسول)وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب نازل کی اس میں کی بعض آیتیں محکمات (صاف و صریح) ہیں جو تمام آیات کے لئے اصل و بنیاد ہیں اور بقیہ (آیتیں) متشابہ ہیں"۔

ظاہر ہے یہاں آیت سے مراد موجوداتِ عالم نہیں ہیں بلکہ قرآن کریم کی یہی تلاوت کی جانے والی آیات مراد ہیں ۔

سورۂ بقرہ (آیت252) اور سورۂ آل عمران (آیت 108) میں اسی کی طرف اشارہ ہے:

(تِلْکَ آیَاتُ اللّهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ)[2]

"اے رسول) یہ خدا کی آیتیں ہیں جو ہم حق کے ساتھ آپ پر تلاوت کر رہے ہیں"۔

یہ آیت مکمل طور پر دلالت کرتی ہیں کہ (آیت) سے مراد کوئی تلاوت کی جانے والی چیز ہے اور ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں قرآن کے جملوں کو آیت کہا گیا ہے ۔ سورۂ یوسف کی پہلی اور سورۂ شعراء نیز سورۂ قصص کی دوسری آیت میں آیا ہے :

(تِلْکَ آیَاتُ الْکِتَابِ الْمُبِیْنِ)[3]

1۔ سورۂ آل عمران آیت 7۔

2۔ سورۂ بقرہ آیت 252۔ اور سورۂ آل عمران آیت108۔

3۔ سورۂ یوسف آیت1۔

"کتاب خدا کی آیتیں ہیں جو حقائق کو آشکار کرتی ہیں"۔

اور (وَكَذَ الِكَ اَنزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ)

"اور ہم نے اس (قرآن) کو یونہی روشنی بخش آیات کی صورت میں نازل کیا"۔

قرآن میں اس طرح کی تعبیریں بہت زیادہ ہیں اور سیکڑوں مقامات ایسے ہیں کہ جہاں پر قرآن کے بعض ٹکڑوں کو آیت یا آیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں لفظ آیت کے ان دونوں طرح کے استعمال کے پیش نظر قرآن کریم میں ذکر (آیات الٰہی) کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1۔تکوینی یا قدرتی آیات۔

2۔تشریعی یا قرآنی آیات۔

تشریعی آیات سے مراد خداوند عالم کا کلام ہے اور تکوینی آیات سے مراد خداوند عالم کی مخلوقات ہیں لیکن بعض مقامات پر لفظ آیت خاص معنی میں استعمال ہوا ہے اور وہ ان مخلوقات کے لئے ہے جو عام علل و اسباب کے ذریعہ وجود میں نہیں آئی ہیں کیونکہ وہ اپنے پیدا کرنے والے پر ذرا واضح انداز میں دلالت کرتی ہیں، موجودات عام علل و اسباب کے ذریعہ وجود پاتے ہیں انسان ان سے بہت زیادہ مانوس ہو جانے کی وجہ سے ان کے پیدا کرنے والے کی طرف توجہ نہیں دیتا لیکن جب کوئی وجود غیر معمولی طریقہ سے وجود پاتا ہے تو وہ سب کی نظروں کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔اس وقت ذہن اپنی عام کیفیت سے نکل آتا ہے اور ایک جھٹکا سا محسوس کرتا ہے۔معلوم ہوا یہ معنای مخصوص یا خاص مقامات غیر معمولی مخلوقات کی تخلیق یا واقعات سے تعلق رکھتے ہیں۔اس بارے میں ہم قرآن سے نمونہ کے طور پر چند مقامات بیان کر دیتے ہیں:

حضرت طالوت کی داستان میں جس وقت بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے اپنے پیغمبر سے بھیمطالبہ کیا کہ ان کے لئے ایک فرشتہ معین کریں اور انھوں نے خدا کی طرف سے حضرت طالوت کو معین فرمادیا تو انھوں نے کہا:

(اَنّٰی يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا)[1]

"یہ ہم پر حکومت کی لیاقت نہیں رکھتے"۔

1۔ سورۂ بقرہ آیت 247۔

ان کا حسب ونسب ہماری طرح نہیں ہے، ان کے پاس ہماری طرح دولت بھی نہیں ہے وغیرہ وغیرہ اور خدا کے نبی نے ان کے جواب میں اس آیت کی تلاوت فرمائی:

(اِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ اَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيهِ سَكِيْنَة مِّنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّة مِمَّا تَرَکَ آلُ مُوْسَىٰ وَآلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰئِكَةُ)[1]

"اس کے بادشاہ ہونے کی پہچان یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائیگا جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تسکین کی چیزیں اور وہ تبرّکات ہوں گے جو موسی اور ہارون کی اولاد چھوڑ گئی ہے اور صندوق کو فرشتے اٹھائے ہوں گے"۔

یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے لشکر روانہ ہوتا ہے اور ایک صندوق خود بخود ان کے آگے آگے چلنے لگتا ہے تو یہ اس چیز کی علامت ہے کہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے اور خداوند عالم نے ملائکہ کے ذریعہ اس کام کو انجام دیا ہے۔

اسی طرح ایک اور پیغمبر کی داستان میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

(اَوْكَالَّذِىْ مَرَّعَلٰى قَرْيَةٍ وَهِىَ خَاوِيَةعَلٰى عُرُوْشِهَاقَالَ اَنّٰى يُحْيِ هٰذِ هِ اللّٰهُ بَعدَ مَوْتِهَافَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْماًاَوْبَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَا مِکَ وَشَرَابِکَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ اِلٰى حِمارِکَ و لِنَجْعَلَکَ ء ايَةً لِلنَّاس وَانْظُرْ اِلىَ العِظَامِ كَيفَ نُنْشِزُهَاثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْماً فَلَمَّاتَبَيَّنَ لَهُ قَالَ اَعلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيءٍ قَدِيْر)[2]

"یا اس بندے کی مانند جو ایک گائوں سے گذرا اور وہ گائوں ایسا اجڑا تھا کہ اس کی چھتیں اپنی بنیاد سے ڈھ گئی تھیں یہ دیکھ کر وہ بندہ کہنے لگا اللہ اب اس آبادی کو ان کی موت کے بعد کیونکر زندہ کرے گا خدا نے اُس (بندہ) کو سو سال تک موت کی نیند سُلا دیا اور پھر انکو زندہ کر دیا (تب) پوچھا کتنی دیر یہاں پڑے رہے؟ عرض کی ایک دن یا ایک دن سے بھی کم (خدا نے) فرمایا نہیں تم سو سال سے یہاں پڑے ہو ذرا اپنے کھانے پینے (کی چیزوں) کو تو دیکھو بالکل نہیں بدلی ہیں اور اپنے گدھے پر نظر ڈالو (کہ اس کی ہڈیاں ڈھیر ہو گئی ہیں) ہم چاہتے ہیں کہ لوگوں کے لئے تمہیں عبرت کا نمونہ بنائیں اور (اب اس گدھے کی) ہڈیوں کو دیکھتے ہو کہ ہم کیونکر ان کو جوڑ کر ڈھانچا بناتے اور پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں پس جب ان پر خدا کی قدرت ظاہر ہو گئی تو بول اٹھے کہ میں جانتا ہونکہ بیشک خدا

1۔ سورۂ بقرہ آیت 248۔

2۔ سورۂ بقرہ آیت259۔

ہر چیز پر قادر ہے "۔

سو سال تک مردہ رہے دوبارہ زندہ ہوئے ان کی سواری کا گدھا بھی ہلاک ہو گیا اور خدا نے اس کو دوبارہ زندہ کیا اور خداوند عالم واقعے کے ذیل میں فرماتا ہے :

(وَلِنَجْعَلَکَ آیَةً لِلنَّاسِ)

"اور اللہ تم کو لوگوں کے لئے نشانی یا نمونہ بنانا چاہتا ہے"۔

یقینا تمام چیزیں اللہ کی نشانیاں ہیں لیکن غیر معمولی چیزوں کا ظاہر ہونا اپنی طرف زیادہ توجہ مرکوز کر لیتا ہے، اس وجہ سے اسکو خاص طور پر (آیت) کہا گیا ہے، اور اسی طرح کے مقامات پر لفظ آیت کا اطلاق اسی لئے ہے کہ اس کی دلالت زیادہ واضح ہے اور اپنی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ کھینچتی ہے۔

اسی طرح بنی اسرائیل کے دستر خوان کی داستان ہے، جب بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ خداوند عالم سے کہئے: ہمارے لئے نعمتوں سے بھرا خوان نازل کرے تو اسوقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آسمان کی طرف ہاتھوں کو اٹھا کر عرض کی تھی :

(اَللّٰھُمَّ رَبَّنَاآَنْزِلْ عَلَیْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَآئِ تَکُونُ لَنَاعِیْدًا لِاَوَّلِنَاوَآخِرِنَاوَآیَةً مِّنْکَ)[1]

"اے ہمارے پالنے والے ہم پر آسمان سے ایک خوان (نعمت) نازل فرما کہ وہ ہم لوگوں کے لئے ہمارے اگلوں اور پچھلو ں کے لئے بھی عیدی قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو"۔

چونکہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے لہٰذا آیت اور نشانی ہے خداوند عالم نے بھی دعا مستجاب کرتے ہوئے فرمایا جو شخص بھی اس آیت کے نازل ہونے کے بعد فرمان الٰہی سے گریز کرے گا اس پر عذاب نازل ہوگا علاوہ ازیں جن مقامات پر انبیاء علیہم السلام نے اپنی نبوت کی نشانی کے طور پر معجزات پیش کئے ہیں وہاں پر بھی لفظ "آیت" استعمال کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت صالح علیہ السلام نے پہاڑ کے دامن سے ناقہ نکالا ہے، فرمایا تھا :

(ھذہ نَاقَةُ اللہ آیَةَ)[2]

"یہ اللہ کا ناقہ تمہارے لئے واضح دلیل ہے"۔

1۔ سورۂ مائدہ آیت 114 ۔

2۔ سورۂ اعراف 73۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ کی ولادت بھی ایک غیر معمولی واقعہ تھا لہٰذا خداوند عالم نے فرمایا :

(وَ جَعَلنَا ابْنَ مَر یَمَ وَاُمَّهُ آ یَةً)[1]

"اور ہم نے مریم کے بیٹے اور ان کی ماں کو آیت قرار دیا"۔

ظاہر ہے یہاں پر لفظ آیت عام مخلوقات کے لئے استعمال کئے گئے لفظ آیت سے الگ ہے یہ مقام ایک خصوصیت رکھتا ہے۔کیونکہ عام طریقہ سے الگ یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے اور خداوند عالم نے معجزہ کے ذریعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا ہے لہٰذا اسکو (آیت) قرار دیا ہے ۔انبیاء علیہم السلام کے اور تمام معجزات کے بارے میں بھی لفظ آیات اور آیت کا استعمال ہو اہے مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے بارے میں خداوند عالم فرماتا ہے :

(وَلَقَد آ تَینَا مُوسیٰ تِسْعَ آیَاتٍ بَیّنَاتٍ)[2]

" ہم نے موسی کو نو معجزے بالکل واضح و آشکار عطا کردیئے "۔

البتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے علاوہ بھی معجزات اور کرامات عطا کی گئیں تھیں لیکن یہ معجزے نبوت کی نشانی اور دلیل کے طور پر تھے ۔وہ سب وہ کرامات تھیں جو آپ کی زندگی میں متعددمرتبہ بنی اسرائیل کے سامنے رونما ہوئیں اور وہ سب بھی ایک معنی میں معجزات ہی تھے لیکن جو چیزیں نبوت کی دلیل کے عنوان سے ابتداء میں آپ کو ملیں دو چیزیں تھیں ایک عصا اور دوسرے ید بیضاء اس کے بعد دوسرے سات معجزے ملے اور یہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خداوند عالم کی طرف سے نبوت کی دلیل کے طور پر عطا کئے گئے تھے ۔

حضرت رسول خدا ﷺ اور قرآن کے بارے میں بھی لفظ آیت کا استعمال ملتا ہے۔چنانچہ خداوندعالم کا ارشاد ہوتا ہے :

(اَوَلَم یَکُن لَّهُمْ آیَةً اَن یَعلَمَهُ عُلَمَائُ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ)[3]

"کیا یہ پہچان ان کے لئے کافی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء ان سے باخبر ہیں"۔

البتّہ یہاں پر لفظ "آیت " معجزہ کے معنی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ نشانی اور پہچان ہے جو لوگوں پر حجت تمام کرتی ہے ۔جب ان کو معلوم تھا کہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام نے ایک ایسے آنے والے نبی کی خبردی ہے۔ تو وہ

1۔ سورۂ مومنون آیت 50۔

2۔ سورۂ اسراء آیت 101 ۔

3۔ سورۂ شعراء آیت 197۔

گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی پیشینگوئیاں اور علماء بنی اسرائیل کا باخبر ہونا، صداقت کی نشانی اور پہچان ہے ۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے ایسے واقعات بھی رونما ہوئے کہ ان کے بارے میں بھی کلمہ آیت کا استعمال ہوا ہے :

(قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَة فِيْ فِئتَيْنِ الْتَقَتَافِئة تُقَاتِلُ فى سَبِيْلِ اللّهِ وَاُخْرٰى كَافِرَة يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْىَ العَيْنِ) [1]

"ان دونوں (کافر و مومن) جماعتوں میں یقینا تمہارے لئے عبرت اور نشانی تھی جو آپس میں گتھ گئیں تھیں ایک جماعت خدا کی راہ میں جہاد کر رہی تھی اور دوسرا کافروں کا گروہ تھا جن کی نگاہوں میں (مومنوں کا لشکر) دو گنا نظر آرہا تھا"۔

جب سپاہ اسلام کفار سے روبرو ہوئی تو اسوقت کرامات ظاہر ہوئیں منجملہ یہ کہ کفّار مسلمانوںکو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے اور اسی وجہ سے ان کے دل میں ڈرپیدا ہوگیا تھا اور ان کا جذبہ کمزور پڑگیا تھا جس نے ان کی شکست میں مدد کی یہ بھی ایک الٰہی (آیت)ہے ۔

گزشتہ قوموں پر خداوند عالم کی جانب سے نازل ہونے والے عذاب کو بھی آیات سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ استعمال بھی دو طرح کے ہیں : کبھی عذاب کا جو اثر باقی رہ جایا کرتا تھا اس اثر کو قرآن نے "آیت" قرار دیا ہے اور کبھی خود واقعہ کو قرآن نے "آیت" کہا ہے ۔ فرعون کے بارے میں قرآن فرماتا ہے :

(فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْکَ بِبَدَ نِکَ لِتَکُوْنَ لِمَنْ خَلْفَکَ آيَةً) [2]

"پس آج تیرے بدن کو ہم (تہ نشین ہونے سے) بچائیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لئے عبرت بن جائے"۔

فرعون کا دریا میں غرق ہونا بنی اسرائیل کے لئے اللہ کی مدد تھی لیکن خداوند عالم نے اس کے بعد فرعون کے بدن کو دریا کے باہر پھینک دیا تاکہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے یہ بدن باقی رہے اور اس چیز کی نشاندہی کرائے کہ خداوند عالم اپنے دشمنوں کو کس طرح نیست و نابود کرتا ہے :

(لِتَکُوْ نَ لِمن خلْفَکَ آيَةً)

"تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لئے عبرت بن جائے"۔

اسی طرح قرآن کریم میں جناب نوح اور ان کی قوم کے بارے میں فرماتا ہے :

1۔ سورۂ آل عمران آیت 13 ۔

2۔ سورۂ یونس آیت 92 ۔

(فَأنجَيْناهُ وَاَصْحَابَ السَّفِيْنَةِوَجَعَلْنَاهَا آيَةً لِلْعَالَمِيْنَ)[1]

"ہم نے ان کو اور کشتی میں سوار ان کے ساتھیوں کو نجات عطا کردی اور اس کشتی کو دنیا والوں کے لئے نشان عبرت بنا دیا"۔

اور اس آیت میں فرماتا ہے:

(وَلَقَد تَرَکناهَا آيَة فَهَل مِنْ مُدَّکِرٍ)[2]

"بیشک ہم نے اس (کشتی) کو نشانی بنا دیا ہے آیا کوئی نصیحت لینے والا ہے؟"۔

اور قوم لوط کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

(وَتَرَکناَ فيهَا آية للَذ ينَ يَخا فُو نَ العَذابَ الاليمَ)[3]

"اور اس سر زمین پر دردناک عذاب سے ڈرنے والوں کے لئے ایک نشانی چھوڑ دی"۔

اسی طرح سورۂ شعراء میں آٹھ مقامات پر گزشتہ قوموں پر نازل ہونے والے عذاب کے واقعات نقل ہوئے ہیں اور ان سب کے ذیل میں قرآن فرماتا ہے:

(اِنَّ فيِ ذالِکَ لَآيَة وَمَا کانَ اَکثَرهُم مُومِنِيْنَ)

"اس میں ہماری ایک نشانی ہے اور ان میں زیادہ تر لوگ مومن نہیں تھے"۔

یہ آٹھ کے آٹھ مقامات ان انتہائی پریشان کن عذاب کے بارے میں ہیں جو گزشتہ قوموں پر نازل ہوئے ہیں۔

مندرجہ بالا تمام مقامات پر لفظ "آیت" کے استعمال میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض وقت قرآن نے ایک غیر معمولی واقعہ کو بنیاد بنا کر اسے ایک "آیت" قرار دیا ہے اوریہی چیز ہماری بحث سے مربوط ہے یعنی قرآن کریم میں لفظ "آیت" کا معجزات کے لئے استعمال ہوا ہے اب اگر لفظ "آیت" مشترک معنوی بھی ہو تو بھی لفظ "آیت" کے محل استعمال میں سے ایک اس کا خاص طور سے معجزات کے معنی میں استعمال ہونا ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن میں "معجزہ" کی لفظ نہیں آئی ہے معجزہ کی جگہ مخصوص طور پر لفظ "آیت" کا استعمال ہوا ہے یہ سب کچھ ہم نے معجزہ کے مفہوم

1۔ عنکبوت آیت 15۔

2۔ سورۂ قمر آیت 15۔

3۔ سورۂ ذاریات آیت 37۔

کی وضاحت کے لئے عرض کر دیا کہ قرآن میںلفظ معجزہ کی جگہ مخصوص طور پر لفظ "آیت" کا استعمال ہو ا ہے البتہ ایسا ہر گز نہیں ہے کہ جہاں بھی لفظ "آیت" استعمال ہو ا ہو اس کا مطلب معجزہ ہی ہو ۔بلکہ مخصوص مقامات پر لفظ آیت معجزہ کے معنی میں بھی استعمال ہو ا ہے ۔

انبیاء علیہم السلام کے معجزات

کیا انبیاء علیہم السلام صاحب معجزہ تھے ؟قرآن اس بارے میں کیا فرماتا ہے ؟

بلا شبہ قرآن نے بہت سے مقامات پر کہا ہے کہ ہم نے انبیاء علیہم السلام کو معجزے عطا کئے ہیں ۔

البتہ بعض مقامات پر ظاہر بیان سے پتہ چلتا ہے کہ جب انبیا ء علیہم السلامبعوث ہوتے تھے اور اپنی قوم میں تبلیغ شروع کرتے تھے تو دعوت کے ابتدائی مراحل میں ہی اپنے معجزہ کی نشاندہی کر دیا کرتے تھے اور بعض مقامات پر یہ.بیان کیا گیا ہے کہ جب لوگ انبیاء علیہم السلام سے معجزہ کا مطالبہ کیا کرتے تھے تو وہ اس وقت اپنے معجزے پیش کیا کرتے تھے ۔

منجملہ جن مقامات سے صاف طور پرپتہ چلتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام ابتدائے تبلیغ میں خود ہی اپنے صاحب معجزہ ہونے کا اعلان کر دیتے تھے ۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن مریم کا واقعہ ہے جن کے لئے اعلان ہو رہا ہے :

(وَرَسُولا اِلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ)[1]

"ہم نے حضرت عیسیٰ کو رسول کی حیثیت سے بنی اسرائیل میں بھیجا "۔

اور پھر انھوں نے کہا :

(اَنّیْ قَدْ جِئتُکُم بآ یَةٍ مِنْ رَّبِّکُم اَنّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ مِنَ الطِّیْنِ)[2]

"میں معجزہ کے ساتھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے درمیان آیا ہو ںتمہارے سامنے مٹی سے پرندہ جیسی چیز بنا ئو نگا ۔"

1۔آل عمران آیت49۔

2۔ سورہ آل عمران آیت49۔

اس آیت سے ظاہری (بلکہ صریحی)طور پر پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی ابتداء دعوت سے ہی لوگوں کے سامنے فرمایا کرتے تھے کہ میں نشانی لیکر آیا ہوں۔

لیکن بعض مقامات پر قرآن کی آیتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ گویا انبیاء علیہم السلامبعوث ہوتے تھے اور اپنی دعوت کا اعلان کرتے تھے اور لوگوں کے مطالبے پر اُن کو معجزہ دکھلاتے تھے۔چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن فرماتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور فرعون والوں کو دعوت دی اور ان کے سامنے اپنی رسالت کا اظہار کیا توفرعون نے کہا:

(اِنْ کُنْتَ جِئْتَ بِآیَةٍ فَا تِ بِهَا اِنْ کُنْتَ مِنَ ا لصَّا دِ قِیْنَ)[1]

"اگر خدا کی طرف سے کوئی نشانی تمہارے پاس ہے تو پیش کرو اگر تم سچّوں میں سے ہو"۔

اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا چھوڑا جو اژدھا بن گیا۔اس آیت سے بظاہر لگتا ہے کہ اس وقت تک حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے سامنے معجزہ پیش نہیں کیا تھا۔

حضرت صالح علیہ السلام کے ذکر میں ہے کہ ان کی قوم (قوم ثمود) نے عرض کی:

(مَاأَنْتَ الاّبَشَرمِّثْلُنَافَاتِ بِآیَةٍ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصَّادِ قِیْنَ قَالَ هٰذِهِ نَاقَة لَهَا شِرْب وَلَکُم شِرْبُ یَوْمٍ مَعلُوْم)[2]

"تم بھی ہمارے جیسے انسان ہو (ورنہ) اگر سچّے ہو تو نشانی دکھاؤ حضرت صالح نے فرمایا: یہ اونٹنی ہے، چشمے سے پانی پینے کا حق ایک دن اس کو حاصل ہوگا اور ایک دن تم کو اور آپ نے تاکید کے ساتھ فرمایا:

(وَلا تَمَسُّوْهَا بِسُوْئٍ فَیَا خُذَ کُم عَذَابُ یَو مٍ عَظِیمٍ)[3]

"اس کو تکلیف نہ پہنچانا (ورنہ) روز عظیم (قیامت) کا عذاب تم کو گھیر لے گا"۔

گویا آیت میں اس سوال کا جواب بھی دیدیا گیا ہے انبیاء علیہم السلام اپنی نبوت کے آغاز میں ہی معجزہ پیش

1۔سورہ اعراف106۔

2۔سورۂ شعراء آیت 154۔156۔

3۔سورۂ شعراء آیت 156۔

کر دیتے تھے یا لوگوں کی درخواست کے بعد معجزہ دکھلایا کرتے تھے ۔
بظاہر بلکہ صاف طور پر آیات شریفہ کا جواب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کبھی اپنی نبوت کے آغاز میں ہی اور کبھی لوگوں کے مطالبہ کے بعد معجزے دکھلایا کرتے تھے ۔
علاوہ ازین یہ بھی معلوم ہوگیا کہ قرآن، کلی طور پر انبیاء علیہم السلام کے لئے معجزہ کا قائل ہے حتی آخر کی آیتوں کے لہجہ سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو انبیاء علیہم السلام سے معجزہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہے۔ جس وقت فرعون نے کہا اگر آپ کے پاس کوئی نشانی ہے تو پیش کیجئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر ڈال دیا البتہ خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ دو برہان پہلے سے عطا کردیئے تھے :
(هٰذَان بُرْهَانانِ مِنْ رَّبِّكُم)
"یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے دو دلیلیں ہیں"۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام معجزہ پیش کرنے کے لئے آمادہ تھے لیکن جب فرعون نے مطالبہ کیا تو پیش کردیا۔یہی حال حضرت صالح علیہ السلام کا ہے جیسا کہ مذکورہ آیت کے ذیل میں ہم نے بیان کردیا ہے۔

معجزہ کی کیفیت

اب بحث یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کس وقت معجزات پیش کیا کرتے تھے؟ کیا وہ ہر وقت اور ہر شخص کے مطالبے پر معجزہ پیش کر دیا کرتے تھے یا ایسا نہیں تھا ؟اور یہ کہ کیا معجزہ اس لئے تھا کہ لوگ قبول کرنے پر مجبور ہوجائیں یا صرف اتمام حجت کے لئے تھا ؟
اس سلسلہ میں بہت سی آیات بتاتی ہیں کہ لوگ کبھی کبھی معجزات کا مطالبہ کیا کرتے تھے اور مخصوص خواہشیںپیش کرتے تھے لیکن انبیاء علیہم السلام ان کا کوئی جواب نہیں دیتے تھے ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ معجزہ اس لئے نہیں ہے کہ لوگ مجبور ہو کر دین حق کو قبول کر لیں بلکہ اس کا مقصد لوگوں پر حجت تمام کرنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت پر ان کے پاس ایک دلیل موجود ہو ۔چنانچہ کبھی کبھی خداوند عالم اپنے لطف کی وجہ سے کسی پیغمبر کو دو، تین، پانچ، یا دس دس معجزے عطا کر دیتا ہے یا یہ کہ اس کی نبوت ثابت ہونے کے بعد اس کے ذریعہ کچھ کرامتیں بھی ظاہر ہو جاتی ہیں ۔ یہ سب خداوند عالم کا فضل ہے ورنہ انبیاء کو معجزہ دینے کی بنیاد اتمام حجت کرنا ہے اور بس، اس سے آگے محض خداوند عالم کی مصلحت ہے جس کو خدا بہتر جانتا ہے۔ اگر مصلحت ہوئی تو خدا دوسرا معجزہ دیدیتا ہے اور اگر مصلحت نہیں ہوتی تو پہلے معجزہ پر اتمام حجت کر دیتا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا وند عالم نے حضرت موسیٰ کو نبوت کے آغاز ہی سے دو معجزے عطا کر رکھے تھے۔ حضرت عیسیٰ کے پاس کئی معجزے تھے۔ مٹی سے پرندے بنادینا مردوں کو زندہ کرنا اندھوں کو بینائی عطا کرنا برص کے مریضوں کو شفاء دینا اور اسی طرح غیب کی خبریں دینا وغیرہ۔

(وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاکُلُوْنَ وَمَا تَدَّ خِرُوْنَ فِیْ بُیُوْ تِکُمْ) [1]

"اور تم کو اس بات کی خبر دونگا کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا گھر میں ذخیرہ کرتے ہو"۔

یہ سب خداوند عالم کی مصلحت سے وابستہ ہے کہ وہ کب کسی پیغمبر کو ایک معجزہ عطا کرتا ہے اور کب ایک سے زیادہ، اس کا کوئی اصول اور فار مولا ہمارے سامنے نہیں ہے اور نہ ہی ہم کو اس کا علم دیا گیا ہے اجمالی طور پر قرآن نے بیان کردیا ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام ایک سے زیادہ معجزہ رکھتے تھے لیکن ایسا نہیں تھا کہ لوگ جس کا بھی مطالبہ کرتے وہ انجام دیدیتے تھے قرآن نے کچھ ایسے مقامات بھی بیان کئے ہیںجہاں لوگوں نے کسی مخصوص معجزہ کا مطالبہ کیا اور انبیاء علیہم السلام نے اسے رد کردیا۔ پہلے کلی طور پر کہتا ہے کہ جس نبی کو بھی معجزہ پیش کرنا ہو خدا کے اذن سے پیش کرنا چاہئے ایسا نہیں ہے کہ معجزہ کے سلسلے میں نبی خود مختار ہو بلکہ خدا کی اجازت سے ہی" معجزہ "پیش کرے گا۔ خداوند عالم قرآن کریم میں فرماتا ہے :

(وَمَاکَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَا تِیَ بِآیَۃٍاِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ) [2]

"اور کسی پیغمبر کے بس میں نہیں کہ خدا کے حکم کے بغیر کوئی معجزہ دکھائے"۔

کچھ مقامات پر خاص طور سے فرماتا ہے کہ لوگوں نے معجزات کی فرمائشیں کیں لیکن انبیاء نے معجزہ نہیں پیش کیا۔ حتی بعض آیات کے لہجہ سے اگر دوسری آیات نہ ہوتیں تو یہ وہم پیدا ہو جاتا کہ انبیاء علیہم السلام کو سرے سے معجزہ دیا ہی نہیں گیا تھا اور یہ معجزہ کا انکار کرنے والوں کے لئے ایک دستاویز بن جاتی لیکن ان کے مقابل انبیاء علیہم السلام کے صاحب اعجاز ہونے پر صاف و صریح آیات موجود ہیں اور ان آیتوں پر ذرا سی توجّہ سے اُن آیات کا ابہام دور ہو جاتا ہے کہ جن سے بظاہر یہ وہم ہوتا تھا کہ انبیاء علیہم السلام سرے سے معجزہ دکھانے سے انکار کرتے تھے یعنی وہ اتمام حجت کے بعد، معجزہ دکھلانے کی فرمائش قبول نہیں کرتے تھے یا یہ کہہ لیجئے کہ نا معقول قسم کے خلافِ مصلحت مطالبے پورے کرنے سے پرہیز کرتے تھے مثال کے طور پر اگر اس طرح کی درخواست کی جاتی کہ جس سے

1۔ سورۂ آل عمران 49۔

2۔ سوررۂ مومن آیت 78۔

لوگوں کے سامنے اختیار کا راستہ بند ہو جاتا تو ایسا کرنا حکمت الٰہی کے خلاف تھا اور اصل غرض فوت ہوجاتی ہے معجزہ اس لئے ہونا چاہیئے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ خدا کا پیغمبر ہے اور لوگ پورے اختیار کے ساتھ اس کی اطاعت کریں۔ اب اگر معجزہ ایسا ہو کہ جس سے لوگوں کا اختیار ان سے سلب ہو جائے تو اس سے خلقت کا مقصد ہی ختم ہوجاتا۔ معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام اس طرح کی فرمائشیں قبول نہیں کرتے تھے اور اسی طرح جو مطالبے لوگ حرص و ہوس کے تحت کرتے تھے اور جن کو پورا کرنے کے لئے نبی کو صبح سے شام تک چوکا لگا کر بیٹھنا پڑے کہ جو شخص جو بھی مطالبہ کرے اس کو نبی انجام دیتا رہے اس طرح کے تمام مطالبوں سے انبیاء علیہم السلام صرف نظر کرتے تھے۔چونکہ یہ سب غرض خلقت اور حکمت الٰہی کے خلاف ہے نبی کو ایک مرتبہ لوگوں کے سامنے اپنی نبوت ثابت کر دینا چاہیئے کہ ان پر حجت تمام ہو جائے اور بس لیکن اگر ایک شخص نبی سے آکر کہے کہ اس پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹا دیجئے دوسرا شخص کہے کہ اس دریا کو خشک کر دیجئے تیسرا کہے اس طرح کیجئے اور چوتھا کہے اس طرح کیجئے تو انبیاء علیہم السلام اس طرح کی چیزوں کو قبول نہیں فرماتے تھے یا لوگ طرح طرح کے بہانے کیا کرتے تھے مثال کے طور پر کہا کرتے تھے کہ ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ کے پاس ایک باغ نہ ہو اور اس میں نہریں اور محل نہ ہوں تو اس میںمصلحت نہیں پائی جاتی یا یہ کہ آسمان سے سونے کے کنگن آئیں اور آپ کے ہاتھ میں چلے جائیں یا اسی طرح کی دوسری باتیں انبیاء علیہم السلام قبول نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ مصلحت صرف اتنا چاہتی تھی کہ لوگوں پر حجت تمام ہوجائے اور ان کی نبوت ثابت ہوجائے۔ بعض آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کبھی کبھی انبیاء علیہم السلام پر لوگوں کی طرف سے بہت زیادہ دبائو ڈالا جاتا تھا کہ اگر آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو فلاں کام انجام دیجئے لیکن اس میں خدا کی مصلحت نہیں ہوتی تھی ،جب لوگوں پر حجت تمام ہوجاتی تو پھر معجزے کے لئے ان کی دوسری درخواستوں پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ لوگ اصرار کرتے اور نبی پر دبائو بڑھ جاتا تھا بلکہ بعض اوقات تواگر ان کو خداوند عالم کی تائید حاصل نہ ہوتی تو وہ دبائو کے تحت ان کے مطالبوں کو جامہ عمل پہنا دیتے۔

لیکن پیغمبر معصوم ہوتے ہیں خدا ان کی خود حفاظت کرتا ہے اور وہ مصلحتِ حق کے خلاف ارادہ نہیں کرتے لیکن حالات ان کو سخت دبائو میں مبتلا کر دیتے تھے اور بالآخر ان کو جواب دینا پڑتا تھا کہ ہماری رسالت تو یہی ہے جس کا تم مشاہدہ کر رہے ہو خداوند عالم نے ہم کو جو امر دیا تھا وہ ہم نے تم تک پہنچا دیا اب تم ایمان لائو یا نہ لائو مختلف قسم کی باتیں اس سلسلے میں کیا کرتے تھے چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں آیات سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اکرم پر لوگوں کا دبائو اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ خداوند عالم کو وحی کرنا پڑتی تھی کہ اے ہمارے نبی مصلحت نہیں ہے آپ ان کے اس طرح کے مطالبے قبول نہ کیجئے گا:

(وَقَالُوْا لَولَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَة مِنْ رَبِّهٖ)

"نبی پر ان کے پروردگار کی طرف سے کیا کوی معجزہ نازل نہیں ہوتا "۔

یہ تو ایسی بات ہے گویا نبی اکرم ﷺ نے ابتک کوئی معجزہ نہ پیش کیا ہو اور ان کی نبوت کے لئے کوئی دلیل موجود نہ ہو، کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ پر کوئی آیت یعنی معجزہ کیوں نازل نہیں ہوا ؟ ظاہر ہے ان تمام دلایل اور معجزات پیش کرنے کے باوجود اس طرح کی باتیں محض بہانہ تلاش کرنا ہے ۔ لہٰذا خداوند عالم نے ان کے جواب میں فرمایا (اے ہمارے نبی!)

(قُلْ اِنَّ اللّٰہَ قَادِرعَلٰی اَنْ یُّنَزِّلَ آیَۃً وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَعلَمُوْنَ)[1]

"(آپ ان سے) کہدیئںکہ خدا معجزے کے نازل کرنے پر ضرور قادر ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ (خدا کی مصلحتوں کو) نہیں جانتے "۔

بعض آیات بتاتی ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ بہت زیادہ دبائو میں تھے۔قرآن کا بیان ہے :

(فَلَعَلَّکَ تارِک بَعْضَ مَایُوْحَیٰ اِلَیْکَ وَضَائِق بِهِ صَدْرُکَ اَنْ یَقُوْلُوْا لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَیہِ کَنْز اَوْجَاءَ مَعْهُ مَلَک)[2]

"توکیا آپ وحی کے ذریعہ بھیجی گئی بعض باتیں صرف اس خیال سے چھوڑدیں گے کہ آپ کا دل اس طرح کی باتوں سے بھرگیاہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ پر کوئی خزانہ کیوں نہیں نازل کیا گیا یا تصدیق کے لئے ساتھ میں کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا "۔

شاید ہم کلمہ (لعلّ) کے بارے میںنہیں بیان کرچکے ہیں :

قرآن میں لعلّ کبھی بولنے والے کے لحاظ سے ، کبھی سننے والے کے لحاظ سے اور کبھی مقام اور حالات کے تقاضے و لحاظ سے استعمال ہوتا ہے۔ لعلّ، ترجّی یعنی (شاید) کے معنی میں ہے لیکن اس کے محل استعمال میں فرق ہے کبھی کہا جاتا ہے کہ شاید فلاں کام ہوجائے یعنی یہ شاید مخاطب کے یہاں پائی جانے والی امید کے لحاظ سے اور کبھی یہ شاید خود متکلم کی توقّع کو بیان کرتا ہے لیکن بعض وقت یہ شاید دونوں میں سے کسی ایک کی بھی توقع اورامید سے تعلق نہیں

1۔ سورۂ انعام آیت 37۔

2۔ سورۂ ہود آیت12۔

رکھتابلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ مقام اور حالات اسی چیز کا تقاضا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت میں بھی جب خداوند عالم یہ فرماتا ہے :

(فَلَعَلَّکَ تَارِک بَعْضَظاہر ہے ایک نبی کے ذہن اقدس میں اپنے فریضۂ رسالت کے چھوڑنے کا تصور پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی خدا اپنے نبی کے بارے میں اس طرح کی توقع رکھتا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس وقت حالات اتنے سخت ہو چکے تھے کہ ایک عام انسان، انسان ہونے کے ناطے یہ کہنے پر مجبور ہوتا کہ اب میں رسالت کا یہ فریضہ چھوڑ کر اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتا ہوں۔

پس یہ جملہ (فَلَعَلَّکَ تَارِک بَعْضَ مَا یُوْحٰی اِلَیْ ک) حالت کے اعتبار سے استعمال ہوا ہے خود پیغمبر کے اعتبار سے استعمال نہیں ہوا ہے۔(وضائق بہ صدرک)اور آپ کا سینہ بہت زیادہ تنگ آچکا ہے ؟ کس بات سے ؟ اس بات سے کہ کفار کہتے ہیں :

(اَنْ یَقُولُوا لَولَا اُنْزَلَ عَلَیْہِ کَنْز اَوْجَائَ مَعَہُ مَلَک)

"ان پر کوئی خزانہ کیوں نہیں نازل ہوتا یا ان کے ساتھ فرشتہ کیوں نہیں آیا ؟تو آپ کا دل تنگ ہے کہ ان کو کیا جواب دے ؟(اِنَّمَااَنْتَ نَذیروَاللہ عَلیٰ کُلِّ شَیئٍ وَکِیْلٍ)

"آپ تو صرف (عذاب سے) ڈرانے والے ہیں اور خدا ہر چیز کا ذمہ دار ہے"۔

آپ اس کے ذمہ دار نہیں کہ کون ایمان لاتا ہے اور کون ایمان نہیں لاتا :

(وَاللہ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ وَکِیلٍ)"خدا ہر چیز کا ذمہ دار ہے"۔

آپ صرف اپنا فریضہ انجام دیجئے اس سے زیادہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ خدا اپنے بندوں کی ہدایت کرتا ہے، چاہیں تو قبول کریںاور چاہیں تو قبول نہ کریں، آپ سے ان کے افعال کے بارے میں سوال نہیں ہو گا ۔

اسی طرح خداوند عالم کا یہ فرمان (وَاِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْکَ اِعْرَاضُھُم)[1]اس بات کی گواہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ پر بہت سخت تھا کہ میں بشر کی نجات کے لئے حق کے ایسے پیغامات لیکر آیا ہوں لیکن یہ پھر بھی مجھ سے روگردانی کرتے ہیں چنانچہ نبی اکرم ﷺ سے خطاب کرکے خداوند عالم فرماتا ہے :

(وَاِنْ کَانَ کَبُرَعَلَیْکَ اِعْرَاضُھُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِ نَفَقًافِی الْاَرْضِ اَوْسُلَّماً فِیْ السَّمَآئِ فَتَأْتِیَھُمْ بِآیَةٍ)[2]

1۔ سورۂ انعام آیت 35۔

2۔ سورۂ انعام آیت35۔

"اگر ان لوگوں کی روگردانی آپ پر اس قدر سخت ہے تو جائیے اگر ہو سکے تو زمین کی تہوں میں کوئی سرنگ ڈھونڈھ نکالئے یا آسمان پہ چڑھنے کے لئے سیڑھی لگالیجئے اور کوئی ایسی نشانی لاکر دکھا دیجئے (کہ یہ لوگ قبول کرلیں اور ایمان لے آئیں"۔

یعنی خدا کبھی ایسے کام انجام نہیں دیگا اس کے کام لوگوں کی خواہشات کے تابع نہیں ہوتے اور آپ بھی اس طرح کے کام انجام نہیں دیں گے اور دے بھی نہیں سکتے۔کیونکہ خدا اس کی اجازت نہیں دے گا۔(پھر بھی) اگر انجام دے سکتے ہوں تو انجام دیجئے۔اس کے بعد خدا فرماتا ہے:

(وَلَوْشَائَ اللّٰہُ لَجَمَعَهُمْ عَلَی الْهُدَیٰ)

"اگر خدا چاہتا کہ سب کے سب حتمی طور پر ایمان لے آئیں تو وہ عاجز نہیں تھا ایک کام ایسا کردیتا کہ وہ سب کے سب ایمان لے آتے لیکن خدا کی حکمت اس کی اجازت نہیں دیتی۔اس کا تقاضا ہے کہ انسان راہ حق کو خود اختیار کرے خدا تو صرف اختیار کے استعمال کی زمین فراہم کردیتا ہے۔وہ لوگوں کو مجبور نہیں کرتا کہ سب کے سب راہ حق کو منتخب کرلیں خدا کا یہ مقصد نہیں ہے۔خدا کسی سیاست داں کی مانند نہیں ہے کہ وہ ہر روز ایک نئی چال سے لوگوں کو ایک خاص راستہ کی طرف لگادے اور جب ایک طریقہ سے کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے تو کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرلے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ خدا کی سنت یہ ہے کہ وہ لوگوں کی راہنمائی کردیتا ہے کہ وہ صحیح راہ سے واقف ہو جائیں:

اب آگے انسان کو خود صاحب اختیار ہے۔خداوند عالم فرماتا ہے:

(فَمَنْ شَائَ فَلْیُؤْمِنْ وَمَنْ شَائَ فَلْیَکْفُرْ)[1]

"پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کافر ہوجائے"۔

خداوندعالم کا ارشاد ہوتا ہے:

(وَلَوشَائَ اللہ لَجَمَعَهُمْ عَلَی الْهُدَیٰ فَلاَ تَکُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِیْنَ)[2]

"(نادانی نہ کرو)اگر چاہے سب کو ہدایت پر جمع کردیتا (مگر وہ نہیں چاہتا کہ سب مجبور ہو کر ایمان لے آئیں)پس آپ اپنا شمار نادانوں میں نہ ہونے دیں"۔

ایک مقام پر خدا ارشاد فرماتا ہے:

1۔ سورۂ کہف آیت 29۔

2۔ سورۂ انعام35۔

(لَعَلَّکَ بٰخِعنَفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ اِنْ نَشَأْ نُنَزِّلْ عَلَیْهِمْ مِنَ السَّمَآئِ آیَۃً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَاخَاضِعِیْنَ)[1]

"شاید (اس فکر میں آپ) اپنی جان ہلاک کرڈالیں گے کہ یہ کفار ایمان کیوں نہیں لاتے اگر ہم چاہتے کہ ہر قیمت پر یہ لوگ ایمان لے آئیں تو ان لوگوں پر آسمان سے کوئی ایسا معجزہ نازل کردیتے کہ ان لوگوں کی گردنیں اسکے سامنے جھک جاتیں"۔

ان سے ملتی جلتی دوسری تعبیریں بھی ہیں لیکن بہ ظاہر ان کے دوسرے معنی ہیں۔ بعض مقامات پر ہے کہ لوگ کہتے تھے کہ آیت کیوں نازل نہیں ہوتی ؟شاید پہلی نظر میں یہ خیال آئے کہ وہ کہتے تھے کوئی معجزہ کیوں نہیں لاتے لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد قرآن کی آیات ہیں یعنی کبھی کبھی وحی نازل ہوئے کئی دن ہوجایا کرتے تھے اس وقت منافقین یا کفّار کہا کرتے تھے کہ ان کا جبرئیل کہاں ہے ؟کوئی آیت کیوں نازل نہیں ہوتی ؟ کبھی کبھی توہین آمیز الفاظ استعمال کیا کرتے مذاق اڑانے کے لئے کہا کرتے تھے :جاؤ کہیں سے ایک آدھ گڑھ لاؤ۔ پیغمبر اکرم ﷺ کو ان سب کے یہ طعن وطنز برداشت کرنے پڑتے تھے۔

سورۂ اعراف میں اس کی طرف اشارہ ہے :

(وَاِذَالَمْ تَأْتِهِمْ بِآیَۃٍ قَالُوْا لَوْلَااجْتَبَیْتَهَا قُلْ اِنَّمَا اَتَّبِعُ مَایُوْحیٰ اِلَیَّ مِنْ رَبِّیْ) [2]

"اور جب آپ ان کے پاس کوئی آیت نہ پیش کرتے توکہتے آپ نے اسے کیوں نہیں بنا لیا (اے رسول) آپ کہدیجئے کہ میں تو بس اسی وحی کا پابند ہوں جو میرے پروردگار کی طرف سے میرے پاس آتی ہے"۔

لولا اجتبیھا (اجتبائ)"یعنی طول دینا کہیں سے اپنی طرف جذب کرنا" بہ ظاہر اس سے یہ مراد ہے کہ اگر رسول پر کوئی آیت نازل نہ ہوتی، اور وحی میں دیر ہوجاتی توکہتے آپ ادھر ادھر کہیں سے خود کیوں نہیں بنالیتے ان سے جواب میں کہدیں میں تو بس خدا کی وحی کا پابند ہوں جب وہ مجھ پر وحی کرے گا میں پہنچا دونگا اور جب وحی نہ کرے گا تو میں اپنی طرف سے کچھ نہیں پیش کرسکتا۔

(قُلْ اِنَّمَا اَتَّبِعُ مایُوحیٰ اِلَیَّ مِنْ رَبِّیْ) بظاہر اس آیت میں "بآیۃٍ" سے مراد قرآن کی آیت ہے۔

اسی مضمون سے ملتی جلتی دوسری آیت بھی ہے اس کے بارے میں بھی یہی احتمال پایا جاتا ہے:

1۔ سورۂ شعراء آیت3۔4۔

2۔ سورۂ اعراف آیت 203۔

(وَ یَقُوْلُوْنَ لَوْلَااُنْزِ لَ عَلَیْہِ آیَۃ مِنْ رَبِّہِ فَقُلْ اِنَّمَا الغَیْبُ لِلّٰہِ فَا نْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَکُمْ مِنَ المُنْتَظِرِیْنَ)[1]

"اور کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر کوئی آیت کیوں نہیں نازل ہوتی تو (اے رسول) کہدیجئے کہ غیب کا علم تو صرف خدا کے واسطے ہے انتظار کرو اور میں (بھی) تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں"۔

یہاں بھی احتمال ہے کہ آیت سے مراد قرآنی آیات کے نازل ہونے کا مطالبہ ہو ارشاد ہوتا ہے کہ علم غیب خدا سے مخصوص ہے۔آیات الٰہی غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔اور میرے ہاتھ میں نہیں ہیں،جب خدا چاہتا ہے نازل کرتا ہے میں بھی انتظار کر رہا ہوں جب خدا وحی کرے گا میں تمہارے سامنے بیان کردونگا۔

البتہ ایک دوسرا احتمال یہ بھی دیا جاتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ پیغمبر کوئی دوسرا معجزہ کیوں نہیں لاتے۔

اور پھر ارشاد ہوتا ہے:(انّما الغیب للہ) یعنی معجزہ کا تعلق بھی غیب سے ہے اور وہ خدا کے قبضہ قدرت میں ہے۔

اسی طرح قرآن نے بعض اہل کتاب کا قول نقل کیا ہے:

(اَلَّذِیْنَ قَالُوْااِنَّ اللّٰہَ عَہِدَ اِلَیْنَا اَ لَّانُوْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتَّیٰ یَاتِیَنَابِقُرْبَانٍ تَاکُلُہُ النَّارُ)

" وہ کہتے تھے کہ خدا نے ہم سے عہد لیا ہے کہ جب تک کوئی رسول ایک قربانی نہ کرے اور اس کو (آسمانی) آگ خاکستر نہ بنا دے اس وقت تک ہم اس پر ایمان نہ لائے"۔

اب اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں تو یہ کام انجام دیدیجئے پیغمبر اسلام ﷺ کو حکم ملتا ہے کہ جواب میں کہد یجئے:

(قُلْ قَدْ جَائَکُمْ رُسُل مِنْ قبْلِی بِا لْبَیِّنَاتِ وَبِالَّذِیْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ)[2]

"(اے رسول) کہدیجئے کہ اگر تم اپنے قول میں سچّے ہو کہ اس طرح کا عمل انجام پانے کے بعد تم ایمان لے آئو گے تو بتائو مجھ سے پہلے کے نبیوں نے جب یہ کام کیا تو ان پر ایمان کیوں نہ لائے؟ نہ صرف یہ کہ ایمان نہ لائے بلکہ تم نے انھیں قتل کر دیا؟"۔

1۔ سورئہ یونس آیت 20۔

2۔ سورئہ آل عمران آیت183۔

قرآن ان کے ارادوں کو فاش کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تم جھوٹ بولتے ہو اور ایمان ہی نہیں لانا چاہتے:

اوّلاً قرآن اس کی تائید نہیں کرتا کہ خدانے ایسی کوئی سفارش کی ہو بلکہ قرآن فرماتا ہے: اس سے پہلے پیغمبر آئے واضح اور بیّن دلایل لیکر آئے اس عمل کو بھی انجام دیا توکیوں تم ایمان نہیں لائے اور ان کو قتل کر ڈالا؟

اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ خداوند عالم لوگوں کی خواہشات نفسانی کا تابع نہیں ہے کہ وہ جو کچھ درخواست کریں خدا اس کو انجام دیدے بلکہ خدا کا کام خود اسی کی اپنی حکمت کی اساس وبنیاد پر ہے جس کو وہ خود جانتا ہے اور صرف جس حد تک اتمام حجت کی ضرورت ہوتی ہے، ضروری جانتا ہے اور اس سے زیادہ اس کی مخصوص مصلحتوں کے تابع ہے۔

پیغمبر پر کچھ اور معجزات کیوں نہیں نازل ہوتے اس کے جواب میں قرآن فرماتا ہے:

(وَمَامَنَعْنَا اَنْ نُرْسِلَ بِالآ یَا تِ اِلَّا اَن کَذَّبَ بِهَاالآوَّلُونَ وآ تَیْنَاثمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْابِهَاوَمَانُرْسِلُ بِالآیَاتِ اِلَّاتَخْوِیْفاً) [1]

"اور ہمیں معجزات کے بھیجنے سے بجز اس کے اور کوئی وجہ مانع نہیں ہے کہ گزشتہ قوموں نے انھیں جھٹلا دیا اور ہم نے قوم ثمود کو کھلے معجزے کے طور پر اونٹنی عطا کی جو (ہماری قدرت) ظاہر کرتی تھی تو ان لوگوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم تو معجزے صرف ڈرانے کی غرض سے بھیجا کرتے ہیں"۔

اس مطلب کی ذرا وضاحت ضروری ہے آیت کے ظاہری معنی میں کچھ ابہام پایا جاتا ہے کہ دوسرونکی تکذیب معجزہ لانے میں کیسے مانع ہو سکتی ہے؟اس کے مختلف طریقوں سے جواب دیئے گئے ہیں۔ منجملہ یہ:چونکہ پہلے"آیتوں" کے بھیجنے سے کوئی نتیجہ نہ نکل سکا اب اگر اس کے بعد بھی آیتیں بھیجے تو یہ فعل عبث ہوگا اور خداوند عالم عبث کام انجام نہیں دیتا لیکن اتنا بیان کر دینا بھی کافی نہیں ہے کیا خدا نہیں جانتا تھا کہ ان معجزوں کا بھیجنا بے سود ثابت ہوگا؟یعنی اگر خدا جانتا تھا کہ اس سے پہلے بھیجی جانے والی آیات کا کوئی فائدہ نہیں ہے تو ان کو نہ بھیجتا؟ یہ وجہ جو بیان کی گئی ہے مبہم ہے گویا خدا کو پہلے یہ علم نہیں تھا کہ اس کا فائدہ ہوگا یا نہیں ہوگا۔ لہٰذا گزشتہ قوموں میں بھیج کر امتحان کیا اور جب یہ دیکھ لیا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے تو کہہ دیا اب نہیں بھیجوں گا یقینا یہ بات صحیح نہیں ہے اوریقینا کہنے والے کا بھی یہ مقصد نہیں ہے پس ہم اس بیان کی اسطرح تکمیل کر سکتے ہیں:پہلے جو آیت بھیجی گئی وہ اتمام حجت کے لئے تھی اور خدا بھی جانتا تھا کہ لوگ چاہے ایمان نہ لائیں لیکن اتمام حجت کے لئے آیت کے بھیجنے میں ہی مصلحت ہے اور یہ کام لغو یا بے فائدہ نہیں ہے لیکن اب اگر اتمام حجت کے بعد

1۔ سورۂ اسراء آیت 59۔

دوبارہ آیت بھیجے تو یہ لغو و بے فائدہ ہوگا۔

بعض دوسرے مفسرین اس آیت کی اس طرح تفسیر کرتے ہیں: اس آیت میں "آیات" سے مراد وہ عذاب ہیں جو گزشتہ قوموں پر نازل ہوئے۔ گزشتہ قوموں پر نازل ہونے والے عذاب، عذاب استیصال کی صورت میں نازل ہوا کرتے تھے۔یعنی پوری قوم نیست و نابود ہو جایا کرتی تھی۔ اس طرح کا واقعہ تاریخ میں متعدد مرتبہ پیش آیا ہے۔ خدا نے کوئی نشانی نازل کی لوگوں نے اس کی تکذیب کی اور ان پر عذاب نازل ہو گیا اگر خداوند عالم اس اُمت پر بھی اُسی طرح کی آیات نازل کرے تو یہ بھی عذاب کی مستحق ہوگی لیکن اس امت کے ہلاک کئے جانے میں مصلحت نہیں ہے اس امت کو تو قیامت تک باقی رہنا ہے لہٰذا اس امت پر تباہ کنندہ عذاب نازل نہیں ہوگا مرحوم علامہ طبا طبائی نے اسی مطلب کی تائید کی ہے۔

بہر حال مجمل طور پر ان آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہر پیغمبر سے جو کچھ مطالبہ کیا جائے وہ اس کو انجام دیدے ایسا نہیں ہے، بلکہ ان سے بہت زیادہ مطالبے کئے جاتے تھے اور ان پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا لیکن انبیاء علیہم السلام ان کو قبول نہیں کرتے تھے کیونکہ مصلحت نہیں تھی اور حجت بھی تمام ہو چکی تھی۔

نتیجتاً قرآن بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ معجزہ، حجت تمام کرنے کے لئے ہے اور اس سے زیادہ کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے اور ان مخصوص مصلحتوں کی تابع ہے جو ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔

معجزہ کا دائرۂ حدود

معجزہ کے سلسلہ میں ایک یہ مسئلہ بیا ن کیا جاتا ہے کہ کیا معجزہ پیغمبر کی نبوّت کے اثبات سے مخصوص ہے یا معجزہ کا دائرہ نبوّت کے اثبات سے عام ہے ؟یعنی وہ غیر معمولی امور کہ جن کو قرآن نے معجزہ کے عنوان سے بیان کیا ہے آیا وہ ان امور سے ہی مخصوص ہے جو کسی پیغمبر کو اس کی نبوت کے اثبات کے لئے دیا گیا ہے یا ان مقامات سے مخصوص اور منحصر نہیں ہے ؟

قرآن کریم میں معجزہ کے واقعات کی تحقیق وجستجو سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہوجاتی ہے کہ معجزہ صرف نبوت کے اثبات سے مخصوص نہیں ہے بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی نبوت کے اثبات کے علاوہ بھی معجزے دکھلائے ہیں۔اور انبیاء علیہم السلام کے علاوہ دوسرے خاصان خدا نے بھی خداوند عالم کی عطا کردہ طاقت وقوت کے ذریعہ معجزات دکھلائے ہیں۔اور دنیا میں ایسے بھی واقعات رو نما ہوئے ہیں جو ایک انسان کے بس کی بات نہیں ہوسکتے لیکن قدرتی اصولوں کے خلاف محض ارادہ الٰہی کے تحت عالم فطرت سے مافوق بنیادوں پر رو نما ہوئے ہیں ۔ منجملہ خود انسان کی پیدائش، قرآن کریم کی رو سے، قوانین فطرت کے مطابق نہیں تھی ۔یعنی ایسا نہیں تھا کہ مادہ نے مخصوص حالات سے گزرنے کے بعد خود بخود انسان کی شکل اختیار کرلی ہو۔قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت کا واقعہ ایک غیر معمولی امر کی صورت میں بیان ہوا ہے اور اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خلقت کا واقعہ اور کچھ دوسرے واقعات بھی ہیں جن کی طرف ہم اشارہ کرینگے۔یہ سب اثبات نبوت کے لئے معجزہ کے عنوان سے بیان نہیں کئے گئے ہیں ۔ لہذا بنیادی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی خلقت ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔قوانین فطرت کے بر خلاف ہوا ہے اسی طرح دوسرے انسان باوجودیکہ اپنے سے پہلے انسانوں کے ذریعہ پیدا ہوئے اور بعد میں پیدا ہونے والوں انسانوں کے لئے ایک قانون فطرت فراہم آگیا لیکن پھر بھی کبھی کبھی اسی قانون آفرینش میں بعض غیر معمولی واقعات بھی وجود میں آئے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مادی اسباب وعوامل کے بغیر غیر معمولی طور پر خلق ہوئے۔اسی طرح نبوت کی بنیاد بھی ایک غیر معمولی امر ہے یہ کہ ایک انسان پر وحی ہو اور اس کو علم عطا کردیا جائے ایک غیر معمولی واقعہ ہے دینوی اسباب اس بات کے متقاضی نہیں ہوتے کہ ایک انسان کسی مافوق ذات سے اس طرح کا رابطہ نبی کے عنوان سے بر قرار کرے۔در حقیقت خود نبوت قوانین فطرت سے الگ ایک غیر معمولی امور کا ایک سلسلہ ہے جو عذاب کی شکل میں مختلف قوموں پر نازل ہوا اور وہ بھی نبوت کے اثبات کے لئے نہیں تھا۔جیسے حضرت نوح نے ایک ہزار سال کے بعد خداوند عالم سے اپنی قوم پر عذاب نازل کرنے کی دعا فرمائی اور خداوند عالم نے عذاب نازل کیا

اور وہ سب کے سب نیست و نابود ہو گئے ۔ یہ واقعہ بھی نبوت کے اثبات کے لئے معجزہ کی صورت میں نہیں تھا ۔ بلکہ ایک عذاب الٰہی تھا جو ظاہراً قدرتی اسباب و عوامل کے تحت نہیں تھا۔ کیونکہ اس بارے میں قرآن کریم کے لہجے سے لگتا ہے کہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا ۔ اسی طرح قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط اوردوسری قوموں پر جو عذاب نازل ہوئے یہ سب غیر معمولی انداز میں واقع ہوئے ہیں یعنی ملائکہ نازل ہوتے عذاب نازل کرتے اور قوم نیست و نابود ہو جایا کرتی تھی یہ سب واقعات بھی نبوت کے لئے نہیں تھے۔ بلکہ سرکشوں اور کافروں کا فیصلہ کرنے کے لئے تھے یہ سب عذاب استیصال تھے اوراصولی طورپر قرآن کریم میں عذاب کی جن قسموں کو عذاب استیصال کے نام سے بیان کیا گیا ہے وہ سب غیر معمولی عذاب ہیں جو بہر حال نبوت کو ثابت کرنے کی غرض سے نہیں تھے۔

اسی طرح جو عذاب تنبیہ کے طور پر کسی قوم یا جماعت پر نازل ہوتے تھے اور وہ سب کے لئے نہیں ہوتے تھے ان کے بھی غیر معمولی طور پر نازل ہونے کا امکان پایا جاتا ہے جیسے بنی اسرائیل کے بعض لوگوں کا بندر اور سُور میں تبدیل ہونا (وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ)"اور ان میں سے کسی کو (مسخ کر کے) بندر اور (کسی کو) سور بنا دیا"یہ بھی غیر معمولی امور ہیں جو نبوت کے اثبات کے لئے نہیں ہیں۔

ان کے علاوہ بھی واقعات ہیں جو قرآن کریم میں بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں جو خاص نوعیت کے غیر معمولی واقعہ کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن نبوت کو ثابت کرنے کے لئے نہیں پیش آئے ہیں۔ حضرت زکریا کا بوڑھاپے میں صاحب اولاد ہونا ، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا صاحب فرزند ہونا وغیرہ ۔

اس طرح کے امور کبھی کبھی بعض مومنین کے ایمان پختہ کرنے کیلئے ہوتے تھے اور کبھی دوسری مصلحتوں کو مدّ نظر رکھکر انجام پاتے تھے۔

حتی معجزہ کا دائرہ صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ دوسرے افراد نے بھی معجزات دکھائے ہیں ۔ قرآن کریم میں بہت سے ایسے غیر معمولی امور کا ذکر ہے جو انبیائے کرام سے مخصوص نہیں ہیں ۔ خاص طور سے وہ علوم جو بعض افراد کو عطا کئے گئے یا وہ الہامات جو بعض افراد پر کئے گئے سب غیر عادی رہے ہیں۔

لہٰذا اس سوال کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ معجزہ کا دائرہ صرف ایسے غیر معمولی امور سے مخصوص نہیں ہے جو نبوت کو ثابت کرنے کے لئے انجام دئے جاتے ہیں ۔

اب ہم ان میں سے بعض معجزاتی واقعات بیان کرتے ہیں:

اگر ہم مختلف قوموں پر نازل شدہ عذاب کی تحقیق و جستجو کرنا چاہیں تو بحث طولانی ہوجائیگی کیونکہ قرآن کریم میں اس طرح کے مسائل جگہ جگہ تکرار کے ساتھ بیان ہوئے ہیں کہ کس قوم پر کونسا عذاب نازل ہوا ہے اور یہ بحث انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی تاریخ کے موضوع سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ لہٰذا ہم ان کو یہاں بیان نہیں کرینگے جو مخصوص اشخاص کے لئے قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیٹیا انبیاء علیہم السلام کے ان معجزوں کو بیان کریں گے جو نبوت کے اثبات کے لئے قرآن کریم میں بیان نہیں ہوئے ہیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان دو نشانیوں کے علاوہ جو آپ کو اپنی نبوت کے اثبات کیلئے عطا کی گئیں تھیں بنی اسرائیل کے مصر سے نکل جانے اور فرعونیوں کے چنگل سے نجات پانے کے بعد بھی بہت سے معجزے ظاہر ہوئے جن کو قرآن کریم نے نبوت کی بنیاد بنایا ہے:

الف: ان کا سب سے پہلا مسئلہ دریا کو پار کرنا تھا: قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَجٰوَزْنَابِبَنِیْ اِسْرَائِیْلَ الْبَحْرَ) [1]

"اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا کے پار کردیا"۔

جب بنی اسرائیل نے مصر کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کیا تو رات کے وقت کھلے اور ایک بڑے دریا کے کنارے پہنچے جس کو انھیں پار کرنا تھا۔ تو خداوند عالم نے دریا کو خشک کردیا اور بنی اسرائیل اس سے گزر گئے اور یہ کام نبوت کے اثبات کے لئے نہیں تھا اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت بنی اسرائیل پر ثابت ہوچکی تھی اور فرعونیوں نے آپ کی نبوت کو ماننا ہی نہیں تھا ۔ایسی صورت میں معجزہ کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ معجزہ رونما ہوا اور دریا خشک ہوگیا۔

ب: بنی اسرائیل طویل راستہ چلنے کی وجہ سے پیاس سے جاں بلب تھے اور پانی یسر نہیں تھا تو حضرت موسیٰ

1۔ سورۂ اعراف آیت 138۔

نے خدا وند عالم سے اپنی قوم کیلئے پانی کی درخواست کی تو آواز قدرت آئی اے موسیٰ علیہ السلام اپنا عصا ایک پتھر پر مارو تاکہ اس سے بنی اسرائیل کے نبیوں کی تعداد کے مطابق بارہ چشمے جاری ہوں چنانچہ اس واقعہ کے بعد سے وہ اس پتھر کو اپنے ساتھ اٹھا کر چلتے تھے جہاں پر بھی ان کو پیاس لگتی تھی اسی عمل کو انجام دیتے تھے۔اس بارے میں قرآن کریم فرماتا ہے:

(وَاَوْحَيْنَا اِلَىٰ مُوسَىٰ اِذِاسْتَسْقٰهُ قَومُهُ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الحَجَرَ فَانْبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَاعَشْرَةَ عَيْناًقَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ) [1]

"اور جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان سے پانی مانگا تو ہم نے ان پر وحی کی کہ اپنا عصا پتھر پر مارو (پس) اس پتھر سے (پانی کے) بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر قبیلہ نے اپنا چشمۂ آب پا لیا"۔

ج: بنی اسرائیل بیابان میں گرمی کی شدت سے پریشان تھی تو خدا وند عالم نے ان پر سایہ کے لئے بادل کے ایک ٹکڑے کو معین فرمادیا کہ وہ ان کو آفتاب کی تمازت سے بچائے۔قرآن کریم میں یہ بات کئی مقامات پر بیان ہوئی ہے منجملہ سورۂ بقرہ (آیت 75) میں ہے (وَظَلَّلْنَا عَلَيكُمُ الْغَمَامَ) ۔) (اور ہم نے بنی اسرائیل پر ابر کا سایہ کیا) اور یہ کوئی عام بات نہیں تھی بلکہ یہ غیر معمولی کام خدا وند عالم کے خاص ارادہ سے واقع ہوا تھا کہ بنی اسرائیل آفتاب کی تمازت سے پریشان نہ ہوں۔

د: چنانچہ بنی اسرائیل (جیسا کہ روایات میں ہے کہ خود بنی اسرائیل کہا کرتے تھے کیونکہ قرآن کریم نے بنی اسرائیل کو دھوکہ باز اور ضدی قوم کے عنوان سے تعارف کرایا ہے۔وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احکام کی ٹھیک سے اطاعت نہیں کرتے تھے اور دین کے احکام کو جیسا چاہیئے تھا قبول نہیں کرتے تھے) نے یہ تجویز رکھی کہ واقعاًیہ احکام خدا وند عالم کی طرف سے ہیں تو اس پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹا دیجے اور ان کی یہ درخواست قبول بھی ہوئی:

(وَاِذْنَتَقْنَاالْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوْااَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ) [2]

"جب ہم نے ان (کے سروں) پر پہاڑ کو چھت کی طرح لٹکا دیا اور وہ لوگ سمجھتے تھے کہ ان پر ابھی گر پڑے گا"۔

البتہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو تسلیم کرتے تھے لیکن بہانہ بازی کیا کرتے۔

ر: جس بیابان میں بنی اسرائیل کچھ مدت تک مقیم رہے وہاں (منّ و سلوی) کا نزول بھی شاید ایک غیر معمولی

1۔ سورۂ اعراف آیت 160۔

2۔ سورۂ اعراف آیت 171۔

طریقہ تھا (کیونکہ بیابان میں سکونت اختیار کرنے کی وجہ بھی خداوند عالم کے حکم سے نافرمانی بنی تھی۔ خدا نے حکم دیا تھا کہ شہر میں داخل ہوکر وہاں کے کافروں سے جنگ کریں ایک بنی اسرائیل نے بھی نہیں مانا اور کہنے لگے موسیٰ علیہ السلام تم اور تمہارا خدا جائے ان سے جنگ کرے اور ان کو شہر سے باہر کردے ہم اس کے بعد شہر میں داخل ہونگے:

(فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَا تِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَا عِدُوْنَ)[1]

"تم اور تمہارا خدا (جائے) اور دونوں (جاکے) لڑو ہم تو یہیں جمے بیٹھے ہیں"۔

خداوند عالم کے اس حکم کی مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ خداوند عالم نے حکم دیدیا کہ چالیس سال تک اسی بیابان میں زندگی بسر کریں۔ (اربعین سنة یتیھون فی الارض) وہ چالیس سال تک مصر کے جنگل میں بھٹکتے رہے صبح کے وقت چلنا شروع کرتے اور چلتے رہتے تھے پھر عصر کے وقت یہ دیکھتے تھے کہ جہاں پر صبح کے وقت تھے اب بھی وہیں پرہیں (البتہ قرآن میں اسکا ذکر نہیں ہے) اور حضرت موسی علیہ السلام بھی اسی چالیس سال کی مدّت کے دوران دنیا سے کوچ کر گئے۔ اس دوران انھوں نے جب خشک بیابان میں کھانے کی فرمائش کی تو خداوند عالم نے ان پر منّ و سلوی[2] نازل کیا۔

قرآن کریم کے ظاہر کلام سے پتہ چلتا ہے کہ (من و سلوی) کا نزول ایک غیر معمولی چیز تھی، جو لوگ معجزوں کے منکر ہیں آسانی سے اس کی تاویل کرسکتے ہیں جیسا کہ کہا بھی ہے: منّ ایک مخصوص گھاس تھی جس سے ایک خاص قسم کا عرق نکلتا تھا اور سلوی بھی ایک قسم کا پرندہ تھا جو اسی جگہ پر ہوتا تھا وہ لوگ اسی گھاس اور پرندہ کو کھایا کرتے تھے لیکن ظاہر قرآن سے لگتا ہے منّ سلوی کا نزول بھی ایک غیر معمولی طریقے سے ہوتا تھا لیکن ہم کو اس بات پر زیادہ اصرار نہیں ہے چونکہ صاف طورپر بیان نہیں ہوا ہے لہٰذا ہم نے احتمال کے طورپر لکھا ہے کہ (منّ سلوی) بھی شاید غیر معمولی طریقہ سے نازل ہوتا تھا۔

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ایک سلسلہ ہے جو ان کے ہاتھوں بنی اسرائیل کے لئے ظاہر ہوا ہے حالانکہ آپ کی نبوت ثابت ہوچکی تھی اور اپنی نبوت کو ثابت کرنے کیلئے معجزہ دکھلانے کی ضرورت نہیں تھی۔

1۔ سورۂ مائدہ آیت 24۔

2۔ من و سلوی کے مختلف معنی ہیں لیکن مشہور و معروف یہ ہیں کہ (منّ) ترنجین کو کہتے ہیں اور (سلوی) بھنا ہوا گوشت یا (تیتر یا بٹیر) کے مانند پرندہ ہوتے تھے جنکا وہ شکار کرتے تھے اور ذبح کرکے کھا جاتے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دستر خوان کا واقعہ ہے جس کا سورۂ مائدہ میں ذکر ہے اور اسی مناسبت سے اس سورہ کانام مائدہ (خوان) رکھا گیا ہے اور یہ نبوت کو ثابت کرنے کیلئے نہیں تھا کیونکہ حوارئین، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے اور آپ کے شاگرد تھے ایک دن ان کے ذہن میں آیا کہ اس طرح کی فرمائش کرنا چاہئے اور انھوں نے کھانے کے لئے حضرت عیسیٰ سے آسمان سے خوان نازل ہونے کی درخواست کردی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی یہ پیشکش قبول کرلی اور خداوند عالم کے حضور دعا مانگی تو خداوند عالم نے اس طرح کا خوان نازل فرمایا اور سب نے کھایا ۔ یہ بالکل واضح سی بات ہے یہ ایک غیر معمولی بات تھی حضرت عیسیٰ کی درخواست پر آسمان سے خوان نازل ہوا جبکہ یہ نبوت کے اثبات کیلئے نہیں تھا ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معجزات

الف : حضرت ابراہیم علیہ السلام بوڑھے ہو چکے تھے اور حالانکہ آپ کے کوئی اولاد نہ تھی آپ خود بھی بہت بوڑھے ہو گئے تھے اور آپ کی زوجہ (سارہ) بھی بانجھ تھیں۔جس وقت قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کی غرض سے فرشتے نازل ہوئے وہ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے چونکہ حضرت لوط حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خالہ زاد بھائی تھے اور آپ کی ہی طرف سے تبلیغ کرتے تھے اور حضرت لوط نبی تھے لیکن حضرت ابراہیم کی (شریعت کی) اتباع کرتے تھے[1] ۔

ملائکہ ابتداء میں انسانوں کی شکل میں ظاہر ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خیال کیا کہ آپ کے پاس مہمان آئے ہیں آپ نے ان کی مہمانی کیلئے گوسفند ذبح کرکے حاضر کرنے کا حکم دیا جب کھانا لگایا گیا تو انھوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا اور عام رواج میں یہ چیز بہت معیوب سمجھی جاتی تھی کہ کسی کے گھر مہمان آئے اور میزبان اس کے سامنے کھانا لگائے اور مہمان کھانا کھانے سے پرہیز کرے اگر کوئی ایسا کرے تو اس کو دشمنی اور کینہ کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ لوگ کھانا نہیں کھا رہے ہیں تو پریشان ہوگئے کہ کیا

1۔ بعض انبیائ، رسول اور صاحب شریعت ہیں (اگرچہ تمام رسول بھی صاحب شریعت نہیں ہیں)اور دوسرے انبیاء (چاہے وہ ایسے زمانے میں ہوں یا بعد والے زمانے میں)صاحب شریعت نبی کے تابع ہوتے ہیں چنانچہ حضرت لوط حضرت ابراہیم کی شریعت کے تابع تھے ۔

بات ہے کھانا کیوں نہیں کھاتے ؟ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیرت کو دور کرنے کیلئے کہا کہ ہم خداوند عالم کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں اور شہر لوط کو زیر وزبر کرنے کیلئے آئے ہیں۔ اسی موقع پر انھوںنے حضرت ابراہیم کو یہ اطلاع دی کہ خداوند عالم آپ کو دو بیٹے عطا کرے گا بعض آیات میں ایک بیٹے کا ذکر ہے اور بعض دوسری آیات میں دو بیٹوں کا تذکرہ ہے لیکن زیادہ تر آیات میں صرف حضرت اسحٰق علیہ السلام کا تذکرہ ہے ۔ جب فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ بشارت دی تو آپ کی زوجہ آپ ہی کے پاس تھیں جب انھوں نے سنا:

(فَاَ قْبَلَتِ امْرَأَتُهُ فِی صَّرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزعَقِيْم)

"تو ابراہیم کی بی بی چلاتی ہوئی انکے سامنے آئیں اور اپنا منھ پیٹ لیا اور کہنے لگیں ایک تو (میں) بڑھیا (اس پر) بانجھ لڑکا کیونکر ہوگا "۔

یہ عورتوں کی عادت ہے کہ کسی تعجب خیز واقعے کے وقت وہ گلا پیٹتی ہیں اس آیت میں مکمل طور پر اس کی منظر کشی کردی گئی ہے (فَصَكَّتْ وَجْهَهَا) اپنے گال پیٹ کر کہا میں صاحب اولاد ہونگی؟ ملائکہ نے کہا (کذلک قال ربک) آپ کے رب نےیونہی فرمایا ہے آپ صاحب اولاد ہونگی؟ (فَبَشَّرْنَاهَابِاِسحٰقَ وَ مِنْ وَرَاءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ) مقصود یہ ہے کہ یہ بھی ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ سارہ بھی بانجھ تھیں اور خود حضرت ابراہیم بھی بوڑھے ہوچکے تھے شاید اس وقت آپ کی عمر سو سال ہوگی اسی حالت میں خدانے آپ کو صاحب اولاد ہونے کی بشارت دی۔[1]

ب ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرودیوں کی آگ سے نجات دینے کا واقعہ بھی بہ ظاہر نبوت کے اثبات کے لئے نہیں تھا کیونکہ یہ مسئلہ ثابت ہوچکا تھا اس کے بارے میں بحث کرچکے تھے اور اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی نبوت کے اثبات کے لئے معجزہ دکھانا لازم تھا تو آپ معجزہ دکھلا چکے تھے اوراور حضرت جراہیم علیہ السلام کو آگ ینڈالنے کی ضرورت کہ خدا وند عالم حضرت ابراہیم کی پیغمبری کے اثبات کے لئے ان کو آگ سے نجات دے

1۔سورۂ انبیاء آیت 69۔یہ بشارت کا واقعہ قرآن کریم میں کئی مقامات پر بیان ہوا ہے منجملہ :سورۂ ہود آیت 71۔73، سورۂ حجر آیت 53۔55، سورۂ والذاریات آیت28۔30۔

نہیں رہ گئی تھی ۔ بظاہر یہ بھی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے نہیں تھابلکہ یہ منجانب اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ایک کرامت تھی۔ اگرچہ یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ خداوند عالم اس کے ذریعہ ان کو یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پیغمبرہیں۔ اس واقعہ کا بھی قرآن کریم میں بہت زیادہ تذکرہ ہے منجملہ ارشاد ہوتا ہے :

(قُلْنَایَانَارُکُوْنِی بَرْدًاوَسَلَاماً عَلَی اِبرَاھِیْمَ)[1]

"تو ہم نے کہا اے آگ تو ابراہیم پر بالکل ٹھنڈی اور سلامتی کا باعث بن جا (کہ ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچے"

ج: حضرت ابراہیم کے ذریعہ پرندوں کے زندہ ہونے کا واقعہ بھی ہے جب آپ نے خداوند عالم سے درخواست کی تھی کہ اے پروردگار :

(رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتَیٰ) ( )[2]

"اے میرے پروردگار مجھے دکھادے کے تو مردے کو کیونکر زندہ کرتا ہے"۔

حکم ہوا ابراہیم چارپرندونکوذبح کرکے ان کے گوشت الگ الگ مقام پر رکھدو۔۔۔ اور پھر ان کو آواز دو اور جب آپ نے ان کو آواز دی تو وہ زندہ ہوگئے۔ یہ بھی نبوت کے اثبات کے لئے نہیں تھا کیونکہ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ شاید آپ کے پاس اور کوئی نہیں تھا ایک بیابان میں جہاں آپ کے (اردگرد) دسیوں پہاڑ پھیلے ہوئے تھے آپ نے یہ کام انجام دیا ممکن ہے کسی اور نے دیکھا بھی نہ ہو ۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی کرامت

انبیاء علیہم السلام سے ظاہر ہونے والی کرامات میں سے حضرت زکریا کا واقعہ بھی ہے جس کا قرآن کریم نے دو مقامات پر ذکر کیا ہے ارشاد ہے :

(ذِکْرُرَحْمَۃِ رَبِّکَ عَبْدَہُ زَکَرِیَّا)[3]

"یہ تمہارے پروردگار کی مہربانی کا ذکر ہے جو (اس نے) اپنے بندہ زکریا کے ساتھ کی تھی"۔

حضرت زکریا علیہ السلام بہت بوڑھے ہو چکے تھے جیسا کہ قرآن کریم میں خود جناب زکریا کی زبانی آیا ہے :

1۔ سورۂ انبیاء آیت69۔

2۔ سورۂ بقرہ آیت260۔

3۔ سورۂ مریم آیت 2۔

(قَالَ رَبِّ اِنِّی وَھَنَ الْعَظْمُ مِنِّی) عرض کی اے میرے پالنے والے میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں۔

(وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَیْبًا) "اور سر کے بال اور بھویں مکمل طور پر سفید ہوچکی ہیں"۔

(وَکَانَتِ امْرَأَتِیْ عَاقِرًا) اور ان کی بیوی بھی اس وقت تک بانجھ تھیں۔پھر بھی انھوں نے خداوندعالم سے فرزند کی دعا کی اور خدا نے بھی آپ کی دعا مستجاب فرمائی اورآپ کو حضرت یحییٰ جیسا فرزند عطا کیا۔

سورۂ آل عمران میں اس بات کا معمولی تمہید کے ساتھ بڑے لطیف انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔یعنی پہلے حضرت مریم علیہا لسلام کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ آپ کا بیت المقدس میں ایک حجرہ تھا جس میں آپ عبادت میں مشغول رہا کرتی تھیں۔[1]

حضرت زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے تھے آپ بیت المقدس کے منتظم تھے ظاہر ہے آپ ہی حضرت مریم علیہا السلام کی خبر گیری رکھتے تھے کہ حضرت مریم علیہا السلام کی روزمرہ کی ضروریات پورا کرے لیکن :

(کُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْھَا زَکَرِیَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَعِنْدَھَارِزْقاً)[2]

"جب بھی زکریا ان کے پاس محراب عبادت میں جاتے تو مریم کے سامنے غذا موجود پاتے"۔

یہ بھی ایک کرامت تھی جو ایک غیر نبی کے لئے انجام پائی (جن کا ہم نے یہاں پر اپنے موضوع کی مناسبت سے ذکر کردیا ہے)جناب زکریا علیہ السلام پوچھتے :

(قَالَ یَامَرْیَمُ اَنّٰی لَکِ ھٰذَا)

"اے مریم !یہ (کھانا)تمہارے پاس کہاں سے آیا "۔

(قَالَتْ ھُوَمِنْ عِنْدِاللّٰهِ اِنَّ اللّٰہَ یَرْزُقُ مَنْ یَشَآئُ بِغَیْرِحِسَابٍ)

"تومریم یہ کہہ دیتی کہ یہ خدا کے یہاں سے (آیا)ہے بیشک خدا جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے "۔

1۔بنی اسرائیل میں رواج تھا کہ کبھی کبھی اپنی اولاد کو بیت المقدس میں عبادت اور خدمت کے لئے وقف کردیتے تھے حضرت مریم کے باپ نے نذر کی تھی کہ اگر خدا نے ان کو اولاد دی تو وہ اس کو بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف کردیں گے ان کے ذہن میں لڑکا تھا لیکن جب لڑکی دیکھی تو کہا (فَلَمَا۔۔۔کَالْاُنْثٰی) جب اپنے بچہ کو دیکھا تو کہا پرودگار یہ تو بچی ہے اور خدا بہتر جانتا ہے اس نے کیا پیدا کیا ہے اور لڑکا لڑکی کے مانند نہیں ہے لیکن جیسا کہ نذر کی تھی حضرت مریم کو بیت المقدس میں لے گئے اور شاید یہ پہلا موقع تھا کہ ایک لڑکی بیت المقدس میں خدمت اور عبادت کے لئے لائی گئی تھی ۔

2۔آل عمران آیت 36۔

ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ : کُلَّمَا دَخَلَ جب بھی (زکریا) ان کی محراب عبادت میں جاتے تو مریم کے سامنے غذا موجود پاتے ۔یعنی حضرت مریم علیہا لسلام کی روزی آسمان سے نازل ہوا کرتی تھی۔جب حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا لسلام کے لئے ان چیزوں کا مشاہدہ کیا کہ خدا اپنے صالح بندوں پر اسی طرح لطف و کرم کرتا ہے تو آپ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ میں بھی اپنے خدا سے ایک فرزند کی خواہش کروں اور آپ نے دعا کی :

(هُنَا لِکَ دَعَاْ زَكَرِيَّا رَبَّهُ)

یہ ماجرا دیکھا اور خدا سے دعا کر بیٹھے بہر حال یہ بھی ایک کرامت ہے جو آپ کو عطا کی گئی تھی ۔

حضرت مریم کی کرامت

(اِذْقَالَتِ الْمَلاَئِكَةُ يَامَرْيَمُ اِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُ كِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَىٰ ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهاًفِى الدُّ نْيَاوَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ) [1]

"(جب فرشتوں نے (مریم سے) کہا اے مریم !خدا تم کو اپنے کلمہ کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام عیسی ابن مریم ہوگا اور وہ دنیا وآخرت میں آبرو اور خدا کے مقرب بندوں میں ہوگا "۔

جس وقت حضرت مریم اپنے حجرے میں عبادت میں مشغول تھیں تو فرشتے نے آپ پر وحی کی (اب حضرت مریم نے اس وقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا یا نہیں یہ آیت سے پتہ نہیں چلتا) آپ کے یہاں بیٹا پیدا ہوگا۔

اس کا نام بھی خدا وند عالم نے رکھ دیا ہے مسیح عیسیٰ ابن مریم ،اور اس کی خصوصیات بھی بیان فرمادی ہیں کہ وہ بچپن میں لوگوں سے باتیں کرے گا اور اسکے بعد ایسا ویسا کرے گا :

(وَيُكَلِّمَ النَّاس فِى الْمَهْدِ وَكَهلاً وَمِنَ الصَّالِحِيْنَ)

"اور جب وہ جھولے میں پڑا ہوگا اور بڑی عمر کا ہو جائیگا لوگوں سے باتیں کرے گا اور نیکو کاروں میں ہوگا "

اس وقت حضرت مریم علیہا السلام نے کہا :

(قَالَتْ رَبِّ اَنَّى يَكُوْنُ لِىْ وَلَد وَلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَر)

"میں کیسے صاحب فرزند ہوں گی جبکہ میں نے شادی نہیں کی ہے اور کسی مرد نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا ہے"۔

فرشتوں نے کہا:(قَالَ كَذَ لِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَايَشَائُ)

1۔آل عمران آیت 45۔

"خدا کا یہی فیصلہ ہے کہ آپ صاحب ادلا د ہوں"۔

حضرت مریم علیہا السلام کے صاحب فرزند ہونے کی بشارت کا واقعہ بھی غیر معمولی تھا اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان (اگر چہ پیغمبر نہ ہو) فرشتوں کے ذریعہ خدا وند عالم کے مخاطب بن سکتے ہیں اور ان پر الہام (یا عام معنی میں ان پر وحی کی جا سکتی ہے۔)

اس کے بعد حضرت مریم علیہا السلام نے ناگہاں ایک انسان کو اپنی مخصوص محراب عبادت میں جہاں حضرت زکریا علیہ السلام کے علا وہ اور کوئی نہیں آسکتا تھا دیکھا جو ایک خوبصورت جوان کی شکل میں ظاہر ہوا تھا حضرت مریم نے کہا :

(قَالَتْ اِنِّي اَعُوذُبِالرَّحْمٰنِ مِنْکَ اِنْ کُنْتَ تَقِيّاً)

حضرت مریم علیہا السلام نہیں سمجھ سکیں کہ یہ جوان فرشتہ ہے آپ نے خیال کیا کہ کوئی ایسا شخص ہے جو شاید کسی برے قصد سے یہاں پر آیا ہے لہٰذا اس فرشتہ نے کہا :

(قَالَ اِنَّمَاَانَارَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَھَبَ لَکِ غُلَامازَکِيّاً)

ایک انسان کے سامنے فرشتہ کا ظاہر ہونا بھی ایک غیر معمولی بات ہے اور اسکے بعد حضرت مریم علیہا السلام کا اسباب طبیعی کے بغیر صاحب فرزند ہونا بھی غیر معمولی واقعہ ہے جو ایک غیر نبی کے لئے رونما ہوا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی کرامت

قرآن کریم میں نبی کے لئے بیان کی جانیوالی کرامتوں میں سے ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مادر گرامی کی داستان ہے:

(وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ)[1]

یعنی خدا کی جانب سے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کے پاس وحی ہوئی کہ تم اس بچے کو ایک صندوق میں رکھ کر دریائے نیل میں ڈال دو اور یہ خوش خبری بھی دیدی گئی کہ ہم اس کو پھر تمہارے پاس پہنچادیں گے اور اس کو (اپنا رسول) بنائیں گے۔

1۔ سورۂ قصص آیت7۔

طالوت کی کرامت

غیر معمولی واقعات میں سے ایک واقعہ طالوت کے تابوت کا بھی ہے طالوت پیغمبر نہیں تھے لیکن خداوند عالم نے ان کے لئے یہ معجزہ ظاہر کیا تاکہ بنی اسرائیل ان کی حکومت تسلیم کرلیں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی ایک پیغمبر کا معجزہ تھا جن کو روایات میں (صموئیل) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ لیکن قرآن میں آیت کا لہجہ اس طرح نہیں ہے بلکہ قرآن کہتا ہے :

(وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ اَنْ يَاتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَة مِنْ رَبِّكُم)[1]

"ان کے (من جانب اللہ) بادشاہ ہونے کی یہ پہچان ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تسکین کی چیزیں ہیں"۔

بہر حال اس میں دو احتمال دیئے جاتے ہیں کہ یا تو یہ صموئیل کیلئے جو نبی تھے معجزہ ہے اگرچہ یہ اثبات نبوت کیلئے نہیں تھا یا پھر یہ طالوت کیلئے کرامت و معجزہ ہے جو خود پیغمبر نہیں تھے۔

ارمیا اور حضرت یونس علیہ السلام کے معجزات

اسی طرح (ارمیا) (یا عزیز) کا واقعہ ہے جو سو سال مردہ رہنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے گئے یہ واقعہ بھی نبوت کے اثبات کیلئے نہیں تھا بلکہ پیغمبر کیلئے ایک غیر معمولی قسم کا واقعہ تھا ۔

اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کا مچھلی کے شکم سے نجات پا جانے کا واقعہ ہے : جب حضرت یونس اپنی قوم کی اصلاح سے ناامید ہوگئے تو آپ نے دریا کی راہ لی اور کشتی پر سوار ہوگئے اتفاقاً دریا میں تلاطم ہوا اور کشتی ڈوبنے لگی ۔ اس زمانہ میں یہ رسم تھی کہ جب کوئی دریائی جانور کشتی پر حملہ کرتا تھا تو اس سے نجات پانے اور کشتی سے دور کرنے کے لئے قرعہ ڈالا جاتا تھا اور اسکے مطابق کشتی میں بیٹھے کسی ایک شخص کو دریائی جانور کے منھ میں ڈال دیا جاتا تھا ، قرعہ ڈالا گیا تو حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکل آیا دوسری اور تیسری مرتبہ بھی آپکا ہی نام نکلا آخر کار آپ کو دریا میں ڈالا گیا ۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کے جانور کے منھ میں جانے کے بعد انسان کے بچنے کا کوئی سوال باقی نہیں رہ جاتا ۔ مچھلی آپ کو نگل گئی آپ نے مچھلی کے شکم میں یہ کہا :

(فَنَادَىٰ فِيْ الظُّلُمٰتِ اَنْ لَااِلٰهَ اِلَّاانْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّی کُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْن فَاسْتَجَبْنَالَهُ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذَالِكَ نُنْجِي الْمُوْمِنِيْنَ)[2]

1۔ سورۂ بقرہ آیت248۔2۔ سورۂ انبیاء آیت87۔88۔

"پس (یونس نے بطن ماہی کے) اندھیرے میں آواز دی کہ (پروردگارا!) تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو (ہر عیب سے) پاک و پاکیزہ ہے بیشک میں ظلم کرنے والوں میں سے ہوں تو ہم نے ان کی دعا قبول کی اور انھیں رنج سے نجات دی اور ہم تو ایماندارو ں کویونہی نجات دیا کرتے ہیں"۔

قرآن کریم میں یہ واقعہ کئی جگہ بیان ہوا ہے اور بعض جگہوں پر اس کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ مچھلی نے آپ کو دریا کے باہر اگل دیا اور خدا نے آپ پر سایہ کے لئے کدو کا درخت اُگا دیا وغیرہ۔۔۔

بہر حال یہ بھی ایک غیر معمولی واقعہ تھا جو اثبات نبوت کیلئے نہیں تھا۔چونکہ آپ کئی سال تک اپنی نبوت کے فرائض انجام دے چکے تھے اور اپنی قوم سے نا امید ہو چکے تھے۔

حضرت دائود علیہ السلام کے کرامات

قرآن کریم میں حضرت دائود اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے بارے میں آیات زیادہ ہیں کہ خداوند عالم نے ان دونوں باپ بیٹے پر اپنا خاص لطف وکرم رکھا ہے منجملہ یہ کہ حضرت دائود کو زرہ بنانے کی صفت سے نوازا اور آپ کے ہاتھ میں لوہے کو موم کی طرح نرم کردیا تھا البتہ یہ بھی ایسا نہیں ہے کہ قابل تاویل نہ ہوچنانچہ معجزہ کا انکار کرنے والوں نے اس کی بھی بڑی آسانی سے تاویل کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ جو قرآن فرماتا ہے:(وَعلّمنَاہ صنعَۃَ لبُوسٍ) یہ اس وجہ سے ہے کہ خداوند عالم کی صفت ہے کہ وہ تمام اشیاء کو اپنی طرف منسوب کرتا ہےچنانچہ یہ ایک توحیدی انداز بیان ہے اور لوہے کو نرم کرنا بھی کوئی غیر معمولی طریقہ سے نہیں تھا بلکہ خدا وند عالم نے آپ کو تعلیم دیدی تھی کہ مثال کے طورپر لوہے کو نرم کرنے کی ایک بھٹی بنائو اور آپ نے خود تجربوں سے ان تمام چیزوں کو سیکھ لیا تھا کہ کس طرح لوہے کو نرم کرکے اس کے حلقے تیار کرکے زرہ بنائی جاتی ہے لیکن اس بارے میں قرآن کا انداز اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ آپ کو یہ سب معجزہ کے عنوان سے عطا کیا گیا تھا اورخدا لوگوں پر احسان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ داوئود کو زرہ بنانے کی تعلیم ہم نے دی تاکہ:

(لتِحْصِنَکُم مِن بَأْسِکُمْ)[1]

"جنگ کے وقت وہ تمہاری حفاظت کریں"۔

(اَلَنَّالَہُ الحَدِیْد) سے بھی نہیں ظاہر ہوتاکہ حضرت داوئود بھٹی میں لوہارکھ کر نرم کیا کرتے تھے بلکہ ظاہر

1۔ سورئہ انبیاء آیت80۔

مطلب یہی ہے کہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا ۔ اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام زبور کی تلاوت کیا کرتے تھے آپ کا لحن اتنا اچھا تھا کہ پہاڑ اور پرندے آپ کے ساتھ خدا کی تسبیح میں شریک ہوجاتے تھے ۔ معجزہ کا انکار کرنے والے اس کی بھی تاویل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام پہاڑ کے دامن میں بیٹھ کر زبور کی تلاوت کرتے تھے تو آپ کی آواز پہاڑ سے ٹکراتی تھی اور یہ وہی آواز کی گونج تھی جو لوگ سنتے تھے اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور کچھ پرندے بھی ایسے ہیں جن کو انسان کی اچھی آواز بہت پسند ہے اور وہ جمع ہوجاتے ہیں لیکن قرآن کا لہجہ اس بارے میں کسی عام طرح کے واقعہ کی نشاندہی نہیں کرتا ۔

مثال کی طور پر قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے :

(وَسَخَّرْنَامَعَ دَاوُوْدَالْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَالطَّیْرَ)[1]

"اور ہم نے داؤد کے ہمراہ پہاڑ اور پرندوں کو بھی تسخیر کرلیا کہ (خدا کی) تسبیح کریں"۔

کیا یہ تعبیر آواز کے مرتعش ہونے سے میل کھاتی ہے ؟"والطیر"یعنی" (وسخرناالطیریُسَبِّحْن) ، (وَکُنَّافَاعِلِیْنَ) اس بات کی مزید تاکید ہے کہ اس کام کو ہم نے (یعنی خدا نے) انجام دیا۔ اگر یہ ایک عام واقعہ تھا تو (وکنا فاعلین)کی ضرورت نہیں تھی۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَلَقَدْ اٰتَیْنَادَاوُوْدَمِنَّا فَضْلاً یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهُ وَالطَّیْرَوَاَلَنَّالَهُ الْحَدِ یْدَاَنِ اعْمَلْ سَابِغَاتٍ وَقَدِّرْ فِی السَّرْدِ) [2]

"اور ہم نے یقیناً داود کو اپنی طرف سے بزرگی عنایت کردی کہ اے پہاڑ وںّاور اے پرندو ں ان کے ہم آواز ہوجاؤ اور ان کے واسطے لوہے کو نرم کردیا تھا اور ان کو حکم دیا کہ فراخ وکشادہ زرہیں بناؤ اور (کڑیوں کے) جوڑنے میں اندازہ کا خیال رکھو ۔۔۔"۔

یہ بھی بہ ظاہر آواز کا قدرتی ارتعاش نہیں ہے البتّہ یہ تمام چیزیں انھیں نبوت ثابت کرنے کیلئے نہیں عطا کی گئی تھیں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے کرامات

1۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک معجزہ عطا کیا گیا تھا کہ آپ پرندوں کی باتوں کو سمجھ لیتے تھے:

1۔ سورۂ انبیاء آیت79 ۔

2۔ سورۂ سبا آیت 10 ۔ 11 ۔

(وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ وَقَالَ يَاأَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِوَأُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْئٍ) [1]

"سلیمان داود کے وارث ہوئے اور کہا لوگو ہم کو پرندوں کی بولی بھی سکھائی گئی ہے اور ہمیں (دنیا کی) ہر چیز عطا کی گئی ہے"۔

شاید اس آیت سے یہ مطلب نکالا جاسکتا ہے کہ حضرت داود بھی ایسے ہی تھے کیونکہ آیت میں (عُلِّمْنَا) کہا گیا ہے جو جمع کا صیغہ ہے اور (عُلِمْتُ) نہیں ہے۔

2۔ اور ان آیات سے یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ جانوروں کی زبان کا جاننا صرف پرندوں تک محدود نہیں تھا بلکہ دوسرے حیوان بھی شامل ہو جاتے تھے چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام چیونٹیوں کی آواز بھی سن سکتے تھے:

(يَاأَيُّهَاالنَّمْلُ ادْخُلُوْامَسَكِنَكُمْ) [2]

"اے چیونٹیوتا پنے اپنے سوراخوں میں گھس جائو"۔

حضرت سلیمان نے اسکو سنا اور سمجھ لیا :

(فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًامِنْ قَوْلِهَا)

"پس سلیمان اس کی بات سن کر ہنس پڑے۔۔۔"۔

3۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک معجزہ یہ تھا کہ خداوند عالم نے آپ کے لئے ہوا کو مسخّر کردیا تھا کہ آپ جس جگہ چاہتے تھے ہوا آپ کے حکم سے آپ کے تخت کو اٹھا کر لیجاتی تھی لیکن معجزہ کا انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ یہ ایک طرح کا ہوائی جہاز تھا جو اس زمانہ میں بنایا گیا تھا لیکن قرآن کریم کے لہجہ سے ایسا نہیں لگتا :

(وَلِسُلَيْمانَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌوَرَوَاحُهَا شَهْرٌ) [3]

"اور ہم نے ہوا کو سلیمان کا تابع بنا دیا تھا وہ ایک صبح میں ایک مہینہ کی (مسافت) طے کرلیتے تھے اور رات میں بھی ایک مہینہ کی راہ طے کرتے تھے"۔ اسی سلسلہ کی ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے :

(فَسَخَّرْنَالَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ اَصَابَ) [4]

1۔ سورۂ نمل آیت 16۔

2۔ سورۂ نمل آیت18۔19۔

3۔ سورۂ سبا آیت 12۔

4۔ سورۂ ص آیت 36۔

"پس تو ہم نے ہوا کو ان کا تابع کردیا کہ جہاں وہ پہنچنا چاہتے تھے ان کے حکم کے مطابق دھیمی چال سے چلتی تھی"۔

4۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک اور معجزہ تھا کہ خداوند عالم نے ان کے لئے تانبے کا ایک چشمہ ظاہر کردیا تھا گویا تانبہ پگھلانے کی صنعت ان کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے خداوند عالم فرماتا ہے:

(وَاَسَلْنَالَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ)

"اور ہم نے ان کیلئے تانبے (کو پگھلا کر اس) کا چشمہ جاری کردیا تھا"۔

5۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک اور معجزہ یہ تھا کہ جن اور شیاطین ان کے قبضے میں تھے قرآن کریم فرماتا ہے:

(وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهِ وَمَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَانُذِ قْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ)[1]

"اور دیو کی ایک جماعت ان کے پروردگار کے حکم سے ان کے کام (کاج) کرتی تھی اور ان میں سے جس کسی نے ہمارے حکم سے انحراف کیا اسے ہم آگ کے عذاب کا مزہ چکھائیں گے"۔

اور پھر اس کی تفسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ جنات کیا کیا کام کرتے تھے:

(يَعْمَلُوْنَ لَهُ مَايَشَائُ مِنْ مَحَارِيبَ وَتَمَثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَاب وَقُدُوْرٍ رَاسِيَاتٍ)[2]

"سلیمان جو کچھ بنوانا چاہتے یہ جنّات اونچے محل اور مجسمے اور حوض کے برابر پیالے اور (بڑی بڑی) دیگے بنادیتے تھے"۔

اس آیت سے یہ ظاہر پتہ چلتا ہے کہ محل وغیرہ کی سجاوٹ کیلئے تصویر وغیرہ ۔۔۔بناتے تھے۔

اسی سلسلہ کی دوسری آیت میں آیا ہے:

(وَالشَّيِّطِيْنَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَغَوَّاصٍ وَآخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِيْ الاَصْفَادِ)[3]

"اور دیو کو ان کے قابو میں کردیا جو عمارت بنانے والے اور غوطہ لگانے والے تھے اور اس کے علاوہ بھی دوسرے دیوئوں کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے"۔

1۔ سورۂ سبا آیت12۔

2۔ سورۂ سبا آیت13۔

3۔ سورۂ ص37۔38۔

اصحاب کہف

غیر نبی کیلئے ظاہر ہونے والی کرامت میں سے ایک اصحاب کہف کا واقعہ بھی ہے جو ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو پیغمبر بھی نہیں تھے خداوند عالم نے ان کو تین سو سال گہری نیند سلا دیا اور پھر ان کو بیدار کیا و۔۔۔"۔

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی کبھی غیر معمولی واقعات انسان کے ارادہ کے تابع نہیں ہوتے یعنی ضروری نہیں ہے ہمیشہ غیر معمولی کام انسان کے ارادے اور اختیار سے ہی انجام پائیں بلکہ ممکن ہے فرشتوں کے ارادہ سے انجام پائیں البتہ اس میں انسان کے ارادہ کی بھی نفی نہیں کی گئی ہے لیکن اصحاب کہف کا واقعہ اس طرح ہے کہ خود انھوں نے تین سو سال سونے کا ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ کچھ دیر آرام کے بعد دوبارہ اپنے راستہ پر آگے بڑھنا چاہتے تھے لیکن خود ان کے یا کسی دوسرے انسان کے چاہے بغیر خداوند عالم نے ان کو تین سو سال سلائے رکھا:

عقلی نکتہ

یہاں پر نامناسب نہ ہوگا اگر ایک عقلی نکتے کی طرف اشارہ کردیا جائے:

غیر معمولی واقعات جب کسی انسانی نفس سے منسوب ہوں تو ہم اس وقت یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وجود فلاں موجود کو متاثر کرنے کرنے یا وجود میں آنے کا ذریعہ بنا ہے اور چونکہ اس کا بدن سے تعلق ہے اس میں مادی شرطیں پائیں جاتی ہیںلیکن جب تقریباً کسی غیر مادی علّت سے منسوب ہو تو یہ سوال پیش آتا ہے کے مجرد تام کی نسبت تمام چیزوں اور تمام جگہوں سے ایک ہوتی ہے تو کیسے ایک مجرد تام بہ درجہ کوئی مخصوص مادی واقعہ کسی جگہ ایجاد کر سکتا ہے ؟ یہ وہ اعتراض ہے جن کا فلسفہ اور معجزات کا عقلی تجزیہ کرنے والوں کو سامنے کرنا پڑتا ہے اس کے جواب میں وہی بات کہدینا کافی ہے جو خود فلسفہ تمام عادی امور میں دیتے ہیں اور وہ یہ ہے: کوئی بھی مادہ جب (وجود کیلئے) تیار ہوجاتا ہے عقل وفعّال کے ذریعے اس کو صورت دی جاتی ہے وقت اور جگہ سے اس کا مخصوص ہونا یہ قابل استعداد پر منحصر ہے فاعل کی تاثیر نہیں ہے۔ اصحاب کہف کے اندر یہ استعداد جو پیدا ہوئی تھی اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کون سی استعداد تھی لیکن ان کے اندر کچھ ایسے حالات کا پایا جانا کہ جن کا تقاضا اس طرح کا تھا طے ہے تو معلوم ہوا کہ اس کا فاعل کسی مجرد تام کو مان لے جو ان موجودات کا باعث ہوا ہو لیکن اس کا ان افراد اور اس زمان سے مخصوص ہونا خود فاعل کی طرف سے ہو تو ان کے مابین کوئی منافات نہیں پائی جاتی۔

نتیجہ

اس پوری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غیر معمولی واقعات خواہ وہ علم کی صورت میں ہوں، خواہ فرشتوں کے تکلّم یا مخصوص افعال کا نتیجہ ہو انبیاء علیہم السلام سے مخصوص نہیں ہیں اور نہ ہی مقام اور نبوت کے اثبات سے مخصوص ہیں۔ عقل کی بنیاد پر جو بات ضروری ہے وہ یہ کہ جب کسی پیغمبر کی نبوت کا اثبات معجزہ پر موقوف ہو تو معجزہ دکھلایا جانا چاہئے تاکہ حجت تمام ہوجائے لیکن تمام مقامات پر یہ ایک طرح کا خدا کا فضل اور لطف ہے اور جب بھی اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے تو وہ ایک غیر معمولی کام معجزہ یا کرامت کی صورت میں انجام دیدیتا ہے۔

دائمی اعجاز

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا اثبات معجزہ پر موقوف ہو تو حکمت الٰہی تقاضا کرتی ہے کہ وہ ان کو معجزہ عطا کر دے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے بارے میں اس کی کیا صورت ہے قرآن کریم فرماتا ہے کہ گذشتہ انبیاء علیہم السلام نے پیغمبر اسلام ﷺ کے ظہور کی بشارت دی تھی یہاں تک کہ اہل کتاب پہلے سے آپ کے ظہور کے منتظر تھے۔ اس بناء پر ان کے لئے آنحضرت کی نبوت ثابت تھی اور اتنے واضح وآشکار قرینے اور نشانیاں موجود تھیں کہ آنحضرت کی نبوت میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جہاں تک دوسرے لوگوں کا سوال ہے تو جو بشارتیں انھیں دی گئیں تھیں اور جن کو وہ بیان کیا کرتے تھے (اور بعد میں متحقق ہوئیں) ان کی وجہ سے ان پر بھی حجت تمام ہو چکی تھی لیکن چونکہ پیغمبر اسلام ﷺ کسی ایک سرزمین اور کسی ایک زمانہ کے لئے مبعوث نہیں کئے گئے تھے بلکہ جب تک انسان اس روئے زمین پر زندہ ہیں اور زندگی بسر کرتے رہیں گے ان کو پیغمبر اسلام ﷺ کا اتباع کرنا ہے ایسی صورت میں حکمت الٰہی کا یہ تقاضا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ایسا جاودانہ معجزہ عطا کرے جو کسی خاص زمان اور مکان سے مخصوص نہ ہو۔ چونکہ تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات صرف اپنے زمانہ والوں کے لئے جو ان سے ملاقات کرتے تھے ثابت ہونا کافی تھا اور اس کے بعد غائبین کے لئے حاضرین کے نقل کر دینے سے ثابت تھا لیکن یہ طریقہ ہمیشہ کے لئے بہت زیادہ مفید نہ تھا۔ یعنی اگر صرف دوسروں کے نقل کرنے پر اکتفاء کر لی جاتی تو ہزاروں سال کی مدت میں یہ محض نقل کرنے کا طریقہ آہستہ آہستہ اپنی اہمیت کھو بیٹھتا۔ لہٰذا کوئی ایسا (دائمی معجزہ) ہونا چاہیئے تھا کہ جس کے ذریعہ لوگ ہمیشہ پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوت کو پہچان سکیں۔ اسی وجہ سے خداوندعالم نے پیغمبر اسلام ﷺ پر ایسی کتاب نازل فرمائی جو بذات خود بڑا ہی عظیم اور جاودانہ معجزہ ہے۔

اہل کتاب کے نزدیک پیغمبر اسلام ﷺ کی نشانیاں

(اَلَّذِیْنَ آتَیْنَا هُمُ الْکِتَا بَ یَعْرِفُوْ نَهُ کَمَا یَعْرِ فُوْنَ اَبْنَا ئَ هُمْ) [1]

"اہل کتاب جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں (اسی طرح)وہ اس (پیغمبر حضرت محمد)کو بھی پہچانتے ہیں"۔

جس ما حول میں یہ آیت نازل ہوئی اس کی تحقیق کریں توحقائق کے سمجھنے میں بہت مدد ملے گی خدا وند عالم نے اہل کتاب کے با رے میں پیغمبر اسلام ﷺ سے اس دشمنی کے با وجود جو ان میں سے بعض آپ کے ساتھ رکھتے تھے صاف طور پر فرمایا ہے:

(یَعْرِفُوْنَهُ کَمَا یَعْرِفُوْ نَ اَبْنَا ئَ هُمْ)

"وہ آپ کو اپنے بچوں کی طرح پہچانتے تھے"۔

اگر اس مسئلہ میں کوئی شک و شبہ ہوتا تو وہ اتنا پروپگنڈہ کرتے کہ جس کا تصور نہیں، ایسا نہیں ہے ہم اس پیغمبر کو نہیں پہچانتے ،ہماری کتابوں میں ان کے بارے مینکچھ بیان نہیں ہوا ہے لیکن قرآن کریم نے دو مرتبہ صاف طور پر کہا ہے کہ کہ وہ اپنے بچوں کی طرح اِس پیغمبر کو پہچانتے ہیں اور ان کے پاس کہنے کو اس کا کوئی جواب بھی نہیں تھا ۔

(وَکَانُوامِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَی الَّذِ یْنَ کَفَرُوْا فَلَمَّاجَائَ هُمْ مَاعَرَفُوْا کَفَرُوْابِهِ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الکَافِرِیْنَ) [2]

"اہل کتاب با وجودیکہ پہلے (آنحضرت کے ظہور کے ذریعے)کافروںپر فتحیاب ہونے کی دعائیں مانگتے تھے پھر بھی ان کے آنے اور پہچان لینے کے بعد بھی انھوں نے انکار کیا (اور ایمان نہیں لائے)پس کافروں پر خدا کی لعنت ہے"۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے مبعوث ہونے سے پہلے اہل کتاب مشرکوں کے ساتھ گفتگو کے وقت یہ بشارت دیا کرتے تھے کہ تمہارے درمیان سے ایک پیغمبر مبعوث ہونے والا ہے جو ہماری تصدیق کرے گا اس وقت تم لوگ سمجھو گے کہ ہمارا دین حق ہے اور خدا کی طرف سے ہے اور اس سے ہماری عزت وآبرو بڑھے گی کہ ہمارا دین باطل نہیں تھایہی لوگ جو مشرکوں سے اس طرح کی گفتگو کیا کرتے تھے جب پیغمبر اسلام ﷺ مبعوث ہوئے تو آپ کو

1۔ سورۂ بقرہ آیت 146 و سورۂ انعام آیت 20۔

2۔ سورۂ بقرہ آیت 89 ۔

پہچاننے کے باوجود آپ کے منکر ہوگئے پس کافروں پر خدا لعنت کرے۔

قرآن کلی طور پر فرماتا ہے کہ تورات میں اور انجیل میں بھی اس پیغمبر کے مبعوث ہونے کی بشارت دی گئی تھی:

(اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهُ مَکْتُوْباًعِنْدَهُمْ فِی التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِیْلِ)[1]

"یعنی جو لوگ ہمارے اس رسول سے نبی امّی کے قدم بہ قدم چلتے ہیں کہ جن کا نام انھوں نے اپنے ہاں توریت اور انجیل میں لکھا ہوا دیکھا ہے"۔ مندرجہ بالا آیت میں اہل کتاب کے مومنین کی تعریف کی گئی ہے کہ وہ اسی پیغمبر کا اتباع کرتے ہیں کہ جس کی بشارت انھوں نے اپنے ہاں توریت و انجیل میں لکھی ہوئی دیکھی ہے۔ پس قرآن ہم کو یہ سمجھاتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے ظہور کی بشارت تورات اور انجیل میں پہلے سے دیدی گئی تھی اور خاص طور سے حضرت عیسیٰ ابن مریم کی زبانی نقل فرماتا ہے کہ انھوں نے پیغمبر اسلام (حضرت محمد مصطفی ﷺ کے ظہور کی بشارت دی تھی اور آپ کا نام (احمد) پہلے سے بتایا تھا:

(وَمُبَشِّراًبِرَسُوْلٍ یَاْتِیْ مِنْ بَعْدِیْ اسْمُهُ اَحْمَدُ)[2]

"اور ایک پیغمبر جن کا نام احمد ہوگا اور میرے بعد آئینگے ان کی خوشخبری سناتا ہوں"۔

(اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْارَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنْکِرُوْنَ)[3]

"آیا یہ اپنے رسول کو نہیں پہچانتے جو اس کا انکار کر بیٹھے ہیں"۔

معلوم ہوا اہل کتاب پیغمبر اسلام ﷺ سے مکمل طور پر آشنا تھے اور وہ جانتے تھے کہ یہ وہی پیغمبر ہے کہ جس کے ظہور کی بشارت گذشتہ انبیاء علیہم السلام نے دی تھی پس قرآن کی رو سے اہل کتاب پر حجت تمام ہو چکی تھی لیکن دوسروں کی کیا کیفیت ہے؟ یہ بشارتیں جو اہل کتاب دیا کرتے تھے اور بعض لوگ اس کی تصدیق بھی کیا کرتے تھے اس سے دوسروں کے لئے بھی حجت تمام کر دی تھی یعنی جب کچھ لوگوں نے آکر یہ خبر دی کہ فلاں زمانہ میں فلاں قبیلہ سے ایک شخص ان خصوصیات کے ساتھ مبعوث ہوگا تو اس وعدہ کا متحقق ہونا اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ گزشتہ کتا بیںبھی سچی تھیں کہ جن میں سے اس طرح کی خوشخبریاں درج ہیں اور یہ پیغمبر بھی اپنی رسالت کے دعوے میں سچا ہے لہذا اہل کتاب جو بشارتیں لوگوں کے سامنے بیان کرتے تھے اور بعد میں بعض لوگوں نے بھی اس کی تصدیق کر دی

1۔ سورۂ اعراف آیت 157۔

2۔ سورۂ صف آیت 6۔

3۔ سورۂ مومنون آیت 69۔

تھی اس کے سبب دوسرے لوگوں کے لئے بھی حجت تمام ہو جاتی ہے اس سلسلہ میں قرآن کریم فرماتا ہے:

(وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَآ مَنَ)[1]

"بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ (شاید ان کے عالم عبد اللہ سلام کی طرف اشارہ ہے) گواہی بھی دے چکا اور ایمان بھی لے آیا کہ یہ وہی پیغمبر ہے کہ جس کی ہم بشارت دیا کرتے تھے"۔

ایک اور آیت شریفہ میں ارشاد ہوتا ہے:

(اَوَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ آيَةً اَنْ يَعْلَمَهُ عُلَمَآئُ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ)[2]

"کیا ان کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ علمائے بنی اسرائیل اس طرح کے نبی کی بعثت سے با خبر ہیں"۔

معلوم ہوا گذشتہ کتابوں کی بشارتیں صرف اہل کتاب کے لئے ہی حجت نہیں تھیں بلکہ وہ تمام معاصرین جو ان خوشخبریوں سے آگاہ تھے اور جنھوں نے وہ نشانیاں پیغمبر میں دیکھ لی تھیں ان کے لئے بھی حجت تمام ہو گئی تھی ۔

چیلنج، قرآن کے معجزہ ہونے کا ثبوت

قارئین کرام جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں چونکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت ابدی اور عالم گیر ہے آپ کا معجزہ بھی عالم گیر ہونا چاہئے اسی بناء پر قرآن خود معجزہ کی صورت میں نازل ہوا۔

قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر یہ دعویٰ موجود ہے کہ یہ کتاب معجزہ ہے اور کوئی شخص قرآن کا مثل نہیں لا سکتا ۔ ہم یہاں پر اس موضوع سے متعلق آیات مختصر طور پر عرض کرتے ہیں :

پیغمبر اسلام ﷺ نے متعدد مقامات پر خداوند متعال کی طرف سے لوگوں کو یہ دعوت دی ہے کہ اگر تم لوگوں کو اس کتاب یا میری رسالت میں شک ہے تو تم بھی اس کے مثل کتاب لے آئو۔ اتفاق سے بعض لوگ اس طرح کی باتیں کیا کرتے تھے کہ اگر ہم چاہیں تو اس طرح کی کتاب لا سکتے ہیں قرآن کریم ان کے دعوے کو اس طرح نقل کرتا ہے :

(وَاِذَاتُتْلَى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَاقَالُوْاقَدْ سَمِعْنَالَوْنَشَآئُ لَقُلْنَامِثْلَ هٰذَآاِنْ هٰذَآاِلَّااَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ)[3]

"اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو بول اٹھتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور اگر چاہیں تو اس

1۔ سورۂ احقاف آیت 10 ۔

2۔ سورۂ شعراء آیت 197 ۔

3۔ سورۂ انفال آیت 31 ۔

طرح کی باتیں ہم بھی کہہ سکتے ہیں یہ پچھلے لوگوں کے سواء اور کچھ نہیں ہے"۔

مقابلہ کی اس دعوت کو چیلنج کہتے ہیں یہ چیلنج قرآن میں کئی طریقہ سے بیان کیا گیا ہے ایک یہ کہ اس قرآن کے مثل لے آئو اس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ اس کتاب کے جیسی کوئی کتاب یا اس قرآن کے سوروں کے مجموعہ جیسا کوئی مجموعہ لے آئو قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

(قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ اَنْ يَاْتُوابِمِثْلِ هٰذَاالْقُرْآنِ لاَ يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهِ وَلَوْكَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْراً)[1]

"اے رسول) کہہ دیجئے کہ اگر دنیا کے تمام آدمی اور جن اکٹھا ہوں کہ اس قرآن کا مثل لے آئیں گے تو اس کے جیسا نہیں لا سکتے اگرچہ (اس کوشش میں ایک دوسرے کی مدد بھی کریں"۔

اور قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

(فَلْيَاْتُوْابِحَدِيْثٍ مِثْلِهِ اِنْ كَانُوْاصَادِقِيْنَ)[2]

"اگر یہ لوگ سچے ہیں تو ایسا ہی کوئی کلام بنا لائیں"۔

پس ان دو آیتوں میں یہ چیلینج کیا گیا ہے کہ اس قرآن کی مانند کوئی کتاب اور کوئی کلام اگر لا سکیں تو لے آئیں اور بہ ظاہر مجموعۂ قرآن کا جواب مطلوب ہے لیکن بعض آیات میں پورے قرآن کی بھی بات نہیں ہے۔جیسا کہ ایک مقام پر دس سوروں کا اور ایک مقام پر صرف ایک سورہ کا جواب لانے کا چیلنج کیا گیا ہے جو ظاہراً قرآن کے چھوٹے سوروں پر بھی صادق آتا ہے۔یعنی اگر قرآن کے کسی چھوٹے سورہ کے مثل ایک سطر بھی لے آتے تو اس آیت کے مطابق پیغمبر اس کو قبول کر لیتے اور یہ اس چیز کی نشانی ہوتی کہ یہ کتاب خداوند عالم کی کتاب نہیں ہے۔ معلوم ہوا قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ اگر تمام انسان جمع ہوجائیں تو وہ بھی قرآن کے ایک سطر کے برابر کسی چھوٹے سے سورہ کا جواب نہیںلا سکتے:

(اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوْابِعشْرِسُوَرٍمِثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوْامَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ)[3]

1۔ سورۂ اسراء آیت 88۔

2۔ سورۂ طور آیت 34۔

3۔ سورۂ ہود آیت 13۔

"یا یہ لوگ کہتے ہیں یہ شخص اپنی طرف سے گھڑ لیتا ہے اور جھوٹ موٹ اسے خدا کی طرف منصوب کردیتا ہے تو آپ ان سے صاف صاف کہدیں کہ اگر تم (اپنے دعوے میں) سچّے ہو تو (زیادہ نہیں) ایسے دس سورہ اپنی طرف سے گڑھ کے لے آئو خدا کے سوا جس جس کو تمھیں بلاتے بن پڑے مدد کے واسطے بلا لو"۔

کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو آپ نے خود گڑھ لیا ہے۔تو ان سے کہدیجئے کہ تم بھی اس قرآن کے دس سوروں کے مثل گڑھ کرلے آئو اور جس کو تم چاہو اپنی مدد کے لئے بھی بلا سکتے ہو۔

نہ صرف یہ کہ تم اس کے مثل نہیں لا سکتے بلکہ دوسروں کی مدد کے ذریعہ بھی چاہے جس کسی کو بھی بلا لو ایسا نہیں کر سکتے۔قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

(فَالَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَکُمْ فَاعْلَمُوْااَنَّمَآ اُ نْزِلَ بِعِلْمِ اللہ) [1]

"پس اگر وہ قبول نہ کریں تو سمجھ لیجئے کہ یہ قرآن خدا کی کتاب ہے اور صرف خدا کے علم کی بنیاد پر نازل کیا گیا ہے"۔

یعنی مقابلے اور چیلنج کی فضا اس قدر آمادہ وتیار ہے کہ اس پر کوئی بھی عاقل انسان اگر غور کرے تو اسے یہ یقین ہوجائیگا کہ یہ کتاب خداوند عالم کی کتاب ہے۔

کلام عربی زبان میں (بلسانٍ عربی مبین)صاف عربی زبان میں ہے اور انھیں حروف سے ملکر بنی ہے جس میں تمام لوگ باتیں کیا کرتے ہیں ان ہی الفاظ سے بنی جن کا لوگ اپنے محاوروں یںنًا ستعمال کرتے ہیں، مفردات وہی مفردات ہیں ترکیب نحوی کے لحاظ سے وہی بتدا خبر، فاعل اور مفعول ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کوئی شخص قرآن کے دس سورں کے مثال نہیں لا سکتا اور چیلنج کا جواب دینے کیلئے بھی بہت سے تقاضے موجود ہیں یہ دیکھتے ہوئے کہ کفّار و مشرکین نے پیغمبر اسلام ﷺ کی تبلیغ کے اثر کو ختم کرنے کیلئے اپنی تمام طاقتوں کو صرف کرڈالا تھا اگر ایک ایک سطر کے دس سورے لکھنا ان کے لئے ممکن ہوتا تو یقین ہے وہ ضرور ایسا کرتے اور اگر ایسا نہ کرسکے تو یہ بتاتا ہے کہ ایک عام انسان کا کام نہیں ہے قرآن نے ایک دوسری آیت میں مقابلے کی شرط کو اور ہلکا کردیا ہے ارشاد ہوتا ہے:

(اَ مْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰہُ قُلْ فَأْ تُوْابِعشرسُوَرٍ مِثْلِہِ مُفْتَرَیَاتٍ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللہ اِنْ کُنْتُمْ صٰادِقِیْنَ)[2]

1۔سورئہ ہود آیت 14۔

2۔سورئہ ہود آیت 13۔

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص جھوٹ ہی (قرآن کی) خدا کی طرف نسبت دیتا ہے تو آپ (ان سے صاف صاف) کہہ دیجئے کہ اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو (زیادہ نہیں) صرف ایک سورہ اپنی طرف سے بنا کے لے آئو اور خدا کے سوا جس کسی کو تم سے بلاتے بن پڑے مدد کے واسطے بھی بلا لو"

ہم دس سوروں سے صرف نظر کرتے ہیں صرف ایک سورہ کا جواب لے آئو اور یہ ایک سورہ بھی صرف ایک انسان نہیں بلکہ جس کو بھی تم چاہو اپنی مدد کے لئے بلا لو اپنی تمام طاقتوں اور افکار کو جمع کر لو اور قرآن کے جیسی ایک سطر بنا کے لے آئو۔

اور رہا یہ مسئلہ کہ بعض آیات میں دس سوروں اور بعض آیات میں صرف سورہ کا چیلنج کیوں کیا گیا ہے، تو اس بارے میںعام طور پر مفسّرین قرآن یہ کہتے ہیں کہ یہ درجہ بدرجہ چیلنج ہے۔

یعنی پہلے یہ چیلنج کیا گیا کہ پورے قرآن کا جواب لے آئو اس کے بعد فرمایا گیا اگر پورے قرآن کا جواب نہیں لا سکتے تو دس سوروں کا جواب لے آئو اس کے بعد فرمایا اگر دس سوروں کا مثل بھی نہیں لا سکتے ہو تو ایک سورہ کا ہی مثل لے آئو اور یہ مد مقابل کی عاجزی کو ثابت کرنے کا زیاد بلیغ اور بہتر طریقہ ہے۔

لیکن یہ بات اس صورت میں صحیح ہو سکتی ہے کہ آیتیں بھی اسی ترتیب سے نازل ہوئی ہوں یعنی پہلے وہ آیات نازل ہوئی ہوں کہ جن میں پورے قرآن کے جواب کا چیلنج ہو، اس کے بعد وہ آیت نازل ہوئی ہو جس میں دس سوروں کا مثل لانے کا چیلنج کیا گیا ہو اور اس کے بعدوہ آیت نازل ہوئی ہو جس میں ایک سورہ کا مثل لانے کا چیلنج ہو لیکن قرآنی سوروں کے نازل ہونے سے متعلق روایات کے ساتھ یہ بات میل نہیں کھاتی۔ کیونکہ دس سوروں کا مثل لانے کا چیلنج سورۂ ہود میں ہے اور ایک سورہ کا مثل لانے کا چیلنج سورہ یونس و سورہ بقرہ میں ہے اور عام طور پر جن لوگوں نے قرآن کے سوروں کے نازل ہونے کی ترتیب بیان کی ہے وہ سورۂ یونس کا سورۂ ہود سے پہلے نازل ہونا بیان کرتے ہیں اگرچہ ایک قول یہ بھی ہے کہ سورۂ ہود سورۂ یونس سے پہلے نازل ہوا ہے لیکن زیادہ تر اقوال میں سورۂ یونس کا پہلے نازل ہونا بیان ہوا ہے۔ اس بناء پر مشہور روایات کے مطابق درجہ بدرجہ چیلنج میں شدّت کا نظریہ سوروں کے نازل ہونے کی ترتیب کے ساتھ میل نہیں کھاتا اب یا تو ہم غیر مشہور روایت کے قول کو قبول کریں یا پھر کوئی اور وجہ بیان ہونی چاہیئے۔

صاحب المیزان علاّمہ طبا طبائی نے اس کی ایک دوسری وجہ بیان فرمائی ہے اور وہ یہ ہے :

ایک سورہ کا جواب لانے کا چیلنج ایک جہت سے ہے اور دس سوروں کا جواب لانے کا چیلنج دوسری جہت سے ہے ۔پورا قرآن بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے اس کے ایک سورہ یا کئی سوروں کے ما بین کوئی فرق نہیں ہے ۔ لہٰذا اگر قرآن کے جیسا ایک سورہ بھی لے آئیں جس میں قرآن جیسی بلاغت ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ قرآن کریم خداوند عالم کا کلام نہیں ہے لیکن صرف بلاغت ہی کسی کلام کے مفید و رسا ہونے کیلئے کافی نہیں ہے بلکہ مختلف فنون ہیں اور ہر فن کی ایک خاص خصوصیت ہوتی ہے جب خداوند عالم فرماتا ہے کہ دس سوروں کا جواب لے آئو تو گویا یہ کہنا چاہتا ہے کہ کلام میں حُسن پیدا کرنے کے جتنے بھی طریقے اور انداز ممکن ہوسکتے ہیں ان سب کو قرآن چیلنج کرتا ہے گویا یہ کہنا چاہتا ہے کہ تم کسی بھی اعتبار سے چاہے وہ کلام کا کوئی بھی میدان ہو قرآن کا مثل نہیں لاسکتے ہو۔ قرآن جہاں علوم و معارف کی بحث ہے تو تم اسکا جواب نہیں لا سکتے ، قرآن جہاں احکام بیان کرتا ہے تم اس کا جواب نہیں لاسکتے قرآن نے جہاں داستانیں اور قصّے بیان کئے ہیں جہاں اخلاق کے موضوع پر باتیں کی ہیں وغیرہ کسی بھی فن میں جن پر قرآن میں گفتگو ہے اگر تم مقابلہ کرنا چاہتے ہو تو اس کا جواب اسی فن میں لے آئو مثال کے طور پر ایسے دس سورے لے آئو کہ جن میں ہر سورہ کسی خاص روش کا حامل ہو اور کسی خاص فن میں بات ہوئی ہو تمہارے کلام کا قرآن سے اسی وقت مقائسہ کیا جاسکتا ہے کہ جب تم ان تمام فنون میں مقابلہ کرسکو ۔پس ممکن ہے یہ (سورئہ ہود کی) آیت سورئہ یونس کے بعد نزل ہوئی ہو اور پھر بھی دس سوروں کا جواب لانے کا چیلنج اس میں کیا گیا ہو۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ خداوند عالم نے پورے قرآن کا بھی، دس سورہ کا بھی اور ایک سورہ کا بھی مثل لانے کا چیلنج کیا ہے اگر درجہ بہ درجہ چیلنج آیات کے نزول کے ساتھ ثابت ہو جائے تو وہ وجہ سب سے زیادہ واضح اور قابل قبول ہے مندرجہ ذیل آیت میںبھی ایک سورہ کا مثل لانے کا چیلنج کیا گیا ہے :

(وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّانَزَّ لْنَاعَلٰی عَبْدِنَافَاْتُوْابِسُوْرَ ةٍ مِّنْ مِثْلِهِ وَادْعُوْا شُهَدَائَ کُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ کُنْتُمْ صَادِ قِیْنَفَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْاوَلَنْ تَفْعَلُوْافَاتَّقُوْاالنَّارَ الَّتِی وَقُوْدُهَاالنَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْکَافِرِیْنَ)[1]

"اور اگر تم اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے (محمد)پر نازل کیا ہے شک میں ہو تو اگر تم سچّے ہو تم (بھی) ایک ایسا ہی سورہ بنا لائو اور خدا کے سوا جو تمہارے گواہ ہوں ان سب کو (بھی) بلا لو، پس اگر تم یہ نہیں کرسکتے ہو اور ہرگز نہیں کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کے ایندھن بدکار آدمی اور پتھر ہوں گے اور کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے"۔

تعبیر کے لحاظ سے شاید یہ آیت دوسری آیات سے زیادہ مطلب کو سمجھا سکتی ہو کیونکہ بحث کے وقت جب دو

1۔ سورئہ بقرہ آیت 23 و 24 ۔

آدمی ایک دوسرے سے بحث کرتے ہیں ایک کہتا ہے کہ اگر تم حق پر ہو تو فلاں کام کرڈالو زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ وہ اس کام کو انجام نہیں دے سکے گا اور بحث میں ہار جائیگا لیکن قرآن اس پر اکتفاء نہیں کرتا بلکہ ان کو پوری طرح ابھارتا اور یہ کام انجام دینے کا شوق دلاتا ہے:

(فَاِ نْ لَمْ تَفْعَلُوْاوَلَنْ تَفْعَلُوْافَاتَّقُوْاالنَّاَ رَ)

صرف تمہارا قبول نہ کرنا اور مثال کے طور پر یہ کہنا کہ ہم اس کا جواب تو لا سکتے ہیں لیکن لا نہیں رہے ہیں کافی نہیں ہے بلکہ یا تو یہ ثابت کرو کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہے یا پھر اگر تم ثابت نہیں کر سکتے تو تم کو قبول کر لینا چاہیئے لیکن اگر تم نے نہ ثابت کیا اور نہ ہی قبول کیا تو سمجھ لو کہ انجام بہت ہی برا ہوگا اور اللہ کا ابدی عذاب تمہارا انتظار کررہا ہے۔

کوئی بھی عاقل اس طرح کی تہدید سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گا اگر اس کا ضمیر زندہ ہے تو وہ اس طرح کے چیلنج کا کوئی اطمینان بخش جواب ضرور ڈھونڈے گا۔ اس لئے کہ عقل ہر عاقل انسان کو اس طرح کا کوئی صحیح جواب تلاش کرنے پر ابھارتی ہے یا تو اِس کا مثل لے آنا چاہیئے کہ یہ معلوم ہو جائے خدا کا کلام نہیں ہے یا کم سے کم خود اپنے اطمینان کے لئے کوئی دلیل فراہم کرے یا (ہار مان کر) اس کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ یہ خدا کا کلام ہے لیکن اگر وہ اس کا مثل نہیں لا سکا تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے خود اس کا جواب لانا نہیں چاہا بلکہ پوری سنجیدگی سے کئے گئے اس چیلنج کی موجودگی اس کی عقل کو مندرجہ بالا دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت کے انتخاب کر لینے پر مجبور کر دیتی ہے در حقیقت یہ آیت تمام آیتوں سے زیادہ بلیغ اور رسا ہے جو مدّ مقابل کو فیصلہ کن مقابلہ کے لئے بالکل تیار کر دیتی ہے۔

(مِثْلِہِ)کی ضمیر کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ اسکا مرجع کون ہے؟

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ (مِنْ مِثْلِہِ)یعنی (مِنْ مِثْلِ الْقُرآن) اور (کلمہ مِنْ)تبعیض کے لئے ہے۔ اس بنا پر سورۂ یونس کی آیت اور اس آیت دونوں کا نتیجہ ایک ہی نکلے گا۔

لیکن بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ (مثلہ) کی ضمیر (عَبْدِنَا) کی طرف پلٹتی ہے یعنی اس طرح کے شخص کے مثل سے اس طرح کا قرآن لاؤ اور یہ قرآن کے دو جہتوں سے معجزہ ہونے کی طرف اشارہ ہے:

ایک یہ کہ کوئی بھی شخص قرآن کے مثل ایک سورہ بھی نہیں لا سکتا ۔

دوسرے یہ کہ خیال رہے ایک ایسا شخص اس طرح کا کلام لیکر آیا ہے کہ جس نے کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا ہے ۔ حتیٰ اگر بہ فرض محال دنیا کے دانشمند تنہا یا مل جل کر اس کا مثل لے بھی آئیں تو خیال رہے کہ پیغمبر نہ تو کوئی دانش ور ہیں اور انھوں نے کسی سے تعلیم حاصل کی ہے ۔ جو شخص کسی مدرسہ میں نہ گیا ہو اور جس نے کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب نہ تہہ کئے ہوں وہ اس طرح کی ایک کتاب لیکر آیا ہے اور یہ بہتر طریقہ سے اس چیز کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ کلام کلام خدا ہے اور شاید آیت میں یہ وجہ زیادہ قوی اور درست ہو ۔

قرآن کریم معجزہ کیوں ہے ؟

قرآن کریم کس رخ سے معجزہ ہے اس بارے میں کافی بحثیں ہیں، کتابیں بھی لکھیں گئی ہیں ۔ اور ہم اپنی بحث مکمل کرنے کیلئے قرآن کریم کے معجزہ ہونے کی وجہیں اجمالی طور پر بیان کرتے ہیں:

1 ۔ صَرف و انصراف

بعض علما علم کلام کہتے ہیں کہ قرآن کریم اپنے مطالب و انداز بیان کے اعتبار سے معجزہ نہیں ہے بلکہ قرآن کریم "صرف یعنی منصرف کردینے "کی وجہ سے معجزہ ہے ،در حقیقت ایسا نہیں ہے کہ انسان قرآن کی ایک آیت یا سطر کا مثل تیار کر سکے آخر مختلف ترکیبوں سے کام لے کر قرآن کے جیسی ایک سطر کی عبارت تیار کی ہی جا سکتی ہے ۔ بلکہ قرآن تو اس وجہ سے معجزہ ہے کہ خدا لوگونکو اس طرح کا کام کرنے سے منصرف کردیتا ہے ۔

یہ علت ظاہر آیات کے ساتھ سازگار نہیں ہے ۔ اس لئے کہ قرآن کا کہنا یہ ہے کہ خود قرآن کریم معجزہ ہے اور کوئی اسکا مثل نہیں لاسکتا نہ یہ کہ خدا ایسا کرنے سے منصرف کردیتا ہے قرآن کریم بلاغت کی اس منزل پر ہے کہ خداوند عالم کی اگر تائید نہ ہو عام انسانوں کی طاقتیں اس کی بلاغت کی سطح تک پہنچنے کیلئے کافی نہیں ہیں ۔ اب اگر کوئی شخص کوئی کتاب یا کوئی سورۂ قرآن کریم کے مثل لے آئے تو یہ اس چیز کی نشانی ہے کہ خداوند عالم نے اس کی غیب سے مدد کی ہے ۔ یعنی قرآن بذات خود معجزہ ہے ۔

2۔ بلاغت:

عام طور پر ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ قرآن کریم بلاغت کے اعتبار سے معجزہ ہے بلاغت یہ ہے کہ "کلام" مقتضائے حال کے مطابق اس طرح بیان کیا جائے کہ متکلم کا مقصد بہترین طریقہ سے ادا ہوجائے ۔ ظاہر ہے ہر کلام کو متکلم کے مقصد اور وقت کے تقاضوں کے تحت پرکھنا چاہیئے تاکہ اس کے بعد ہم یہ مشاہدہ کرسکیں کہ اس کلام میں اس مقصد کو پورا کرنے کیلئے بہترین طریقہ کا انتخاب کیا گیا ہے یا نہیں بلاغت یہ نہیں ہے کہ صرف الفاظ کی خوبصورتی اور انداز بیان کے لحاظ سے جائزہ لیں بلکہ ان باتوں کے علاوہ متکلم کے مقصد اور مخاطب کے حال کو بھی مد نظر رکھنا چاہیئے چونکہ خداوند متعال اپنے ہدف کو سب سے بہتر جانتا ہے اور اپنے بندوں کی حالت کو بھی سب سے بہتر جانتا ہے اور الفاظ کی ترکیبوں پر بھی وہ سب سے زیادہ تسلط رکھتا ہے پس وہ مقتضائے حال کی بنیاد پر اپنے ہدف کو سب سے اچھے طریقہ سے بیان کرسکتا ہے لیکن دوسروں کو اس طرح کا تسلط حاصل نہیں ہے ان کو اس کا علم نہیں ہے کہ کلام میں کن کن نکات کی رعایت ضروری ہے اور تمام مخاطبین کے حال کو کس طرح مد نظر رکھیں اور کس طرح اس پیچیدہ فارمولے کی بنیاد پر کلام کریں۔ قرآن کریم کا مثل نہ لاسکنے کا راز یہی تمام نکات ہیں کیونکہ انسان کتنا بھی ذہین اور دور اندیش ہی کیوں نہ ہو آخر کار اس کا ذہن محدود ہے اور وہ چند محدود مطالب کو ہی اپنی نظر میں معین کرسکتا ہے اور تمام جہات پر تسلط نہیں رکھتا تو جب اس کلام کا قرآن کریم سے مقائسہ کیا جاتا ہے اس وقت ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں وہ نکات پائے جاتے ہیں جو دوسرے کلام میں نہیں پائے جاتے اور یہی چیز قرآن کریم کو اس کلام سے ممتاز کردیتی ہے ۔

اس مقام پر ایک بہت دور کا احتمال یہ ہو سکتا ہے : الفاظ کی ترکیبیں آخر کار محدود ہیں اور ان ترکیبوں کے درمیان قرآن کریم سے مشابہ جملے تیار کئے جاسکتے ہیں چونکہ حروف محدود ہیں ان سے بننے والے الفاظ اور جملے بھی محدود ہیں ۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص یہ کام انجام نہیں دے سکتا تو دو افراد ایک ساتھ بیٹھ کر غور و فکر کریں دو دن میں نہیں کرسکتے تو ایک سال تک باہم کوشش کریں یہ کیسے ممکن ہے کہ چند مخصوص و محدود الفاظ اور حروف سے مرکب جملے اس حد کو پہنچ جائیں کہ کوئی شخص قرآن کریم کا مثل نہ لاسکے ؟ چند جملوں کی ترکیبوں سے ایک ایسا خوبصورت جملہ نکالا جاسکتا ہے جو قرآن کی طرح کا ہو ۔ یہ کہنا کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم بلاغت کے اس درجہ پر پہنچا ہوا ہے کہ تاریخ کے طویل دور میں تمام انسان ملکر بھی اس کا مثل نہیں لاسکتے ؟ ہاں ہم محسوس کرتے ہیں کہ قرآن کریم دوسرے کلاموں سے زیادہ فصیح و بلیغ کلام ہے اور اپنے اندر پر کشش نکات سموئے ہوئے ہے لیکن قرآن کریم دوسرے تمام کلاموں کے ساتھ لامتناہی فرق نہیں رکھتا بلکہ ایک محدود فرق پایا جاتا ہے اور ممکن ہے کہ کچھ ایسے انسان پیدا ہو جائیں جو اس فاصلے کو بھی پر کرڈالیں

مختصر طور پر حقیقت سے بعید اس تصور کا سرچشمہ یہ ہے کہ ہم صحیح طور پر یہ نہیں سمجھ سکے کہ کیسے قرآن کریم کیلئے یہ غیر معمولی مقام اور درجہ تصور کیا جاسکتا ہے۔ہاں اگرچہ شعراء اور ادباء کے کلام سے یقینا بلند درجہ رکھتا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی اس کے قریب پہنچ ہی نہ سکتا ہو۔

یہ ضعیف اور موہوم خیال اس لئے وجود میں آتا ہے کہ ہم صحیح طریقہ سے قرآن کی بلاغت کا اندازہ ہی نہیں لگا سکے لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کی بلاغت کوئی غیر معمولی اور لاجواب چیز نہیں ہے بلکہ اس کا معیار دوسرے کلاموں سے ذرا بہتر اور بلند ہے لیکن کس قدر زیادہ فصیح و بلیغ ہے اسکا اندازہ ہم نہیں کرسکتے ہیں۔

صاحب" تفسیر المیزان"علامہ طباطبائیؒ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے اس مثال سے استفادہ کیا ہے :

ہم عام طور پر کسی کلام کے ایک دوسرے سے بہتر ہونے یا ہر باکمال چیز کے لئے دوسری خوبصورت چیز سے کیفیت کے اعتبار سے بہتر ہونے کا اندازہ اپنے عام پیمانوں سے نہیں لگا سکتے ،ہم دو محدود چیزوں کا ایک دوسرے سے مقایسہ کریں تو کسی حد تک ان کے فرق کو سمجھ لیتے ہیں ۔ مثال کے طور پر جب ہم ایک سینٹی میٹر کی لائن کا مقائسہ ایک میٹر والی لائن سے کرتے ہیں ،تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک میٹر والی لائن ایک سینٹی میٹر والی لائن کے سوگنا بڑی ہے۔تو ہم اس کا تو اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن اسی طرح ہم کیفیات کا ایک دوسرے سے مقائسہ نہیں کرسکتے ۔ لہٰذا ہم آجکل کے دور میں یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ سائنس میں تمام مسائل کو کمّی(تعداد)طریقہ سے بیان کرتے ہیں ۔ اس لئے کہ انسان کا ذہن علم حساب کے اعداد اور فارمولوں کو جلدی اخذ کر لیتا ہے ۔ مثال کے طور پر آپ ایک خوبصورت منظر کا دوسرے معمولی منظر سے مقایسہ کریں تو ملاحظہ کریں گے کہ آسانی سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ منظر اس منظر سے کتنا خوبصورت ہے ۔ مثلاً جب ایک خوبصورت پھول کا اس سے کچھ کم حسین پھول سے مقایسہ کرتے ہیں تو اس صورت میں انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ پہلا پھول دوسرے پھول سے کتنا خوبصورت ہے ۔

شروع میں تو انسان یہ خیال کرتا ہے کہ یہ پھول اس پھول سے ایک درجہ بہتر ہے لیکن جب ان کے پاس واسطہ کی صورت میں تیسرا پھول لاکر رکھدیا جائے تو فوراً آپ یہ کہیں گے کہ ایک درجہ نہیں بلکہ دو درجہ بہتر ہے وغیرہ وغیرہ۔۔۔مرحوم علامہ طباطبائیؒ فرماتے ہیں کہ میں جب کتابت کی مشق کرتا تھا حالانکہ میری کتابت بری بھی نہیں تھی۔ میں پہلے ایک " ن "لکھتا تھا اس کے بعد (میر) کی کتابت سے اس کا موازنہ کرتا تھا کہ ان کی کتابت مجھ سے کتنی اچھی ہے ؟تو میں اس کو نہیں سمجھ پاتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ ان کی تحریر میری کتابت سے ایک دو درجہ بہتر ہے ۔ اس کے بعد بطور مثال میں سو عدد" ن "لکھتا تھا جس میں ہر ایک دوسرے سے بہتر ہوتا تھا ۔یعنی سو واں "ن "پہلے "ن " سے سوگنا بہتر ہوتا تھا۔

اس کے بعد پھر اس آخری تحریر سے (میر) کی کتابت کا موازنہ کرتا تھا تو پھر بھی میں اتنا ہی فرق محسوس کرتا تھا جتنا کہ پہلی مرتبہ میں ،میں خیال کرتا تھا کہ (میر)کی کتابت میری کتابت سے ایک دو درجہ بہتر ہے حالانکہ میں نے اِس وقت پہلے سے سو برابر اچھا لکھا تھا تب بھی میں ایک دو درجہ کا فرق ہی محسوس کرتا تھا ۔

یہ مثال ہم نے اس لئے پیش کی ہے تا کہ انسان یہ سمجھ جائے کہ وہ کیفیات میں صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا ۔ یہ مثال بہت اچھی ہے۔(ہم نے استاد محترم کا شکریہ ادا کرنے اور ان کی یاد کو تازہ کرنے کی خاطر اس مثال سے استفادہ کیا ہے)۔بہر حال انسان کا ذہن کیفیات کا موازنہ کرنے اور ان کے درمیان فیصلے کرنے کی بہت کم توانائی رکھتا ہے۔بہت ہی مشکل سے آہستہ آہستہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ ان دونوں کے مابین کتنا فرق ہے ۔

یہی قاعدہ وقانون حسن اعمال (اچھے اعمال) میں بھی جاری ہوتا ہے ۔ مثال کے طورپر جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں کا عمل بہت خالص ہے (یعنی بڑے ہی خلوص کے ساتھ صرف اور صرف اللہ کے لئے عمل انجام دیتا ہے) توچونکہ اس کا عمل خالص ہے تو لہذااس کے عمل کی بھی اتنی ہی اہمیت ہو گی لیکن اس کے عمل کی اہمیت کتنی زیادہ ہے ؟ اس کے لئے کیفیت کو کمیت (تعداد) میں بدل کر مثال کے طورپر یہ کہہ سکتے ہیںکہ :اگر خالص عمل انجام دینے والے شخص کا جنت میں ایک درخت ہے توزیادہ خلوص کے ساتھ عمل انجام دینے والے کے دو درخت ہیں یعنی اس کے فرق کو دو گنا تصور کرتے ہیں ۔ لیکن اگر کوئی دقیق معیار ہو جس کے ذریعہ اس فرق کو سمجھا جا سکے تو اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اخلاص کے ان دو مرتبوں کے درمیان زمین سے آسمان تک کا فاصلہ ہے ۔ہم بھی نماز پڑھتے ہیں اور بالکل خلوص کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں ریا کے لئے نماز نہیں پڑھتے لیکن اس نماز اور حضرت امیر المومنین یا دوسرے تمام ائمہ علیہم السلام کی نمازوں کے درمیان کتنا فرق ہے ؟ اتنا فرق ہے کہ اگر ہم ساری عمر بیٹھکر اس کا حساب کریں کہ ان کی نماز ہماری نماز سے کتنا بلند درجہ رکھتی ہے تو ہر گز ممکن نہیں ہے ۔

محسوسات کے اندر خاص طور سے معنویات والی چیزو نمیںنہاں معنویت کو سمجھنا بھی ضروری ہے یہ مسائل اتنے دقیق و ظریف ہیں کہ انکو عدد کے معیاروں کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا ۔

آپ نہج البلاغہ کے کسی حصہ کا ایک بہت بڑے شاعر کے کلام سے مقائسہ کریں تو یہ ملا حظہ کرینگے کہ نہج البلاغہ کا کلام بہت ہی زیبا ہے لیکن کتنا زیبا ہے ؟اس کو ہم دقیق طور پر معین نہیں کر سکتے اور یہ فکر کریں گے کہ اس سے بہتر اور کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن اگر نہج البلاغہ کے کلام کا قرآن مجید سے مقائسہ کرتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جتنا فرق شاعر اور قرآن کے کلام میں پایا جاتا ہے اتنا ہی فرق قرآن اور نہج البلاغہ کے درمیان پایا جاتا ہے ۔

یہ مثالیں ہم نے اس لئے بیان کی ہیں کہ کمال اور معنوی امور کے درمیان موجود کیفیت کے فرق کو سمجھنے کے لئے ہمارا ذہن آمادہ وتیار ہو جائے اور یہ تسلیم کر لینگے یہ مسائل کمیات (عدد) کے ساتھ قابل موازنہ نہیں ہیں اور ان کو عدد کے ذریعہ بیان نہیں کیا جا سکتا ۔اس وقت ہم اس مطلب کو تسلیم کر لیں گے کہ ایک کلام خوبصورتی اور بلاغت کے اعتبار سے اس درجہ پر ہو کہ انسان اس تک نہ پہنچ سکے۔

بہر حال قرآن کے معجزہ ہونے کی ایک وجہ اس کی یہی بلاغت ہے جس کا شاہد یہ ہے کہ ہر ایک کی تمناؤں کے با وجود تاریخ انسانیت میں آج تک کوئی اس کا مثل نہ لا سکا اور لطیف بات تو یہ ہے کہ ہم سے بھی یہ نہیں کہا گیا کہ تم اسکا جائزہ لو کہ قرآن کتنا بلند و بہتر و برتر ہے ، بلکہ یہ کہا گیا کہ اگر تم چاہتے ہو تو اس کا مثل لے آؤ ۔ورنہ اگر اس کے جائزہ کی ذمہ داری ہم کو سونپ دی جاتی تو ہم کبھی بھی اس کا جائزہ نہیں لے سکتے تھے ۔ہم صرف اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ اس کا مثل نہیں لایا جا سکتا البتہ اس کو بھی محققین اور ماہرین ہی معین و مشخص کر سکتے ہیں ۔

3۔ اختلاف نہ ہونا :

قرآن کریم کے معجزہ ہونے کی ایک اور وجہ جس پر خود قرآن کا اعتماد ہے وہ اس کے اندر (اختلاف نہ ہونا)ہے :

(اَفَلَا یَتَدَ بَّرُوْنَ الْقُرْآنَ وَلَوْکَا نَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْافِیْہِ اِخْتِلَا فاً کَثِیْراً)[1]

1۔ سورۂ نساء آیت 82۔

"کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے ہیں کہ وہ اگر غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو اس میں بڑا اختلاف ہوتا "۔

انسان کا کلام ہوتو اختلاف کیونہوتا ہے اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے :

انسان کے اندر اس دنیا مینتمام مادی موجودات کی طرح تغیر اور تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ماحول اور انسان کے اندر ہونے والے تغیرات انسان کے روحی حالات اور ان سے ظاہر ہونے والے آثار میں موثر ہوتے ہیں ۔

ایک طرف تو انسان ہمیشہ تکامل کی حالت میں ہے ،جن چیزوں کو وہ پہلے نہیں جانتا تھا ان کو سیکھ لیتا ہے ، یہ نئی چیزیں اس کے کلام میں اثر انداز ہو سکتی ہیں ۔ اسی طرح نئے انجام دئے جانے والے کاموں میں جب اس کے اثر کو دیکھتا ہے تو اس کے ذریعہ بعد والے کاموں کو بہتر طریقہ سے انجام دینے کے لئے آمادہ رہتا ہے ۔اور دوسری طرف انسان کے حالات جیسے : غم اور خوشی ،خوف اور امید وغیرہ۔۔۔ بیرونی عوامل اور کبھی کبھی اندرونی عوامل کے ماتحت اس میں تبدیلی کرتے رہتے ہیں اور اس کے کلام میں اثر انداز ہوتے ہیں ۔ انسان خوشی کے موقع پر ایک طریقہ سے بات کرتا ہے اور غم کے موقع پر دوسرے طریقہ سے بات کرتا ہے ۔پس انسان ایک مادی موجود ہے اس پر مختلف عوامل اثرانداز ہوتے ہیں اور وہ خود بھی تکامل پیدا کرتا ہے اور اس کی معلو مات میں اضافہ ہوتا ہے ۔اس کے حالات میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے اور ان سب سے اس کے کلام میں اثر پڑتا ہے ، اس بناء پر ایک بھی انسان ایسا نہیں ہے جو اپنی پوری زندگی میں بالکل ایک ہی طریقہ سے بات کرے جو بلاغت کے اعتبار سے یکنواخت ہو ،اور مجبوری کے وقت یا بھوک اور شکم سیری ، غم اور خوشی ، صحت اور بیماری، اضطراب اور اطمینان ، شکست اور کامیابی وغیرہ کے موقع پر اس کے کلام میں فرق نظر نہ آتا ہو۔

قرآن نے ان تمام چیزوں کے بارے میں گفتگو کی ہے ،اس وقت جب کہ پیغمبر ﷺ بہت زیادہ مشکلوں میں گھرے تھے اور جب آپ فتح و کامرانی کے بلند درجہ پر فائز ہو چکے تھے ،جب آپ فقر کی حالت میں زندگی بسر کررہے تھے اور جس دور میں آپ غنی تھے ،جس وقت آپ مریض تھے اور جب آپ صحیح و تندرست تھے اور آخر کار 23سالہ دور میں (جس میں ہر انسان علمی ترقی اور گفتگو میں مہارت حاصل کرتا ہے) قرآن نے بلاغت کے اعتبار سے ایک ہی اسلوب پر گفتگو کی ہے ۔یہ صحیح ہے کہ ایک کلام خاص موقع کے لحاظ سے کہا گیا ہے اور اس کا انداز دوسرے کلام سے جدا ہے لیکن یہ دونوں صورتیں بلاغت کے اعتبار سے سب سے بلند درجہ کی مالک ہیں ۔پس قرآن کے معجزہ ہونے کی ایک وجہ (اصل بلاغت کے علاوہ)پوری تاریخ نزول میں ایک ہی اسلوب کا باقی رہنا بھی ہے ۔

4۔ پیغمبر امی کی جانب سے ہے

قرآن کے معجزہ ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ قرآن اس شخص پر نازل ہوا ہے جس نے کسی سے سبق نہیں پڑھا، علماء اور دانشمندوں سے جس کا کوئی سروکار نہ تھا اور اس کا انداز گفتگو بعثت تک دوسرے عام لوگوں کی طرح تھا (شاید ان سے کچھ بلیغ ہو) لیکن آپ کے لہجہ میں ایک دم تبدیلی آئی اور جو چیز آپ کے کلام میں پہلے نہیں پائی جاتی تھی وہ دکھائی دینے لگی۔ پیغمبر اکرم ﷺ کے کلمات میں اگرچہ فصاحت و بلاغت کا بلند درجہ پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود رسالت کے بعد بھی آپ کے کلمات کا قرآن سے مقائسہ ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ خود قرآن کریم نے اس مسئلہ کو یوںبیان فرمایا ہے:

(قُلْ لَوْشَاءَ اللّٰهُ مَاتَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَاَدْرٰيكُمْ بِهِ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًامِنْ قَبْلِهِ اَفَلاَ تَعْقِلُوْنَ)[1]

"آپ کہدیجئے کہ اگر خدا چاہتا تو میںتمہارے سامنے تلاوت نہ کرتا اور تمہیں اس کی اطلاع بھی نہ دیتا آخر میں اس سے پہلے بھی تمہارے درمیان ایک مدت تک رہ چکا ہوں تو کیا تمہارے پاس اتنی عقل بھی نہیں ہے؟"۔

اگر یہ کتاب میری بنائی ہوئی ہوتی تو فطری طور پر میری پہلی گفتگو کے مشابہ اس میں کوئی کلام ہونا چاہیئے تھا۔ یہ مطلب اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کام ناگہانی اور الٰہی کام ہے اور خداوندعالم چاہتا ہے کہ میں اس طرح کلام کروں۔ اگر خداوندعالم مجھ پر وحی نہ کرتا تو میں ان کلمات کو ادا نہیں کر سکتا تھا میں وہی شخص ہوں جو کل تم لوگوں سے گفتگو کیا کرتا تھا اور تم میری باتوں کو سنا کرتے تھے اور میرے اور تمہارے درمیان کوئی غیر معمولی امتیاز نہ تھا۔ پس اگر تم عقل رکھتے ہو تو سمجھو کہ بلاغت کا اچانک یہ عروج امر الٰہی کی تائید سے ہے۔

تاکہ یہ مسئلہ تمام لوگوں پر اچھی طرح واضح ہو جائے خداوندعالم نے پیغمبر اسلام ﷺ کی تربیت اس طرح فرمائی کہ آپ کے پاس درس پڑھنے اور علم حاصل کرنے کی کوئی جگہ نہ تھی، اور آپ اکثر افراد کی طرح لکھنا اور پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے، اس دوران کچھ ایسے افراد بھی تھے جنھوں نے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے لکھنا اور پڑھنا بھی نہیں سیکھا تھا:

(وَمَاكُنْتَ تَتْلُوْامِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَا بٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِيْنِكَ اِذاً لَّأرْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ)[2]

"اور اے پیغمبر آپ اس قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے ورنہ یہ اہل باطل شبہ میں پڑجاتے" اور خداوندعالم نے آپ کی ایسی تربیت کی کہ تمام لوگوں کو یہ معلوم رہے کہ آپ اس کلام کے آنے سے پہلے

1۔ سورۂ یونس آیت 16۔

2۔ سورۂ عنکبوت آیت 48۔

نہ پڑھتے تھے اور نہ لکھتے تھے تاکہ یہ لوگ سمجھ جائیں کہ یہ آپ کا کلام نہیں ہے ۔اگر ایسا نہ ہوتا اور آپ لکھنا اور پڑھنا جانتے ہوتے تو ممکن تھا کچھ لوگ شک میں پڑجاتے : (اِذاً لاَّرْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ) اورجو لوگ آپ کے دعوے کو باطل کرنا چاہیں وہ ایسا شبہہ پیدا کر سکتے ہیں، لہٰذا کوئی دستاویز ڈھونڈھ لائیں کہ انھوں نے تو فلاں استاد سے کئی سال تعلیم حاصل کی ہے لیکن آپ اس ماحول اور معاشرہ میں پہلے سے موجود ہیں اور یہ سب آپ کو پہچانتے ہیں کہ آپ پڑھنا اور لکھنا نہیں جانتے تھے اس طرح لوگ اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں ۔

5۔جامعیت :

قرآن کے معجزہ ہونے کی دوسری چند وجہیں مفسرین نے بیان کی ہیں حتی کہ علماء کلام نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ جن میں سے بعض کو چیلنج کے طور پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے ان میں سے جس کو چیلنج کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے وہ قرآن کی جامعیت ہے ۔یعنی ایک انسان عقاید، سیاست ، اقتصاد، اخلاق ،فوجی فنون اور ایک جملہ میں یہ سمجھئے کہ جن تمام چیزوں کی انسان کو اپنی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے اس میں ماہر ہو ۔ معمولی انسان میں اس طرح کے صفات کا جمع ہونا محال ہے اور عملی طور پر بھی انسان کی زندگی میں یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ جو انسان کسی کام میں ترقی کرنا چاہتا ہے وہ اپنی ساری زندگی کو ایک ہی موضوع کو حاصل کرنے میں صرف کردیتا ہے تب کہیں اس علم کا ماہر ہوگا اور لوگوںکی نظروں میںترقی یافتہ شمار کیا جائیگا لیکن ایک ہی انسان تمام علوم کا احاطہ کرلے اور ہر شعبہ میں دوسرے تمام ماہرین سے بہتر ہو جائے یہ ایک معمولی انسان کے بس کی بات نہیں ہے ۔

6۔ علمی نکات کا اظہار:

قرآن مجید کے معجزہ ہونے کا ایک اورپہلو وہ علمی نکات ہیں جن کو اس زمانہ میں قبول نہیں کیا جاتا تھا اور تعلیم یافتہ طبقہ ان کو تسلیم نہیں کرتا تھا لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے باصراحت اور شجاعت کے ساتھ ان کو بیان فرمایا اور اس کے بعد تدریجی طور پر علوم کی ترقی نے ان کا اثبات کیا ہے ۔ مثلاًیہی کہ ایک ان پڑھ انسان ایک پست اور پچھڑے ہوئے ملک میں ظہور کرے اور دنیا کے تمام علمی طبقوں کے بالمقابل مکمل صراحت اورپورے یقین و اعتماد کے ساتھ کسی ایسی چیز کا بیان کرے جس کے وہ سب مخالف ہوں ،خاص طور سے جس دور میں یہ ثابت ہو جائے کہ جو باتیں انھوں نے بیان فرمائی ہیں وہ صحیح ہیںاورجو کچھ دوسروں نے بیان کیا ہے وہ باطل ہے یہ خود اس بات کا شاہد ہے کہ یہ کلام خدا کا ہے ۔

ان میں سے ایک نمونہ یہی ہیئت بطلیموسی کا مسئلہ ہے جس کو دنیا کے علمی طبقوںنے تسلیم کر رکھا تھا لیکن آسمانوں کے سلسلہ میں قرآن کے بیانات افلاک بطلیوسی کے موافق نہیں تھے ۔ وہ کہتے تھے کہ افلاک میں خرق و التیام محال ہے و۔۔۔لیکن قرآن معتقد ہے کہ نہ صرف خرق و التیام محال نہیں ہے بلکہ یہ تمام پاش پاش ہو جائیں گے اور قرآن نے کبھی بھی نو آسمانوں پر کوئی تکیہ نہیں کیا ہے وغیرہ۔۔۔۔

7۔غیبی خبریں:

قرآن کے معجزہ ہونے کی ایک اور وجہ قرآن کا غیبی خبریں دینا ہے۔ یہ خبریں دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہیں :

1۔ وہ گذشتہ خبریں جن کو قرآن نے بیان کیا ہے اور ان سے مطلع ہونے کے لئے قرآن کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا : (ذَلِکَ مِنْ اَنْبَائِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَا اِلَیْکَ)

"پیغمبر یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی وحی ہم آپ کی طرف کر رہے ہیں ۔

اور ایک مقام پر ارشاد ہے:

(وَمَاكُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَمَهُم اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ) [1]

"جب وہ قرعہ ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے گا"۔

یہ سب غیبی خبریں تھیں جو غیب کے پیغمبر کے لئے تھیں ان میں کچھ آئندہ کے لئے پیشینگوئیاں ہیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں اور ہم ان میں سے ذیل میں دو نمونوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں:

ایرانیوں پر رومیوں کا غلبہ

(غُلِبَتِ الرُّوْمُفِیْ اَدْنٰی الْاَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ) [2]

"(یہاں سے) بہت قریب ہے کہ ملک میں رومی (نصارا اہل فارس آتش پرستوں سے) ہار گئے مگر یہ لوگ عنقریب ہی اپنے ہارجانے کے بعد چند سالوں میں پھر (اہل فارس پر) غالب آجائیں گے ۔۔۔"۔

فتح مکہ

(لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْ لَهُ الرُّؤْيَابِالْحَقِّ لَتَدْ خُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَا مَ اِنْ شَائَ اللّٰهُ آمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُؤُسَكُمْ)[3]

"بیشک خدا وند عالم نے اپنے رسول کو بالکل سچا خواب دکھلایا تھا کہ خدا نے چاہا تو تم لوگ مسجد الحرام میں امن و سکون کے ساتھ سر کے بال منڈا کر اور تھوڑے سے بال کاٹ کر داخل ہو گے اور تمھیں کسی طرح کا خوف نہ ہوگا۔۔۔"۔

پس قرآن کی غیبی خبریں بھی اس آسمانی کتاب کے معجزہ ہونے میں شمار کی جاتی ہیں۔

1۔ سورۂ آل عمران آیت44۔

2۔ سورۂ روم آیت 2۔4۔

3۔ سورۂ فتح آیت 27۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے بقیہ معجزات

ہم اس سے پہلی بحث میں بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کریم وہ معجزہ ہے جو آخر الزمان کی امت پر منت کے طور پر رکھا گیا ہے اور پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہوا ہے تاکہ قیامت تک امت رسول کے ہاتھوں میں رہے اور امت اس سے اسلام کی حقانیت کی راہ کو طے کرے اور اپنی سعادت کی راہ کی معرفت حاصل کرے ۔ اب یہ سوال درپیش ہے :

کیا پیغمبر اسلام ﷺ کو قرآن کے علاوہ دوسرے معجزے بھی عطا کئے گئے ہیں یا نہیں ؟

قرآن مجید میں خود اس کے معجزہ ہونے اور اس میں غیبی خبروں کے مندرج ہونے کے علاوہ پیغمبر اسلام ﷺ کے بعض معجزات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ اسی طرح خداوند عالم نے متعدد مرتبہ جو پیغمبر اسلام ﷺ اور آنحضرت کی امت کی غیب سے مدد فرمائی ہے اس کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے جن میں سے ہر ایک اپنے مقام پر ایک معجزہ شمار کیا جاتا ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ کی برکت کے ذریعہ اس امت کو عطا کیا گیا ہے ۔ ان معجزات میں سے بعض معجزات کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں :

شقّ القمر

(اِقتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ القَمَرُوَاِنْ یَرَوْاآ یَةً یُعْرِضُوا وَیَقُولُواسِحْر مُّستَمِرّ) [1]

"قیامت قریب آگئی اور چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے اور یہ کوئی بھی نشانی دیکھتے ہیں تو منھ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک مسلسل جادو ہے"

اس آیۂ شریفہ سے کہ رسول اللہ کے دور حیات میں چاند کے دو ٹکڑے ہوئے اور یہ اللہ کی نشانی تھی ،چونکہ اللہ اس کے بعد یہ فر ماتا ہے : (وَ اِنْ یَرَوْاآیَةً یُعْرِضُوْا) "اور یہ کوئی بھی نشانی دیکھتے ہیں تو منھ پھیر لیتے ہیں" اس کے

1۔ سورۂ قمر آیت1۔2۔

باوجود کہ چاند دو ٹکڑے ہوا لیکن کفار و مشرکین دشمنان پیغمبر کہتے ہیں:

(سِحْرٌ مُسْتَمِرّ)

"یہ ایک مسلسل جادو ہے"۔

اس آیۂ شریفہ کے سلسلہ میں دوسرے نظریہ بھی ہیں جو ان افراد کے ہیں جو معجزاتی چیزوں پر ایمان نہیں رکھتے ہم ان میں سے بعض نظریات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

بعض افراد کا کہنا ہے کہ یہ آیت قیامت سے متعلق ہے۔یعنی قیامت میں چاند دو ٹکڑے ہوگا اور اس کی نشاندہی اس سے ہوتی ہے کہ اس کے بعد (اِقْتَرَ بَتِ السَّا عة) بیان ہوا ہے۔

لیکن جیساکہ قارئین کرام آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ آیۂ شریفہ کا ظاہر اس نظریے سے سازگار نہیں ہے، چونکہ "اِنْشَقَّ الْقَمَرُ"ایک وقوع پذیر ہونے والے واقعہ کی نشاندہی کرتا ہے۔قیامت کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے "اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃ""قیامت نزدیک آگئی" لیکن انشقاق قمر (چاند کا دو ٹکڑے ہونا) کے متعلق فرماتا ہے "وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ"یہ نہیں فرمایا کہ "اِقْتَرَبَ اِنْشِقَا قُ الْقَمَرُ"یا "اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃ وَاِنْشِقَاقُ الْقَمَرُ"۔یہ صحیح ہے کہ قرآن کریم میں قیامت کے آثار کو بیان کیا گیا ہے جس کو روایات میں (اشراط الساعۃ) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور ان کو عام طور پر کلمہ" اِذَا" سے بیان کیا جاتا ہے:(اِذَاالسَّما ئُ انْفَطَرَتْ ، اِذَاالسَّما ئُ انْشَقَّتْ) لیکن اس مقام پر انشقّ القمر فرمایا ہے۔اس کے علاوہ بعد والی آیت اس بات کی شاہد ہے کہ یہ ایک آیت تھی جس کا لوگوں نے خود مشاہدہ کیا اور اس کو جادو سے منسوب کردیا، خدا فرماتا ہے کہ یہ اس کے علاوہ دوسری آیت کو بھی دیکھیں گے تو اسی کو جادو کہدیں گے:(وَ اِنْ یَرَوْ اآیَۃًیُعْرِضُوْاوَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُسْتَمِرٌ) ان کے اس قول کی یہاں اس سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے کہ قیامت میں شق القمر ہوگا یا لوگ جس آیت کو دیکھتے ہیں اسے جادو کہدیتے ہیں یعنی کیا قیامت میں بھی جادو کہیں گے؟! وہاں حقیقتیں ظاہر ہوں گی اور کوئی شخص ان حقیقتوں کا انکار نہیں کر سکتا۔پس ظاہر ہے کہ یہ آیت اسی دنیا سے مربوط ہے۔

دوسرے بعض افراد کا کہنا ہے کہ چاند کا دو ٹکڑے ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ چاند زمین سے جدا ہوا ہے اور یہ ایک علمی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔دنیا کی معرفت حاصل کرنے کی ایک تھیوری یہ ہے کہ زمین سورج سے جدا ہوئی ہے اور چاند زمین سے جدا ہوا ہے، اس بنا پر چاند زمین کا چکر لگاتا ہے اور قمر زمین ہے۔پس قرآن اس نظریہ کی تائید کرتا ہے کہ چاند زمین سے جدا ہوا ہے۔

اس نظریہ پر بھی پہلے والا اعتراض ہوتا ہے کہ یہ آیت ظاہر کے خلاف ہے، اس لئے کہ یہ ایک آیت کا بیان معجزہ کی حیثیت سے تھا ایک فطری اور تکوینی لحاظ سے نہیں تھا۔اس کے علاوہ کلمۂ" انشَق"چاند کے زمین سے جدا ہونے کے بارے میں نہیں ہے ۔اِنْشقَّ یعنی شگافتہ ہو گیا یا پھٹ گیا اگر خدا وند عالم یہ فرمانا چاہتا کہ چاند زمین سے جدا ہوا تو اِشْتَقَّ یا اِنْفَصَل فرمانا چاہئے تھا۔

بہر حال ہم تو اس سلسلہ میں کوئی شک ہی نہیں کرتے کہ" اِنْشَقَّ القمر" سے مراد وہی شق القمر ہے جو پیغمبر اکرم ﷺ کے دست مبارک کے ذریعہ وقوع پذیر ہوا تھا، شیعہ اور اہلسنت سے اس بارے میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں کہ مہینہ کی چودھویں رات تھی اور چاند ابھی نکلا ہی تھا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے اشارہ کیا اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور کچھ دیر تک اسی طرح باقی رہا اور پھر دونوں ٹکڑے آپس میں مل گئے اور پہلے کی طرح مکمل ہو گئے ۔یہاں تک کہ بعض اہلسنت علماء نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ شق القمر کے سلسلہ میں بعض روایات متواتر ہیں ۔

اس بارے میں بھی کچھ علمی اعتراضات ہوئے ہیں کہ ایک آسمانی کرہ کا دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جانا اس کا کیا مطلب ہے؟ یا اگر ایسا ہوا تھا تو دوسرے افراد بھی اس کا مشاہدہ کرتے، اور یہ تاریخ میں نقل ہوتا اسی طرح کے متعدد اعتراضات کئے ہیں ۔

ہمارے بزرگ علما نے ان سوالوں کے یہ جوابات دئے ہیں :

1۔یہ معجزہ ایک اتفاقی اور اچانک واقعہ تھا ۔ لوگ ہمیشہ بیٹھکر آسمان کی طرف یہ نہیں دیکھا کرتے ہیں کہ کیا کیا حادثے رونما ہو رہے ہیں ۔ جو لوگ آسمان کے سلسلہ میں زیادہ جستجو کرتے ہیں وہ اس چیز کے منتظر رہتے ہیں کہ کیا اس طرح کا کوئی حادثہ واقع ہو سکتا ہے یا نہیں وہ دیکھتے ہیں ۔

2۔اُس وقت ایسے حالات نہیں تھے کہ تمام حوادث اورواقعات تحریر کرلئے جاتے ہوں اور ان سے سب کو مطلع کردیا جائے اس زمانہ میں ایک دوسرے سے رابطہ کرنے والے موجودہ وسیلے نہیں تھے کہ جن سے فوری طور پر ساری دنیا کو مطلع کردیا جاتا اس کے علاوہ جب کرۂ زمین کے کسی ایک مقام پر اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آئے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سب جگہ اس کا مشاہدہ کیا جائے۔چونکہ رات کی ابتداء میں یہ واقع ہوا اور اس وقت چاند بہت سے مقامات پر طلوع بھی نہیں ہوتا ۔

لوگوں کے ادراک میں تصرف

قرآن فرماتا ہے کہ بعض جنگوں میں خدا وند عالم نے مسلمانوں اور مشرکین کے اذہان میں اس طرح تصرف کیا ہے کہ وہ کسی جنگ میں فوجیوں کی تعداد کو کم یا زیادہ دیکھتے تھے اور اس طرح کہ خداوندعالم مسلمانوں کو جو کامیابی دینا چاہتا تھا وہ حاصل ہو جاتی تھی ۔دو آیات میں اس مسئلہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے :

(قَدْ كَانَ لَكُم آيَةفِى فِئَتَيْنِ الْتَقَتَافِئَة تُّقَاتِلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّهِ وَأُخرَىٰ كَافِرَة يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأىَ العَيْنِ وَاللّهُ يُؤَ يّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَّشَآئُ اِنَّ فِى ذَلِکَ لَعِبْرَةً لِّأُوْلِي الاَبْصَٰرِ) [1]

"تمہارے واسطے ان دونوں گروہوں کے حالات میں ایک نشانی موجود ہے جو میدان جنگ میں آمنے سامنے آئے کہ ایک گروہ راہِ خدا میں جہاد کر رہا تھا اور دوسرا کافر تھا جوان مومنین کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہا تھا اور اللہ اپنی نصرت کے ذریعہ جس کی چاہتا ہے تائید کرتا ہے اور اس میں صاحبان نظر کے واسطے سامان عبرت و نصیحت بھی ہے"۔

مفسرین قرآن کے مابین جملہ "یَرَوْنَھُمْ مِثْلَیْھِمْ"کے سلسلہ میں بہت زیادہ اختلافات پائے جاتے ہیںکہ "یَرَوْنَ"کا فاعل کون ہے ؟اور پہلی ضمیر" ھُم "کس کی طرف پلٹتی ہے اور" مِثْلَیْھِمْ "کی ضمیر"ھُمْ "کا مرجع کیا ہے ؟اس بارے میں کئی وجہیں بیان کی گئی ہیں :

بعض مفسرین کہتے ہیں :مومنین خود کو دوگنا دیکھ رہے تھے تاکہ اپنی کامیابی کی امید لگائے رکھیں۔ یہ داستان جنگ بدر سے متعلق ہے ۔مسلمان 313افراد تھے خداوندعالم نے ان کی تعداد خود انھیں دوگنا دکھلائی ۔پس یَرَوْنَ کا فاعل اور ضمیر"ھُمْ""یَرَوْنَھُم "اور "مِثْلَیْھِمْ"میں سب مومنین کی طرف پلٹتی ہیں۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے :ضمیریَرَوْنَ کا فاعل کفار ہیںلیکن ضمیر"ھُمْ"مومنین کی طرف پلٹتی ہے یعنی کفار مومنین کو دوگنا دیکھتے تھے ۔یہ کفار کے اذہان پر تصرف تھا جس کی وجہ سے کفار یہ سمجھتے تھے کہ مومنین کی تعداد626 ہے حالانکہ ان کی تعداد تین سو تیرہ سے زیادہ نہیں تھی ۔

اور بعض دوسرے مفسرین کا کہنا ہے کہ :یَرَوْنَ کا فاعل کفار ہیں اور مِثْلَیْھِمْ کی ضمیر کفار کی طرف پلٹتی ہے۔یعنی کفار مومنین کو دوگنا دیکھتے تھے ۔ان کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی اور مومنین کی تعداد تین سو تیرہ تھی لیکن کفار سوچتے تھے کہ مومنین دوہزار افراد ہیں ۔یعنی کفار تعداد کو دوگنا دیکھ رہے تھے مومنین کی تعداد کے دوگنا نہیں ۔

مرحوم علامہ طباطبائی نے اس احتمال کی تائید فرمائی ہے کہ یَرَوْنَ کا فاعل کفار ہیں لیکن دوسری دونوں ضمیریں"ھُمْ"مومنین کی طرف پلٹتی ہیں یعنی کفار مومنین کو دوگنا دیکھتے تھے یعنی 626 آدمی دیکھتے تھے ۔

بہرحال کچھ بھی ہو اس آیت سے ہمارے مقصد کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا ۔یعنی خداوندعالم نے لوگوں کے اذہان

1۔ سورۂ آل عمران آیت13۔

میں تصرف کیا کہ وہ ایک تعداد کو دو گنا دیکھیں اور یہ مومنین کی کامیابی میں موثر تھا :

(وَاِذْیُرِیْکُمُوْھُم اِذِالْتَقَیْتُمْ فِیْ اَعْیُنِکُمْ قَلِیْلاً وَیُقَلِّلُکُمْ فِیْ اَعْیُنِھِمْ لِیَقْضِیَ اللّٰہُ اَمْراًکَانَ مَفعُوْلاً) [1]

"اور جب خدا مقابلہ کے وقت تمہاری نظروں میںدشمنوں کو کم دکھلا رہا تھا اور ان کی نظر میں تمھیں کم کرکے دکھلا رہا تھا تاکہ اس امر کا فیصلہ کردے جو ہونے والا تھا اور سارے امور کی بازگشت اللہ ہی کی طرف ہے" ۔

یہاں دو اعتراض درپیش ہیں :

جب طرفین ایک دوسرے کو کم دیکھیں تو اس سے تو کامیابی میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ اگر ایک طرف کے افراد دوسری طرف کے افراد کو زیادہ دیکھتے ہیں تو یہ اس بات کا باعث ہونا چاہئے تھا کہ جس طرف زیادہ افراد دکھائی دیں وہ غلبہ حاصل کرلیں چونکہ اس کا نفسیاتی اثر ہوتا ہے لیکن جب دونوں طرف کے افراد ایک دوسرے کو زیادہ دیکھیں تو دونوں کی نسبت ایک ہے لہٰذا کامیابی میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا ۔ وہ ایک ہزار آدمی ہوں اور یہ 313 یا مثال کے طور پر وہ 500 افراد ہوں اور یہ 155 افراد ہوں پھر بھی دونوں کی نسبت ایک ہے۔

ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ یہ آیت پہلی آیت کے ساتھ کیسے جمع ہو سکتی ہے حالانکہ پہلی آیت میں خداوندعالم نے مومنین پر یہ احسان کیا کہ وہ ان کو دو گنا دیکھتے ہیں ۔یہاں پر بھی احسان کر رہا ہے کہ تم کو کم دیکھتے ہیں۔ ان میں موثر کونسا ہے ؟اور کس طرح ان کو جمع کیا جا سکتا ہے ؟

ان دونوں آیات کو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ کفار مسلمانوں کو جوکم دیکھتے تھے اس میں ایک مصلحت ہے ،اور مومنین کفار کو کم دیکھتے تھے اس میں دوسری مصلحت ہے اور مومنین کو زیادہ دیکھنے میں تیسری مصلحت ہے ۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ سب ایک ہی وقت میں نہیں تھا ۔ ایک مرتبہ کفار مومنین کو کم دیکھتے تھے اور دوسری مرتبہ زیادہ دیکھتے تھے ۔

لیکن یہ سوال کہ کم دیکھنا کس طرح مومنین کی کامیابی میں موٴثرہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر مومنین کفار کی تعداد کو اسی طرح دیکھتے جتنے کہ وہ تھے تو وہ ڈر جاتے اور جنگ کرنے کی ہمت نہ کرپاتے لہٰذا خداوندعالم نے کفار کی تعداد مومنین کو کم دکھلائی تاکہ مومنین خوف نہ کریں ۔

اور کفار کے مومنین کی تعداد کو کم دیکھنے کی مصلحت یہ ہے کہ اگر وہ شروع ہی سے مومنین کی تعداد کو زیادہ دیکھتے

1۔ سورۂ انفال آیت44۔

تو فرار کر جاتے اور جنگ ہی نہ ہوتی نتیجتاً جو حکمت اس جنگ کے واقع ہونے اور مسلمانوں کی کامیابی میں مخفی تھی وہ سامنے نہ آتی ۔خداوند عالم نے ابتداء میں ان کو مومنین کی تعداد کم دکھلائی تاکہ کفار یہ کہیں کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں ہم جلد ہی ان کا خاتمہ کر ڈالیں گے ۔ لیکن جب جنگ شروع ہو گئی اور بھاگنے کا کوئی موقع نہ رہ گیا تب انھوں نے مومنین کو اپنے سے دو گنا دیکھا لہٰذا اُن پر مومنین کا رعب طاری ہو گیا اور وہ شکست کھا گئے ۔

لہٰذا تینوں چیزیں صحیح ہیں اور خداوند عالم کی طرف سے مومنین کے اوپر یہ ایک طرح کی نعمت ہے ۔ مومنین کو کم دیکھنے کی مصلحت یہ تھی کہ وہ جنگ کرنے کے لئے قدم بڑھائیں ۔" (لِيَقْضِىَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلاً) "۔

مومنین بھی ان کو کم دیکھتے تھے تاکہ پہلے ہی سے ہار نہ مان لیں اور اتفاق سے اسی آیت سے پہلے یہ بیان ہوا ہے کہ خداوند عالم نے پیغمبر اکرم ﷺ کو خواب میں کفار کی تعداد کم دکھلائی ۔پیغمبر اکرم ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ آپ مشرکوں کے کچھ افراد کے ساتھ جنگ کر رہے ہیں اور اس آیت کے ذیل میں فرماتا ہے :(وَلَوْاَرَا كَهُمْ كَثِيْراً لَفَشِلْتُمْ) اگر خداوند عالم خواب میں پیغمبر اکرم ﷺ کو ان کی بہت زیادہ تعداد دکھلا دیتا اور پیغمبر اکرم ﷺ اس ماجرے کو مومنین کے سامنے بیان فرمادیتے تو مومنین اپنے کمزور ہونے کا احساس کرتے اور نتیجہ میں کفار سے شکست کھا جاتے ۔

خلاصہ :یہ آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مومنین اور کفار کے اذہان پر خداوند عالم کی طرف سے ایسا تصرف واقع ہوا جو مومنین کے نفع میں تھا ۔

"القاء رُعب "اور" نزول سکون و اطمینان"

خداوند عالم کی طرف سے مسلمانوں کے نفع اور کامیابی میں غیر معمولی طریقہ سے "القاء رعب" کا مسئلہ واقع ہوا۔ یہ مسئلہ بھی کئی آیات اور کئی مقامات پر بیان ہوا ہے ۔ روایات میں بھی بیان ہوا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کا رعب و دبدبہ تھا ۔جب مومنین کفار پر حملہ کرتے تھے تو ان کفار کے دلوں میں خوف پیدا ہوتا تھا جس کی وجہ سے وہ جنگ میں مات کھا جاتے تھے ۔اس مطلب کو کئی آیات میں بیان کیا گیا ہے جن میں سے چند آیات ہم ذیل میں بیان کر رہے ہیں :

(سَنُلْقِىْ فِىْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْاالرُّعْبَ)[1]

"ہم عنقریب کافروں کے دلوں میں تمھارا رعب ڈال دیں گے"۔

1۔ سورۂ آل عمران آیت151۔

(سَأُ لْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الذَّیْنَ کَفَرُوْا الرُّعْبَ)[1]

"یں عنقریب کفار کے دلوں میں رعب پیدا کروں گا"۔

مجموعی طور پر قرآن کریم میں اس کا تذکرہ چار مقامات پر کیا گیا ہے کہ خدا وند عالم کفار کے دلوں میں خوف ایجاد کرتا تھا جو ان کی شکست کا باعث ہوتا تھا۔

(وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ)[2]

"اور ان کے دلونمیں ایسا رعب ڈال دیا"۔

اور اس کے با لمقابل مومنین کے دلوں میں "سکینہ"سکون و اطمینان پیدا کردیتا تھا۔

(ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَکِیْنَتَهُ عَلَیٰ رَسُوْلِهِ وَعَلَیٰ الْمُؤْمِنِیْنَ)[3]

"پھر اسکے بعد خدانے اپنے رسول اور صاحبان ایمان پر سکون نازل کیا"۔

اور دوسری آیت:

(فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَکِیْنَتَهُ عَلَیْهِ)[4]

"پھر خدانے اپنی طرف سے پیغمبر پر سکون نازل کردیا"۔

یہ آیت پیغمبر اکرم ﷺ کے سلسلہ میں ہے۔البتہ یہ پیغمبر اکرم ﷺ کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے متعلق ہے کہ جب آپ نے" غار ثور" میں قیام فرمایا تھا۔

دوسری آیات:

(هُوَالَّذِیْ أَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُومِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْا اِیْمَاناًمَعَ اِیْمَاهِهِمْ)[5]

"وہی خدا ہے جس نے مومنین کے دلوں میں سکون نازل کیا ہے تاکہ ان کے ایمان یںمزید اضافہ ہوجائے"۔

1۔ سورۂ انفال آیت12۔

2۔ سورۂ احزاب آیت26، سورۂ حشر آیت2۔

3۔ سورۂ توبہ آیت26۔

4۔ سورۂ توبہ آیت40۔

5۔ سورۂ فتح آیت4۔

(فَأَ نْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثٰبَهُمْ فَتْحاً قَرِيْباً)[1]

"تو اس نے ان پر سکون و اطمینان اتار دیا اور انھیں قریبی فتح عنایت کردی"۔

(فَأَ نْزَلَ اللّٰہُ سَكِيْنَتَهُ عَلَىٰ رَسُوْلِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ)[2]

"تو اللہ نے اپنے رسول اور صاحبان ایمان پر سکون نازل کردیا"۔ان مقامات پر "انزال سکینہ" کے بعد دوسری بات بیان فرماتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا وند عالم آسمان سے فوج بھیجتا تھا کہ لوگ دیکھنے نہ پائیں اور وہ فوج مومنین کی مدد کرے:

(وَاَنْزَلَ جُنُوْداً لَّمْ تَرَوْهَا)[3]

"اور وہ لشکر بھیجے جنھیں تم نے نہیں دیکھا"۔

دوسری آیت:

(وَاَيَّدَهُ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا)[4]

"اور ان کی تائید ان لشکروں سے کردی جنھیں تم نہ دیکھ سکے"۔

پس ایک کرامت جس کے ذریعہ سے خدا وند عالم نے پیغمبر اکرم ﷺ اور مومنین کی مدد فرمائی وہ غیبی لشکر ہیں کہ خود مومنین بھی اس کو دیکھ نہیں پاتے تھے لیکن وہ مومنین کی کامیابی میں موثر کردار ادا کرتا بعض آیات میں جنود(بہت سے لشکروں) کے علاوہ (ریح)(یعنی ہوا) کا بھی ذکر ہوا ہے۔یعنی خدا وند عالم نے ہوا(آندھی) بھیجی جو مسلمانوں کی کامیابی اور کفار کی شکست کا سبب بنی:

(اِذْجَائَ تْكُمْ جُنُود فَأَرْسَلْنَاعَلَيْهِمْ رِيْحاًوَجُنُوداً لَّمْ تَرَوْهَا)[5]

"جب کفر کے لشکر تمہارے سامنے آگئے اور ہم نے ان کے خلاف تمہاری مدد کے لئے تیز ہوا اور ایسے لشکر بھیج دیئے جن کو تم نے دیکھا بھی نہیں تھا"۔اب سوال یہ ہے کہ یہ جنود کون افراد تھے؟احتمالی طور پر وہ ملائکہ (فرشتے) ہی تھے۔بعض آیات میں صاف

1۔سورۂ فتح آیت18۔

2۔سورۂ فتح آیت26۔

3۔سورۂ توبہ آیت26۔

4۔سورۂ توبہ آیت40۔

5۔سورۂ احزاب آیت9۔

صاف یہ بیان ہوا ہے کہ خداوندعالم نے ملائکہ کو بھیجا ، لیکن ان کے دیکھنے یا نہ دیکھنے کا ذکر نہیںہوا ہے :

(وَلَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍوَاَنْتُمْ اَذِ لَّۃ فَاتَّقُوْااللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ) [1]

"اور اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی ہے جب کہ تم کمزور تھے لہٰذا اللہ سے ڈرو شاید تم شکر گذار بن جائو "۔

رہا مسئلہ یہ کہ خدا وند عالم نے اس آیت میں مومنین کو ذلیل سے کیوں تعبیر کیا حالانکہ خود اس کا فرمان ہے : (اَلْعِزَّۃُ لِلّٰہِ وَ لِلْمُؤمِنِیْنَ)"عزت اللہ اور مومنین کے لئے ہے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں پر ذلت کفار کے مقابلہ میں یاتو مومنین کی ظاہری حالت کی مناسبت سے ہے کہ مومنین کی تعداد بہت کم تھی اور جنگی ساز و سامان بھی بہت کم تھاچھ عدد زرہیں اورچند تلواروں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا ۔ حالانکہ کفار ہر طرح سے مسلح تھے یا یہ کہ اگر خدا وند عالم کی عطا کردہ عزت نہ ہو توانسان بذات خود ذلیل ہے یعنی بذات خود تم ذلیل تھے اگر خدا وند عالم تم کو عزت نہ دیتا جیسا کہ خدا وند عالم اپنے پیغمبر اکرم ﷺ سے فرماتا ہے : (وَوَجَدَ کَ ضَالاًّ فَھَدی)"اور کیا تم کو گم گشتہ پا کر منزل تک نہیں پہنچایا ہے " اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی موجود کی بذات خود کوئی عزت نہیں ہے یہ خدا ہے جس نے تم کو با عزت بنا یا ہے ۔ اور تم کو یہ یاد دلاتا ہے کہ تم بذات خود کوئی عزت نہیں رکھتے ہو ۔ خدا نے تم کو عزت عطا کی ہے بہرحال وہ یہ فرماتا ہے کہ تم جنگ بدر میں ذلیل تھے اور خداوند عالم نے تمہا ری مدد فرمائی (فَاتَّقُوْااللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ)

اس کے بعد فرماتا ہے :

(اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُوْ مِنِیْنَ اَلَنْ یَکْفِیَکُمْ أَنْ یُمِدَّکُمْ رَبُّکُمْ بِثَلٰثَۃِ ئَ الَافٍ مِّنَ الْمَلٰئِکَۃِ مُنْزَلِیْنَ) [2]

"اس وقت جب آپ مومنین سے کہہ رہے تھے کہ کیا یہ تمہارے لئے کافی نہیںہے کہ خدا تین ہزار فرشتوں کو نازل کرکے تمہاری مدد کرے "

مومنین اپنے دلوں میں کمزوری کا احساس کرتے تھے اور کبھی کبھی اس کو اپنی زبان سے بھی بیان کیا کرتے تھے کہ ہم اتنے کم افراد اور وہ اُتنے زیادہ کفار وہ بھی پورے جنگی ساز و سامان کے ساتھ ہم ان کا کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں ؟

اس کے بعد خدا دو بنیادی چیزوں یعنی صبر اور تقوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

1۔ سورئہ آل عمران آیت123۔

2۔ سورئہ آل عمران آیت124۔

(بَلَىٰ اِنْ تَصْبِرُوْاوَتَتَّقُوْاوَيَأْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَايُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ ئَ الَافٍ مِّنَ الْمَلٰئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ)[1]

"یقینا اگر تم صبر کروگے اور تقویٰ اختیار کروگے اور دشمن فی الفور تم تک آجائیں گے تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا جن پر بہادری کے نشان لگے ہوں گے"۔

اس آیت میںیہ وعدہ کیا گیا ہے کہ خدا وند عالم ملائکہ (فرشتوں) کو تمہاری مدد کے لئے بھیجے گا لیکن کیا خداوند عالم نے بھیجا یا نہیں ؟

(اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّى مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ)[2]

"جب تم پروردگار سے فریاد کررہے تھے تو اس نے تمہاری فریاد سن لی کہ میں ایک ہزار ملائکہ سے تمہاری مدد کررہا ہوں جو برابر ایک کے پیچھے ایک آرہے ہیں"۔

جنگ بدر میں پیغمبر اکرم ﷺ اور مومنین نے اپنے ہاتھوں کو خداوندعالم کی بارگاہ میں بلند کرکے دعا کی اور اس سے مدد کی درخواست کی اور خدا نے بھی ان کی دعا کو مستجاب فرمایا۔ استجابت دعا بھی یہی تھی کہ خدا وندعالم نے فرمایا میں ایک ہزار فرشتوں کو تمہاری مدد کے لئے نازل کروں گا۔

اب یہ سوال درپیش ہے کہ اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ نے وعدہ کیا تھا کہ تین ہزار فرشتے اور اس کے بعد خدا وند عالم نے بھی فرمایا تھا اگر صبر اور تقویٰ سے کام لیا تو پانچ ہزار فرشتے بھیجوں گا لیکن اس آیت میں فرماتا ہے کہ ہم نے ایک ہزار فرشتے بھیجے ؟

جواب یہ ہے کہ یہ ہزار فرشتے مقدمہ تھے، اس بات کا شاہد یہ ہے کہ خداوندعالم فرماتا ہے (مُرْدِفِيْنَ) مردف اس مقام پر استعمال ہوتا ہے کہ جب کوئی آگے آگے چلتا ہو اور دوسرا اس کے پیچھے پیچھے آرہا ہو۔ ابتداء میں یہ ایک ہزار فرشتے نازل ہوئے اور اپنے بعد دو ہزار فرشتوں کو لانے والے تھے۔ پس وہی تین ہزار فرشتے نازل ہوئے۔

اب ان ملائکہ نے نازل ہوکر کیا کیا ؟

(اِذْيُوْحِىْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰئِكَةِ أَنِّى مَعَكُمْ فَثَبِّتُوْا الَّذِيْنَ آمَنُوْا)[3]

1۔ سورۂ آل عمران آیت125۔

2۔ سورۂ انفال آیت9۔

3۔ سورۂ انفال آیت12۔

"جب تمہارا پروردگار ملائکہ کو وحی کررہا تھا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں لہذا تم صاحبان ایمان کو ثبات قدم عطا کرو"۔

ملائکہ نے جنگ بدر میں نازل ہو کر کیا کردار ادا کیا، کیا انھوں نے جنگ کی یا کوئی دوسرا کردار ادا کیا؟ روایات میں وارد ہوا ہے کہ جنگ بدر میں نازل ہونے والے فرشتوں نے کسی شخص کو قتل نہیں کیا۔جنگ بدر میں اکثر مقتولین کو حضرت علی علیہ السلام اور دوسرے اصحاب نے قتل کیا تھا، ملائکہ کا کام فقط مومنین کی روحی اور معنوی طاقت کو تقویت دینا تھا۔اس آیت میں بھی فرمایا گیا ہے کہ خداوند عالم نے ان پر وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم مومنین کو ثابت قدم رکھنا، ان کے اندر اطمینان و سکون پیدا کرنا۔اس کے بعد اسی آیت میں فرماتا ہے:

(فَاضْرِبُوافَوْقَ الْاَعنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ)[1]

"لہٰذا تم کفار کی گردن کو ماردو اور ان کی تمام انگلیوں کو پور پور کاٹ دو"۔

ان دو جملوں کے سلسلہ میں مفسرین کے مابین اختلاف ہے کہ یہ خطاب کس سے ہے؟کیا یہ خطاب ملائکہ سے ہے یا مومنین سے؟

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ خطاب ملائکہ سے ہے اور ان کو جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔یہ وجہ روایات کے مدنظر اور آیۂ شریفہ کے پہلے جملہ سے سازگار نہیں ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں ملائکہ سے خطاب ہے لیکن (اضْرِبُوافَوقَ الْاَعْنَاقِ سے مراد سر یا ہاتھ یا پیروں کا قطع کرنا نہیں ہے بلکہ ان کا کمزور کرنا مراد ہے، یعنی فرشتوں نے دو کردار ادا کئے ہیں: ایک یہ کہ مومنین کو تقویت پہنچائیں اور دوسرے یہ کہ دشمنوں کو کمزور کریں ان کے سر پر ماریںیعنی ان کو ذلیل کریں، ان کی روحانی طاقت کو کمزور کریں، ان کے ہاتھوں پر ضرب لگائیں تاکہ ان کے ہاتھ سست ہو جائیں نہ یہ کہ ان کے ہاتھ کٹ جائیں۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آخری جملہ میں مومنین سے خطاب کیا گیا ہے۔اب جبکہ ہم نے تمہاری مدد کے لئے ملائکہ کو بھیج دیا ہے تو تم اپنی ہمت باندھے رکھنا اور ان کو نیست ونابود کردینا۔

اس آیت سے متعلق ان تینوں وجہوں کو بیان کیا گیا ہے اور ممکن ہے دوسری وجہ سب سے بہتر ہو اس لئے کہ(خیرالاموراوسطہا)ہے۔یہ وہ تمام آیات تھیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خداوندعالم کی غیبی طاقت اکثر جنگوں میں مومنین کے شامل حال رہی ہے۔

1۔سورۂ انفال آیت12۔

لیکن پیغمبر اکرم ﷺ کرامات و معجزات کے سلسلہ میں شیعہ اور اہلسنت سے متعدد روایات نقل ہوئی ہیں،اور چونکہ ہماری بحث قرآن سے متعلق ہے لہذا ہم ان کو بیان کرنے سے قاصر ہیں لیکن بہت زیادہ متواتر حدیثوں میں ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ سے اتنے زیادہ معجزات ظاہر ہوئے ہیں کہ ان کا شمار کرنا بہت مشکل کام ہے ۔ کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ آپ سے ایک ہی دن میں متعدد معجزاتی باتیں ظاہر ہوتی تھیں ۔ان میں سے بعض کفار کی خواہش کی وجہ سے اور اپنی نبوت کے اثبات کے لئے ہوا کرتی تھیں ،جبکہ بہت سی دوسری چیزیں اپنی نبوت کے اثبات کے لئے نہیں ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر پیغمبر اکرم ﷺ جب بیابان میں خیمہ کے اندر تشریف لاتے تھے اور وہاں پر کوئی بکری ہوتی تھی تو آپ اپنا دست مبارک اس پر رکھ دیتے تھے تو وہ فربہ ہو جاتی تھی اور دودھ دینے لگتی تھی ۔اگر بیمار ہوتی تو شفا پا جاتی تھی وغیرہ وغیرہ اس طرح اور بہت سی مثالیں موجود ہیں ۔

کثیر احادیث میں نقل ہوا ہے کہ کفار پیغمبر اکرم ﷺ سے کہا کرتے تھے کہ اگر آپ نے فلاں کام انجام دیدیا تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے ۔ مشہور و معروف واقعہ ہے کہ انھوں نے کہا کہ اگر آپ سچ فرماتے ہیں کہ میں خدا کا نبی ہوں تو وسط بیابان میں کھڑے اس درخت سے کہئے کہ وہ آگے بڑھ کر آئے اور آپ کی رسالت کی گواہی دے یا یہ سنگریزے آپ کے دست مبارک میں آکر کلام کریں آنحضرت ﷺ نے ان سنگریزوں کو اپنے دست مبارک میں اٹھایا تو وہ سنگریزے تسبیح الٰہی کرنے میں مشغول ہو گئے اور اسی طرح کی بہت سی چیزیں بے شمار روایات میں ذکر ہوئی ہیں۔

عصمت

گذشتہ مباحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ (خداوند) انسانوں کے درمیان کچھ ایسے افراد منتخب کرے جو اسکے اہداف ومقاصد اور ان تک پہنچنے کی راہیں انسانوں کو تعلیم دیں اورپھروہ لوگ بھی ان کو دوسروں تک پہنچائیں ۔

اب یہ سوال پیش آتا ہے: ٹھیک ہے خداوند عالم نے پیغمبر کو منتخب کیا اور اس پر بعض مطالب کی وحی کی کہ اسے بندوں تک پہنچائے ۔اب ہمیں کیسے اطمینان حاصل ہو کہ خداوند عالم نے جو کچھ اپنے پیغمبر پر وحی نازل فرمائی تھی بالکل وہی من وعن بندوں تک پہنچی ہے ؟

دوسرے الفاظ میںتوہ پیام جو خداوند عالم کی طرف سے اسکے بندوں پر نازل ہوتا ہے کئی مرحلوں کو طے کرتا ہے تب بندوں تک پہنچتا ہے فرض کیجئے اگر ان مراحل میں کوئی غلطی ہوجائے، بطور مثال، وحی پہنچانے والے نے پیغمبرتک وحی پہنچانے میں غلطی یا انحراف سے کام لیا ہو، یا پیغمبر وحی کے سمجھنے میں، یا وحی کی تبلیغ کے وقت غلطی کربیٹھے یا یہ احتمال ہو کہ العیاذ باللہ نبی نے (جان بوجھ کر) کوئی بات بدل کر بیان کردی ہے تو جب تک ان مراحل و مراتب کے سلسلے میںہم کو یہ اطمینان نہیں ہوگا کہ اس دوران کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے اس وقت تک لوگوں پر حجت تمام نہیں ہوگی تو اسی دلیل کی بنیاد پر کہ جن کے تحت حکمت الٰہی تقاضا کرتی ہے کہ لوگ راہ سعادت و شقاوت کو پہچانیں اور خداوند عالم کی معرفت حاصل کریں ۔جہاں تک مقاصد الٰہی کو درک کرنے کی بات ہے تو یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اس میں کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے یہی دلیل کافی ہے ۔

یعنی جب ہم نے اس بات کو سمجھ لیا کہ خود خداوند عالم کی حکمت کا تقاضا ہے کہ لوگ الٰہی مقاصد کا علم حاصل کریں تو جو کچھ اس عالم ہونے کا لازمہ ہے یہی دلیل مرحلہ بہ مرحلہ ان سب کے لئے کافی ہے کیونکہ اگر ان میں سے کسی ایک مرحلہ میں کوئی غلطی یا خطا ہوجائے تو مقصد ہی فوت ہوجائیگا اوروہ الٰہی مقصدپورا نہیں ہوگا پس یہی دلیل اس بات کوثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ الٰہی اغراض و مقاصد اپنے اصل متن کی صورت میں ہی لوگوں تک پہنچتے ہیں اور خدا کی طرح سے معین درمیانی واسطے کی غلطی کا ارتکاب نہیں کرتے بنابراین وحی کے لانے والے فرشتوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وحی کے حصول اور نبی تک پہنچانے میں کوئی غلطی نہ کریں اور خود انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی ضروری ہے کہ پیغام وحی صحیح طورپر وصول کریں اور اس کو لوگوں تک پہنچانے میں بھی کوئی غلطی وخطا نہ کریں معلوم ہوا کہ اسی پیغام کا اپنے اصل سرچشمہ سے لوگوں تک پہنچنے کے تمام مراحل میں غلطی وخطا سے محفوظ رہنا اسی دلیل کے ذریعہ ثابت ہے۔

یعنی اسی دلیل سے وحی کو صحیح طورپر وصول کرنے اور اس کو لوگوں تک پہنچانے کے سلسلے میںانبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کی عصمت کی ایک قسم ہے جو انبیاء علیہم السلام کیلئے اور انبیاء سے پہلے ملائکہ کیلئے ثابت ہوتی ہے۔

لیکن عصمت کے دوسرے معنی اوردوسرے مراتب بھی ہیں منجملہ یہ کہ عمل کے میدان میں بھی انبیاء کو غلطی نہیں کرنا چاہیئے یعنی وہ اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی کی نہ صرف خلاف ورزی نہ کریں بلکہ ان کا عمل بھی خود ان پر نازل ہونے والی وحی کے مطابق ہونا چاہیئے حتیٰ اس سے بھی بڑھکر ان کو اپنی نبوت ورسالت سے پہلے بھی معصوم ہونا چاہیئے اور کبھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیئے اور پھر اس سے بھی بڑھکر نہ صرف یہ کہ وہ گناہ و سرکشی نہ کریں بلکہ احکام کو بیان کرنے کے علاوہ بھی ان سے کوئی غلطی اور سہو ونسیان صادر نہیں ہونا چاہیئے ۔مذکورہ دلیل، عصمت کے ان مراتب کو بیان نہیں کرتی بلکہ فقط اتنا بیان کرتی ہے کہ وہ ہدف الٰہی کہ جس کا بندوں کے لئے سمجھنا ضروری ہے، اصل صورت میں ان تک پہنچنا ہی چاہیئے لیکن یہ کہ انبیاء علیہم السلام کو اس کے مطابق عمل بھی کرنا چاہیئے یا نہیں ؟ یہ دلیل اس بات کو ثابت کرنے کی قدرت نہیں رکھتی بلکہ ہمیں آیات، روایات اور دوسری دلیلوں سے اس مطلب کو معلوم کرنا ہوگا۔

پہلے مسئلے میں یعنی "وحی کو لیکر لوگوں تک پہنچانے میں انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا "اس طورپر کہ وہ کوئی غلطی نہیں کرتے، یعنی جان بوجھ کر خودپر نازل ہونے والی وحی کے خلاف، کوئی بات لوگوں تک نہیں پہنچاتے ۔ اس ذیل میں عقلی دلیل کے علاوہ بہت زیادہ آیات و روایات موجودہیں جو اس بات کی تائید کرتی ہیں لیکن یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ جس شخص پر ابھی نبی کی نبوت نیز اس کی کتاب کی حقانیت ثابت نہ ہوئی ہو اس کے لئے کتاب کے مطالب سے استدلال کرنا بے فائدہ ہے اس لئے کہ فرض یہ ہے کہ اس کو ابھی نبی اور اس کی کتاب کے بارے میں شک ہے۔ لہذا ایسے شخص کے سامنے پہلے عقلی دلیل ہی قائم کرنا چاہیئے ۔ہاں یہ ثابت ہوجانے کے بعد کہ خداوند عالم کی طرف سے ایک کتاب ہی نازل ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مطالب بھی اس کے لئے حجت ہوں گے۔ مثال کے طورپر یہ ثابت ہوجانے کے بعد کہ قرآن خداوند عالم کی طرف سے معجزہ ہے فطری طورپر اس کے مطالب بھی تمام لوگوں کے لئے حجت ہوں گے لیکن اس سے پہلے کے مراحل میں ہم جو بھی دلیل پیش کریں اس کی بنیاد عقل پر استوار ہونا چاہیئے ۔

ملائکہ کی عصمت

قرآن کریم میں وہ آیات موجود ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ملائکہ معصوم ہیں اور وہ الٰہی پیغامات پہنچا نے میں کوئی غلطی نہیں کرتے اسی طرح انبیاء علیہم السلام بھی جان بوجھ کر خطا سے محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ وحی کے پیغام وصول کرنے اور لوگوں تک پہنچانے میں بھی غلطی اور خطا سے محفوظ ہوتے ہیں ۔

ہم ملائکہ کی عصمت کے بارے میں کچھ آیات ذیل میں پیش کر رہے ہیں قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے :

(وَقَا لُوْااتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَداً سُبْحٰنَهُ بَلْ عِبَا دمُّكْرَمُوْنَلَايَسْبِقُوْنَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ)[1]

"اور (اہل مکہ) کہتے ہیں کہ خدائے رحمان صاحب اولاد ہے وہ اس سے پاک و مبرا ہے بلکہ (وہ فرشتے) خدا کے معزز بندے ہیں جو اس کی بات پر اپنی بات مقدم نہیں کرتے اور یہ لوگ اسی کے حکم پر چلتے ہیں"۔ دوسری آیت

ل (ٰا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاأَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَايُوْمَرُوْنَ)[2]

"خداجس بات کا حکم دیتا ہے فرشتے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو انھیں حکم دیا گیا ہے"۔

قرآن نے خاص طور سے حضرت جبرئیل کے بارے میں (جو قرآنی وحی میں واسطہ رہے ہیں) یہ بات زور دیکر کہی ہے کہ خداوند عالم جو کچھ ان پر وحی کرتا تھا وہ من وعن پیغمبر اسلام ﷺ تک اسی طرح پہنچا دیتے تھے ۔ خدا کی وحی اور پیغام وصول کرنے اور اس کو پیغمبر اسلام ﷺ تک پہنچانے کے سلسلے میں عصمتِ جبرئیل کی تصدیق ہے، رہا یہ مسئلہ کہ جناب جبرئیل کے سلسلے میں یہ خاص طور سے اہتمام کیوں کیا گیا ؟ اس کا راز یہ ہے کہ بنی اسرائیل حضرت جبرئیل کی نسبت بہت زیادہ حساسیت رکھتے تھے بنی اسرائیل پر جو کچھ بھی عذاب نازل ہوئے (خود ان کے عقیدہ کے مطابق) حضرت جبرئیل کے ذریعہ ہی نازل ہوئے تھے ۔ اسی بناء پر وہ پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میںحاضر ہو کرکہنے لگے آپ پر جو فرشتہ نازل ہوتا ہے کون ہے ؟اگر وہ جبرئیل ہے تو ہم آپ کی باتوں کو قبول نہیں

1۔ سورۂ انبیاء آیت 26۔27۔

2۔ سورۂ تحریم آیت6۔

کریں گے کیونکہ ان کو ہم سے دشمنی ہے اس وقت یہ آیت نازل ہوئی :

(قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوّاً لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهُ نَزَّ لَهُ عَلَىٰ قَلْبِکَ بِاِذْنِ ا للّٰهِ)[1]

"(اے رسول ان لوگوں سے)جو جبرئیل کے دشمن ہیں کہدیجئے انھوں نے خدا کے حکم سے(اس قرآن کو)تمہارے قلب پرنازل کیاہے"۔ اس آیۂ شریفہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جو کچھ بھی حضرت جبرئیل نے پیغمبر اکرم ﷺ پر وحی کیا ہے وہی ہے جو خدا نے ان سے فرمایا ہے اور انھوں نے اس کو پہنچانے میں کوئی کوتاہی یا مداخلت اور تصرف نہیں کیا ہے ۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

(اِ نَّهُ لَقَوْ لُ رَسُوْلٍ كَرِ يْمٍ ذِ ىْ قُوَّ ةٍ عِنْدَ ذِىْ الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ)[2]

"بیشک یہ (قرآن)ایک معزز پیغامبر(جبرئیل)کی بات ہے جو عرش کے مالک کی بارگاہ میں بلند رتبہ ہے فرشتوں کا سردار اور امانت دار ہے"۔

یہ ان مقامات میں سے ہے جہاں ملائکہ کو بھی رسول کہا گیا ہے اور کچھ دوسری آیات جیسے سورۂ حج میں آیا ہے :

(اللّٰه يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰئِكَةِ رُسُلاً)[3]

" خدا فرشتوں میں سے بعض کو اپنے احکام پہنچانے کے لئے (رسول یعنی پیغامبر کے طورپر) منتخب کر لیتا ہے"۔

جن اوصاف کا ان آیتوں میں ذکر ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ فرشتۂ وحی کی طرف سے کسی تشویش کی ضرورت نہیں ہے فرشتہ "رسولٍ کریمٍ ذی قوۃٍ" ہے ۔

چونکہ ممکن ہے کوئی یہ خیال کرے کہ جس وقت جبرئیل وحی لیکر پیغمبر کے پاس آرہے ہو ںراستہ میں ان پر شیاطین حملہ کر کے وحی (کی آیات)چھین لیں اور اس میں کوئی کمی یا زیادتی کردیں ۔ اسی لئے یہاں پر جبرئیل کی اس قوت و طاقت پر زور دیا گیا ہے کہ جبرئیل اس قدر قوی ہیں کہ پیغام پہنچانے میں کوئی بھی طاقت ان پر قابو حاصل نہیں کر سکتی ۔ یقیناً ہم نہیں کہہ سکتے کہ جناب جبرئیل تک کس طرح وحی پہنچتی تھی اور پیغمبر تک کس طرح وہ پہنچاتے تھے لیکن معقول کے ساتھ محسوس کی تشبیہ کے طورپر یہ فرض کرلیجئے کہ ایک شخص کسی چیز کو لیکر کسی دوسرے شخص کے پاس

1۔ سورۂ بقرہ آیت 97۔

2۔ سورۂ تکویر آیت 19 ۔ 21 ۔

3۔ سورۂ حجآیت 75۔

پہنچا نے جا رہا ہے اور راستہ میں کوئی چور اس پر حملہ کر دے یا کسی بہا نہ سے اس چیز میں رد و بدل کر دے ، یا اس میں کسی چیز کی کمی یا زیادتی کرنا چا ہتا ہے ۔ قرآن کریم ایسے میں فر ماتا ہے کہ جناب جبر ئیل اس طا قت کے مالک ہیں کہ کوئی بھی طا قت کسی طرح بھی ان کی پیغام رسانی میں کوئی مدا خلت اور تصرف نہیں کر سکتی ۔ اب جبکہ معلوم ہو گیا کہ شیا طین جبر ئیل پر غا لب آ کر ان کی رسالت میں کوئی مدا خلت او رتصر ف نہیں کر سکتے تو اب سوا ل پیدا ہو تا ہے کہ کیا خود جبر ئیل اس وحی میں کو ئی تصر ف کر سکتے ہیں ؟ قر آن کریم فر ما تا ہے :"مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ" جبر ئیل تمام فر شتو ں کے سردار اور اما نتدار ہیں ۔ اس بنا پر جبر ئیل کی طرف سے بھی وحی میں دخل اندازی اور تصرف کا احتمال نہیں رہ جا تا ۔

ایک اور آیت میںخدا وند عالم فر ماتا ہے :

(وَمَانَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِرَبِّکَ لَهُ مَا بَیْنَ اَیْدِ یْنَا وَمَاخَلْفَنَا وَمَا بَیْنَ ذٰلِکَ وَمَاکَانَ رَبُّکَ نَسِیّاً)[1]

"اور ہم (فرشتے)آپ کے پر ور دگا ر کے حکم کے بغیر زمین پر نہیں اتر تے جو کچھ ہما رے سا منے اور ہما ری پس پشت اور جو کچھ ان کے در میان ہے (سب کچھ) اسی کا ہے اور تمہا را پر ور دگا ر کچھ بھو لتا نہیں ہے "۔

پس یہ آیتیں اس چیز کی ضما نت ہیں کہ ملا ئکہ ہر طرح کی خطا اور شیا طین کے تسلط و تصر ف سے محفو ظ ہیں ۔

عصمتِ انبیا ء علیہم السلام (وحی سمجھنے میں)

کیا انبیا ء علیہم السلام سے وحی سمجھنے میں غلطی ممکن ہے ؟ عا م انسا نو ں کے لئے تو ایسا ہو تا ہے کہ جب وہ کسی سے گفتگو کر تے ہیں تو بعض او قات ان کی بات صحیح طو ر پر نہیں سمجھ پا تے یا کچھ کا کچھ سن لیتے ہیں تو کیا انبیا ء کے با رے میں بھی اس بات کا احتمال ہے کہ مثلاً جب جبر ئیل ان کے پاس خدا کا پیغا م لائیں تو وہ جبر ئیل کی با تیں کچھ کا کچھ سمجھ لیں ؟ یا فرض کیجئے خدا کا پیغام صحیح طور پر سمجھ تو لیں لیکن کیا یہ احتما ل پا یا جا تا ہے کہ وہ تبلیغ کے مر حلے میں پیغا م خدا لوگوں تک پہنچا تے وقت غلطی سے دو چا ر ہو جائیں ؟ اور اگر وہ غلطی کے مر تکب نہیں ہو تے تو اس کی دلیل کیا ہے ؟

مذ کو رہ عقلی دلیل کے قطع نظر ، اس سلسلہ میں بھی آیتیں مو جو دہیں جو اس بات کی ضا من ہیں کہ انبیا ء علیہم السلام نہ تو وحی کے سمجھنے میں غلطی کر تے اور نہ ہی اس کو لو گو ں تک پہنچا نے میں خطا کر تے ہیں خدا وند عالم ارشا د فر ما تا ہے:

(عَالِمُ الْغَیْبِ فَلاَیُظْهِرُعَلَی غَیْبِهِ حَدًاِلاَّمَنْ ارْتَضَی مِنْ رَسُولٍ فَ◌ِنَّهُ یَسْلُکُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًالِیَعْلَمَ نْ قَدْ بْلَغُوارِسَالاَتِ رَبِّهِمْ وَ◌َحَاطَ بِمَالَدَیْهِمْ وَ◌َحْصَی کُلَّ شَیْئٍ)

1۔ سورئہ مریم آیت 64 ۔

(عَدَدًا)[1]

"(خدا) غیب کا عالم ہے اور اپنی غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر وہ جس پیغمبر کو منتخب فرمائے تو اس کے آگے اور پیچھے نگہبان (فرشتے) مقرر کر دیتا ہے تاکہ دیکھ لے کہ انھوں نے اپنے پروردگار کے پیغامات (لوگوں تک) پہنچا دیئے ہیں اور جو کچھ ان کے پاس ہے سب اس کے حصار میں ہے اور ایک ایک چیز اس کے زیر تسلط ہے "۔

("فانّهٗ یَسْلُکُ مِنْ) "اب وہ جس رسول اور پیغمبر کو پسند اور منتخب کر لیتا ہے اس کے آگے اور پیچھے محافظ لگا دیتا ہے اور اپنے حصار میں رکھتا ہے کوئی ان پر اعتراض نہیں کر سکتا اور نہ ہی ان کی رسالت میں خلل اندازی کر سکتا ہے ۔ وہ اس طرح الٰہی نگہبانوں کے احاطہ میں رہتے ہیں کہ کوئی خطا نہیں کرتے ۔

("لِیَعْلَمَ اَنْ قَدْ) ۔۔۔"خدا یہ کام انجام دیتا ہے تاکہ وہ سمجھ لے کہ انھوں نے اپنے پروردگار کے پیغامات ٹھیک پہنچا دیئے ہیں۔

اس آیۂ شریفہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انبیائے الٰہی وحی کے سمجھنے اور بعینہ ان ہی الفاظ میں لوگوں تک (منطوق کلام پہنچانے میں)غلطی نہیں کرتے ۔ اس لئے کہ اگر ان میں خطا کا احتمال ہو تو "لِیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسَالَاتِ رَبِّھِمْ" متحقق نہیں ہو گا جب خدا وند عالم کے علم میں انھوں نے اس کے پیغامات صحیح طور پر لوگوں پہنچا دیئے ہوں تو ان میں کسی خطا کا احتمال نہیں پایا جاتا ۔ یہ آیت اس چیز کا بہترین ثبوت ہے کہ انبیائے الٰہی وحی کا پیغام سمجھنے اور لوگوں تک پہنچانے میںکوئی غلطی اور خطا نہیں کرتے ۔ یعنی یہ بھی اسی عقلی دلیل کے مانند ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو مقصد بھی فوت ہوجائے گا اور یہ حکمت الٰہی کے خلاف ہے ۔

کیا انبیاء علیہم السلام وحی میں کسی چیز کا اضافہ کر سکتے ہیں ؟

اب جبکہ طے پا گیا کہ انبیاء علیہم السلام وحی کے سمجھنے اور تبلیغ کرنے میں کوئی غلطی نہیں کرتے بالکل صحیح اور مکمل طور پر لوگوں تک پہنچاتے ہیں تو کیا ان کے لئے وحی میں کسی چیز کا اضافہ کرنا ممکن ہے ؟ گذشتہ آیت میں خداوند عالم نے فرمایا تھا کہ خداوند عالم جو کچھ ان پر وحی کرتا ہے انبیاء اسی طرح اس کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور ان کی اس طرح حفاظت کرتے ہے کہ خداوند عالم کے پیغامات بالکل صحیح طور پر لوگوں تک پہنچ جائے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان کے لئے ممکن ہے وہ وحی میںکسی اور چیز کا اضافہ کردیں ؟اور کوئی ایسی بات پر جو خداوند عالم نے ان پر وحی نہ کی ہو وحی کے عنوان سے لوگوں تک پہنچا دیں ؟

1۔ سورۂ جن آیت 26۔ 28 ۔

اس منزل میں بھی (گذشتہ آیات میں ذکر شدہ علت سے عمومی استفادہ کے علاوہ)بہت سی دلیلیں ہیں جو اس چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ خداوند عالم بندوں تک اپنے پیغامات پہنچانے کے لئے کسی ایسے ہی شخص کو منتخب کرتا ہے کہ جس کے بارے میں اطمینان ہوکہ وہ خیانت نہیں کرے گا۔ ورنہ خدا کا مقصد فوت ہو جائے گا اگر رسول معصوم نہ ہو اور یہ احتمال پایا جائے کہ وہ اپنی طرف سے بھی لوگوں کے سامنے کچھ بیان کر سکتا ہے تو خدا کی غرض فوت ہوجائے گی کیونکہ لوگ شبہہ میں پڑ جائیں گے اور وحی اور غیر وحی میں فرق نہیں کر سکیں گے۔

ہم اس سلسلہ میں بھی متعدد آیات سے استفادہ کر سکتے ہیں پہلے ان آیات کو بیان کر دیں کہ جن میں کلی طور پر کہا گیا ہے کہ نبی پیغام وحی میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کرتا:

(وَمَاارْسَلْنَامِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ) [(1)]

"اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ خدا کے حکم کے تحت لوگ اس کے حکم کی اطاعت کریں"۔

ظاہر ہے کہ خدا کا رسول جو کچھ بھی لوگوں تک پہنچائے اس پر عمل کرنا لوگوں کا فریضہ ہے اب اگر پیغمبر اپنی طرف سے کوئی بات اضافہ کر دے تو اس پر عمل ضروری نہیں ہوگا۔ حالانکہ خداوندعالم نے حکم دیا ہے کہ ہر رسول کی مطلق طور پر اطاعت کرنا چاہئے۔ معلوم ہوا کہ جو کچھ بھی انبیاء علیہم السلام الٰہی پیغام کے عنوان سے بیان کرتے ہیں وہ خدا کی رضا کے مطابق تائید شدہ ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انبیاء علیہم السلام جن باتوں کی تبلیغ فرماتے ہیں وہ سب خداوند عالم کی تائید شدہ ہیں اور ان کی کلی طور پر اطاعت ہونی چاہئے دوسرے لفظوں میں: خداوند عالم ایسے کو پیغمبر نہیں بناتا جو خداوند عالم کے پیغامات میں اپنی طرف سے کسی چیز کا اضافہ کر دے۔ دوسری آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے نصاریٰ کا عقیدہ تھا کہ عیسیٰ بن مریم نے اپنے کو لوگوں کے سامنے خدا کے بیٹے کی حیثیت سے پہچنوایا ہے اور اپنی پرستش کرنے کی دعوت دی ہے۔ بہت سی آیتوں میں اس موضوع کے بارے میں بحث کی گئی ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے اور اسی انتساب کی بنیاد پر جو نصاریٰ نے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف دی ہے ایک آیت میں خداوند عالم حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال کرتا ہے:

(ئَ أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُ مِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ) [(2)]

1۔ سورۂ نساء آیت 64۔

2۔ سورۂ مائدہ آیت 116۔

"کیا تم نے لوگوں سے کہا ہے کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو خدا بنا لو"۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی نفی میں جواب دیتے ہوئے عرض کرتے ہیں:

(اِنْ کُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ)

"اگر میں نے ایسا کچھ کہا ہوتا تو تجھ کو خود معلوم ہوتا کیونکہ تو میرے دل کی سب بات جانتا ہے"۔

پیش نظر آیت میں گویا خداوند عالم استدلال کے پیرائے میں فرماتا ہے کہ اس کا کوئی سوال ہی نہیں ہے کہ خداوند عالم کسی کو رسول بنائے اور وہ خداوند عالم کے اغراض و مقاصد کے خلاف بات کرے۔ خداوند عالم بھی کسی ایسے شخص کو کہ جس کے یہاں اس طرح کا احتمال بھی ہو رسالت کے لئے منتخب نہیں کر سکتا۔ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں یا تو خدا جاہل ہوتا اور اس کو یہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ یہ شخص ایسا کرے گا یا یہ کہ وہ عاجز ہوتا اور اس کو ایسا کرنے سے نہ روک سکتا اور خداوند عالم نہ جاہل ہے اور نہ عاجز، اور وہ فرماتا ہے:

(وَمَاکَانَ لِبَشَرٍاَنْ یُؤْ تِیَهُ اللّٰهُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنَّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِکُوْنُوْا عِبَا داً لِّی مِنْ دُوْنِ اللّٰه)[1]

"کسی آدمی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ خدا اسے کتاب، حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ"۔

کیا خدا ایسے کو پیغمبر بنا سکتا ہے کہ خدا نے تو اس کو توحید کی رہنمائی کے لئے بھیجا ہو اور وہ لوگوں کو شرک کی دعوت دے؟ خداوند عالم کبھی بھی ایسے پیغمبر کا انتخاب نہیں کر سکتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہے کہ مشرکین آپ کی طرف افتراء کی نسبت دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے (العیاذ باللہ) آپ جو کلمات خدا سے منسوب کرتے ہیں وہ خود آپ ہی کے کلمات ہیں صرف اس لئے کہ لوگ قبول کر لیں، کہتے ہیں کہ خدا نے ایسا فرمایا ہے۔ بہت سی آیات ہیں جن میں خداوند عالم نے مشرکین کی زبانی پیغمبر پر افتراء کی نسبت نقل کی ہے۔ آج بھی بعض دانشور اور مستشرقین جب دین اسلام کا ایک ترقی یافتہ دین کے عنوان سے تعارف کراتے ہیں اور دین اسلام کی تعلیمات کی تعریف کرتے ہیں اس کے ساتھ ہی یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا قانون بنانے والے (نبی) بات منوانے کے لئے اپنی بات کو خدا سے منسوب کر دیتے تھے۔ اس زمانہ میں بھی اس طرح کی

1۔ سورۂ آل عمران آیت 79۔

باتیں تھیں لیکن جو دین اسلام قبول نہیں کرنا چاہتے تھے ۔ وہی اس طرح کی باتیں بنایا کرتے تھے۔ خداوندعالم فرماتا ہے کہ اگر یہ طے ہوتا کہ جو کچھ ہم نے اپنے نبی پر وحی کی ہے وہ اسکے خلاف ایک حرف بھی لوگوں سے کہیں گے تو ہم ان کو ایسا کرنے کی مہلت ہی نہ دیتے ارشاد ہوتا ہے:

(وَ لَوْتَقَوَّلَ عَلَیْنَابَعْضَ الاَ قَاوِیْلِلاَخَذْنَامِنْهُ بِالْیَمِیْنِثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْه الْوَ تِیْنَفَمَامِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِیْنَ)[1]

"اگر رسول ہماری طرف سے کوئی بات گڑھ کر کہتے تو ہم پوری قوت کے ساتھ ان کو روک دیتے اور پھر ہم ان کی رگِ حیات ہی قطع کر دیتے اور تم میں کوئی مجھے اس سے روک نہیں سکتا تھا" ۔

یہاں پر (لَا خَذْ نَا مِنْهُ بِا لْیَمِیْنِ) "تو ہم ان کو داہنے ہاتھ سے پکڑ لیتے" سے مراد یہ ہے کہ ہم ان کو اپنی پوری قوت سے روک دیتے ۔ (عربی زبان میں اس طرح کے جملے قدرت کی علامت ہوتے ہیں کیونکہ عام طور پر انسان کا داہنا ہاتھ اس کے بائیں ہاتھ سے زیادہ قوی ہوتا ہے) اور نہ صرف یہ کہ ہم ایسی بات کرنے سے روک دیتے بلکہ ان کی رگ حیات کو منقطع کر دیتے "ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِیْنَ "اور کوئی شخص ہم کو ایسا کرنے سے روک بھی نہیں سکتا تھا۔

یہ آیات اس چیز پر دلالت کرتی ہیںکہ انبیاء علیہم السلام وحی کو سمجھنے اور اس کو من و عن لوگوں تک پہنچانے میں کوئی بھی غلطی یا خطا نہیں کرتے اور نہ ہی اپنی طرف سے اس میں کسی چیز کا اضافہ کرتے ہیں ۔

مقامِ عمل میں انبیاء علیہم السلام کی عصمت

عقل ہم سے کہتی ہے کہ بندوں تک الٰہی پیغام من و عن بالکل صحیح پہنچنا چاہیئے لہٰذا انبیاء علیہم السلام کا وحی کے سمجھنے اور لوگوں تک پہنچانے میںقطعی طور پر معصوم ہونا ثابت ہے لیکن مقام عمل میں بھی خود انبیاء علیہم السلام ان پیغامات پر ضرور عمل کرتے ہیں اس کو ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل کافی نہیں ہے۔ بعض علماء علم کلام نے مقام عمل میں انبیاء علیہم السلام کی عصمت عقل کے ذریعہ ثابت کرنے کی چند صورتیں بیان کی ہیں منجملہ وہ کہتے ہیں :

قول کی طرح عمل بھی کسی کام کے جائز ہونے پر دلالت کرتا ہے ۔ اگر پیغمبر (العیاذ باللہ) کسی گناہ کا ارتکاب کرتے تو لوگ ان کے عمل کو اس گناہ کے جائز ہونے کی دلیل سمجھتے اور اس سے بھی خداوندعالم کی حکمت فوت ہوجاتی۔ خداوندعالم نے انبیاء علیہم السلام کو اسی لئے بھیجا ہے کہ وہ لوگوں کو سمجھائیںکہ کونسا کام کرنا چاہیئے اور کونسا کام

1۔ سورۂ الحاقہ آیت 44تا47۔

نہیں کرنا چاہیئے ۔ اگر کوئی پیغمبر عملی طور پر کسی گناہ کا مرتکب ہو تو لوگ اُس کو اِس گناہ کے جائز ہونے کی دلیل سمجھیں گے اور اس سے خدا کی حکمت فوت ہو جائے گی ۔

یہ دلیل بہت زیادہ یقین آور نہیں ہے اس لئے کہ ممکن ہے کوئی شخص خدا کے پیغام کو صحیح طور پر لوگوں تک پہنچادے اور اُن سے کہے کہ اس کے مطابق کام انجام دینا چاہیئے لیکن میں بھی تمہاری طرح کبھی کبھی گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہوں اور میرا فلاں کام خلاف ورزی کی وجہ سے تھا لیکن تم اس گناہ کا ارتکاب نہ کرنا ۔ عقل سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اتنا کہنا کافی نہیں ہے اور یہ عقلی طور پر محال بھی نہیں ہے البتہ ہمارے پاس کتاب و سنت سے کافی دلیلیں موجود ہیں جو اس چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام حتیٰ رسالت سے پہلے بھی معصوم ہوتے ہیں لیکن عصمت کی ضرورت پر عقلی دلیل کا قائم کرنا آسان نہیں ہے ۔ ہم عقل کے ذریعہ جو بات انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے لئے ثابت کر سکتے ہیں وہ وحی کے سمجھنے اور اس کو ٹھیک ٹھیک لوگوں تک پہنچانے کے سلسلے میں ان کا معصوم ہونا ہے ۔ ہاں یہ خداوند عالم کی طرف سے ایک لطف ہے کہ انبیاء علیہم السلام عملی طور پر بھی خطا و غلطی سے معصوم ہوتے ہیں کیونکہ خطا و غلطی سے معصوم ہونے کی وجہ سے لوگ ان پر زیادہ اعتماد کریں گے اور ان کی رفتار لوگوں کیلئے نمونۂ عمل ہوگی اور لوگ ان (معصوموں) کی رفتار و کردار سے پوری طرح تمسک کر سکیں گے ۔ یہ ان پر خداوند عالم کا ایک لطف ہے لیکن ہم اس بات کی ضرورت عقلی دلیل کے ذریعہ ثابت نہیں کر سکتے البتہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت پر بہت سی آیات دلالت کرتی ہیں اور روایات بھی کثرت سے موجود ہیں ۔

اس مسئلہ میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان کئی جہتوں سے کم و بیش اختلاف رہا ہے انبیاء علیہم السلام نبوت ملنے کے بعد معصوم ہوتے ہیں اس بارے میں تقریباً سبھی متفق ہیں لیکن بعض کے نزدیک نبوت ملنے سے پہلے معصیت کا امکان پایا جاتا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ انبیاء علیہم السلام ایسا فعل انجام دے سکتے ہیں جو بعد میں خود ان کے دین میں حرام ہو جائے لیکن ابھی حرام نہیں ہوا ہے اور بعض کا یہ نظریہ ہے کہ وہ صرف گناہ کبیرہ سے معصوم ہوتے ہیں ۔

ان تمام نظریوں کے طرفداروں نے اپنے اپنے نظریوں کو ثابت کرنے کے لئے کچھ عقلی دلیلیں پیش کی ہیں منجملہ یہ کہ: اگر کوئی شخص کسی گناہ کا مرتکب ہوا ہو تو یہ اس شخص کے وقار کو ختم کر دیتا ہے اور لوگ ایسے شخص پر اعتماد نہیں کرتے ۔ لہٰذا نبی کو خود بھی عملی طور پر بُرے اعمال سے محفوظ رہنا چاہیئے تاکہ لوگوں کی نظر میں قابل اعتماد رہے ۔ اس دلیل کی بنیاد بھی گمان پر ہے اس لئے کہ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ ایک شخص کے پاس کتاب ہے اور وہ اِس کتاب کو خداوند عالم کی طرف سے لوگوں کے لئے لیکر آیا ہے اور اس کتاب کو اس نے لوگوں تک پہنچا کر حجت تمام کر دی ہے تو اس صورت میں خود اس کو بھی کتاب کے خلاف عمل نہیں کرنا چاہیئے اس پر کوئی عقلی دلیل قائم کرنا مشکل ہے البتہ اس کی ترجیح اور اولویت میں کوئی شبہ نہیں ہے ۔

بہر حال شیعوں کا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی پیدائش سے موت تک تمام گناہوں سے خواہ کبیرہ ہو یا صغیرہ محفوظ ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت خاتم النبیین تک کسی ایک نبی نے بھی اپنی پوری عمر کے دوران چھوٹے سے چھوٹے گناہ کا بھی ارتکاب نہیں کیا ہے لیکن اہلسنت کے بعض فرقے ہم سے اس بارے میں کم و بیش اختلاف رکھتے ہیں اور انھوں نے بعض شکوک و شبہات بھی پیدا کئے ہیں شاید ہم بعد میں ان میں سے بعض شبہات کو بیان کریں۔

مقامِ عمل میں انبیاء کے معصوم ہونے پر کیا کوئی قرآنی دلیل ہے؟

قرآن کریم کی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ انسانوں کے درمیان کچھ ایسے "مخلَص "بندے ہیں جن کی خلقت کے پہلے دن سے ہی جب شیطان نے بنی آدم کو گمراہ کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس کے یہاں ان افراد کو گمراہ کرنے کی طمع نہیں تھی چنانچہ خداوند عالم کے دربار سے نکالے جانے کے بعد اس نے قسم کھا کر کہا تھا:

(فَبِعِزَّ تِکَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِ لَّا عِبَادَ کَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ)[1]

"تیری عزت (و جلال) کی قسم تیرے مخلَص بندوں کے سوا ہر ایک کو ضرور گمراہ کروں گا"۔

یہ "مخلصین "بندے کس طرح کے ہیں کہ خود شیطان بھی جانتا تھا کہ میں ان کو گمراہ نہیں کرسکتا؟ وہ کون سے بندے ہیںٍاور ان کی کیا خصوصیتیں ہیں؟تعبیر مخلَص سے یہ مطلب نکالا جاسکتا ہے کہ یہ وہ افراد ہیں جن کو خداوند متعال نے صرف اپنے لئے پاک و مخلص کیا ہے۔

قارئین کرام: یہاں یہ بیان کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مخلَص (لام پر زبر) کے ساتھ اور مخلِص (لام پر زیر) کے ساتھ دو الگ الگ مفہوم کے حامل ہیں (زیر کے ساتھ) مخلصین وہ لوگ ہیں جو اپنی جگہ خود خلوص نیت سے خدا کے لئے عمل انجام دیتے ہیں لیکن (زبر کے ساتھ) مخلصین وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے پاک نیت اور مخلص بنایا ہے صرف ان کے عمل میں ہی خلوص نہیں ہے بلکہ وہ خود بھی مجسمۂ خلوص ہیں یعنی ان کا پورا وجود خدا کے لئے ہے۔ چنانچہ ان افراد سے شیطان کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ مخلص کی تعبیر تقریباً اسی اصطلاح معصوم پر منطبق ہوتی ہے۔ جب ہم معصوم کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بندہ جس کو خداوند عالم نے گناہوں سے محفوظ کردیا ہے (البتہ یہاں یہ

1۔ سورۂ ص آیت 82۔83۔

یاد رکھنا چاہئے کہ یہ چیز صاحب اختیار ہونے کے منافی نہیں ہیں۔ خدا نے صرف ان کے گناہ نہ کرنے کی ضمانت لی ہے ۔ آن کا اختیار سلب نہیں کیا ہے) قرآن کریم میں معصوم کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی ہے جو تعبیر " معصوم " کے مفہوم پر منطبق ہوتی ہے ۔ یہ وہ بندے ہیں جن کو خداوندعالم نے خالص اپنے لئے قرار دیا ہے ، اور ان کے یہاں شیطان کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے اور وہ اس طرح کے ہیں کہ خود شیطان بھی ان کو گمراہ کرنے کی ہوس میں نہیں آتا۔ قرآن کریم نے کچھ ایسے انبیاء علیہم السلام کے نام لئے ہیں جو خدا کے مخلص بندے ہیں :

(اِ نَّہْ مِنْ عِبَادِنَاالْمُخْلِصِیْنَ وَکَانَ مُخْلِصاً)

"بیشک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھا اور وہ میرا مخلَص بندہ تھا "۔

ان مخلص بندوں کے بارے میں بعض مقامات پر وضاحت کی گئی ہے کہ خداوند عالم چاہتا ہے کہ ان کو برے کاموں سے دور رکھے اور ان کے وجود کو ہر طرح کے انحرافات اور پلیدیوں سے محفوظ رکھے اور ان ہی مقامات میںسے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہے جس میں قرآن نے عزیز مصر کی بیوی زلیخا کا حضرت یوسف علیہ السلام پر عاشق ہو جانا ذکر کیا ہے یہاں تک کہ زلیخا نے ایک ایسا کمرہ تیار کیا جو ہر رخ سے محفوظ اور تنہا ہو اور وہاں حضرت یوسف علیہ السلام کو مشتعل کرنے کے تمام وسائل بھی فرا ہم تھے اور وہ بہانے سے آپ کو کمرہ میںلے گئی اور دروازوں کو اس طرح بند کیا کہ کسی دوسرے کو اس کی خبر نہ ہو سکے ۔ روایات میں یہاں تک ہے کہ اس نے کمرہ کے چاروں طرف آئینہ بندی کر دی تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام جس طرف بھی نظر اٹھا ئیں زلیخا ہی کی تصویر دکھائی دے اس طرح کے حالات میں قرآن کریم فرماتا ہے :

(وَلَقَدْ ہَمَّتْ بِہِ وَہَمَّ بِہَا لَوْلَا اَنْ رَّئَ ا بُرْہٰنَ رَبِّہِ کَذٰلِکَ لِنَصْرِفَ عَنْہُ السُّوْئَ وَالْفَحْشَآئَ اِنَّہُ مِنْ عِبَادِنَاالْمُخْلَصِیْنَ)

(1)

"اس عورت نے تو ان کو حاصل کرنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا اب اگر انھوں نے اپنے پروردگار کی دلیل نہ دیکھی ہوتی تو وہ بھی اس کا قصد کر بیٹھتے (لیکن) ہم نے ایسا کیا کہ ان سے برائی اور بدکاری کو دور رکھیں ، بیشک وہ (یوسف) ہمارے "مخلَص" بندوں میں تھے "۔

ظاہر ہے اس طرح کے مواقع پر اگر خداوندعالم کا خاص لطف نہ ہو تو ایک عام انسان اپنے نفس پر کنٹرول نہیں کر سکتا۔ ایسے میں جب عزیز مصر کی بیوی حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف بڑھی تو قبل اس کے کہ آپ بھی اس

1۔ سورئہ یوسف آیت 24 ۔

کی طرف مائل ہوں خدا وند عالم نے ان پر اپنی دلیل آشکار کر دی اور یہ کام اس لئے کیا کہ حضرت یوسف گناہ سے محفوظ رہیں ۔ رہی بات کہ وہ دلیل کیا تھی جو خدا وند عالم نے حضرت یوسف علیہ السلام پر آشکار کی تھی ؟ اس بارے میں کچھ ایسی آیات نقل ہوئی ہیں جن کے مطالب اطمینان بخش نہیں ہیں ۔

قرآن کریم نے واضح طور پر یہ بیان نہیں کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کیا چیز دیکھی تھی ۔ قرآن نے صرف اتنا کہا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے "خدا کی دلیل "کا مشاہدہ کیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی غیبی بات ان پر آشکار ہوئی تھی "دلیل "یا "برہان "کی لفظ عام طور سے اس جگہ بولی جاتی ہے جہاں انسان کو کوئی علم حاصل ہو ۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے کوئی ایسی نشانی کا مشاہدہ کیا جس نے ان کو غفلت سے بچا لیا ۔ ہم عرفان کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ "الٰہی تجلّی " تھی لیکن کیا تھی اور کس طرح کی تھی ؟ قرآن اس بارے میں کچھ نہیں کہتا اور ہم کو بھی نہیںپتہ کہ وہ کیا ہے کہ انھوں نے کس چیز کا مشاہدہ فرمایا تھا ۔ بہر حال کوئی ایسی چیز دیکھی تھی جس نے ان کو غفلت سے بچا لیا اور ان کی توجہ خدا وند عالم کی طرف مبذول کر دی ، الٰہی دلیل تھی ، خدا وند عالم فرماتا ہے کہ ہم نے یہ کام انجام دیا "لِنَصۡرِفَ عَنۡہُ السُّوۡٓءَ وَالۡفَحۡشَآءَ "تاکہ ان کو گناہ اور برائی سے دور رکھے ، کیوں؟ "اِنَّہٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِیۡنَ"اس لئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام خدا کے مخلَص بندوں میں سے تھے اور ہم اپنے مخلص بندوں سے اسی طرح پیش آتے ہیں ۔ یعنی جب بھی ان کے سامنے انحراف کے بیرونی عوامل آتے ہیں ہم ان کو راہ سے ہٹا دیتے ہیں ۔

قرآن کریم میں خدا وند عالم نے پیغمبر اکرم ﷺ کے بارے میں بھی اسی طرح کے بعض حالات نقل کئے ہیں ایک جگہ خدا فرماتا ہے :

(وَلَوۡلَآ اَنۡ ثَبَّتۡنٰکَ لَقَدۡ کِدۡتَّ تَرۡکَنُ اِلَیۡھِمۡ شَیۡئاً قَلِیۡلاً اِذاً لَّاَذَقۡنٰکَ ضِعۡفَ الۡحَیٰوۃِ وَضِعۡفَ الۡمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیۡنَانَصِیۡراً) (1)

"اور اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رکھتے تو دور نہیں تھا کہ تم بھی کسی حد تک ان کی طرف راغب ہو جاتے اور (اگر تم ایسا کرتے تو)ہم تم کو زندگی میں بھی اور مرنے پر بھی دوہرے (عذاب) کا مزہ چکھا دیتے اور پھر تم کو ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار نہ ملتا "

اللہ نے اس واقعہ کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا ہے کہ کچھ لوگ پیغمبر اکرم ﷺ کو ذاتی مقاصد کے تحت

1۔ سورۂ اسراء آیت 74 ۔75 ۔

اپنے فریضہ کی انجام دہی میں کمزور دکھانا چاہتے تھے چنانچہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے طویل دور میں کئی ایسے مواقع پیش آئے ہیں کہ کچھ لوگ (کبھی کبھی آپ کے دوست و احباب بھی) ایسے کام کرنے کی فکر میں رہتے تھے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کو بعض الٰہی احکام انجام دینے سے روک دیا جائے۔ مثال کے طور پر کبھی کبھی بیجا قسم کی سفارشیں کرتے یعنی آج کی زبان میں پارٹی بازی سے کام لیتے تھے چنانچہ اگر کوئی چوری کرتا تو قانون کے تحت اس کے ہاتھ کٹنے چاہیئے تھے لیکن اس کے خاندان کے افراد اپنے خاندان کو اس بدنامی اور ننگ و عار سے بچانے کے لئے متعدد بہانوں کے ذریعہ پیغمبر اکرم ﷺ کے سامنے یہ کوشش کرتے کہ آنحضرت اس چور کے متعلق حد جاری کرنے سے باز آجائیں اس قدر باتیں بناتے اور ایسا ماحول تیار کرتے کہ کوئی بھی اور شخص ہوتا تو ان کی بات قبول کر لیتا۔ پیغمبر اکرم ﷺ کا بھی ایک انسان کی حیثیت سے جب ایسے حالات پیش آجاتے تھے تو متاثر ہونا ایک فطری امر تھا لیکن خداوند عالم ایسا نہیں ہونے دیتا تھا، آپ کو ملائکہ کی تائید حاصل تھی وحی نازل ہوتی یا الہام ہوتا اور پیغمبر اکرم ﷺ اپنے فیصلے میں ثابت قدم رہتے اسی طرح کے ایک موقع کا اس آیت میں ذکر ہے خداوندعالم فرماتا ہے "لَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰکَ" "اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رکھتے" (لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْهِمْ شَیْئاً قَلِیْلاً) "تو قریب ہوتا کہ تم بھی کسی حد تک ان کی طرف مائل ہو جاؤ اور ان کی باتوں پر اعتماد کر لو" لیکن ہم تمہاری حفاظت کرتے اور تم کو ثابت قدم رکھتے ہیں یقیناً کوئی انسان اگرچہ وہ خدا کا پیغمبر ہی کیوں نہ ہو کسی بھی عالم میں اللہ کی مدد سے بے نیاز نہیں ہے اور پیغمبر کی فضیلت یہی ہے کہ خداوند عالم اس کی حفاظت کرتا ہے۔ ان آیتوں سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو بھی خداوند عالم کے تمام مخلَص بندوں کی مانند جب بھی بیرونی عوامل شکوک و شبہات میں گھیرتے تو خداوند متعال غیبی طریقہ سے آپ کی مدد کرتا اور آپ ہر طرح کی لغزش سے محفوظ رہتے اور عصمت کا مطلب بھی یہی ہے۔

کیا عصمت "جبر" ہے؟

عصمت یعنی خداوند عالم ایک انسان کو ہر اُس وسیلہ سے جو اس کے علم میں ہے گناہ اور برائی سے محفوظ رکھے لیکن کیا اس کا مطلب جبر ہے یا نہیں، انسان خود اپنے اختیار سے گناہ کو ترک کرتا ہے اس بارے میں ہم اجمالی طور پر عرض کر دیں کہ اس چیز پر بہت سی دلیلیں موجود ہیں پیغمبر بھی دوسرے تمام انسانوں کی طرح مکلف ہیں اور ان کو بھی ان کے اعمال پر ثواب دیا جائے گا اور چونکہ اعمال اختیاری ہیں، وہ گناہ کو ترک کرنے میں مجبور نہیں ہیں بلکہ مختار ہیں لیکن خداوند عالم نے ان کو اس طرح خَلق فرمایا ہے اور اُن کو وہ عقل عطا کی ہے کہ اپنے اختیار سے بُرے کاموں کو ہاتھ نہیں لگاتے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اُن سے اُن کا اختیار سلب کر لیا گیا ہو، ورنہ اختیار کے بغیر گناہ نہ کرنا کوئی ہنر نہیں ہوگا، اس لئے کہ جس شخص کو خدا بُرے کاموں سے زبردستی روکے گا وہ رک ہی جائیگا۔

ایک انسان کے عنوان سے پیغمبر کا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے اختیار کے باوجود خود کو گناہ سے دور رکھتا ہے ۔ تو اب سوال یہ ہے کہ یہ کس طرح کی عصمت ہے ؟ یعنی اس کو یوں سمجھیئے کہ خداوند عالم نے انسانوں کے درمیان کچھ افراد اس قدر مستعد اور کامل خلق کئے ہیں کہ ان کے بارے میں اسے علم ہے کہ وہ افراد بذات خود گناہ کے مرتکب نہیں ہوں گے ، خداوند عالم کے احکام کی اطاعت کرتے رہیں گے ۔ خداوندعالم اپنے اسی علم غیب کے تحت چونکہ وہ ان کی سرنوشت سے آگاہ ہے ان کو ہی اپنی رسالت کے لئے منتخب کرتا ہے جو اپنے اختیار کے باوجود خدا کی نافرمانی کے ذریعہ گناہوں کا ارتکاب نہیں کرتے ۔ البتہ یہ کوئی زیادتی یا ناانصافی نہیں ہے یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خداوندعالم پیغمبر کی جو برے کاموں سے بچنے میں مدد فرماتا ہے اس میں دوسروں کی مدد سے دریغ کرتا ہے بلکہ قاعدہ اور اصول کے تحت خدا مدد کرتا ہے دراصل ، خداوند عالم تمام مومنین اور راہ خیر میں قدم اٹھانے والے تمام لوگوں کی مدد کرتا ہے ۔ مگر اس کی مدد نہ ان افراد کی سعی و کوشش کے مطابق ایک قاعدے اور اصول کے تحت ہوتی ہے جو شخص ایک قدم آگے بڑھاتا ہے خداوند عالم دس قدم بڑھکر اس کی مدد کرتا ہے اگر کوئی سو قدم آگے بڑھاتا ہے اسی اعتبار سے خدا اس کی مدد کرتا ہے چونکہ پیغمبر اپنی تمام قوت و توانائی خدا کی بندگی کی راہ میںلگا دیتے ہیں اور کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہیں کرتے ۔ خداوند عالم بھی جہاں ان کی غیر معمولی مدد کی ضرورت ہو کوئی دریغ نہیں کرتا لیکن اس مدد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کو جبر کا نام دیا جائے یا ان سے ان کا اختیار سَلب کرلینے کے مترادف ہو ۔

جب خداوند عالم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے اپنی دلیل آشکار کی ہے وہاں مدد تو اسی بنیاد پر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس طرح کی مدد کی لیاقت رکھتے تھے اور انھوں نے بھی جب خدائی دلیل دیکھی تو اس کی مدد سے استفادہ کرتے ہوئے (زلیخا کے خیال سے) منصرف ہوگئے اور ان کے دل میں گناہ کا قصد بھی پیدا نہ ہوسکا ۔

خداوند عالم کی جانب سے اس طرح انبیاء علیہم السلام کی جو غیبی امداد ہوتی ہے اس کے بھی قاعدے اور اصول ہیں اور کسی بھی طرح یہ چیز اختیار سلب کرنے کا باعث نہیں بنتی ۔ اس بات کو ذہن سے قریب کرنے کیلئے یوں سمجھیئے کہ بہت سے ایسے برے کام ہیں کہ جن کی تمام برائیوں سے ہم آگاہ ہیں اور کبھی بھی ہم ان کو انجام دینے کا قصد نہیں کرتے لیکن ہم اسکے انجام دینے سے مجبور بھی نہیں ایک بہت ہی گندی چیز جس کا کھانا کوئی شخص اپنی عمر کے کسی بھی مرحلے میں قصد و ارادہ کے ساتھ پسند نہیں کرتا اور نہیں کھاتا تو کیا کسی نے اس کو نہ کھانے پر مجبور کیا ہے ؟ قطعاً مجبور نہیں ہے لیکن اسکا کھانا اسکے خیال میںنہیں آتا ۔ انبیاء علیہم السلام بھی خداوند عالم کے عطا کردہ علم کے ذریعہ گناہوں کی گندگی کو اس طرح مشاہدہ کرتے ہیں کہ کبھی بھی ان کے ارتکاب کی ہوس نہیں کرتے لیکن ہم ایک بار پھر تاکید کے ساتھ کہدیں کہ اس کا مطلب ہرگز جبر نہیں ہے ۔

عصمت انبیاء علیہم السلام سے متعلق شبہات

ہم یہ بیان کرچکے ہیں کہ شیعہ حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام اپنی خلقت سے لے کر اپنی زندگی کی آخری سانس تک معصوم ہوتے ہیںًا ور صرف یہ کہ وحی سمجھنے اور اسکی تبلیغ کرنے میں غلطی نہیں کرتے بلکہ اپنے شخصی افعال و کردار میں بھی غلطی یا خطا نہیں کرتے لیکن اہلسنت کے درمیان خاص طور سے اس مسئلہ میں، متعدد اقوال موجودہیں جس میں انھوں نے عصمت کے بعض درجات کا انکار کیا ہے، ان میں سے بعض علماء کا کہنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا نبوت ملنے سے پہلے معصوم ہونا لازمی نہیں ہے اور بعض کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام نبوت ملنے کے بعدبھی ممکن ہے گناہان صغیرہ کے مرتکب ہوں۔ انھوں نے اپنے اقوال کے لئے قرآن کریم کی آیات بھی سند میں پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ بعض آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام فی الجملہ گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں بہر حال یہ بحث شیعہ اور اہل سنت کے درمیان صدر اسلام سے ہی موجود ہے اور عصمت انبیاء علیہم السلام کی دلیل میں انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا انکار کرنے والونکے شکوک و شبہات کے جواب کے بارے میں اہل بیت علیہم السلام سے بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیںیہاں تک کہ حضرت امام رضاعلیہ السلام کے دور میں مامون نے جو سوالات آپ سے کیے تھے ان میں سے بعض سوالات عصمت انبیاء علیہم السلام اور اس کے بارے میں بعض شبہات کے سلسلے میںتھے جو ہماری حدیث کی کتابوں میں نقل ہوئے ہیں۔

ہم اس بحث میں بعض ان آیات کو نقل کر رہے ہیں جن میں انبیاء کے معصوم نہ ہونے کے بارے میںتوہم پیدا ہوا ہے ۔

حضرت آدم علیہ السلام

بعض آیات میں یہ مطلب پیش کیا گیا ہے کہ خداوند عالم نے حضرت آدم علیہ السلام کو ایک مخصوص درخت کے پاس جانے سے منع کردیا شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو وسوسہ دلایا اور آپ نے اس درخت سے پھل کھالیا جو آپ کے بہشت سے نکلنے کا باعث بنا۔

قرآن کریم میں یہ واقعہ کئی جگہ پربیان ہوا ہے اور سب سے زیادہ صاف طور پر ان آیات میں بیان ہوا ہے:

(وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ) [1]

"اور آدم نے اپنے پروردگار کا گناہ کیا اور راہ گم کردی اس کے بعد ان کے پروردگار نے ان کو منتخب کیا اور ان کی توبہ قبول کی اور ان کی ہدایت کردی"۔

دوسری آیتوں سے بھی یہ مطلب نکلتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے اس ترکِ اولیٰ کے بعد استغفار کیا:

(فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ) [2]

"پھر آدم نے پروردگار سے چند الفاظ سیکھے پس خدا نے ان (الفاظ کی برکت سے) ان کی توبہ قبول کرلی"۔

قرآن کریم میں اس واقعہ کے ذیل میں "عصیان استغفار اور توبہ" کے مانند الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ دوسرے انبیاء کے بارے میں بھی ایسے ہی الفاظ آئے ہیں کہ جن سے اس بات کا وہم پیدا ہوتا ہے۔ مقدمہ کے طور پر ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ عصیان، استغفار اور توبہ کی مانند الفاظ جہاں کہیں بھی استعمال ہو ہر جگہ یہ اُس عصمت کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے، جس کے ہم قائل ہیں چنانچہ جس عصمت کے ہم معتقد ہیں اس کا مطلب حرام چیزوں کے ارتکاب سے معصوم ہونا ہے۔یعنی اگر شارع مقدس کی طرف سے کسی حرام کام سے منع کیا گیا ہو تو انبیاء علیہم السلام اس کام کے مرتکب نہیں ہوتے لیکن اگر نہی اور مخالفت تنزیہی یا ارشادی ممانعت ہو (یعنی تقدس اور پاکیزگی کی شان باقی رکھنے کے لئے نصیحت کے طور پر کسی چیز سے روکا گیا ہو تو) اگرچہ اس پر عصیان کا اطلاق ہی کیوں نہ ہوتا ہو تو یہ عصیان عصمت کے منافی نہیں ہے۔

1۔ سورۂ طہٰ آیت 121و122۔

2۔ سورۂ بقرہ آیت 37۔

اسی آیۂ شریفہ کے بارے میں کہ جس میں حضرت آدم علیہ السلام کی طرف عصیان اور توبہ کی نسبت دی گئی ہے ایک غلط فہمی ہے کہ جس کے جواب میں شیعہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ عصیان کسی فعل حرام کی ممانعت کی نسبت نہیں ہے۔ در اصل، خداوند عالم کسی بندہ کو کسی کام سے اس لئے منع کرے کہ اس کام کا کرنا آخرت کے عذاب کا باعث ہوگا یعنی اگر یہ کام کیا تو آخرت میں شقاوت اور خداوند عالم سے دوری کا باعث ہوگا اور یہ کہ کسی کام سے اس لئے روکا جائے کہ یہ کام دنیا میں نا مطلوب نتائج کا باعث بنے گا اگر چہ یہ شقاوت اور عذاب آخرت یا خداوند عالم سے دوری کا باعث نہ ہو۔ ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے درخت کا پھل کھانے کی ممانعت، نہی تحریمی یعنی فعل حرام کی ممانعت نہ تھی کہ اس کا نہ کرنا لازم و ضروری ہو، اس کی دلیل اور گواہ اسی سورۂ طٰہٰ کی وہ آیات ہیں کہ جن میں خداوندعالم نے حضرت آدم علیہ السلام کو جہاں اس امر سے روکا ہے خود ہی اس نہی کی علت بھی بیان کردی ہے:

(فَلَایُخْرِجَنَّکُمَامِنَ الجَنَّةِ فَتَشْقَیٰا نَّ لَکَ اَلَّاتَجُوْعَ فِیْهَاوَلَاتَعْرَیٰ وَاَنَّکَ لَا تَظمَؤُا فِیْهاوَ لَا تَضْحَیٰ)[1]

"ہم نے آدم سے کہدیا: شیطان تم دونوں کو بہشت سے نکال نہ دے ورنہ تم (دنیا کی مصیبت میں پھنس جاؤ گے) (بہشت میں) تمھیں یہ (آرام) ہے کہ نہ تم یہاں بھوکے رہو گے اور نہ برہنہ اور نہ یہاں پیاسے رہو گے اور نہ دھوپ میں جلو گے"۔

اس ممانعت کی وجہ خداوند عالم کا یہ فرمان ہے: تم موجودہ آرام و آسائش سے محروم ہو جاؤ گے۔

اس مقام پر بہت سی بحثیں وجود میں آتی ہیں یہ کہ جس دنیا میں حضرت آدم علیہ السلام سے یہ خطاب ہوا ہے۔ آیا وہ دنیا عالم تکلیف تھی اور بندوں پر احکام عائد ہو چکے تھے یا نہیں؟ فرائض اور تکلیف اِس دار دنیا اور اس عالم خاکی سے تعلق رکھتے ہیں اور جب آدم علیہ السلام اس عالَم میں بھیج دئے گئے تو آپ سے خطاب ہوا:

(فَاِمَّایَا تِیَنَّکُمْ مِنّی هُدًی فَمَنْ تَبعَ هُدَایَ فَلَاخَوْفعَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ)[2]

"اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی کی جائے تو جو میری ہدایت پر چلیں گے اُن پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے"۔

اس سے پہلے سرے سے کوئی فریضہ تھا ہی نہیں، یہ اوامر و نواہی ایک امر تکوینی کی حکایت کرتے ہیں یا یہ کہئے

1۔ سورۂ طٰہٰ آیت 117۔119۔

2۔ سورۂ بقرہ آیت 38۔

کہ عقل کی رہنمائی کی گئی ہے ان زحمتوں کی طرف رہنمائی ہے جو اس نہی کی مخالفت پر مرتب ہوتی ہیں ۔ اس مقام پر شیعہ علماء نے جو وضاحتیں دی ہیں مختلف ہیں بعض علماء کا کہنا ہے کہ وہ عالَم عالِم تکلیف نہیں تھا اور بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ فریضہ تحریمی نہیں تھا بلکہ تنزیہی تھا اور عام طور پر یہ اصطلاح رائج ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے ترک اولیٰ کیا تھا یعنی ایک تنزیہی تکلیف نہ کھانے کے سلسلہ میں تھی اور حضرت آدم علیہ السلام نے اس تنزیہی تکلیف کے خلاف کیا۔ اس دلیل کا مطلب یہ ہوا کہ اس زمانہ میں بھی شرعی تکلیف یا (فریضہ) اگرچہ تنزیہی صورت میں ہی سہی موجود تھا لیکن دوسری توضیح یہ ہے کہ اس زمانہ میں سرے سے فریضہ مرتب ہی نہیں ہوتا تھا اور اس حکم اور ممانعت کی کوئی دوسری صورت بیان کرنے کی ضرورت ہے ۔

بہر حال اس غلط فہمی کا ہم یہ جواب دے سکتے ہیں کہ عصیان یا "گناہ" کی اصطلاح چونکہ واضح نہیں ہے کہ آیا یہ عصیان ایک شرعی فریضے کی ادائیگی سے متعلق تھا اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو اس درخت کے پاس جانے سے منع کیا گیا تو اس ممانعت کی علت بھی بیان کردی گئی کہ اگر تم نے اس کام کو انجام دیا تو زحمت میں پڑ جاؤ گے اور تم سے (بہشت کی) یہ آرام و آسائش چھن جائے گی اور یہ زبان کسی فعل حرام سے منع کرنے کی زبان نہیں ہے اور ائمہ علیہم السلام سے عصمت کے متعلق نقل ہونے والی روایات کے منافی نہیںہیں۔

حضرت ابراہیم اور حضرت یوسف علیہما السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے چاند، سورج اور ستاروں کی پرستش کے متعلق مباحثہ کیا اور بت پرستی کے خلاف جنگ کا فیصلہ کر لیا اور موقع کی تلاش میں تھے کہ بتوں کے خلاف آواز بلند کریں اور ایک توحیدی تحریک کی بنیاد رکھیں۔ لہذا آپ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اہل شہر جس دن مخصوص رسومات انجام دینے کیلئے شہر سے باہر جاتے ہیں اسی دن یہ کام کیا جا سکتا ہے اور پھر خود کو اس کے لئے آمادہ کرلیا کہ جب شہر والے شہر سے باہر نکل جائینگے تو وہ بت خانہ میں جا کر بتوں کو توڑ ڈالیں گے۔ اہل شہر باہر جاتے وقت ظاہر ہے آپ سے بھی کہتے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلئے۔چونکہ آپ ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے کہ جس کے سرپرست (آزر) بت تراش تھے اس طرح کے پیشہ کا یہی تقاضا تھا کہ جب خاندان والے شہر سے باہر جائیں تو تمام افراد منجملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی (جو اس خاندان کی ایک فرد تھے) اپنے ہمراہ لے جائیں ۔ حضرت ابراہیم نے شہر سے باہر نہ جانے اور اپنے منصوبے پر عمل کرنے کی غرض سے اپنے کو مریض ظاہر کیا قرآن کریم فرماتا ہے:

(فَنَظَرَنَظْرَةً فِی النُّجُوْمِفقَالَ اِنِّیْ سَقِیْم)[1]

"تو ابراہیم نے ستاروں کی طرف ایک نظر دیکھا اور کہا کہ میں بیمار ہوں"۔

اس آیت سے کچھ مفسرین نے یہ استفادہ کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حقیقت کے بر خلاف بات کی تھی کیونکہ آپ مریض نہیں تھے اور فرمایا تھا (اِنِّیْ سَقِیْمُ)(میں بیمار ہوں) پس معلوم ہوا کہ پیغمبر کا نبوت سے پہلے کذب بیانی سے کام لینا ممکن ہے اب یا تو نبوت سے پہلے گناہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یا یہ کہ پھر وہ گناہ صغیرہ تھا جس کے ارتکاب سے نبوت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اسی طرح کی گفتگو حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میںبھی ہے۔ وہ مشہور و معروف واقعہ ہے کہ جب (قحط میںگرفتار) حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی آپ کے پاس کھانے پینے کی اشیاء لینے کیلئے آئے اور دوسری مرتبہ اپنے ساتھ اشیائے خوردو نوش لینے کے لئے بنیا مین کو بھی لے آئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے کارندوں کو حکم دیا کہ چپ کے سے وزن کرنے والا پیمانہ ان کے سامان میں رکھ دیا جائے تا کہ اس کے بہانے ان کے بھائی "بنیا مین" کو وہاں روکا جاسکے چنانچہ چپکے سے ایک پیمانہ ان کے سامان میں رکھ دیا گیا۔ جب وہ جانے لگے تو کارندوں نے کہا کہ تم لوگ یہاں سے نہیں جاسکتے اس لئے کہ تم نے چوری کی ہے اور تم کو عدالت میں پیش کیا جائے گا خداوند عالم قرآن کریم میں فرماتا ہے:

(فَلَمَّاجَهَّزَهُم بِجَهَازِهِم جَعْلَ السِّقَا يَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَ ذَّنَ مُؤَذِّن اَ یَّتُهَاالْعِيْرُ اِ نَّكُمْ لَسَارِقُوْنَ)[2]

"پھر جب یوسف نے ان کا سازو سامان (سفر غلّہ وغیرہ) درست کرادیا تو (اشارے سے) اپنے بھائی کے اسباب میںایک پیمانہ رکھوادیا پھر ایک شخص للکارکے بولا کہ اے قافلہ والو تم لوگوں نے چوری کی ہے"۔

انھوں نے کہا نہیںہم چوری کرنے نہیں آئے ہیں آخرکار ان کے سامان کی تلاشی لی گئی تو وہ پیمانہ ان ہی کے سامان سے نکلا اور اس طرح بنیامین کو آپ نے اپنے پاس روک لیا۔

گویا حضرت یوسف علیہ السلام کے حکم سے ان کے بھائیوں پر چوری کی تہمت لگائی گئی حالانکہ تہمت لگانا جائز

1۔ سورۂ صافات آیت 88و 89۔

2۔ سورۂ یوسف آیت 70۔

نہیں ہے ۔ پتہ چلا کہ ایسے فعل کا انبیاء علیہم السلام سے سرزد ہونا ممکن ہے ۔

ان غلط فہمیوں کے مختلف انداز سے جواب دیئے گئے ہیں :

بعض کہتے ہیں کہ یہ "توریہ" تھا ۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو فرمایا "اِنِی سقیم" اس سے آپ نے واقعاً بیمار ہونامراد نہیںلیا تھا بلکہ آپ نے توریہ کیا تھا ۔ اسی طرح جب حضرت یوسف علیہ السلام کے ملازموں نے یہ اعلان کیا کہ "اِنَّکم سَارِقُونَ" (یقیناً تم لوگوں نے چوری کی ہے) تو اس سے مراد یہ تھی کہ (مثلاً) "تم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو چرایا ہے" ۔ تو یہ توریہ تھا لیکن اس کا اور زیادہ مدلّل و قاطع جواب دیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام جگہوں پر جھوٹ بولنا حرام نہیں ہے بلکہ بعض موقعوں پر حتیٰ جھوٹ بولنا واجب بھی ہو سکتاہے اور بعض موقعوں پر جھوٹ بولنا مباح بھی ہے اور یہ خیال کہ "مطلق طورپر جھوٹ بولنا حرام ہے" ایک باطل تصور ہے ۔ ان تمام واقعوں میں ایک ضروری مصلحت تھی جو اگر جھوٹ نہ بولا جاتاتو مصلحت فوت ہوجاتی ۔ مثال کے طورپر اگر ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کا دقیق نظروں سے مطالعہ کریں تو یہ دیکھیں گے کہ آپ ایک انقلاب اور تحریک کے ذریعہ لوگوں کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے کہ بت پرستش کے لایق نہیں ہیں اور اس کی راہ یہی تھی کہ بیماری کے بہانے شہرمیں رک کربتوں کو توڑدیں اور شرعی طورپر بیماری کا یہ بہانہ حرام نہیں ہے۔

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں اگر آپ کے بھائیونکی سمجھ میںیہ آجاتا کہ حضرت یوسف علیہ السلام ان کے بھائی ہیں تو شرمندگی اور شرمساری یا سزا کی وجہ سے فرار کرجاتے اور پھر آپ کے پاس نہ آتے اور اگر وہ اپنے ساتھ بنیامین کو لیجاتے تو پھر آپ کے پاس حضرت یعقوب کے آنے کی کوئی راہ نہ رہتی اور اس کام میں جو مصلحتیں مضمر تھیں حاصل نہ ہوپاتیں ۔فرض کیجئے یہ صاف جھوٹ بھی ہو تو بنیامین کواپنے پاس روکنے کے لئے آپ نے جو چال چلی اس لئے تھی کہ حضرت یعقوب کے مصر آنے کی راہ ہموار ہوسکے اور آپ کے بھائی اپنے کئے پر توبہ کریں وغیرہ وغیرہ ۔

بنابر ایں ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ جس کے تحت اس طرح کا جھوٹ بھی حرام ہو۔ اس کے علاوہ یہ جملہ "انکم لسارقون" بھی حضرت یوسف علیہ السلام کا جملہ نہیں ہے بلکہ یہ اعلان کرنے والے کا جملہ ہے شاید اس نے یہ خیال کیا ہو کہ حقیقت میں انھوں نے چوری کی ہے اگرقابل اعتراض بات ہے تو اس کے مقدمات میں ہے کہ جناب یوسف علیہ السلام نے یہ حیلہ کیوں کیا یعنی آپ نے یہ حکم کیونصادر کیاکہ ناپ کا پیمانہ ان کے سامان میں رکھ دیا جائے کہ وہ شخص "انکم لسارقون" کہنے پر مجبور ہو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ تمام حالات الٰہی تدبیر کے تحت بعض مصلحتوں کو پورا کرنے کی غرض سے طے پائے تھے کہ جن کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے: (کَذٰلِکَ کِدْنَا لِیُوسُفَ) "یوسف کو بھائی کے روکنے کی یہ تدبیر ہم نے بتائی تھی" ۔

حضرت یونس علیہ السلام

دوسری آیت حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میںہے کہ جب آپ اپنی قوم سے الگ ہونے کے بعد دریا میں گرے اور مچھلی کے شکم میںچلے گئے تو دعاء کی :

(فَنَادَیٰ فِی الظُّلُمَاتِ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّااَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ)[1]

"پھر تاریکیوں میں جاکر آوازدی کہ پروردگار تیرے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے تو (ہر عیب سے)پاک و پاکیزہ ہے بیشگ میں اپنے نفس پر ظلم کرنے والوں میںسے تھا "۔

جناب یونس نے اپنے قصورکا اقرار کرتے ہوئے فرمایا :"میںبھی ظالم ہوں "توگویا انبیاء کیلئے بھی ظلم اور گناہ کا ارتکاب کرنا جائز ہے اور اتفّاق سے یہ واقعہ بھی رسالت کے بعد کا ہے لہٰذا یہ آیت ان دلیلوں میں سے ہے جن سے انبیاء علیہم السلام کی طرف سے یہاں تک کہ نبوت کے بعد بھی صغیرہ کے ارتکاب کے جائز ہونے کا استدلال کیاگیا ہے۔

اس شبہہ کا جواب بھی واضح ہے اس لئے کہ جس عصمت کا ہم دعویٰ کرتے ہیں وہ ارتکاب محرمات سے معصوم ہوناہے لیکن غیر محرمات کا ارتکاب (اس پر عصیان اور ظلم کا اطلاق کیوںنہ ہو) انبیاء علیہم السلام کی عصمت سے منافات نہیں رکھتا ہے حضرت یونس علیہ السلام کے لئے بہتر تھا کہ اپنی قوم کے درمیان رہتے اور ان کو ترک نہ کرتے لیکن انھوں نے جلدی کی اور یہ جلدی کرناترک اولیٰ تھا"ترک واجب" نہیں تھا اور اس کام پر ظلم کا اطلاق بھی اسی مناسبت سے ہوا کہ انھوں نے وہ کام ترک کر دیا تھا جس کا انجام دینا (یعنی قوم کے ساتھ ہی رہنا)اولیٰ تھا۔یہی سبب بنا کہ آپ مچھلی کے منھ میں جا پڑے اور مشکلات میں مبتلا ہوگئے ۔

اسی طرح لفظ مغفرت یا "بخشنا" وغیرہ کی تعبیر اس چیزپر دلالت نہیں کرتا کہ خداوند عالم نے کسی فعل حرام کے گناہ کو مغفرت کا مورد قرار دیاہے ۔بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوندعالم نے ترک اولیٰ پر مترتّب ہونے والے آثار کو دور کردیا ہر چیز کا بخشنا خود اسی چیزکی مناسبت سے ہے حرام گناہ کے بخشنے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کے عذاب سے نجات دی ہے لیکن ترک اولیٰ کے بخشنے کا مطلب یہ ہے کہ اس پرجو معمولی اثرات مترتب ہوسکتے تھے رفع

1۔ سورۂ انبیاء آیت 87۔

ہوجائیں۔چنانچہ حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو مچھلی کے شکم سے نجات مل گئی اور وہ دوبارہ اپنی قوم میں واپس آکر ان کی رہنمائی میں مشغول ہوگئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

اسی طرح کا ایک اور مقام حضرت موسی علیہ السلام کی اس مشہور و معروف داستان سے متعلق ہے کہ ایک روز جب آپ فرعون کے محل سے باہر نکلے آپ نے دیکھا ایک فرعونی بنی اسرائیل کے ایک شخص سے لڑرہا ہے۔تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے ایک شخص پر ہونے والے ظلم کو دور کرنے کی غرض سے فرعونی کو ایک گھونسا مارا اور وہ شخص گرا اور دنیا سے رخصت ہوگیا:

(فَوَكَزَهُ مُوْسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ)

"پس موسیٰ نے ایک گھونسا مارا تو اسکا کام تمام ہوگیا"۔

یہ خبر فرعون کو ملی تو لوگ ان کی تلاش میں نکل پڑے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی وہاں سے نکل جانا بہتر سمجھا ۔۔۔اور بالآخر مدین چلے گئے۔شہر مدین سے واپس پلٹتے وقت جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خداوند عالم نے خطاب فرمایا کہ اے موسیٰ تم فرعون کے پاس جائو اور فرعونیوں کو (توحید کی) دعوت دو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی:

(وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْب فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ)[1]

"اور میں نے ان کے خیال میں ایک جرم کیا ہے پس مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے قتل نہ کردیں"۔

خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ یقین دلایا کہ میں تمہاری حفاظت کرونگا جب حضرت موسیٰ حضرت ہارون کے ہمراہ فرعون کے پاس آئے تو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہچان لیا اور کہا:

(قَالَ اَلَمْ نُرَبِّک فِيْنَاوَلِيْداًوَلَبِثْتَ فِيْنَامِنْ عُمُرِک سِنِيْنَ)[2]

"فرعون نے کہا کیا ہم نے بچپنے میں تمہاری پرورش نہیں کی اور تم نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے درمیان نہیں گذارے"۔

اور اس کے بعد اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

1۔سورۂ شعرا آیت 14۔

2۔سورۂ شعرا آیت18۔

(وَفَعَلْتَ فَعَلْتَکَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ)

"اور تم نے وہ کام جو کیا ہے (ایک مرد قبطی کا خون) کیا نہیں کیا؟ پس تم (میری نعمتوں کے) منکر اور ناشکرے ہو"۔

سابقہ تو تمہارا یہ ہے اور آئے ہو مجھکو یہ دعوت دینے کہ میں اپنے ملک و سلطنت سے دست بردار ہو جائوں ؟ !

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا :

(قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذاًوَّاَنَاْمِنَ الضَّآلِّیْنَ)

"موسیٰ نے کہا (ہاں) میں نے اس وقت اس کام کو کیا (اور سمجھ لو کہ) میں اس وقت راہ گم کر دینے والوں میں سے تھا"۔

اس آیت کے جملہ ("وَاَنَامِنَ الضَّا لِّیْنّ) "اور اسی طرح "وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْب" سے بعض نے استدلال کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے لئے نبوت سے پہلے گناہ کرنا اور گمراہ ہونا ممکن ہے۔

اس شبہ کے بھی متعدد جواب دیئے گئے ہیں۔ بعض جوابات لفظ "ضلال" کے بارے میں ہیں جس کے "گمراہ" کے بجائے دوسرے معنی بیان کئے ہیں کہ ان کا لازمہ گناہ نہیں ہے۔ منجملہ انھوں نے کہا ہے کہ ضلال کا مطلب "عدم عمد" (یا جان بوجھ کر کام نہ کرنا) اور "جہل" یا بھول ہے۔ چنانچہ "جہل" کبھی علم کے مقابل استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی عمد (یعنی بالارادہ کام کرنے) کے مقابل میں استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ فرمانا چاہتے تھے کہ میں نے اس مرد قبطی کو قتل کرنا نہیں چاہا تھا بلکہ میں تو مرد بنی اسرائیل کو (اس کے ظلم سے) نجات دلانا چاہتا تھا لہٰذا اس کا بھولے سے مجھ سے قتل ہو گیا۔ گویا آپ نے یہ فرمایا (وَاَ نَامِنَ الْمُخْطِئِیْنَ) یعنی یہ قتل خطا کے تحت ہو گیا تھا۔

کچھ دوسرے افراد نے "ضلال" کے معنی "محبت" بتائے ہیں (یہ ان عجیب باتوں میں سے ہے جو کبھی کبھی بیان کی جاتی ہیں)اور وہ ستدلال میں وہ آیت پیش کرتے ہیں کہ جس میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے ان سے کہا تھا "اِنَّکَ فِیْ ضَلَالِکَ الْقَدِیْمِ" "یقینا آپ اپنے پرانی (محبت) میں (پڑے ہوئے) ہیں"

یہاں لفظ "ضلالت" سے ان کی مراد حضرت یعقوب کی حضرت یوسف سے محبت تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضلال کے ایک معنی محبت بھی ہیں۔ "اَنَامِنَ الضَّا لِّیْنَ" یعنی "اَنَامِنَ الْمُحِبِّیْنَ" محبین للہ۔

اس بارے میں دوسری وجہیں بھی بیان کی گئیں ہیں۔ جن میں سے اگر بعض بیان نہ کرتے تو بہتر تھا۔ مرحوم علامہ طباطبائی نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ میں اس وقت نہیں سمجھ سکا کہ اس جھگڑے کو کس طرح ختم کیا جائے اور اس جھگڑے کو حل کرنے کی بہتر صورت سے ناواقف تھا۔ لہٰذا میں نے ایک گھونسا ماردیا جس سے یہ حادثہ رونما ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ ضلال سے مراد جہل ہے اور جہل سے مراد اس کام کو احسن طریقہ سے انجام دینے سے جاہل ہونا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ حقیقت میں یہ فرعون کی دل جوئی کا ایک طریقہ تھا۔فرعون نے کہا تم اس وقت گمراہ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا کر کہنا چاہتے تھے کہ اس زمانہ کی گمراہی کا آج کی دعوت حق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اصل مسئلہ کو بیان کرنے کے لئے دلجوئی کا انداز اپنایا تھا کہ اس گفتگو کو ختم کیا جا سکے۔

بہر حال ان آیات میں (کافر) اور (ضالّ) کی لفظیںاصطلاحی معنی میں استعمال نہیں ہوئی ہیںاورکسی حرام کے ارتکاب پر دلالت نہیں کرتیں۔

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام

خداوند عالم حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرماتا ہے:

(وَاَلْقَیْنَا عَلَیٰ کُرْسِیِّہِ جَسَداً ثُمَّ اَنَابَ)[1]

"اور ہم نے ان کے تخت پر ایک بے جان جسم لا کر گرا دیا تو پھر انھوں نے خدا کی طرف توجہ کی"۔

اور حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ جب آپ کی خدمت میں دو آدمی آئے ایک نے کہا:

(اِ نَّ ھٰذَااَخِیْ لَہُ تِسْع وَ تِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَلِیَ نَعْجَة وَاحِدَ ة فَقَالَ اَکْفِلْنِیْھَاوَعَزَّ نِیْ فِیْ الْخِطَابِ)[2]

"یہ (شخص) میرا بھائی ہے اور اس کے پاس ننانوے دُنبیاں ہیںاور میرے پاس صرف ایک ہے اس پر بھی یہ مجھ سے کہتا ہے کہ وہ ایک دُنبی مجھے دیدو اور زبان درازی میں مجھ پر حاوی ہوجاتا ہے"۔

(لَقَدْ ظَلَمَکَ بِسُؤَا لِ نَعْجَتِکَ اِلَیٰ نِعَاجِہِ)

"داؤد نے "بغیر اس کے کہ دوسرے فریق سے کچھ پوچھیں" کہدیا کہ یہ جو تیری دنبی لے کر اپنی دُنبیوں میں اضافہ کرنا چاہتا ہے ظلم کا مرتکب ہوا ہے"۔

1۔ سورئہ ص آیت 34۔

2۔ سورئہ ص آیت 23۔ 24۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے فیصلہ کرنے میں جلدی دکھائی دلیل مانگنے اور عدالتی کارروائی کے مقدمات فراہم ہونے سے پہلے ہی صرف مدّعا کے بیان پر ہی فیصلہ کرتے ہوئے کہدیا (لَقَدْ ظَلَمَکَ) یہ درست نہیں ہے!!

اس اعتراض کا بھی یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ باقاعدہ قسم کی کوئی عدالتی کارروائی نہیں تھی۔ یعنی حقیقت میں حضرت داؤد ایک کی چیز دوسرے کو نہیں دینا چاہتے تھے فیصلہ تو اس وقت ہوتا جب اس کی بنیاد پر ایک سے لیکر دوسرے کو دے دیتے اور جس ملکیت کے بارے میںجھگڑا ہے وہ ایک کے حق میں ثابت ہو جائے۔ یہاں ایسا نہیں ہوا دو افراد کے درمیان صرف ایک عام سی گفتگو ہو رہی تھی: ان میں سے ایک کہہ رہا تھا کہ وہ ایک گوسفند جو اس کے پاس ہے وہ بھی مجھے دید و دوسرا کہہ رہا تھا نہیں دونگا اور پھر دونوں حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی بات دہرائی۔ معلوم ہوا یہ کوئی باقاعدہ عدالتی کارروائی نہ تھی کہ جس میں دو طرفہ بیان اور دلیل کی ضرورت پڑتی لہٰذا جناب داؤد نے کوئی خلاف شرع کام انجام نہیں دیا تھا۔ ہاں بہتر یہی تھا کہ آپ فیصلہ میں جلدی نہ کرتے اور دقّتِ نظر سے کام لیتے۔

حضرت داؤد علیہ السلام اسی بات پر چالیس دن تک اشک ندامت بہاتے اور استغفار کرتے رہے اس وقت خطاب ہوا :(يَادَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِیْ الْاَرْضِ)

"اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں (اپنا) نائب قرار دیا"۔

تم جو محض ترکِ اولیٰ کی وجہ سے چالیس دن سے گریہ کر رہے ہو یقیناً تم لوگوں کے درمیان ہمارے خلیفہ اور قاضی ہونے کی صلاحیت اور لیاقت رکھتے ہو۔ نتیجہ کے طور پر یہ آیات بھی ایک نبی کے ذریعہ کسی حرام شرعی کے ارتکاب پر دلالت نہیں کرتیں ۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ

کچھ اور آیتیں پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں ہیں جن میں سے بعض میں پیغمبر اکرم ﷺ کی طرف علی الظاہر گناہ اور استغفار کی نسبت یہاں تک کہ گذشتہ آیتوں سے بھی زیادہ صاف الفاظ میں نظر آتی ہے ۔

پہلی آیت

(اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحاً مُبِیْناًلِیَغْفِرَلَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّ مَ مِنْ ذَ نْبِکَ وَمَاتَاَخَّرَ)[1]

1۔ سورۂ فتح آیت ا۔

"ہم نے حقیقتاً تم کو کھلم کھلا فتح عطا کی تا کہ خدا تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کردے"۔

یہ آیت سے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ بھی (نعوذ باللہ) گناہ کے مرتکب ہوئے وہ بھی ایک مرتبہ نہیںبلکہ آپ نے کم سے کم دو مرتبہ ، ایک گناہ ما تقدم (یعنی زمانۂ گذشتہ سے اور دوسرا ما تاخر(یعنی آنے والے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے)اور خدا نے ان کو بخش دیا ہے۔

جو آیتیںذنب (گناہ) اور استغفار پر دلالت کرتی ہیں ان کا مجموعی طور پرایک جواب ہے اور سورۂ فتح کی پہلی آیت کا ایک مخصوص جواب ہے ۔

جن آیات میں مطلق طور پر استغفار کا حکم دیا گیا ہے یا ان میں" ذنب "یعنی گناہ کی لفظ استعمال ہوئی ہے وہ بھی پہلے بیان شدہ مقدمہ کی روشنی میں اس بات پر دلالت نہیں کرتیں کہ پیغمبر نے (العیاذ باللہ) حرام شرعی کا ارتکاب کیا ہو ۔ہاں ، فی الجملہ ظاہرِ آیت سے گناہ کا اثبات ہوتا ہے اور اس گناہ کی بہ نسبت خداوند عالم کی طرف سے مغفرت بھی ثابت ہے ۔

پہلی نظر میں ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ یہ گناہ ترکِ اولیٰ یا کسی مکروہ فعل کے ارتکاب سے تعلق رکھتا ہے لیکن ذرا غور و فکر کے بعد یہ کہا جا سکتاہے کہ یہ آیتیں حتی پیغمبر اکرم ﷺ سے کسی مکروہ فعل کے ارتکاب کو بھی ثابت نہیں کرتیں ۔اس بات کی وضاحت کے لئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے : کبھی لفظ ذنب (گناہ) خداوند عالم کے کسی ایسے قانون کی مخالفت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ جس پر عمل لازم ہے،جس پر ممکن ہے دنیا میں سزا ملے، اور اگر دنیا میں سزا نہیں ملی تو آخرت میں بہر حال اس کی جزاء سزا دی جائیگی لیکن کبھی لفظ "ذنب "کامعنوی مدارج کے لحاظ سے استعمال ہوتا ہے۔

مرحوم علامہ طبا طبائی "تفسیر میزان "میں فرماتے ہیں " ذنب "تین طرح کا قابل تصور ہے :

1۔ ذنبِ قانونی (وضعی) یعنی ایک قانون بنا دیا گیا اور اس کی مخالفت کی جائے جو حرام ہے ۔

2۔ذنبِ اخلاقی :یعنی انسان ایک ایسے عمل کا ارتکاب کرے جو مکارمِ اخلاق سے منافات رکھتا ہو اگر چہ وہ شرعی اعتبار سے حرام نہ ہو یعنی وہ عمل جو ناپسند آثار انسان کی روح پر مرتب کرے اور ان دونوں سے الگ ایک تیسری صورت ہے یعنی :

3۔مقام محبت میں کسی عمل کا انجام دینا درست نہ ہو جو قانونی مخالفت نہیں ہے اور نہ ہی اخلاقی رذایل کا سبب ہے لیکن مقام محبت اس کا متقاضی نہیں ہے ۔ محبت تقاضا کرتی ہے کہ محب، محبوب کے تئیں پوری طرح مطیع و منقاد ہو اس کی پوری توجہ اپنے محبوب کی طرف ہو اور کسی حال میں بھی وہ اپنے محبوب سے غافل نہ ہو اسکا تمام رنج و غم اس لئے ہو کہ اس کا محبوب کیا چاہتا ہے تاکہ وہی کام انجام دے اور اپنے محبوب کے سوا کسی اور کی فکر نہ کرے ۔

مقام محبت کے بھی خاص آداب ہوتے ہیں جن کا حساب و کتاب قانون اور اخلاقیات سے جدا ہے محب اور محبوب کے درمیان ایک خاص رابطہ ہوتا ہے ۔ اولیائے خدا اور انبیائے عظام چونکہ خدا کی محبت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں ۔ تو اس مقام محبت کا تقاضا ہے کہ ان کی پوری توجہ اپنے معبود کی طرف ہو ، خداوند عالم کے علاوہ کسی اور کی بالکل فکر نہ کریں اور خداوند عالم کی رضا کے سوا کسی اورچیز کی خواہش نہ ہو ۔ اگر اس مقام محبت کے خلاف کوئی فعل انجام پایا اور اپنے محبوب حقیقی کے علاوہ کسی اور کی طرف متوجہ ہوئے تو اس کو اپنے لئے گناہ تصور کرتے ہیں اور مقام استغفار میں وہ اس گناہ سے استغفار کرتے ہیں ۔

البتہ تمام اولیاء و انبیاء علیہم السلام کا ایک مقام اورایک ہی منزلت نہیں ہے بلکہ ان کے مراتب جدا جدا ہیں اور ہر ایک اپنے مقام کی مناسبت سے گناہ کا احساس کر سکتا ہے ۔ ایک درجہ کے افراد کیلئے ممکن ہے ایک کام گناہ نہ ہو لیکن اس سے بلند مرتبہ والے نبی یا ولی کی نظر میں اس کام کا ارتکاب گناہ شمار ہوتا ہو بہر حال جتنا بھی خداوند عالم سے قریب ہوتا جائیگا اتنا ہی احساس گناہ بھی لطیف لیکن اس کے ساتھ ہی عظیم ہوتا جائیگا مثال کے طور پر ذہن کو قریب کرنے کے لئے فرض کیجئے کہ عام طور پر رائج اموریں اگر ایک بڑی شخصیت مثلاً ایک مجتہد مرجع تقلید یا کسی دنیاوی منصب پر فائز شخص کو نظر میں رکھ لیجئے تو جتنے لوگ ان سے تعلق رکھتے ہیں ان سب کے تعلقات ایک طرح کے نہیں ہوتے تعلق کا ایک عام درجہ ہے جس کے تحت تمام افراد کا ایک ہی فریضہ ہے اس درجہ میں ان کی توہین کرنا یا مثال کے طور پر برا بھلا کہنا یا گالی دینا حرام ہے اور اگر کوئی شخص توہین نہ کرے تو وہ کسی گناہ کا مرتکب نہیں کہا جائے گا ۔ فرض کیجئے کہ اگر ایک بے معرفت شخص ان کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھ جائے تو کوئی اس کو گناہگار نہیں کہے گا لیکن جو افراداس اعلیٰ مرتبہ شخص سے قریب ہیںان کے فرائض بھی اُس کے تئیں زیادہ ہیں اگر وہ ان فرائض کو انجام نہ دیں تو ممکن ہے قانونی خلاف ورزی نہ کہی جائے لیکن انھوں نے اپنے مقام و مرتبہ کے تقاضے کو پورا نہیں کیا ہے جو شخص بھی اس اعلیٰ مرتبہ شخصیت سے جتنا زیادہ قریب ہوگا اُتنا ہی اس کا فریضہ بھی زیادہ ہوگا جس کا دوسرے کو احساس بھی نہیں ہوگا کہ یہ بھی کوئی فریضہ ہوسکتا ہے اور اُن کو یہ کام انجام دینا چاہیئے اصل میں جو لوگ اس سطح کے افراد نہیں ہیں وہ یہ محسوس نہیں کر سکتے کہ اس طرح کا بھی کوئی فریضہ ہے لیکن وہ ایسا مخصوص مقام ہے کہ اس کے فرائض بھی مخصوص ہیںتو وہ لوگ جو اس عظیم شخصیت کے مقرب ہیںآمدورفت کے وقت بھی ان کا فریضہ ہے کہ اُن کی طرف پیٹھ نہ کریںاور اگر کبھی خلاف ادب کوئی عمل ان سے سرزد ہوجاتا ہے تو وہ اس کو اپنے لئے گناہ شمار کرتے ہیں ۔

پس اس طرح کے اشخاص کی طرف گناہ کی نسبت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ان محرمات کے مرتکب ہوئے ہیں جن سے عام لوگوں کو منع کیا گیا ہے وہ اس درجہ اور اس مقام پر فائز افراد سے مخصوص ایک چیز ہے ان کے لئے جو معرفت و بصیرت کے لحاظ سے ایک اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں ممکن ہے ان کی نظر میں گناہ اتنا بڑا ہو جو عام لوگوں کے محرمات کے ارتکاب سے بھی کہیں زیادہ عظیم ہو اور اگر ایسا کوئی فعل سرزد ہو جائے تو وہ ایک عام آدمی کے مقابل کہ جس سے کوئی حرام فعل سرزد ہوگیا ہو کہیں زیادہ گناہ کا احساس کرتا ہے اور یہ فقرہ استعمال ہوتا ہے: (حسنات الابرار سیئات المقرّبین)

مقربین کے اپنے تقرب کے اعتبار سے ہی مخصوص فرائض ہوتے ہیں جن کی خلاف ورزی وہ اپنے لئے گناہ شمار کرتے ہیں اور اس گناہ کا لازمہ اپنے محبوب سے دوری ہے نہ یہ کہ ان گناہوں کا لازمہ عذاب جہنّم اور بہشت سے محرومی ہو ان کو سب سے زیادہ یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں ان کے محبوب کا لطف کم نہ ہوجائے اور وہ اس کی بے توجہی کا مرکز قرار پاجائیں، ان کیلئے ایسا ہوجانا جہنّم کے ہر عذاب سے زیادہ سخت اور عظیم ہے اور چونکہ ان کو یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ان سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہوجائے کہ وہ اس کی آنکھوں سے گرجائیں اور ہم پر اسکا لطف کم نہ ہوجائے لہٰذا ان کو خوف بھی سب سے زیادہ ہوتا ہے اور اگر ان سے کوئی ایسا فعل سرزدہ ہوگیا ہو جو اس سے دوری کا باعث ہو تو وہ دوسروں سے زیادہ خائف ہوجاتے ہیں اور توبہ و استغفار کرنے لگتے ہیں۔

پیغمبر اکرم ﷺ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل تھے بلا شبہ آپ پروردگار عالم سے تقرب کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز تھے اور سب سے بلند مرتبے پر فائز ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ آپ کی ذمہ داریاں بھی سب سے سخت ہوںلہٰذا آپ کو فرائض کے پورا نہ کرنے کی بھی سب سے زیادہ فکر رہتی تھی کہ فریضہ میں کوتاہی نہ ہونے پائے بہرحال دنیاوی زندگی کے بھی کچھ ضروریات ہیں حتیٰ ممکن ہے یہ ضروریات شرعی طور پر واجب بھی ہوں لیکن وہی چیز جو قانونی طور پر واجب ہے ممکن ہے مقام محبت میں وہی کام گناہ شمار ہو۔ محبت کا لازمہ یہ ہے کہ محب کی توجہ صرف اور صرف اپنے محبوب کی طرف ہو لیکن خود محبوب کا حکم ہے کہ جائو شادی کرو، زندگی بسر کرو، کھانا کھائو اور لوگوں کے ساتھ معاشرت کرو یہ تمام واجب فریضے ہیں جن کو انجام دینا چاہئے لیکن انسان اپنی جگہ احساس گناہ کرتا ہے۔ فکر یہ ہے کہ کہیںتوجہ کا ایک حصہ بھی غیر خدا کی طرف مرکوز نہ ہو جائے اس کے بعد بھی یقیناً ایسا نہیں ہے کہ دنیوی زندگی کی ضروریات کی طرف توجہ ان کو خدا سے غافل کردے لیکن ڈرتے ہیں کہ کہیں اس میں معمولی ترین کمی یا کمزوری نہ آجائے اسی لئے اس حد تک بھی دنیوی امور کی طرف توجہ وہ اپنے لئے گناہ تصور کرتے ہیں۔

بنا بریں پیغمبر اسلام ﷺ جیسے کی طرف گناہ اور استغفار کی نسبت دنیا ان کے اس مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ہے کہ جس پر وہ فائز تھے اور اس کی یہی توجیہ کی جاتی ہے۔ ائمہ اطہار سے مروی یا منسوب مناجات اور دعائوں میں جو مطالب بیان ہوئے ہیں کہ جن میں ائمہ نے اپنے لئے سب سے بڑے گناہگار ہونے کی بات کی ہے۔

مثلاً یہ کہنا کہ: "کون ہے جس نے میرے طرح یوں گناہ کئے ہوں" ان سب کی بھی توجیہ یہی ہے کہ وہ اپنے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے کہ جس پر وہ فائز تھے خدا کے علاوہ کسی اور طرف اپنی معمولی ترین توجہ کو بھی اپنے لئے سب سے بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اپنے کو سب سے بڑا گناہ گار کیوں سمجھتے تھے؟ اس لئے کہ وہ اس چیز سے آگاہ تھے کہ اور لوگ اُس فریضہ کے حامل نہیں ہیں اس لئے کہ وہ ان کی مانند معرفت اور محبت نہیں رکھتے۔ پس معلوم ہوا کہ ان کی طرف گناہ کی نسبت قطعی طور پر حرام شرعی کے ارتکاب کے معنی میں نہیں ہے لیکن سورۂ فتح کی آیت میں:

(اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحاًمُّبِیْنًالِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ)

"ہم نے تم کو حقیقتاً کھلی ہوئی فتح عطا کی ہے تا کہ خدا تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دے"

اگر غور و فکر کریں تو معلوم ہوگا کہ اس آیت میں ایک اور خصوصیت پائی جاتی ہے، خود آیت اس بات کی گواہ ہے کہ یہ گناہ ان مسائل سے کوئی ربط نہیںرکھتا یہ کونسا گناہ ہے کہ جب پیغمبرِ اکرم کو فتح ملتی ہے تو آپ کا گناہ بخش دیا جاتا ہے یہ پیغمبر اکرم ﷺ کی قیادت میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی ہے جس میں کفار و مشرکین کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے: ہم نے تم کو یہ کھلی فتح عطا کی تا کہ تمہارے گناہ معاف کر دیں۔ اس کا گناہ سے کیا تعلق ہے؟ اتفاق سے یہی سوال مامون نے امام رضا علیہ السلام سے پوچھا تھا تو آپ نے فرمایا تھا: یہ وہ گناہ تھا جس کی مشرکین نے پیغمبر اکرم ﷺ کی طرف نسبت دی تھی۔ یعنی مشرکین کے عقیدہ کے مطابق پیغمبرِ اکرم ﷺ نے سب سے بڑے گناہ کا ارتکاب کیا تھا کیونکہ آپ نے ان کے بتوں کو برا کہا تھا اور ان کے دین کے خلاف جنگ کی تھی اور یہ وہ گناہ ہے جو فتحِ مبین کے ذریعہ مٹا دیا گیا اور ختم کر دیا گیا ایسا نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے (العیاذ باللہ) خدا کی نسبت کوئی گناہ انجام دیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ خدا نے کیوں بخشا؟ تو یہ قرآن کے ان ہی توحیدی بیانوں میں سے ہے۔ جس کا بار بار قرآن میں ذکر ہوا ہے کسی بھی ناپسند چیز کا اثر جب محو ہوتا ہے تو خدا اس کو محو کر دیتا ہے ویسے ہی ہے کہ جس طرح خداوندعالم نے پیغمبر اکرم ﷺ کو یہ فتح عنایت فرمائی ہے پس تو جو کچھ بھی اس فتح کے آثار مترتب ہوں گے وہ خدا کے ذریعہ مرتب ہوں گے منجملہ یہ کہ مشرکین کی نظر میں جو آثارِ گناہ تھے وہ مٹ گئے اور اب اُن میں اس طرح کا کوئی احساس باقی نہیں رہے گا۔ معلوم ہوا کہ اس کا بھی شرعی گناہ سے قطعی کوئی رابطہ نہیںہے۔

دوسری آیت

(عَفَااللّٰہُ عَنْکَ لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیْنَ صَدَ قُوْاوَتَعْلَمَ الْکَا ذِبِیْنَ)[1]

1۔ سورۂ توبہ آیت 43۔

"(اے ہمارے رسول) خدا آپ کو معاف فرمائے آپ نے کس لئے انھیں (پیچھے رکنے کی) اجازت دے دی؟ چاہئے تھا کہ سچ بولنے والے آشکار ہو جائیں اور آپ جھوٹوں کو بھی پہچان لیں"

آیۂ کریمہ کے آغاز میں جملہ ہے (عَفَا اللہ عنکَ) (اللہ آپ کو معاف کرے) ممکن ہے کوئی اس جملہ سے خیال کر بیٹھے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے (العیاذ باللہ) کسی گناہ کا ارتکاب کیا تھا اور خداوند عالم نے ان کو معاف فرمادیا۔ لہٰذا خود یہی جملہ عدم عصمت کے غلط تصور کی بنیاد بن سکتا ہے۔ دوسرے جملہ میں خداوند عالم فرماتا ہے کہ (لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ) "آپ نے کس لئے انھیں رکنے کی اجازت دیدی" خود یہ سوالیہ جملہ بھی جواب طلبی کی نشاندہی کر رہا ہے اور پیغمبر اکرم ﷺ کے معصوم نہ ہونے کے توہّم کا سرچشمہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم واضح کرنے اور اس طرح کے شبہہ کو دور کرنے کے لئے آیت کے شانِ نزول اور اس کے مفاد کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری ہے: یہ آیت ان منافقوں یا اُن (ضعیف الایمان) افراد کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے جو جنگ و جہاد سے فرار اختیار کرنے کے لئے بہانہ پر بہانہ تلاش کیا کرتے تھے اور باوجودیکہ ایک مرتبہ پیغمبر اکرم ﷺ نے ایک جنگ میں رضاکارانہ طور پر تمام لوگوں کی شرکت کا اعلان فرمایا تھا کچھ لوگوں نے آپ کے اس فرمان کی خلاف ورزی کی اور جنگ کرنے کے لئے نہیں گئے۔ تو آیت نازل ہوئی جس میں ان کی بہت سختی سے سرزنش کی گئی۔ کچھ اور افراد تھے جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کے سامنے طرح طرح کی باتیں بنا کر جنگ سے فرار کی اجازت طلب کرتے تھے مثال کے طور پر کہتے کہ ہم کو کچھ ضروری کام ہے یا ہم سخت مشکلوں سے دوچار ہیں لہٰذا ہم کو شہر میں رہنے کی اجازت دیدیں۔ در حقیقت کوئی معقول عذر نہیں تھا لیکن اپنے عمل پر پردہ ڈالنے کے لئے کہ کوئی اگر ان پر اعتراض کرے تو اس کو جواب دے سکیں کہ ہم نے رسول اللہ سے اجازت لے لی ہے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور جہاد میں شریک نہ ہونے اجازت طلب کرتے تھے۔ آنحضرت بھی ان کو پہچانتے اور ان کے انداز گفتگو سے ہی سمجھ لیتے تھے کہ یہ منافقین یا" ضعیف الایمان" ہیں (وَلَتَعرِفَنَّھُم فِیْ لَحَنِ الْقَوْلِ)[1]

"اور تم انھیں ان کے اندازِ گفتگو سے ہی ضرور پہچان لوگے"

لیکن ان کی ظاہری شان باقی رکھنے کے لئے آپ ان کو شہر میں رہنے کی اجازت مرحمت فرما دیتے اور یہ پیغمبر اکرم ﷺ کے نہایت ہی کریم اور مہربان ہونے کی وجہ سے تھا ایک طرف تو آپ کو یہ خیال تھا کہ لوگوں کے راز

1۔ سورۂ محمد آیت 30۔

فاش نہ ہو جائیں اور دوسری طرف یہ فکر تھی کہ جب کمانڈر یہ اعلان کر دے کہ سب جنگ میں شریک ہوں اور کچھ افراد کمانڈر کے اس اعلان کی صاف طور پر مخالفت کریں تو خود یہ مخالفت دوسرے افراد میں بھی جرأت کا سبب بن جاتی ہے اور کمانڈر کے فرمان کی اہمیت کو کم کرتی ہے ان ہی دو وجہوں کی بناء پر پیغمبر اکرم ﷺ ان کو شہر میں رہنے کی اجازت مرحمت فرما دیتے کہ تم شہر میں رہ سکتے ہو۔ آیۂ کریمہ اسی موقع پر نازل ہوئی اور (عَفَا اللہُ عَنکَ) کا ظاہری مطلب یہی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ سے ایک ان چاہا امر صادر ہوا ہے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا عقیدہ رکھنے والے بعض مفسّرین اس کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ یہ درگذر ترکِ اولیٰ پر تھی نہ کہ معصیت پر۔ یعنی خداوند عالم نے پیغمبر اکرم ﷺ کو اختیار دے رکھا تھا کہ وہ جس کو مناسب سمجھیں شہر میں رہنے کی اجازت دے سکتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کا انھیں اجازت دینا حرام نہیں تھا اس لئے آپ نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ یہاں زیادہ سے زیادہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان کو اجازت نہ دینا بہتر تھا اور (عَفَا اللہُ عَنکَ) کا مطلب یہ ہے کہ خدا آپ کے اس ترکِ اولیٰ کو معاف فرمائے لیکن علامہ طباطبائی [فرماتے ہیں کہ یہ حتی ترکِ اولیٰ بھی نہیں تھا اور آیت کا مقصود بھی یہ بیان کرنا نہیں ہے کہ یہ کام جو آپ نے کیا ہے انجام نہ دیتے تو اولیٰ تھا۔ بلکہ ناراضگی کی زبان میں مدح کی گئی ہے۔ کبھی تو ایک شخص کی براہ راست مدح کی جاتی ہے مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص بہت مہربان اور ہمدرد ہے اور کبھی ممکن ہے اس طور پر کہ بہ ظاہر ناراضگی کا اظہار ہو مدح کی جاتی ہے اور مدح کرنے کا زیادہ بلیغ طریقہ بھی یہی ہے۔ مثال کے طور پر کہتے ہیں: کہ تم کتنے ہمدرد ہو، ہمدردی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے! یہ آیت اسی طرح کا مطلب بیان کر رہی ہے۔ اس لئے کہ خداوندعالم اس آیت کے ذیل میں ہی فرماتا ہے:

(وَلَوْاَرَادُوْاالْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهُ عُدَّةً)[1]

"اور اگر یہ لوگ (جنگ کے لئے) نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اپنے لئے کچھ سازوسامان تو تیار کئے ہوتے"۔

وہ سرے سے نکلنے کا قصد ہی نہیں رکھتے تھے اور خداوندعالم چونکہ ان کے دلوں کے حال سے باخبر تھا وہ کسی لائق نہیں ہیں فرماتا ہے:

(وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَا ثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْامَعَ الْقَاعِدِيْنَ)[2]

1۔ سورۂ توبہ آیت 46۔

2۔ سورۂ توبہ آیت 46۔

"لیکن خدا نے ان کی (جنگ کے لئے)رضا کا رانہ شمو لیت کو نا پسند کیا تو ان کو کا ہل بنا دیا اور (گو یا) ان سے کہدیا کہ تم (جنگ سے)گریز کر نے وا لوں کے ساتھ بیٹھے رہو "۔

ان کے اندر جہا د میں شریک ہو نے کی لیا قت نہ ہو نے کی وجہ سے ہی خدا وند عا لم خود نہیں چا ہتا تھا کہ وہ جنگ میں شریک ہوںؔاوریہ عذابِ الٰہی تھا جس کے تحت ان میں سستی اوربہا نے با زی کی حالت پیدا ہو گئی تھی ، خداوند عالم تویہاں تک فر ما تا ہے:(لَوْخَرَجُوْافِیْکُمْ مَّازَادُوْکُمْ اِلَّاخَبَا لاً) [1]

"اگر یہ لوگ تمہا رے ساتھ (جنگ کے لئے)نکلتے بھی تو تم میں فسا دبر پا کر نے کے سوا کچھ نہ کر تے "

معلوم ہوا ان کا جہا د میںؔشریک نہ ہونا ہی الٰہی مصلحت تھی۔ لہٰذا آیت میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اولیٰ یہ تھا کہ آپ ان کو جہا د میں شریک ہو نے کی اجا زت نہ دیتے حتی خود اسی آیت میں اس لہجہ کی وجہ بھی مو جود ہے کہ اگر آپ ان کو اجا زت دیدیتے تو (یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْاوَتَعْلَمَ الْکَاذِ بِیْنَ)"آپ پر سچ بو لنے وا لے ظا ہر ہوجاتے اور آپ جھوٹوں کو بھی پہچان لیتے "معلوم ہو جاتا کون سچ بو لنے وا لے ہیں اور کون جھوٹ بولنے وا لے ہیں اگر آپ ان کو اجا زت نہ دیتے تو جو سچے تھے وہ جہا د میں شر کت کر تے اور جو جھو ٹے تھے معلوم ہو جا تا وہ جھوٹے ہیں دل سے اطا عت گذار نہیں ہیں ۔پس ایسا نہیںہے کہ وا قعا مصلحت یہ تھی کہ پیغمبر ان کو اجا زت نہ دیں بلکہ آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ کی مدح کی جا رہی ہے کہ آنحضرت ﷺ نہا یت ہی ہمدرد و مہر با ن ہیں اور یہ نا راضگی کے پیرائے میںؔمدح کا بلیغ اندازہے ، اور آیت میں (عَفَا اللہ عَنْکَ) خبر یہ جملہ نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ نے گنا ہ یا ترکِ اولیٰ کیا تھا اور خدا وند عالم نے اس کو معاف کر دیا بلکہ یہ انشا ء اور دعا ہے ۔بات کو ذہن سے قریب کر نے کے لئے ہم اپنی روز مرّہ کی زبان میں عمو ماً کہا کر تے ہیں کہ (خدا آپ کے باپ کی مغفرت کر ے)اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم آپ کے باپ کو گنا ہگارثابت کر نا چا ہتے ہیں ۔ معلوم ہو ا کہ آیۂ شریفہ میں نا راضگی کا لہجہ نا راضگی کے لئے نہیں ہے ۔بلکہ محبوب نے ناراضگی وا لے لہجہ میں مدحِ لطیف کی ہے جو اس ظا ہری نا راضگی میں مخفی ہے لیکن ہاں (اِیَّاکَ اَعْنِیْ وَاسْمَعِیْ یَا جَا رَةْ)کے عنوان سے اس

1۔سو رئہ تو بہ آیت 47۔

میں منافقین اور ضعیف الایمان افراد کی نسبت عتاب ہے ۔یہی بات المیزان میں علامہ طبا طبائی نے اس آیت کے ذیل میں بیان کی ہے ۔ بہر حال یہ آیت پیغمبر اکرم ﷺ سے حتی ترکِ اولیٰ صادر ہونے پر بھی دلالت نہیں کرتی۔

تیسری آیت

(وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْ اَنْعَمَ اللهُعَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِکْ علیک زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللهَ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللهُ مُبْدِ یْهِ وَتَخْشَیْ النَّا سَ وَاللهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ)[1]

"اور (اے رسول) آپ نے جب اس شخص (زید بن حارثہ) سے کہ جس کو خدا نے نعمت سے نوازا تھا اور آپ نے خود بھی اس پر انعام کیا تھا کہا: کہ اپنی بیوی کو اپنی زوجیت سے الگ نہ کرو اور خدا سے ڈرتے رہو حالانکہ آپ اس بات کو اپنے دل میں چھپا ئے ہوئے تھے کہ جس کو خدا نے ظاہر کر دیا آپ لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ خدا اس کا زیادہ حقدار تھا کہ آپ اس سے ڈرتے "۔

یہ (روایتوں اور خود آیۂ شریفہ کی روشنی میں موجود قرینہ کے مطابق) پیغمبر اکرم ﷺ کے منھ بولے بیٹے زید بن حارثہ تھے، وہ بہت باکمال جوان تھے جن کو اس زمانہ کے معمول کے مطابق پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنا منھ بولا بیٹا قرار دیدیا تھا اس زمانہ میں دستور تھا کہ بعض افراد کسی جوان (خاص طور سے غلام) کو اپنا بیٹا بنا لیا کرتے تھے اور اس زمانہ کے رسم و رواج کے مطابق اس پر نسلی اور واقعی فرزند کے جیسے احکام جاری ہوتے تھے اور اس کو میراث بھی دی جاتی تھی جس طرح حقیقی فرزند کی شادی کے بعد اس کی بیوی باپ کی بہو شمار کی جاتی ہے اور اس کی محرم ہو جاتی ہے اور باپ کا اس سے شادی کرنا حرام ہے اگرچہ بیٹا اسے طلاق ہی کیوں نہ دیدے ۔ اس زمانہ میں یہی احکام منھ بولے بیٹے پر بھی جاری کئے جاتے تھے ۔ دینِ اسلام میں اس رسم کو ختم ہونا چاہئے تھا کیونکہ کہ یہ ایک غلط رسم تھی ۔

سورۂ احزاب کے آغاز میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے :

(اُدْعُوْهُمْ لِآ بَائِهِمْ هو اَقْسَطُ عِنْدَ اللهِ)[2]

"لے پالکوں کو ان کے (اصل) باپ کی طرف نسبت دو کیونکہ یہی خدا کے نزدیک انصاف سے قریب ہے"

1۔ سورۂ احزاب آیت 37۔

2۔ سورۂ احزاب آیت 5۔

اسی سنت کو توڑنے کے لئے حکمتِ الٰہی کا تقاضا ہوا کہ خود پیغمبرِ اکرم ﷺ اس رسم کو اپنے منھ بولے بیٹے کے ذریعہ توڑیں تا کہ لوگوں کو یقین ہو جائے اور دورِ جاہلیت کی اس رسم کا اختتام ہو جائے۔

زید شادی شدہ تھے اور اللہ نے پیغمبر اکرم ﷺ پر وحی کی کہ آپ زید کی زوجہ سے عقد کرلیں یعنی زید اپنی زوجہ کو طلاق دیدیں اور آپ اس سے عقد کرلیں تا کہ دورِ جاہلیت کی اس رسم کا خاتمہ ہو جائے پیغمبر اکرم ﷺ پر یہ وحی نازل ہو چکی تھی کہ اس طرح کا واقعہ پیش آئیگا۔ ایک دن زید نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میں اپنی زوجہ کو طلاق دینا چاہتا ہوں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: نہیں اپنی زوجہ کو الگ نہ کرو، تقویٰ اختیار کرو اور عدل و انصاف کی رعایت کرو۔

یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی: (وَاِذْ تَقُوْ لُ لِلَّذِیْ اَنْعَمَ اللہ عَلَیْہِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْہِ) وہ شخص جس پر خدا نے انعام کیا تھا اور آپ نے بھی انعام سے نوازا تھا۔ آپ نے اس سے کہا (اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْ جَکَ وَ اتَّقِ اللہ)"اپنی بیوی کو اپنی زوجیت میں رہنے دو۔ یہ اس وقت تھا کہ (وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللہ مُبْد یْہِ)"آپ اس بات کو اپنے دل میں چھپا رہے تھے کہ جس کو آشکار کرنے کا خدا فیصلہ کر چکا تھا (وَ تَخْشی النَّا سَ) اور آپ لوگوں سے ڈر رہے تھے"(وَاللہ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ)"جبکہ خدا سے ڈرنا زیادہ سزاوار ہے"

اسلام دشمنوں نے اس آیۂ شریفہ کے متعلق ایک داستان گڑھ ڈالی اور افسوس بعض مسلمانوں میں بھی اس کا چرچا ہونے لگا اور اس کو کتابوں میں بھی لکھ مارا جس سے وہ اسلام کے دشمنوں کے لئے ایک دستاویز بن گئی یہاں تک کہ اس دور میں بھی اس کو پیغمبر کی ایک کمزوری شمار کرتے ہیں۔ دشمنان اسلام نے (معاذ اللہ کہا اور لکھا ہے کہ ایک روز پیغمبر اکرم ﷺ کی نظر مبارک زید کی خوبصورت بیوی پر پڑ گئی تو آپ کا دل اس پر آگیا اور آپ اس کے عاشق ہو گئے آپ اس سے شادی کے خواہشمند تھے لیکن اس سے عقد کرنے کی کوئی راہ نہ تھی آپ کو یہ خوف تھا کہ کہیں لوگ اس بات سے مطلع ہو کر یہ نہ کہنے لگیں کہ پیغمبر اس جوان عورت پر فریفتہ ہو گئے ہیں اللہ نے بھی پیغمبر کی دلی آرزو کو پورا کرنے کے اسباب فراہم کئے کہ زید اپنی زوجہ کو طلاق دیدیں اور پیغمبر اس سے عقد کرلیں لیکن دشمنانِ اسلام تو یہاں تک کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی دلی آرزو کو پورا کرنے کے لئے یہ آیات خود بنائی ہیں انھوں نے یہ تمام مقدمات فراہم کرنے کے بعد فرمادیا کہ: آیۂ شریفہ نازل ہوئی ہے اور خداوند عالم نے فرمایا ہے کہ۔۔۔

بالکل اسی طرح کی داستان کہ جس کی حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف نسبت دی گئی ہے کہ آپ اپنے ایک صحابی کی بیوی پر فریفتہ ہو گئے تھے وغیرہ وغیرہ اور دشمنانِ اسلام ثبوت میں آیت کا یہ ٹکڑا پیش کرتے ہیں کہ "تم لوگوں سے ڈرتے ہو" اور کہتے ہیں کہ انسان اسی وقت ڈرتا ہے جب وہ خداوند عالم کی مرضی کے خلاف کوئی کام انجام دے ۔ یہ ایک جھوٹی داستان ہے جو اسلام کے دشمنوں نے گڑھی ہے در اصل، پیغمبر اکرم ﷺ کو خوف یہ تھا کہ لوگ اپنے درمیان رائج اس مستحکم رسم کا توڑا جانا قبول نہیں کر سکیں گے کیونکہ ان کے نقطۂ نظر سے یہ کام ایسا تھا کہ گویا کسی نے اپنے حقیقی فرزند کی زوجہ سے عقد کر لیا ہو، آپ کو لوگوں کے درمیان اپنی آبرو ریزی کا ڈر نہیںتھا بلکہ آپ اس لئے ڈر رہے تھے کہ کہیں خدا کے اس حکم کو لوگ قبول نہ کریں آپ کسی منا سب وقت کی تلاش میںتھے اور آپ خداوند عالم کی طرف سے کسی ایسے واقعہ کے پیش آنے کے منتظر تھے جس کے ذریعہ لوگوں کی مصلحتیں بھی پوری ہوجائیں اور حکمتِ الٰہی بھی محقّق ہوجائے اور لوگ بھی اس کو تسلیم کر لیںاورنا فرمانی نہ کریں ۔ بالکل اسی سے ملتا جلتا مسئلہ غدیر کی ولایت کا ہے ارشاد ہوتا ہے :

(یَاأَیُّهَاالرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاأُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِکَ وَاِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَابَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّا سِ)[1]

"اے رسول جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پرنازل کیا گیا ہے لوگوں تک پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو گویارسالت کا کوئی پیغام نہیں پہنچایا اور خدا تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا"

اس منزل میں بھی پیغمبر اکرم ﷺ کو یہ خوف تھا کہ کہیں لوگ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کو تسلیم نہ کریں ۔یہ خوف در حقیقت امر الٰہی کی جہت میں تھا ۔آپ کو یہ خوف اس لئے تھا کہ کہیں لوگ حکمِ خدا کو تسلیم نہ کریں آپ اس لئے نہیں ڈر رہے تھے کہ میری عزّت چلی جائے گی جیسا کہ دشمنانِ اسلام نے خیال کیا ہے اسی مقام پرخدا فرماتا ہے : تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللہ مُبْدِیہ)جس چیز کو آنحضرت ﷺ لوگوں سے چھپا رہے تھے یہ وہی چیز تھی جس کی آپ پر وحی ہوچکی تھی کہ یہ کام ہونا ضروری ہے آپ لوگوں پر آشکار نہیں کر رہے تھے اور لوگوں سے اس طرح کا انداز اختیار کئے ہوئے تھے کہ لوگ متوجہ ہوں کہ پیغمبر نتیجہ سے باخبرہیں ۔ لہٰذا جب زید نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ عرض کی کہ میں اپنی زوجہ کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا "نہیں طلاق نہ دو بلکہ اپنی ازدواجی زندگی جاری رکھو "۔ آپ نے یہ (العیاذ باللہ) اپنے عشق کو مخفی رکھنے کے لئے نہیں فرمایا تھا بلکہ آپ کو یہ خوف تھا کہ کہیں لوگ اس امر کو قبول نہ کریں اور امرخدا کی اطاعت سے انکار نہ کردیں ۔

بنا بر این آیت کا مفہوم یہ نکلتا ہے :آپ نے اپنے منھ بولے بیٹے سے کہ جس پر آپ کے خدا نے اور خود آپ نے بھی انعام و احسان کیا تھاسفارش کی کہ تم اپنی زوجہ کو اپنی زوجیت میں رکھو حالانکہ وہ بات کہ جس کی آپ پر

1۔ سورۂ مائدہ آیت 67۔

وحی ہو چکی تھی کہ اس کو آپ کی زوجیت میں لانا مقصود ہے آپ نے لوگوں سے مخفی رکھی آپ لوگوں سے خوف زدہ تھے کہ کہیں وہ حکمِ خدا کی خلاف ورزی نہ کریں، (وَاللہ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاہُ) کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ" لوگوں سے خوف" اور" خدا سے خوف "کے درمیان مقائسہ کیا گیا ہو یعنی لوگوںسے خوف خداوندعالم سے خوف کے ساتھ منافات رکھتا ہو کہ آپ کو خدا سے خوف کرنا چاہیئے لوگوں سے نہیں، یہاں دونوں باتوںمیں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دینے اور اس بات کی طرف متوجّہ کرنے کے لئے ہے کہ آپ اپنی توجہ کا مرکز خدا وند عالم کو قرار دیں، خدا بھی آپ کی حفاظت کرے گا آپ پریشان نہ ہوں ۔یقینا پیغمبر اکرم ﷺ معصوم ہیں اور آپ تمام صفاتِ کمال کے آخری درجہ پر فائز ہیں لیکن اِن کمالات کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ آپ خداوندعالم سے بے نیاز ہوجائیںبلکہ آپ خدا وند عالم کی عطا کردہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ ہی معصوم خلق ہوئے ہیں اور آپ کے پاس سب کچھ خدا وند عالم کا ہی دیا ہوا عطیہ ہے ۔

بہر حال پیغمبر اکرم ﷺ کے بارے میں قرآنی آیات نے یہ بتایا ہے کہ خدا وند عالم کا لطف و کرم جو آپ کے شامل حال ہے ہر مقام پر آپ کا محافظ ہے ،آپ کی تربیت اور آپ کو متوجہ کرتے رہنا اس چیز کو ثابت کرتا ہے کہ خدا وند عالم کی طرف سے اس طرح کا لطف پیغمبر کے شامل حال ہے۔چنانچہ "وَاللہ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاہُ"کا مطلب بھی پیغمبر کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ آپ کو صرف اور صرف خدا سے ڈرنا چاہیئے ۔دوسرے لوگ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور خدا نے جب کسی امر کو متحقق کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اس کو متحقق ہونا ہی ہے اور خدا اس امر میں آپ کی خود حفاظت کرے گا اس طرف سے آپ بالکل مطمئن رہیں ۔ اوراس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ پیغمبر کی طرف سے تشویش تھی بلکہ اس کا مطلب حالات کا فراہم ہو جانا تھا حالات اس چیز کے متقاضی تھے کہ ایک انسان کو اس طرح کی تشویش ہو ۔ اور خدا نے وحی ،الہام اور اپنی خاص تربیت کے ذریعہ ان تمام پریشانیوں سے (جو عام طور پر جو ایک انسان کو پیش آتی ہیں) پیغمبر کی حفاظت فرمائی ۔

معلوم ہوا یہ آیت بھی عصمت کے منافی کسی چیز پر دلالت نہیں کرتی ۔اور وہ داستان بھی گڑھی ہوئی ہے ۔

چوتھی آیت:

(یَاَیُّهَاالنَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَااَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِکَ وَاللّٰہُ غَفُوْررَحِیْمُ)[1]

"اے رسول جو چیز خدا نے حلال کی ہے تم اس سے اپنی بیویوں کی خوشنودی کے لئے کیوں خود پر حرام کر رہے

1۔ سورۂ تحریم آیت 1۔

ہو اور خدا تو بڑا بخشنے والا مہربان ہے"۔

یہ اسلام دشمن عناصر کا ایک بہت تیز حربہ ہے اور دین اسلام کی مخالفت میں لکھی جانے والی کتابوں میں خاص طور سے اس آیت کا سہارا لیا گیا ہے ان کا کہنا ہے کہ خود قرآن کریم نے کہا ہے کہ پیغمبر (العیا ذ باللہ) امور شرعی میں مداخلت کیا کرتے تھے حلال کو حرام کر دیتے تھے۔ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ اس طرح کے کام کیوں انجام دیتے ہیں ؟!

جی ہاں اسلام دشمنوں نے اس مسئلہ کو یہ رنگ دیا ہے کہ وحی اور قرآنی مطالب سے بلکہ اس سے بھی پہلے درجہ میں نبی کی سنّت سے لوگوں کا اعتماد سلب کر لیں۔

اس مقام پر بھی شبہ کو دور کرنے کیلئے آیت کے مطلب اور اسکے شأن نزول کو مد نظر رکھنا چاہئے یہ آیت ایک ایسی داستان سے متعلق ہے جس کو روایتوں میں مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے علاوہ ازیں پیغمبر اکرم ﷺ کی بعض ازواج سے متعلق بھی ایسے مطالب ہیں جن میں خداوندعالم نے اُن پر عتاب کیا ہے اور ان پر شدید حملے کئے گئے ہیں اور بعید نہیںہے کہ اس طرح کے واقعات میں پیغمبر اکرم ﷺ کی بعض ازواج (عائشہ اور حفصہ جو ابوبکر اور عمر کی بیٹیاں تھیں) سے متعلق شبہے پیدا ہو جائیںا ور اصل قضیہ روشن و واضح نہ ہو چونکہ اہلسنّت حضرات پیغمبر اکرم ﷺ کی تمام ازواج کو تقدس کے سب سے بلند مرتبہ پر فائز سمجھتے ہیں اور کسی طریقہ سے بھی ان کی شان میں کوئی کمی نہیں چاہتے لہٰذا مطلب کو حتیٰ الامکان اس طرح بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کو بالکل بری قرار دیا جا سکے لیکن ان آیتوں کا لہجہ اتنا سخت اور واضح ہے کہ کسی شخص کیلئے کوئی عذر باقی نہیں رہتا خداوندعالم فرماتا ہے :

(وَإِذْأَسَرَّالنَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا)

پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی بعض بیویوں سے راز کی بات کہی اور تاکید کر دی کہ کسی سے اس کا ذکر نہ کریں انھوں نے مخالفت کی اور کچھ باتیں دوسروں سے کہہ دیں اور راز فاش کر دیا خدانے وحی کے ذریعہ اس امر کو رسول پر ظاہر کردیا کہ ایک یا دو بیویوں نے آپ کے راز کو فاش کردیا ہے جب رسول نے اُن سے بازپُرس کی تو کہنے لگیں آپ سے کس نے کہا کہ ہم نے خبر دی ہے؟پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا:(قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ)اس نے خبر دی ہے جو ہر بات سے آگاہ ہے اس کے بعد خداوندعالم ان سے خطاب فرماتا ہے کہ تم یہ خیال نہ کرنا کہ (ہماری اپنی زبان میں) تم میں سرخاب کے کوئی پر لگے ہیں ۔ اگر رسول تم کو طلاق دیدیں تواُن کو اُن کا پروردگار تم سے اچھی بیویاں عطا کردے گا اور اگر تم پیغمبر اکرم ﷺ سے دشمنی پر اتر آئیںتو یہ خیال نہ کرنا کہ تم ان کو شکست دے دوگی کیونکہ خدا، جبرئیل اور تمام ایماندار اشخاص ان کے دوست و مددگار ہیں کبھی بھی یہ خیال نہ کرنا کہ تم اپنی سازشوں کے ذریعہ ان کو شکست دیدوگی ۔

ظاہر ہے بات بہت اہم تھی گویا پیغمبر اکرم ﷺ کے خلاف سازش تھی اسی لئے خداوند عالم نے ان کو اس انداز سے با خبر کیا ہے کہ تم کچھ نہیں ہو۔ خدا، ایماندار افراد اور جبرئیل ان کے ساتھ ہیںاور تم ان کا کچھ نہیںبگاڑ سکتی ہو۔ مسئلہ بہت ہی اہم تھا، اسی وجہ سے قرآن کریم نے ان کی سخت طریقہ سے سرزنش کی ہے۔

صرف اس خیال سے کہ کہیںنوہ مطالب و مقاصد قارئین پر واضح نہ ہوں عرض ہے کہ اس سلسلہ میں عجیب و غریب واقعات نقل کیے گئے ہیں۔ منجملہ عامہ کی روایت ہے کہ ایک روز پیغمبر اکرم ﷺ اپنی بیوی "سودہ" کے یہاں تشریف فرما تھے انھوںنے آپ کے لئے شہد کا شربت تیار کیا جس سے ایک خاص قسم کی بو آرہی تھی۔ جب آنحضرت ﷺ وہ شربت نوش فرما کر عائشہ کے پاس گئے تو انھوںنے منھ موڑتے ہوئے کہا: اونہہ یہ کیسی بو ہے؟ کچھ دیر بعد آنحضرت ﷺ حفصہ کے پاس تشریف لے گئے تو انھوںنے بھی اسی طرح کے الفاظ ادا کئے تو آنحضرت ﷺ سمجھ گئے کہ ان لوگوں کو اس شربت کی بو پسند نہیں ہے اس وقت آپ نے قسم کھائی کہ اب اس کا شربت نہیں پیئیں گے اس وقت آیت نازل ہوئی:

(یَاایُّهَاالنَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآأَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ)

شہد کا شربت حلال ہے آپ اس کو اپنے اوپر کیوں حرام قرار دے رہے ہیں؟ اس آیت کے شان نزول میں جو داستانیں نقل کی گئی ہیں یہ ان میں سے ایک ہے۔

شیعی منقول روایات میں یہ بات دوسری طرح نقل ہوئی ہے کہ ایک دن حضرت رسول خدا ﷺ اپنے بیت الشرف میں تشریف فرما تھے اور آپ کی بیوی ماریۂ قبطیہ جو پہلے کنیز تھیں آپ کے حجرہ میں موجود تھیں اور بعض روایات کے مطابق آنحضرت ﷺ کا سرِ مبارک ماریہ قبطیہ کے زانو پر تھا اور آپ آرام فرما تھے اسی دوران عائشہ اور حفصہ دونوں حجرے میں داخل ہوئیں تو انھیںیہ حالت دیکھ کر تعجب ہوا کہ ان کی موجودگی میں پیغمبر اکرم اپنا سر مبارک ایک کنیز (زوجہ) کی گود میں کیوں رکھتے ہیں۔ انھوں نے آپ سے جنگ و جدل شروع کردی اور آپ کے خلاف محاذ آرائی کا فیصلہ کر لیا، اور ناراضگی کے انداز میں کہاکہ اب ہم دونوں آپ کے پاس نہیں آئینگے وغیرہ وغیرہ پیغمبر اکرم ﷺ نے ان کو خاموش کرنے کے لئے کہ گھر میں ہنگامہ نہ کریں قسم کھائی کہ میں اب ماریہ کے پاس نہیں جاؤنگا انھوں نے بھی پیغمبر اکرم ﷺ کی اس قسم کے بعد راحت کی سانس لی اور قصہ تمام ہوگیا۔

اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ اگرچہ آپ بعض کی ازواج چاہتی ہیں کہ آپ اپنی دوسری (بیوی) پر نظر نہ اٹھائیں لیکن آپ کو ان کی خوشی کا اتنا خیال نہیں کرنا چاہیے: (لِمَ تُحَرِّمُ مَااَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ) خداوند عالم نے پیغمبر اکرم ﷺ پر کنیز کو حلال قرار دیا تھا اوران کی خوشی کے لئے پیغمبر اکرم ﷺ نے یہ قسم کھالی تھی کہ اب اس کنیز کے نزدیک نہیں جائیں گے خداوند عالم فرماتا ہے کہ آپ نے اس طرح کی قسم کیوں کھائی ؟! (قَدْ فَرَضَ اللّٰہُ لَکُمْ تَحِلَّۃَ اَیْمَانِکُمْ') 'خدا نے اس طرح کی قسموں کا توڑدینا آپ پر لازم قراردیا ہے" روایات کے مطابق مسئلہ اس موضوع سے مربوط ہے اور اہلسنّت کی روایات میں دوسری باتیں بیان کی گئی ہیں۔

بہر حال پیغمبر اکرم ﷺ نے جو چیز خود پر حرام قرار دی تھی کوئی بدعت نہیں کی تھی اس کو تشریع کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا یعنی جس چیز کو خداوند عالم نے حلال قرار دیا تھا آنحضرت ﷺ نے اس کے حرام ہونے کا حکم نہیں دیا تھا۔ کیونکہ بعدکی آیت میں تائید ہوتی ہے: (قَدْ فَرَضَ اللّٰہُ لَکُمْ تَحِلَّۃَ اَیْمٰنِکُمْ) ممیں "خدا نے اس طرح قسموں کو توڑڈالنا آپ پر لازم کردیا ہے" یہ (تَحِلَّۃ) اُسی تحریم کے مقابل میں ہے اور دونوں کا مصدر باب تفعیل ہے۔ یعنی اس تحریم کے مقابلہ میں جو تم نے کی ہے خدا نے تمہارے لئے اس کو حلال قرار دینا لازم قرار دیا ہے یعنی جس چیز کو تم نے اپنے لئے ممنوع قرار دیا ہے اس کی ممنوعیت ختم کردو۔ " اَیْمَان"(تَحِلَّہ) کی ایمان کے ذریعہ بتایا ہے کہ اس چیز کو قسم کے ذریعہ حرام قرار دیا گیا تھا پیغمبر اکرم ﷺ نے قسم کے ذریعہ ایک چیز اپنے اوپر حرام قرار دی تھی قانون وضع نہیں کیا تھا اور کیسے ممکن ہے کہ جس کے لئے خداوندقدوس فرماتا ہے:

(وَلَوْتَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ لَاَخَذْنَامِنْہُ بِالْیَمِیْن) (1)

"اگر رسول ہماری طرف کسی جھوٹی بات کی نسبت دیتے تو ہم پوری قوت سے ان کو روک دیتے"۔

وہ اس (رسول) کو اپنے خلاف قانون بنانے کی اجازت دیدے ؟اس طرح کی چیز تمام انبیاء علیہم السلام کیلئے محال ہے چہ جائیکہ پیغمبر اسلام ﷺ جو تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں اور خود آیت بھی اس چیز کی شہادت دیتی ہے کہ یہ تحریم قانونی یا شر عی نہیں تھی کوئی بھی شخص ایک مباح کام انجام نہ دینے کی قسم کھا سکتا ہے۔آنحضرت نے بھی اپنی ازواج کے مطالبات کو حتیٰ الامکان پورا کرنے کی کوشش فرمائی اور ایک کام جو حلال تھا اس کے انجام نہ دینے کی قسم کھالی اور یہ آپ کا نہایت ہی لطف تھاجو آپ نے دوسروں کے آرام کیلئے اپنے کو زحمت میں ڈالنا گوارا کیا لیکن خداوند عالم آنحضرت سے خطاب فرماتا ہے چونکہ اس مسئلہ میں مصلحتیں ہیں تو آپ اپنی قسم توڑدیں اور قسم کے ذریعہ جو چیز اپنے لئے حرام قرار دی ہے حلال کیجئے۔

پس حقیقت میں یہ (لِمَ تُحَرِّمِ) سورئہ توبہ میں (لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ) کی مانند ہے یہ بھی محبت بھری ناراضگی

1۔ سورئہ الحاقۃ آیت44۔45۔

کے لہجے میں ایک قسم کی مدح ہے یعنی صحیح ہے کہ آپ کو دوسروں کی خواہش کا خیال کرنا چاہیئے لیکن کس قدر؟ کیا اس حدتک کہ خود کو زحمت میں ڈال دیں ؟ہم یہ نہیںچاہتے کہ آپ بذات خود اپنے کو اتنی زحمت میں ڈال دیں کہ دوسروں کی خواہشوں پر حلال چیزوں کو بھی اپنے لئے حرام قرار دیدیں یہ خداوندعالم کا امر ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کام پیغمبر اکرم ﷺ نے انجام دیا ہے وہ برا کام ہے بلکہ یہ پیغمبر اکرم ﷺ کی طرف سے دوسروں کی نسبت ہمدردی ، محبت، مہربانی اور ایثار کے مقابلہ میں آنحضرت ﷺ پر خداوند عالم کا لطف و کرم ہے اس لئے کہ آپ نے اپنی ازواج کے لئے اپنی خواہشات کو قربان کردیا خداوند عالم نے اس ایثار و قربانی کے جواب میں کہاہے کہ اے رسول اپنی قسم سے صرف نظر کرومیں اپنے حق سے درگذر کرتا ہوں اس بناء پر یہ لہجہ اگرچہ ظاہر میں جواب طلب کرنے کا ہے لیکن حقیقت میں ایک طرح کی مدح ہے جس میں پیغمبر اکرم ﷺ کی دوسروں کی نسبت کمال ہمدردی اور ایثار کی تعریف ہے ۔

بہر حال یہ آیت بھی ان دوسری آیات میں سے ہے جو اس چیز پردلالت کرتی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ اپنی زندگی اور گھریلوماحول میں کتنی مشکلوں کو برداشت کیا کرتے تھے ، اس مسئلہ کی اہمیّت اس وقت اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے جب ہم بقیہ سورۂ تحریم کا آخرتک مطالعہ کریں اس لئے کہ خداوندعالم نے سورہ کے آخرمیں مومنوں اور کافروں کے لئے حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی ازواج اور ان کے مقابلہ میں فرعون کی زوجہ اور حضرت مریم کی مثالیں بیان کی ہیں ، سورہ کا لہجہ بتاتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر آپ کو اس طرح کی ازواج کا سامنا ہے تو حضرت نوح اور حضرت لوط بھی اس طرح کی ازواج کا سامنا رہا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کو نہ توکوئی شخص چھپا سکتا ہے اورنہ ہی اس کے لئے کوئی بہانہ تلاش کرسکتا ہے ان ازواج کے سلسلے میں آیہ شریفہ کا لہجہ اتنا سخت ہے جس کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی ہے ۔

پانچویں آیت

یہ آیت شک و شبہ ایجاد کرنے کے اعتبار سے دوسری تمام آیتوں سے زیادہ محکم ہے یعنی اس آیت سے پیغمبر اکرم ﷺ کی عصمت میں یہاں تک کہ مقام تبلیغ رسالت میں بھی شبہ پیدا ہو جاتا ہے گذشتہ آیات ایک شخص کے عمل سے متعلق تھیں لیکن اس آیت کا شبہ اصل تبلیغ رسالت سے متعلق ہے سورۂ حج میںخداوند عالم ارشاد فرماتا ہے :

(وَمَآاَرْسَلْنَامِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَسُوْلٍ وَ لَا نَبِیٍّ اِ لَّآ اِذَا تَمَنّیٰٓ اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ فَیَنْسَخُ اللّٰہُ مَا یُلْقِیْ الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰہُ آیَاتِہٖ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْم لِیَجْعَلَ مَایُلْقِی الشَّیْطَانُ فِتْنَۃً لِلَّذِ یْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرضوالْقَاسِیَۃِقُلُوْبُھُمْ وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍوَلِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ اُوْتُوْاالْعِلْمَ اَنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّکَ فَیُؤْمِنُوْابِہٖ) [1]

"اور (اے رسول) ہم نے تم سے پہلے کوئی ایسا رسول اور نبی نہیں بھیجامگر یہ کہ جس وقت اس نے کوئی آرزو کی تو شیطان نے اس کی آرزو میں (اپنی طرف سے) خلل ڈالاتو خدا نے جو وسوسہ شیطان نے پیدا کیا تھا اسے مٹادیا پھر اپنی آیات (احکام) کواستحکام بخشا اور خداتو بڑادانا اور حکیم ہے ایسا اس لئے ہے کہ ان کی باتوں میں جو کچھ شیطان نے خلل ڈالا ہے اس کو ان لوگو ں کی آزمائش (کا ذریعہ)قرار دے کہ جن کے دلوں میں (کفرکا مرض ہے اور جن کے دل سخت ہیں اور ظالمین یقیناً بہت سخت اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں اوریہ اس لئے بھی ہے کہ صاحبانِ علم جان لیں کہ بیشک یہ قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے بر حق ہے اور اس پر وہ ایمان لائیں"۔

اس آیت کے شانِ نزول سے متعلق اہل سنت کی تفسیروں اور احادیث کی کتابوں میں ایک عجیب و غریب داستان نقل کی گئی ہے جس نے تبلیغِ رسالت میں پیغمبراکرم ﷺ کی عصمت سے متعلق ایک بہت بڑا شبہہ ایجاد کردیا ہے اور اس بارے میں انھوں نے سعیداور ابن عباس سے متعدد روایتیں بھی نقل کی ہیں اور سیوطی اورابن حجر جیسے کئی دوسرے افراد نے صراحت کے ساتھ کہاہے کہ ان روایتوں کی سند بھی صحیح ہے۔

داستان کچھ اس طرح ہے: جب سورۂ نجم نازل ہواتو پیغمبر ﷺ مکہ میں اس کی قرائت فرمارہے تھے۔یہاں تک کہ آپ اس آیت:

(اَفَرَأَیْتُمُ اللَّا تَ وَالْعُزّیٰ وَمَنٰو ۃَ الثَّا لِثَۃَ الْاُ خْرَیٰ) پرپہنچے ''کیا تم لوگوں نے لات و عزیٰ کو دیکھا ہے اور منات کو جو ان کا تیسرا ہے؟ "اس وقت شیطان نے آپ کی زبانِ اقدس پر یہ دو جملے جاری کردیئے:

"تِلْکَ الْغَرَانِیْقَ الْعُلَیٰ وَاِنَّ شَفَا عَتَھُنَّ لَتُرْ تَجَیٰ "اس کے بعد آنحضرت سجدہ ریز ہوئے اور لوگوں نے بھی سجدہ ادا کیا پھر جبرئیل نازل ہوئے اور سوال کیا کہ آپ نے یہ کیا پڑھ دیا؟ نبی نے فرمایا کہ میں نے اپنی زبان پر یہ دو جملے جاری کئے ہیں جبرئیل نے کہا کہ میں نے آپ پر یہ وحی نہیں کی تھی۔یہ جملے شیطان نے القاء کئے ہیں اس وقت پیغمبراکرم ﷺ نے لوگوں کے سامنے یہ اعلان فرمایا کہ یہ دو جملے قرآنی جملے نہیں ہیں۔

بعض اہلِ سنّت نے اس داستان کے صحیح السند ہونے کی تائید کے بعد اس داستان کو مندرجہ بالاآیات کا مصداق

1۔ سورۂ حج آیت52سے 54۔

قرار دیا ہے ان کی نظر میں سے آیت کا مضمون کچھ اس طرح سے ہے : کہ جب بھی کوئی پیغمبر آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرنا چا ہتا شیطان اس میں کوئی چیز القاء کر دیتا۔ اس اعتبار سے تمنّیٰ کے معنی تلاوت اور قرائت کے ہیں اور انھوں نے شاہد مثال کے لئے شعرائے عرب میں سے کسی ایک شاعر کا شعر بھی نقل کیا ہے جس میں تمنّیٰ قرائت کے معنی میں استعمال ہوا ہے پس "اِذَا تَمَنّیٰ"یعنی جس وقت وہ تلاوت کرنا چاہتے تھے تو "اُلْقِیَ الشَّیْطَانُ فِی اُمْنِیَّتِہِ "یعنی فِیْ قَرَائَتِہِ"شیطان ان کی قرائت میں کچھ چیز وں کا القاء کر دیتا تھا۔ منجملہ اس داستان میں شیطان نے دو جملے القاء کر دیئے اور چونکہ شیطان یہ کام انجام دیتا ہے لہذا :(فَیَنْسَخَ اللّٰہ مَایُلْقِیْ الشّیَطَان) "خدا شیطان کے القاء کئے ہوئے جملوں کو نسخ کر دیتا ہے"

جیسا کہ یہاں پر جبرئیل آئے اور اُس کے جملوں کو نسخ کیا اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ اس میں تمام انبیاء بتلاء ہوئے ہیں شیطان اپنی بات القاء کرتا اور اس کے بعد خداوند عالم اس کو منسوخ کر دیا کرتا۔

یہ بات قطع نظر اس سے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی عصمت میں شبہ ایجاد کرتی ہے اس سے تو بنیادی طور پر وحی اور قرآن کریم پر اعتماد ختم ہوجاتا ہے یعنی دشمنان اسلام کے لئے ایک بہت بڑی دستاویز ہے جو یہ کہہ سکتے ہیں کہ خود قرآن کریم میں یہ کہا گیا ہے کہ وحی کے وقت شیطان کچھ مطالب پیغمبر اکرم ﷺ پر القاء کردیتا تھا اس بناء پر یہ کیسے معلوم ہو کہ جن آیات کو قرآن کریم کا جزء کہاجاتا ہے وہ شیطانی القائات کا حصہ نہ ہو اور اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ بعد میں جبرئیل نازل ہوئے اور انھوں نے یہ فرمایا کہ وہ آیات نسخ ہوگئی ہیں تو بھی ممکن ہے وہ نسخ تو ہوگئی ہوں لیکن قرآن کریم سے نکالی نہ گئی ہوں۔

قرآن کے اعتبار و اعتماد پر سب سے بڑی ضرب جو لگائی جا سکتی تھی یہی ہے اور افسوس! وہ بات کہ جس کو ہم حقیقی معنی میں (القی الشیطان فی اُ مْنِیَّتِہِ) کہہ سکتے ہیں یہی روایت اور داستان ہے جو ہمارے برادران اہلسنّت نے اپنی کتابوں میں لکھ دی ہے بلا شبہ یہ وہی شیطانی القائات ہیں۔

یہ روایت اوّل سے آخر تک اپنے جھوٹے ہونے کی خود گواہی دیتی ہے، ایسا فرض کرلیجئے کہ پیغمبر ﷺ نہ ہوتے بلکہ کوئی عام شخص ہوتا جو عوام الناس کو توحید کی دعوت دیتا تو کیا ایک عام موحّد بھی تین بتوں کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہے :"اِنَّ شَفَاعَتَھُنّ تَرْتَجِیْ ؟!"وہی شخص جو (ھٰؤُلَاءِ شُفَعَاءُ نَاعِنْدَ اللّٰہ) کے دعوے کی مذمت کر رہا ہے کہ ان کی حیثیت کیا ہے؟! یہ شفاعت کے کیا کام آئیں گے؟! کیا ان میں شعور و عقل ہے ؟ کیا خدا نے ان کو شفاعت کرنے کی اجازت دیدی ہے ؟ کیا شفاعت کا کوئی قاعدہ و قانون نہیں ہے کہ جس کا دل چاہے وہ شفاعت کرے ؟اس وقت یہی شخص کہہ رہا ہے کہ ہم ان بتوں سے شفاعت کے امیدوار ہیں اور پھر ان کے سامنے سجدہ ریز بھی ہوجاتا ہے؟

کیا ایک عام شخص سے بھی اس طرح کا فعل سرزد ہونا معقول ہے ؟چہ جائیکہ ہم اس فعل کو پیغمبر اکرم سے منسوب کریں !بعض نے عذر تراشا ہے کہتے ہیں کہ یہ سبقت لسانی تھی زبان پھسل گئی تھی، پیغمبر اکرم ﷺ نے دل سے یہ جملے زبان پر جاری کئے ہوں، ایسا نہیں ہے لیکن یہ عذر گناہ سے بد تر ہے ۔

ایک تو یہ کہ سبقت لسانی ایک حرف یا ایک جملہ میں ہوتا ہے نہ کہ دو طویل جملے کہ ان کا مطلب ہی بنیادی طور پر دعوت پیغمبر کے مخالف ہو۔

دوسرے یہ کہ سبقت لسانی کے بعدبات کرنے والا سجدہ ریز نہیں ہوتا !

بہر حال کسی شک و شبہ کے بغیریہ داستان دشمنان اسلام کی گڑھی ہوئی ہے اور ان کے گڑھنے کی علامتیں بھی اس میں آشکار و ظاہرہیں ۔

لیکن آیۂ شریفہ کی تلاوت اورتلاوت میں شیطانی خلل سے کوئی ربط نہیںہے ۔اگر کسی شعر میں لفظ تمنّیٰ پڑھنے کے معنی میں استعمال بھی ہوا ہو (جو خود بھی قابل غور ہے)توشاید اس کی وجہ یہ ہوکہ جب انسان کسی چیز کی آرزو کرتا ہے تو عموماً زبان پر جاری کرتا ہے اوریہ زبان پر جاری ہونا ہی تمنّا کی حکایت کرتا ہے شاید اسی وجہ سے اس کو تمنّا کہا گیا ہو ورنہ کلمۂ تمنّا کا اصل مطلب پڑھنا اورتلاوت کرنا نہیں ہے ۔ سب جانتے ہیں کہ تمنّا یعنی آرزو کرنا اور آرزو کرنا کسے کہتے ہیں ؟آرزو کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن میں ایک خاکہ اور منصوبہ تیار کرے اوردل اس کو عملی جامہ پہنانا چاہے ۔ ایک پیغمبر، پیغمبر ہونے کی حیثیت سے کس چیز کی تمنّا کرتاہے ؟ ظاہرہے وہ پیغمبر اپنی رسالت کے محقق ہونے کی آرزو کرتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ جب بھی کوئی پیغمبر کوئی آرزو کرے وہ محقق ہوجائے ۔ بلکہ شیطان اس آرزو کے متحقّق ہونے میں خلل اور مشکلیں ایجاد کرتا ہے وہ کیسے ان مشکلوں کو ایجاد کرتا ہے ؟ شیطان کا کام وسوسہ کرنا ہے ، وہ لوگوں کے اذہان میں وسوسہ کرتا ہے ، ان کو ایمان نہیں لانے دیتا کہ پیغمبر کی آرزو پوری ہو اور خداوند عالم ان شیطانی وسوسوں کو نیست ونابود کردیتا ہے اور اس شبہہ کی بنیاد پر آیت کا یہ فقرہ ہے " فَيَنْسَخُ اللهُ مَا يُلْقِيَ الشَّيْطَانُ "چونکہ لفظ نسخ کے اصطلاح میں ایک خاص معنی ہیں اور اس کا متعلّق کلام یا حکمِ الٰہی ہے جبکہ نسخ کے لغوی معنی زائل کرنا اور محو کرنا ہیں ۔ نسخ کے دو معنی ہیں :

1۔ ایک چیز کو دوسری جگہ نقل کرنا، نسخہ کرنا یا فوٹو کاپی کرنا۔
2۔ کسی چیز کا محو کرنا
جملہ "فَيَنْسَخُ اللهُ "یعنی خداوند عالم ان شیطانی وسوسوں کو نیست و نابود اور اس کے بالمقابل آیاتِ الٰہی کو محکم و مضبوط کردیتا ہے۔ آخر کار انبیاء علیہم السلام غالب ہوں گے "لَاَ غْلِبَنَّ اَنَاوَرُسُلِیْ ""میں اور میرے رسول غالب آنے والے ہیں" لیکن آیت کے ذیل میں جو یہ فرمایا ہے:
(لِيَجْعَلَ مَايُلْقِیْ الشَّيْطَا نُ فِتْنَةً لِلَّذِ يْنَ فِیْ قُلُوْ بِهِمْ مَرَض)
"اور شیطان جو (وسوسہ) ڈالتا (بھی) ہے اس لئے ہے کہ خدا اسے ان لوگوں کی آزمائش (کا ذریعہ) قرار دے کہ جن کے دلوں میں (کفر کا) مرض ہے"
شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ٹھیک ہے بالآخر، کار خداوندی کو ہی کامیاب و کامران ہونا ہے اور انبیاء علیہم السلام غالب آئیں گے لیکن بنیادی طورپر شیطان کا وجود عالَم کے کلی مصالح کا جزاور انسان کی آزمائش و امتحان کا وسیلہ و ذریعہ ہے تا کہ ایک طرف جن لوگوں کے دلوں میں کفر کا مرض ہے اور قسی القلب ہیں شیطانی وسوسوں سے دوچار ہوں اور دوسری طرف :
(وَلِيَعْلَمَ الَّذِ يْنَ اُوْتُوْا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّکَ)
"جن لوگوں کو کتب سماوی کا علم عطا ہوا ہے وہ جان لیں کہ یہ وحی بیشک تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے"۔
مومنین شیطانی وسوسوں کا مقابلہ کریں، گمراہ انسانوں اور جنوں کی کارشکنی ان کو متزلزل نہ کرے اور جو کچھ پیغمبر پر نازل ہوا ہے اس کے برحق ہونے پر علم یقینی کے ساتھ پختہ و راسخ رہیں۔
معلوم ہوا کہ جو کچھ ان لوگوں نے تصور کیا ہے اس پر یہ آیۂ شریفہ ہرگزدلالت نہیں کرتی اور وہ داستان تو بالکل گڑھی ہوئی ہے ۔

غیر انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا

ہم عرض کر چکے ہیں کہ قرآنِ مجید کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر پیغام وحی لینے اور پہنچانے میں معصوم ہوتے ہیںیہاں تک کہ رسالت الٰہی کسی خطا اور انحراف کے بغیر لوگوں تک پہنچ جاتی ہے اور دوسرے دلایل سے چاہے وہ عقلی ہوں یا نقلی یہ ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغِ وحی میں معصوم ہونے کے علاوہ وحی کے مطابق عمل کرنے میں بھی معصوم ہوتے ہیں بلکہ شیعہ حضرات کے کھلے عقاید کی روسے وہ کسی غلطی، اور سہو و نسیان سے بھی دوچار نہیں ہوتے۔ اس سلسلہ میں کچھ شکوک بھی تھے جن کی حتی المقدور وضاحت کے ساتھ ہم نے جواب بھی عرض کردیئے ہیں:

اب اس مقام پر ایک دوسرا سوال یہ پیش آتا ہے: کیا عصمت، انبیاء علیہم السلام سے مخصوص ہے؟ یا انبیاء علیہم السلام کے علاوہ بھی کچھ لوگ معصوم ہو سکتے ہیں؟ اور کیا قرآن مجید کی آیات اس سلسلہ میں ہماری کچھ رہنمائی کرتی ہیں یا نہیں؟

اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے خود عصمت کے مفہوم کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ عصمت سے مراد صرف گناہ کا ترک کرنا نہیں ہے۔ اگر کسی انسان سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو تو کافی نہیں ہے کہ ہم اس کو معصوم کہہ بیٹھیں۔ اس لئے کہ اولاً انسان مکلف ہونا چاہیئے یعنی اس عمر کو پہنچ چکا ہو کہ اس پر شرعی فریضہ عائد ہوتا ہو اور اس وقت وہ فریضہ کی مخالفت نہ کرے ورنہ اگر کوئی انسان ابھی مکلّف نہیں ہوا ہے تو وہ اس مقام پر نہیں ہے کہ اس کے لئے کہیں معصوم ہے کہ نہیں؟ مثلاً بچے کے لئے بالغ ہونے سے پہلے (معصوم ہونے یا نہ ہونے کی) بحث نہیں اٹھتی اگر ان کو معصوم کہاجاتا ہے تو یہ ایک تسامح ہے معلوم ہوا ان کے اندر گناہ کرنے کی قوت ہونی چاہیئے یعنی مکلف ہوں البتہ سب انسانوں کے لئے احکام یکسان نہیں ہوتے ہمارے پاس ایسے دلایل موجودہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ممکن ہے کچھ لوگ قانونی سن سے پہلے ہی مکلف ہوجائیں جیسے ائمہ اطہار رسمی اور ظاھری بلوغ سے پہلے ہی مکلف ہیں اور ان بلند مرتبوں پر فائز ہونے کی بنا پر اپنی ذمہ داریوں کی بہ نسبت متعہد اور ملتزم ہیں امام پانچ سال یا اس سے کم و بیش عمر میں امام ہوسکتاہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتاہے۔ بہر حال عصمت کا مسئلہ اس شخص سے متعلق ہوتاہے جو مکلف ہو، چاہے وہ معمولی اعتبار سے مکلف ہو جیسے عام طور سے لوگ ایک مخصوص عمر میں مکلف ہوتے ہیں چاہے مخصوص طور پر مکلف ہو جیسے انبیاء اور ائمہ علیہم السلام غیر متعارف عمر میں مکلف ہوتے ہیں۔

دو سرے اگر مکلّف شخص میں معصیت کرنے کی طاقت نہ ہو جس کی بناء پر اس سے گناہ سرزد نہیں ہوتا تو اس کو بھی معصوم نہیں کہا جاتا۔ عصمت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر گناہ کرنے کی طاقت اور تمام شرطیں موجود ہوں اس کے با وجود بھی وہ گناہ نہ کرے۔ چاہے معمولی اور متعارف شرطیں ہوں یا استثنائی شرطیں ہوں۔ اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے:

ہر انسان کچھ ایسے ملکہ کا مالک ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس سے کچھ مخصوص کام صادر ہوتے ہیں مثلاً بہادر آدمی کے اندر ایک ملکہ ہوتا ہے یعنی اس میں ایک ایسی کیفیت راسخ ہو جاتی ہے جو اس سے کچھ کاموں کے انجام دینے اور دوسرے کاموں کے ترک کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ پس ملکۂ عفت اور ملکۂ سخاوت بھی ایسے ہی ہیں معمولی طور پر یہ ملکات جن کے متعلق اخلاق میں بحث کی جاتی ہے اسی طرح کے ہیں جو متعارف و معمولی حالات و شرطوں میں کچھ کاموں کے انجام دینے کا منشاء ہوتے ہیں لیکن ان پر عمل نہ کرنا محال نہیں ہوتا یعنی بہادر آدمی اس کو کہا جاتا ہے جو معمولی حالات و شرطوں میں نہیں ڈرتا لیکن اگر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آجائے تو ممکن ہے وہ ڈرجائے۔ہاں اگر انسان کے اندر یہ ملکہ بہت زیادہ راسخ ہو جائے اور درجۂ کمال تک پہنچ جائے تو غیر معمولی اور استثنائی حوادث بھی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر ملکۂ عفت اتنا مستحکم و قوی ہو جائے کہ اگر وہ حالات جو حضرت یوسف علیہ السلام کو پیش آئے اس کے سامنے آجائیں تو بھی گناہ نہیں کرتا، اسی طرح دو سرے تمام ملکات اس قدر قوی ہوں کہ کسی بھی حال میں گناہ سرزد نہ ہو اگرچہ غیر معمولی حالات ہی کیوں نہ پیدا ہوجائیں۔ اگر کسی انسان کے اندر ایسا ملکہ پیدا ہو جائے تو اس کو معصوم کہا جاتا ہے۔

عصمت کی تعریف یونکر سکتے ہیں "عصمت انسان میں پایا جانے والا وہ ملکہ ہے جو انسان کو ہر حال میں گناہ سے محفوظ رکھتا ہے "البتہ ہمارا یہ کہنا کہ یہ ملکہ انسان کی حفاظت کرتا ہے اس بات سے منافات نہیں رکھتا کہ خدا انسان کی حفاظت کرتا ہے اس لئے کہ توحید افعالی تقاضا کرتی ہے کہ کسی بھی موجود کے پاس جو کچھ ہے اور جوکام بھی وہ انجام دیتا ہے اس کی انتہاء اور بنیادی بازگشت خدا کی طرف ہے۔ خدا ہی اس کے اندر موجود ملکہ عصمت کے ذریعہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا یہ ملکہ صرف انبیاء علیہم السلام سے مخصوص ہے یا غیر انبیاء علیہم السلام میں بھی اس کے پائے جانے کا امکان ہے، اس کے بھی دو مرحلے ہیں ایک مرحلۂ ثبوت دوسرا مرحلۂ اثبات ،یعنی پہلے یہ ثابت ہونا چاہئے کہ ایک شخص میں اس طرح کا ملکہ پایا جانا کیا ممکن ہے؟ اور دوسرے مرحلے میں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا غیر انبیاء میں اس طرح کا ملکہ ثابت کرنے کی ہمارے پاس کوئی دلیل ہے یا نہیں ؟ جہاں تک ایک انسان کے اندر اس طرح کا ملکہ پائے جانے کی بات ہے تو ہمیں کوئی مشکل نہیں ہے اور نہ ہی اس مفروضہ میں کوئی محال عقلی لازم آتا ہے۔ ہمارے پاس ایسی دلیلیں اور ثبوت موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ملکہ انبیاء سے مخصوص نہیں ہے مثال کے طور پر آیۂ کریمہ (اِلّا عِبَادَ اللہ الْمُخْلَصِیْنَ)یعنی "شیطان اللہ کے مخلص بندوں کو گمراہ کرنے کی ہوس نہیں کر سکتا" عام ہے اور مخلصین میں غیر انبیاء بھی شامل ہو سکتے ہیں اس اخلاص اور عصمت کو صرف انبیاء میں مخصوص کر دینے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے۔ جو شخص بھی مخلَص ہو اس آیۂ کریمہ کے مطابق معصوم ہوگا چونکہ شیطان اس کو فریب نہیں دے سکتا۔ رہی یہ بات کہ معصومین کون لوگ ہیں ؟ اور کیا صرف انبیاء علیہم السلام ہی معصوم ہیںؑیا نہیں ؟ اس کے لئے الگ سے دلیل کی ضرورت ہے خود آیۂ کریمہ اس بات کا انکار نہیں کرتی کہ غیر انبیاء بھی معصوم ہو سکتے ہیں حتی ذہن کو مطمئن اور مانوس کرنے کے لئے ہم نمونہ کے طور پر کچھ ایسے مقامات بیان کر رہے ہیں کہ جن میں قرآن کریم نے غیر انبیاء کے معصوم ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے :

مثال کے طور پر خداوند عالم حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے بارے میں فرماتا ہے:

(وَاِذْقَالَتِ الْمَلَا ئِکَۃُ یَامَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰیکِ وَطَهَّرَکِ وَاصْطَفٰیکِ عَلَیٰ نِسَآءِ الْعَالَمِیْنَ)[1]

"اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم بیشک اللہ نے آپ کو منتخب کیا ہے اور آپ کو پاک و پاکیزہ بنایا ہے اور عالمین کی تمام عورتوں پر آپ کو برتری عطا کی ہے"۔

ہماری بحث کلمۂ (طَهَّرَکِ)سے ہے کہ لفظ تطہیر تقاضا کرتا ہے کہ کسی طرح کی آلودگی ان کے قریب نہیں آسکتی وہ گناہان صغیرہ اور کبیرہ کی ہر برائی سے پاک ہیں پس یہ ثابت ہے کہ غیر انبیاء بھی عصمت و طہارت کے اس درجہ پر فائز ہوتے ہیں کہ تمام عمران سے کوئی بھی گناہ صغیرہ اور کبیرہ سرزد نہیں ہو سکتا۔

1۔ سورۂ آل عمران آیت 42۔

آئمہ علیہم السلام کی عصمت

اہلِ تشیّع کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور بارہ امام علیہم السلام اور اسی طرح حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا پیغمبریا امام نہ ہونے کے باوجود معصوم ہیں معلوم ہوا کہ عصمت انبیاء سے مخصوص نہیں ہے بلکہ غیر انبیاء بھی معصوم ہوسکتے ہیں یہاں اس بات کی طرف دھیان رہے کہ جس عصمت سے ان تیرہ شخصیتوں کو منسوب کیا جاتا ہے وہی عصمت ہے جو پیغمبر اکرم ﷺ کے لئے ثابت ہے، یعنی شیعہ حضرات کے مشہور قول کے مطابق (گناہ سے بھی معصوم ہیں اور خطا اور سہو و نسیان سے بھی معصوم ہیں) اور اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس امت میں چودہ معصوموں کے علاوہ کوئی اور گناہوں سے محفوظ نہیں ہے بلکہ اس طرح کے دوسرے افراد کے ہونے کا بھی امکان ہے جو اس طرح کے ماحول میں زندگی بسر کررہے ہوں کہ تمام حالات میں ملکۂ تقویٰ و عدالت ان کو گناہ سے اس طرح محفوظ رکھے کہ انھوں نے کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو حتی یہ بھی ممکن ہے کہ ان چودہ ہستیوں کے علاوہ کچھ لوگ ملکۂ تقویٰ کے ان اعلیٰ مراتب پر فائز ہوں کہ حتی غیر معمولی حالات بھی اگر پیش آئیں تو ان سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو۔ ان چودہ ہستیوں کے لئے عصمت کا مخصوص ہونا اس معنی میں ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ کے لئے ثابت ہے اور جس کا لازمہ خطا اور نسیان سے بھی محفوظ ہونا ہے۔ پس یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ حضرت سلمان بھی ملکۂ عصمت پر فائز ہوں اور مختلف حالات میں ان سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوا ہو اور اگر اس سے بھی زیادہ سخت حالات ان کے لئے پیش آجاتے تب بھی ان سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوتا لیکن ممکن ہے کہ کسی مقام پر اپنے فیصلے میں غلطی کرگئے ہوں کیونکہ اپنے تمام فیصلوں میں خطا سے محفوظ رہنے کا چودہ معصوموں کے علاوہ کسی اور کے لئے اثبات نہیں کیا جاسکتا اگرچہ ممکن ہے وہ ملکۂ عدالت کے ایک ایسے بلند مرتبہ پر فائز ہوں کہ اس کو بھی عصمت کا نام دیا جاسکے اور اس کی نفی کے لئے بھی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور شاید پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ قول (سَلْمَا نُ مِنَّا اَھْلَ الْبَیْت) اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ بعض خصوصیات جو اہل بیت علیہم السلام کے لئے ثابت ہیں ان کے لئے بھی ثابت ہوں، اور شاید علماء، فقہاء اور شیعوں کی عظیم شخصیتوں کے درمیان ایسے افراد موجود رہے ہوں اور اب بھی موجود ہوں جو عدالت اور تقوے کے اس بلند درجہ پر فائز ہوں کہ کسی بھی طرح کے حالات میں وہ معصیتِ خدا سے پرہیز کرتے ہوں۔ مرحوم سید رضی اور سید مرتضیٰ کا مشہور و معروف واقعہ ہے (البتہ یہ داستان سوفیصدی صحیح ہے میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا) لیکن ان دو بزرگوں کا شمار ان افراد میں ہوتا ہے جو عدالت اور تقویٰ کے اعتبار سے غیر معمولی مرتبہ پر فائز تھے واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک دن طے پایا یہ دونوں متقی عالموں میں سے ایک نماز جماعت میں امام بنے اور دوسرا ماموم، اب یہ کہ گھر میں تھے اور ان کی مادر گرامی کی پیشکش تھی یا کچھ اور، میں نے جزئیات قلمبند نہیں کی ہیں اور یقین سے نہیں کہہ سکتا)

مرحوم سید مرتضیٰ نے امامت کے لئے اشارتاً اولویت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ٹھیک ہے وہ شخص پیش امام بنے جس نے اب تک کوئی گناہ نہ کیا ہوتو اس وقت سید رضی نے فرمایا: بلکہ بہتر ہے وہ شخص پیش امام ہو جس نے گناہ کا خیال تک نہ کیا ہو، یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ انھوں نے اپنی عمر بھی گناہ کا تصور تک نہیں کیا ہے، اور یہ بعید بھی نہیں ہے خدا کے بہت سے ایسے لائق بندے ہیں اگر ہم اس کے اہل نہیں ہیں تو ہمیں اس کا انکار بھی نہیں کرنا چاہئے۔ پس وہ عصمت کہ جس کی ہم ان چودہ معصوموں کی طرف نسبت دیتے ہیں وہی عصمت ہے جو خود پیغمبر اکرم ﷺ میں پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ ہرطرح کی غلطی اور سہوو نسیان سے بھی محفوظ تھے ۔ اسی طرح ہماری مراد اس عصمت سے ہے جو مقامِ اثبات میں دلیل رکھتی ہو ممکن ہے کوئی شخص اپنی زندگی میں گناہ کا خیال تک نہ کرے لیکن اس کے پاس اس کی کوئی ضمانت نہ ہو اور وہ دوسروں کے سامنے یہ ثابت نہ کرسکے کہ اس کے دل میں کبھی گناہ کا تصور آیاہے یا نہیں ؟ آیا کسی کے حق میںسو ء ظن کیا ہے یا نہیں ؟ لیکن چودہ معصومو ں کے سلسلے میں عصمت ثابت کرنے کی دلیل موجود ہے۔

بہت سی روایات اس بات کو ثابت کرتی ہیںپس معلوم ہوا چودہ معصوموں کی عصمت اور ان افراد کے درمیان کہ جن سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوا ہوحتی انھوں نے گناہ کا تصور بھی نہ کیا ہو دو فرق ہے :

1۔ ائمہ علیہم السلام کی عصمت اس حد کو پہنچی ہوئی ہے کہ وہ خطا اورسہوو نسیان سے بھی محفوظ ہیں ۔

2۔ ان کی عصمت پر ہمارے پاس دلیلیں موجود ہیں ۔

ائمہ علیہم السلام کی عصمت پر قرآنی دلیل

کیاقرآن کریم کی آیات سے ان ذواتِ مقدسہ کی عصمت پر کوئی دلیل موجود ہے یا نہیں ؟

اس کے جواب میں متعدد آیات موجود ہیںلیکن ہم ان میں سے نمونہ کے طورپر صرف دو آیتیں پیش کررہے ہیں ارشاد ہوتا ہے:

(یَاَیُّھَاالَّذِیْنَ آمَنُوْااَطِیْعُوْااللّٰہَ وَاَطِیْعُوْاالرَّسُوْلَ وَاُوْلِیْ الْاَمْرِمِنْکُمْ) [1]

"اے ایمان لانے والو اللہ کی اطاعت کرواور اپنے رسول اور اولی الامر کی اطاعت کرو"۔

اہل تشیّع اور اہل سنّت دونوں کی معتبر روایات کے مطابق اولی الامر سے مراد بارہ امام ہیں حتی برادران اہلسنّت نے کچھ ایسی روایتیں نقل کی ہیں کہ جن میں پیغمبر اسلام ﷺ نے اولی الامر کے عنوان سے بارہ اماموں کا تعارف

1۔ سورۂ نساء آیت59۔

کرایا ہے۔ شیعہ حضرات سے تو اس سلسلہ میں بہت سی روایتیں نقل ہوئی ہیں ہم روایات کے قطع نظر پہلے یہ جائزہ لیتے ہیں کہ کیا خود اس آیت سے اولی الامر کے لئے عصمت ثابت کی جا سکتی ہے یا نہیں ؟ پھر مقام تطبیق میں ہم یہ دیکھیں کہ اولی الامر کون لوگ ہیں ؟

آیۂ کریمہ میں یہ بیان کہا گیا ہے کہ اے ایمان لانے والو خدا، رسول اور اولی الامر کی اطاعت کرو ۔ آیت کے آغاز میں "اَطِیْعُوا اللہ" اس کے بعد" (اَطِیْعُوْا الرَّ سُوْل) "اور اس کے بعد" (وَاُوْ لِیْ الاَمْرِمِنْکُمْ) "آیا ہے۔ خدا کی اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کے نازل کردہ احکام پر عمل کرے اور ہرگز مخالفت نہ کرے لیکن اطاعتِ رسول اور اولی لامر کا جہاں تک سوال ہے تو رسول کی اطاعت کے دو پہلو ہیں ۔ ایک یہ کہ لوگوں تک رسالتِ الٰہیہ کے عنوان سے جو کچھ پہنچایا ہے یعنی وہ احکام جو خدا نے اس کے ذریعہ نازل کئے ہیں اُن پر عمل کریں در حقیقت خدا کے ان اوامر ونواہی پر عمل کرنا اطاعتِ رسول بھی ہے کیونکہ پیغمبر، خدا اور لوگوں کے درمیان ابلاغ کا ذریعہ ہیں ۔ اس کے علاوہ پیغمبر اکرم ﷺ کی ایک اور حیثیت اور منزلت بھی ہے جس کی وجہ سے ان کی اطاعت واجب ہے اور وہ مقامِ ولایت و حکومت ہے۔ ہم پر صرف اس چیز کا حکم نہیں ہے کہ پیغمبر کی بس انھیں احکام میں اطاعت کریں جو اس نے خدا کی جانب سے احکام کلی کے طور پر بیان کئے ہیں بلکہ ان کے علاوہ ہمارا فریضہ ہے کہ اپنی زندگی کے دوران جو بھی اوامر ونواہی پیغمبر ﷺ نے مولویت اور ولایت کے عنوان سے دیئے ہیں،ہم ان کی بھی اطاعت اور پیروی کریں ۔ مزید وضاحت کے لئے عرض کروںکہ ایک دفعہ پیغمبر اکرم ﷺ ایک آیت کی تلاوت فرماتے جو کسی حکمِ الٰہی پر دلالت کرتی ہے تو ہم اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ مثلاً نماز وروزہ وغیرہ واجب ہیں اور اس واجب پر عمل ضروری ہے پس ان احکام پر عمل کرنا خدا کی اطاعت بھی ہے اور اس کے رسول کی بھی اطاعت ہے ۔

خدا کی اطاعت اس لئے ہے کہ وہ حکم نازل کرنے والا ہے اور پیغمبر کی اطاعت اس لئے ہے کہ وہ اس حکم کو پہنچانے والے ہیں ۔بنیادی طور پر نبوّت اور رسالت اس سے زیادہ کا تقاضا نہیں کرتی، جب ہم یہ سمجھ گئے کہ ایک شخص اللہ کا رسول ہے تو اس کے رسول ہونے تقاضا یہ ہے کہ وہ جو کچھ رسالتِ الٰہی کے عنوان سے ہمارے لئے لے کر آئے اسے قبول کریں لیکن اس کے ہر حکم کی اطاعت ضروری ہے یا نہیں ؟ خود رسالت اس کا تقاضا نہیں کرتی اس کے لئے ایک اور دلیل کی ضرورت ہے ایک مرتبہ وحی کے ذریعہ حکم ہوتا ہے کہ رسول جو کچھ دے یا کہے اس کی اطاعت کرو، تو اب اس حکم سے رسول کے لئے ایک دوسرا مقام ثابت ہوتا ہے کہ عام امور میں بھی اس کی اطاعت ضروری ہے ۔ کبھی خود وحی کے الفاظ میں یہ بات نہیں ملتی بعد میں جب نبی اکرم ﷺ کی رسالت ہمارے لئے ثابت ہوگئی آنحضرت ﷺ کی رسالت ہی میں یہ بات کہی جاتی ہے:

(وَمَآاَرْسَلْنَامِنْ رَسُوْلٍ اِلَّالِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہ) [1]

"اور ہم نے کسی پیغمبر کو نہیںبھیجا مگر یہ کہ لوگ اذنِ خدا سے ان کی اطاعت کریں"۔

ہم اس قرآنی دلیل کے تحت چونکہ ہر رسول کی اطاعت کرنا واجب سمجھتے ہیں اگر یہ آیت نازل نہ ہوئی ہوتی تو صرف عقلی دلیل کے تحت چونکہ یہ پیغمبر ہے اور پیغمبر کی تمام مسائل میں اطاعت ہونی چاہیئے ہم نہ سمجھ پاتے لیکن چونکہ یہ آیت نازل ہوئی لہٰذا اس دلیل نقل پر اعتماد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول کی اطاعت ضروری ہے۔ لہٰذا پیغمبر حکومت سے متعلق معاملات اور لوگو ں کی زندگی سے متعلق امور میں جو امر و نہی کرتا ہے" ولیِ امر"کی حیثیت سے اس کی اطاعت واجب ہے۔ یہ رسالت کے علاوہ ایک دوسرا مقام ہے۔ اسی طرح اگر وہ کسی معاملہ کا فیصلہ کریں تو ان کے فیصلہ کو بھی تسلیم کرنا چاہیئے کیونکہ وہ خداوند عالم کی طرف سے قاضی بن کر آئے ہیں۔

معلوم ہوا مندرجہ بالا جائزے کی روشنی میں تین مقام ثابت ہوتے ہیں:

ایک مقامِ حکومت :یعنی نبی اکرم ﷺ ولیِ امر، مدبّر اور معاشرہ کی عنان ہاتھ میں رکھنے والے سائس رہبر(ساسۃ العباد)ہیں ۔یعنی حاکم ہیں۔دوسرا مقامِ قضاوت : یعنی دو فریقوں کے مابین فیصلہ کرنا ،قاضی و منصف ،اورتیسرا مقام، رسالت اور الٰہی پیغام رسانی،یعنی رسول ہیں اور ان تینوں مقامات کے لئے قرآن کریم میں آیات موجودہیں :پہلے مقام و مرتبہ سے متعلق خداوند عالم قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے:

(اِ نَّآاَنْزَلْنَااِلَیْکَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآاَرٰکَ اللّٰہُ) [2]

"(اے رسول)ہم نے تم پر حق کے ساتھ یہ کتاب اس لئے نازل کی ہے کہ جس طرح خدا نے تمہاری رہنمائی کی ہے لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو"۔اور اسی سورۂ نساء کی دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

(فَلَا وَرَبِّکَ لَایُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَاشَجَرَبَیْنَھُمْ ثُمَّ لَایَجِدُوْافِیْ اَنْفُسِھِمْ حَرَجاًمِّمَّاقَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْاتَسْلِیْماً) [1]

"پس (اے رسول) آپ کے پروردگار کی قسم یہ لوگ صاحبِ ایمان نہ ہوں گے جب تک اپنے باہمی جھگڑوں میں آپ کو اپنا حاکم (نہ) بنائیں اور جو کچھ آپ فیصلہ کردیں اس سے کسی طرح دل تنگ بھی نہ ہوں اور آپ

1۔ سورۂ نساء آیت 64۔

2۔ سورۂ نساء آیت105۔

3۔ سورۂ نساء آیت 65۔

کے فیصلے کے سامنے سراپا تسلیم ہو جائیں"۔

اسی طرح ولایتِ امر، تدبیر اور حاکمیت کے مسئلے میں کہ وہ مسلمانوں کو جس چیز کا بھی حکم دیں سب کو تسلیم کرلینا چاہیئے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

(اَ لنَّبِیُّ اَوْلَیٰ بِالْمَؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ)[1]

"نبی تو مومنین پر خود اُن سے بڑھکر حق رکھتے ہیں"۔

اس سلسلہ میں دوسری آیتیں بھی ہیں منجملہ وہ آیت جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں: (اَطِیْعُوْااللّٰہَ وَاَطِیْعُوْاالرَّسُوْلَ وَاُوْلِی الْاَمْرِمِنْکُمْ)[2]"خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اور تم میں سے جو صاحبانِ امر ہیں اُن کی اطاعت کرو"۔

اس آیۂ شریفہ میں کلمۂ(اَطِیْعُوْا) دو مرتبہ استعمال ہوا ہے ایک مرتبہ اس کو خدا سے منسوب کیا گیا ہے اور دوسری مرتبہ اسکی رسول اور اولی الامر سے نسبت دی گئی ہے اور رسول اور اولی الامر کی اطاعت کا ایک(اَطِیْعُوْا) کے تحت ایک ساتھ حکم ہوا ہے۔ خدا وند عالم نے (اَطِیْعُوْااللّٰہ وَالرَّسُوْلَ وَاَطِیْعُوْااُولِی الاَمْرِمِنْکُمْ) نہیں فرمایا ہے۔ خدا کو ایک (اَطِیْعُوْا) کے ساتھ بیان فرمایا اور رسول اور اولی الامر کو ایک ساتھ ایک ہی امر کا متعلق قرار دیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرا (اَطِیْعُوْا)رسول اور اولی الامر کے درمیان مشترک ہے۔

اولی الامر کی شان کیا ہے؟

اولی الامر یعنی وہ افراد جو لوگوں کے امور کو چلاتے ہیں اور لوگوں پر حکومت کا حق رکھتے ہیں ظاہر ہے کہ رسول اور اولی الامر سے یکساں طورپر متعلق ہونے والا یہ امر پیغمبر اکرم ﷺ کی رسالت کے اس پہلو سے تعلق رکھتا ہے جو ولایتِ امر، تدبیر اور معاشرہ کے امور سے مربوط ہے لہٰذا رسول اور اولی الامر دونوں خدا کی طرف سے واجب الاطاعت ہونے کے امر میں مشترک ہیںتو کیا، اس اطاعت کا واجب ہونا کسی قید و شرط کے ساتھ ہے یا نہیں؟ آیت مطلق ہے جس طرح (اَطِیْعُوْا اللہ)حکم ہے اسی طرح " (اَطِیْعُوْا الرَّسُوْلَ وَاُوْ لِیْ ا لْاَمْرِمِنْکُمْ) " حکم ہے؟! دو اعتبار سے آیۂ شریفہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آیۂ شریفہ میں جن اولی الامر کا ذکر ہے ان کی مطلق طورپر اطاعت

1۔ سورۂ احزاب آیت 6۔

2۔ سورۂ نساء آیت 59۔

واجب ہے :ایک تو اس لحاظ سے کہ "اَطِیْعُوْا" مطلق طور پر کہا ہے اور دوسرے اس لحاظ سے کہ اولی الامر کی اطاعت کا حکم ،رسول کی اطاعت سے جڑی ہوئی ہے اور دونوں کی اطاعت خداوند متعال کی اطاعت سے وابستہ ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ان اولی الامر کے اوامر ونواہی کی مطلق طور پر اطاعت ہونا چاہئے۔ اگر یہ افراد معصیت سے محفوظ نہ ہوتے اور ان افراد کے بارے میں معصیت کا احتمال پایا جاتا تو ممکن تھا کہ ان کے اوامر ونواہی بھی معصیت سے مربوط ہوں اور خداوند عالم کے امر و نہی کی مخالفت کا باعث بنیں تو اس صورت میں یہ صحیح نہیں تھا کہ خدا کی اطاعت بھی واجب ہو اور ان کی اطاعت بھی واجب ہو۔" اَطِیْعُوْا اللہ " کا تقاضاء یہ ہے کہ جس چیز کا خدا نے حکم دیا ہے اس کی اطاعت کرو اگرچہ دوسرے اس کے خلاف کیوں نہ حکم دیں اور "اطیعوا الرسول واولی الامر"کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی مطلق طور پر اطاعت واجب ہو اب اگر خداوند عالم کے حکم کے خلاف ہوتو بھی اس کے مطلق ہونے کا مقتضی یہ ہے کہ ان کی اطاعت واجب ہے تو ایسی صورت میں لازم آئیگا کہ ہمارے لئے ایک ہی وقت میں دو متناقض امر واجب ہوں مثال کے طور پر اگر (العیاذ باللہ) پیغمبر اکرم ﷺ کسی گناہ کا حکم صادر فرماتے تو "اطیعو اللہ"کا تقاضا تھا کہ اس گناہ کا ارتکاب نہ کریں اور "اطیعو االرسول "کا تقاضا ہوتا کہ نبی کی بات مانیں یعنی ایک ہی مسئلہ میں دو متضاد فرائض ہوجاتے ؛پتہ چلا کہ آیت میں اس چیز کی ضمانت ہے کہ رسول اور اولی الامر کے اوامر کبھی بھی خداوندعالم کے اوامر کے خلاف نہیں ہوسکتے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں معصوم ہیں اور یہ خود اس چیز کی ضمانت ہے کہ یہ بزرگان کبھی بھی حکم الٰہی کے خلاف امر و نہی نہیں کرسکتے ممکن ہے کوئی یہ فکر کربیٹھے کہ اس اطلاق کو بھی مقید کیا جاسکتا ہے ۔یعنی "اَطِیْعُوْا الرَّسُوْلَ وَ اُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" اس معنی میں مقید یا تخصیص کے قابل ہے کہ "اطیعو االرسول الافیما خالف اللہ"اور یہ اسی طرح ہے کہ جیسے قرآن میں بہت سے مطلق اور عام احکام ہیں جن کی دوسری عقلی یا نقلی دلیلوں کے ذریعہ تخصیص یا تقیید کی گئی ہے،ہمارے پاس دلیل نقلی ہے "لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق "جو تخصیص کا کام کرتی ہے دلیل عقلی بھی ،وہ محکم قرینہ ہے کہ کسی بھی صورت میں خداوند عالم کی مخالفت جائز نہیں ہے معلوم ہوا کہ یہ عقلی اور نقلی دلیل آیت کے اطلاق کو مقید کرتی ہے ان کے معصوم ہونے پر دلالت نہیں کرتی ۔

لیکن یہ بات ذہن کی پیداوار ہے یعنی کبھی کبھی ہم اپنے ذہن میں اس طرح کا قاعدہ فرض کرلیتے ہیں کہ ہاں عام قابل تخصیص ہے اور مطلق قابل تقیید ہے لیکن جب ہم الگ سے بعض عام اور خاص پر نگاہ ڈالتے ہیںتو دیکھتے ہیں کہ وہ تخصیص اور تقید کو قبول نہیں کرتے اور اگر ان پر تخصیص یا تقیید کا حکم جاری کیا جائے تو وہ عرف عام میں قبیح اور مستہجن ہے ۔ علم فقہ میں ایسے بہت سے موارد ہیں جہاں ہمارے فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ "مامن عام الاوقد خص"لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ بعض عام کے لئے تخصیص کی گنجائش نہیں ہے یعنی عرف عام میں کلام کا مفہوم ایسی عمومیت رکھتا ہے کہ اگر اس پر تخصیص لگائی جائے تو اس کو متناقض خیال کرتے ہیں مخصّص نہیںمانتے اور یہاں اسی طرح کی صورت ہے مثال کے طور پر آیہ شریفہ میں خدا فرماتا ہے :

(وَمَآ اَرْسَلْنَامِنْ رَسُولٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللَّهِ)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بھی پیغمبر فرمائیں اسکی اطاعت کرنی چاہیئے بعد میں اگر کہاجا ئے کہ (لا تطع الرسول فیھا خالف امر اللہ)"یعنی اللہ کے حکم کے خلاف جو حکم دے اس میں رسول کی اطاعت نہ کرو "تو عرف عام میں ان دونوں بیانوں میں تناقص ہے یعنی آیت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کسی بھی امر میں رسول کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے ۔ اسکے علاوہ قرآن کریم کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اہم موارد میں جہاںشک و شبہ کا اندیشہ ہو اگر ان میں تخصیص و تقیید کی ضرورت ہو تو صاف طور پر بیان کردیتا ہے ۔ اس طرح کے بہت سے مقامات جہاں اس سے کم اہمیت کے مسائل ہیں جب قرآن کریم دیکھتا ہے کہ ممکن ہے حکم عام سے غلط مطلب نکال لیا جائے تو وضاحت کے لئے تقیید کردیتا ہے ۔ مثال کے طور پر والدین سے نیکی کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے :

(وَقَضَیٰ رَبُّکَ اَلَّاتَعْبُدُواِلَّااِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَاناً) (1)

"اور تمہارے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم سب اسکے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔۔۔"۔

یہاں چونکہ یہ شبہہ ہوتا ہے کہ اگر والدین کہیں کہ فلاں کام انجام نہ دو یا فلاں گناہ کرو تو اس صورت میں ہمارا کیا فریضہ ہے ؟تو خداوندعالم فرماتا ہے :

(وَاِنْ جَاھَدَاکَ لِتُشْرِکَ بِی مَالَیْسَ لَکَ بِہِ عِلْم فَلاَ تُطِعْھُمَا) (2)

"اوراگروہ کسی کو میرا شریک بنانے پر مجبور کریں جسکا تمھیں علم نہیں ہے تو خبردار ان کی اطاعت نہ کرنا۔۔۔" اب ایک ایسے مسئلہ میں جہاںیہ احتمال ہو کہ اولی الامر ہونے کے اعتبار سے کہیں کوئی غلط فائدہ نہ اٹھائے اور

1۔ سورۂ اسراء آیت23۔

2۔ سورۂ عنکبوت آیت 8۔

اپنے ذاتی نظریات لوگوں پر نہ لاددے(کیونکہ یہ عام سی چیز ہے کہ جب بھی کسی نا اہل کے ہاتھ میں حکومت آجاتی ہے وہ اپنے نظریات لوگوں پرلاددیتا ہے اور اپنے مفادات حاصل کرنے کے چکرمیں لگا رہتا ہے) اس طرح کے حالات میں قرآن کریم مطلق طور پرفرماتا ہے : (اَطِیْعُوْا الرسول و اُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ)اور اس میں کوئی قیدو شرط بیان نہیں فرمائی یہ طریقہ قرآن کریم کے اندازبیان سے بالکل بعیدہے مطلب اتنا واضح و روشن ہے کہ "فخر رازی"(جن کو بعض نے"امام المشککین" کے لقب سے یاد کیا ہے)اعتراف کرتے ہیں کہ یہ آیت اولی الامرکی عصمت پردلالت کرتی ہے البتہ اولی الامرکی مطابقت اور مصادیق معین کرنے میں غلطی کر بیٹھتے ہیں اورکہتے ہیں : "اولی الامرسے مرادکسی بھی اسلامی معاشرہ کے اہل حل و عقدہیں اوریہ بات اس چیزپردلالت کرتی ہے کہ اجماع حجت ہے اور جہاں بھی اہل حل وعقدکسی بات پر اجماع کر لیں تو ان کی نظرغلطی و خطا سے محفوظ ہے [1]بہرحال قرآن کریم نے اس امت کے جن افراد کو اولی الامرکہا ہے ان کی عصمت پراس آیہ کریمہ کودلیل کے عنوان سے پیش کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے مصادیق معین کرنے کے سلسلے میںتمام احکام کی تفصیل کی طرح پیغمبراکرم ﷺ سے پوچھناچاہیئے ۔

ائمہ اطہار علیہم السلام کے زمانہ میں کبھی کبھی مخالفین اس طرح کے شبہے ایجادکیا کرتے تھے کہ اگرتم یہ عقیدہ رکھتے ہوکہ بارہ امام خداکی طرف سے مقرر کئے گئے ہیں اوران کی اطاعت واجب ہے اور ان کا مقام تمام لوگوں سے بلند و بالا ہے تو ان میں سے کسی کا نام قرآن کریم میں کیوں نہیں آیا؟ ہمارے آج کے دور میں بھی اس طرح کے عامیانہ شبہے پیدا کئے جاتے ہیں متعدد روایتیں اس چیزکی نشاندہی کرتی ہیں کہ اس طرح کے شبہات رائج تھے۔ حضرات نے اس کے جواب کا طریقہ بتایا ہے: قرآن کریم میں نماز قائم کرنے کا حکم ہے لیکن کیا نمازکی رکعتوں کی تعدادبھی معین کی گئی ہے ؟تو اس بارے میں عوام کا فریضہ کیا ہے ؟رکعتوں کی تعدادکس سے پوچھیں گے ؟کیا پیغمبراکرم ﷺ سے سوال کرنے کے علاوہ ان کا کوئی اور فریضہ تھا ؟!اس بارے میں قرآن کریم فرماتا ہے:

(وَاَنْزَلْنَااِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ)[2]

"اور آپ کی طرف بھی ذکر کو(قرآن)نازل کیا ہے تاکہ وہ احکام واضح کردیں جو لوگوں کے لئے نازل کئے گئے ہیں اور شاید وہ غور وفکر کریں"۔

1۔مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں "تفسیر المیزان "علامہ طبا طبائی نیزالامامت والولایت فی القرآن الکریم''۔

2۔ سورۂ نحل آیت44۔

پیغمبر اکرم ﷺ کا کام احکام کی تفصیل بیان کرنا ہے اسی طرح زکوٰۃ دینے کا حکم نازل ہوا کیا قرآن کریم میں ہے کہ ہر چالیس درہم میں سے ایک درہم زکوٰۃ ادا کرنی چاہیئے ؟ یہ حکم روایت میں آیا ہے اور پیغمبر اکرم ﷺ نے بیان فرمایا ہے ، حج کا حکم نازل ہوا تو کیا قرآن کریم میں طواف کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ طواف میں سات چکّر لگانا چاہیئے ؟ لوگوں نے کہاں سے سیکھا ؟ کیا پیغمبر اکرم ﷺ کے فرمان کے علاوہ کہیں اور سے ملا ہے ؟

اس آیت کے بارے میں بھی سب سے اولیٰ اور سب سے زیادہ جاننے والے مفسر اور حامل قرآن ، یعنی حضرت رسول اکرم ﷺ نے اولی الامر کا تعین کر دیا ہے جب آپ سے سوال کیا گیا تو حضور ﷺ نے بارہ اماموں کا تعین فرمادیا اور میں عرض کر چکا ہوں کہ اہل سنت کی روایات میں بھی آیا ہے ؛ انھوں نے "جابر بن عبداللہ انصاری " سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے بارہ اماموں کو معین و مشخّص فرمایا ہے ۔

اس بناء پر اولی الامر کو معین و مشخّص کرنے کے سلسلے میں پیغمبر اکرم ﷺ کے قول کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے ہم کو ان کی بات ماننا چاہیئے اور اس کے مطابق روایتیں بھی موجود ہیں اور اس بارے میں ہمارے لئے ذرہ بھی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔

اہل بیت علیہم السلام کی عصمت کے ثبوت میںیہ آیت پیش کی جاتی ہے :

(اِنَّمَا یُرِیْدُاللّٰہُ لِیُذْ ھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا)[1]

"(اے اہل بیت)خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو (ہر طرح کی)برائی سے دور رکھے اور جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے ویسا پاک و پاکیزہ رکھے "۔

اس آیہ شریفہ سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ خداوندعالم نے اس آیت میں "اہل بیت " کے نام سے ایک گروہ کو خطاب فرمایا ہے اور حصر کے طورپر کہا ہے کہ خدا نے تو بس تم کو پاک رکھنے کا ارادہ کرلیا ہے ۔یقیناًیہ ارادہ اور فیصلہ اس گروہ سے مخصوص ہے اور خداوندعالم نے جو عام انسانوں کے پاک کرنے کا اعلان کیا ہے اس سے مختلف ہے وہ تشریعی ارادہ ہے جس کا واقع ہونا لازم نہیں ہے خداوند عالم غسل اوروضو کے حکم کے ساتھ فرماتا ہے :(یُرِیْدُ اللہ لِیُطَھِّرَکُمْ)خداوند عالم تم کو وضو اور غسل کے ذریعہ سے پاک کرنا چاہتا ہے یہ تشریعی ارادہ ہے اور متحقق ہونے کی ضمانت نہیں رکھتا ۔

اب اگر جو طہارت اس آیت میں بیان کی گئی وہی طہارت ہو جو ارادۂ تشریعی کے تحت ہے تو وہ ایک خاص

1۔ سورۂ احزاب آیت 33۔

گروہ سے مخصوص نہیں ہے، خداوندعالم کا تشریعی ارادہ تمام انسانوں کی طہارت سے تعلق رکھتا ہے لیکن یہ ارادہ جو ایک خاص گروہ سے مخصوص ہے تکوینی ارادہ ہے جو متحقق ہونے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ معلوم ہوا کہ خداوندعالم نے اس امت میں وہ لوگ کہ جن کو "اہل بیت علیہم السلام"ہونے کا شرف حاصل ہے ان کی نسبت تکوینی ارادہ فرمایا ہے کہ یہ افراد طاہر رہیں اور مطلق طور پر ان میں یقیناً طہارت متحقّق ہوگی اور "یطھرکم تطھیرا"کی تکرار اُن کی تطہیر میں مبالغہ پر دلالت کرتی ہے۔

اہل بیت علیہم السلام کون ہیں؟

بعض برادران اہل سنّت اور شیعہ کے نام سے منسوب ایک گروہ جس نے اُن ہی کی پیروی کی ہے آیۂ تطہیر سے قبل کے جملوں کو قرینہ قرار دیکر یہ خیال کیا ہے کہ اہل بیت علیہم السلام سے مراد پیغمبر اکرم ﷺ کی ازواج ہیں چونکہ اس آیت سے پہلے کی آیات میں نبی اکرم ﷺ کی ازواج سے خطاب ہے، اسی کو قرینہ مان کر انھوں نے کہا ہے کہ اس ارادہ سے تشریعی ارادہ مراد ہے کیونکہ کوئی بھی ازواج نبی کی عصمت کا مدعی نہیں ہے یہاں تک کہ اہل سنت بھی مانتے ہیں کہ وہ معصوم نہیں تھیں۔ قرآن نے بھی صاف طور پر بیان کیا ہے کہ وہ معصوم نہیں تھیں انھوں نے حتی پیغمبر اکرم ﷺ کو تکلیفیں بھی دی ہیں اور قرآن نے ان کی سرزنش کی ہے معلوم ہوا کہ یہ آیت ان کی عصمت پر دلالت نہیں کرتی۔

اس غلط فہمی کا جواب یہ ہے کہ خود آیت کا سیاق اس بات کا شاہد ہے کہ اس میں "ازواج نبی" سے خطاب نہیں ہے اس لئے کہ آیت سے پہلے کے جملوںمیں تمام ضمیریں مؤنث کی ضمیریں ہیں جبکہ اس آیت میں خدا فرماتا ہے (لِیُذْھِبَ عَنْکُمْ) اور بظاہر اس کی کوئی وجہ نظر نہیںآتی کہ اگر اُن ہی سے خطاب تھا تو ضمیر اور آیت کا سیاق و لہجہ کیوںبدل دیا گیا۔ اس کے علاوہ شیعہ اور اہلسنّت کی ستّر سے زیادہ صحیح اور غیر صحیح طریقہ سے نقل ہونے والی روایتیں ہیں (جن میں بیشتر (روایتیں بہ ظاہر اہلسنّت سے نقل ہوئی ہیں)اور ان سبھی میں کہا گیا ہے کہ یہ آیت "خمسہ طیّبہ"یا "پنجتن پاک" سے مخصوص ہے اور یہ جملۂ شریفہ تمام جملوں سے جدا اور مستقل طور پر خمسۂ طیبہ کی شان میں نازل ہوا ہے۔

اگر ہم اس بارے میں فریقین کے طریقہ سے نقل ہونے والی ستّر روایتوں پر اعتماد نہ کریں تو پھر کس چیز پر اعتماد کرینگے؟!اس بناء پر کسی بھی با انصاف محقق کیلئے کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ یہ آیت، خمسۂ طیبّہ کی شأن میں نازل ہوئی ہے اور ان کی مخصوص طہارت پر دلالت کرتی ہے جس کو ہم "عصمت"کہتے ہیں اور جو دلیل کے ذریعہ ثابت ہوتی ہے یعنی گناہان صغیرہ اور کبیرہ سے پاک ہونا اور یہ ارادۂ تکوینی الٰہی کا مقتضی ہے۔

خداوند عالم کے ارادۂ تکوینی کا مطلب یہ ہے کہ عصمت و طہارت یقیناً متحقق ہوگی اور ہوئی ہے البتہ اسکا مطلب جبر نہیں ہے اور ہم نے الٰہی ارادہ کی بحث میں یہ واضح کردیا ہے کہ خداوندعالم کا تکوینی ارادہ، چاہے وہ عالم میں پورا ہوچکا ہویا پورا ہونے والا ہو، فاعل مختار کے اختیار سے ہوچاہے نظام جبر کے تحت قدرتی کارندوں کے ذریعہ پورا ہو بہ ہر صورت پورا ہوتا ہے لیکن الٰہی ارادہ فاعل مختار کے ارادہ کے طول میںہے نہ کہ عرض میں ۔یہاں پر جب خدا فرماتا ہے کہ اہل بیت علیہم السلام کی طہارت یقینی اور خداوند عالم کے ارادۂ تکوینی کے تحت ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مجبور ہیںبلکہ ان کے لئے ضمانت لی گئی ہے کہ وہ خود اپنے اختیار سے گناہ نہیں کرتے اور وہ طاہر خلق ہوئے ہیں ۔

لیکن نبی کی ازواج کا واقعہ بھی دلچسپ ہے جن روایتوں کو اہلسنّت نے نقل کیا ہے ان میں قابل توجہ مطالب موجود ہیں مثال کے طورپر "تفسیر ثعلبی "میں عائشہ سے نقل ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تومیں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے سوال کیا : اَ انا مِنْ اَھلَ بَیْتِکَ ؟کیا میں آپ کے اہل بیت علیہم السلام میں سے ہوں ؟آنحضرت نے فرمایا:(تنحی انت علی خیر) نہیں ، الگ ہی رہو، ام سلمہ سے نقل ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تومیں نے عرض کی کیا میں آپ کے اہل بیت علیہم السلام میں سے ہوں تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا : (انت علی خیر) تم خیرپر ہو، لیکن یہ نہیں فرمایا کہ تم میرے اہل بیت علیہم السلام میں ہو ۔

ان روایتوں کو خود ازواج نے نقل کیا ہے کہ اس آیت میں ازواج نبی شامل نہیں ہیں لیکن دیگ سے زیادہ گرم چمچے پیدا ہوگئے اورکہتے ہیں کہ یہ آیت ازواج نبی کی شان میں نازل ہوئی ہے اور عصمت پر دلالت نہیں کرتی، خداوند عالم جو قابل ہدایت ہیں ان کی ہدایت فرمائے(انشاء اللہ)اور جو ہدایت کے قابل نہیںہیں مسلمانوں کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔

ادیان کا اشتراک اور امتیاز

قرآن کریم سے پتہ چلتاہے کہ نبوت کا سلسلہ اول سے لیکر آخر تک ایک ہی سلسلہ ہے اس لحاظ سے بھی کہ تمام انبیاء علیھم السلام کو خدائے وحدہ لاشریک نے ہی مبعوث کیاہے اور اس اعتبار سے بھی کہ تمام انبیاء علیھم السلام کی دعوت کی بنیاد بھی ایک ہی ہے ،نبوت کے پیغامات جن کو دین کہاجاتا ہے اسی اصول پر مبنی ہیں کہ خدائے وحدہ لاشریک کی ہی عبادت کرنی اور اسکی اطاعت کرنی چاہیئے دوسرے لفظوں میں انسان کو خدائے واحد کے حضور مطلق طورپر بغیر کسی قیدو شرط کے اپنے کو تسلیم کردینا چاہیئے۔

اسلام ،دعوت انبیاء علیھم السلام کی روح

ہم مندرجہ بالا مطلب کو مدّ نظر رکھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام آسمانی ادیان کی اساس و بنیاد ایک چیز سے زیادہ نہیں ہے اور وہ یہ کہ اپنے کو خداوندعالم کے سامنے تسلیم کردیں، دوسرے لفظو ں میں تمام آسمانی ادیان ایک ہی دین ہیں وروہ "اسلام" ہے ۔

البتّہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وحی کے مطالب میں جوتمام انبیاء علیھم السلام پر کسی بھی زمان و مکان میں نازل ہو ئے ہیں کسی طرح کاکوئی اختلاف نہیں پایا جاتا ،بلکہ بعض احکام کے جزئیات کامختلف زمانوں اور جگھوں یا مختلف اقوام کے اعتبار سے الگ ہونا ممکن ہے لیکن سب کی اساس و بنیاد ایک ہی ہے اوروہ خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت ہے۔

(اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ وَمَااخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوْاالْکِتَابَ اِلَّامِنْ بَعْدِ مَاجَائَ ھُمُ الْعِلْمُ بَغْیاًبَیْنَھُمْ وَمَنْ یَکْفُرْ بِآیَاتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِفَاِنْ حَآجُّوْکَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْھِیَ لِلّٰہِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُلْ لِلَّذِیْنَ اُوْتُوْاالْکِتَابَ وَالْاُمِّیِّیْنَ ئَ اَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اھْتَدَوْاوَاِنْ تَوَلَّوْافَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلاَ غُ وَاللّٰہُ بَصِیْرٌبِالْعِبَادِ)[1]

"دین، اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے اور اہل کتاب نے آپس میں اختلاف نہیں کیا مگر یہ کہ علم آنے کے بعد، صرف آپس کی شرارتوں کی بناء پر اور جو بھی آیات الٰہی کا انکار کرے (سن لے)کہ خدا بہت جلد حساب کرلینے والا ہے ۔(اے پیغمبر) اگر یہ لوگ آپ سے کٹ حجتی کریں تو کہہ دیجئے کہ میرا رخ تمام تر اللہ کی طرف ہے اور میرے پیرو بھی ایسے ہی ہیں اور پھر اہل کتاب اور جاہل مشرکین سے پوچھئے کیا تم بھی اسلام لے آئے ہو؟ اگر وہ اسلام لے آئے ہیں توگویا ہدایت پا گئے اور اگر منھ پھیر لیں تو آپ کا فرض صرف تبلیغ ہے اور بس اور اللہ اپنے بندوں کو خوب پہچانتا ہے"۔معلوم ہوا دعوت انبیاء علیہم السلام کی روح وجان یہی اسلام ہے قرآن کریم کی آیات سے بھی اس بات کا اثبات ہوتا ہے ۔خداوند عالم فرماتا ہے :

(وَمَنْ یَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ اِبْرَاھِیْمَ اِلَّا مَنْ سَفِہَ نَفْسَہُ وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَاوَ اِنَّہُ فِی الآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِیْنَ)[2]

"اور کون ہے جو ملت ابراہیم سے منھ موڑے مگر یہ کہ اپنے کو بیوقوف اور ناسمجھ ثابت کرے؟

اور ہم نے ابراہیم کو دنیا میں منتخب قرار دیا ہے اور وہ آخرت میں بھی نیکوکاروں میں ہیں"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا انتخاب اس طرح عمل میںآیاکہ:

(اِذْقَالَ لَہُ رَبُّہُ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰالَمِیْنَ)[3]

"جب ان سے ان کے پروردگار نے کہا کہ اپنے کو میرے حوالے کردو تو انھوں نے کہا کہ میں رب العالمین کے سامنے سراپا تسلیم ہوں"۔معلوم ہوا الٰہی انتخاب کا معیاریہی اسلام اور خود سپردگی ہے ۔صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کاہی دین اسلام نہیں تھا بلکہ آپ نے اپنے فرزند کو بھی اسی دین اسلام کی وصیّت فرمائی تھی:

(وَوَصَّیٰ بِھَا اِبْرَاھِیْمُ بَنِیْہِ)[4]

1۔آل عمران آیت 19۔20۔

2۔سورۂ بقرہ آیت130۔

3۔سورۂ بقرہ آیت 131۔

4۔سورۂ بقرہ آیت132۔

"اور اسی بات کی ابراہیم نے اپنی اولاد کو وصیت کی"۔

اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے فرزندوں کو اسی دین اسلام کے بارے میں وصیّت فرمائی تھی :

(یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّاوَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ)[1]

"اے میرے فرزند اللہ نے تمہارے لئے دین کو منتخب کردیا ہے اب اس وقت تک دنیا سے نہ جانا جب تک واقعی مسلمان نہ ہوجائو"۔

ایک اور آیت میں بھی حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے فرزندوں کو اسی دین اسلام کے بارے میں وصیّت فرمائی ہے:

(اَمْ کُنْتُمْ شُھَدَآئَ اِذْ حَضَرَیَعْقوبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِیْہِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِی قَالُوْانَعْبُدُ اِلٰھَکَ وَاِلٰہَ اٰبَائِ کَ اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰھاً وَاحِدًا وَنَحْنُ لَہُ مُسْلِمُوْنَ)[2]

"کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کا وقت موت آیا اور انھوں نے اپنی اولاد سے پوچھا کہ میرے بعد کس کی عبادت کرو گے تو انھوں نے کہا کہ آپ کے اور آپ کے آباء و اجداد ابرہیم و اسماعیل و اسحاق کے پروردگار، خدائے وحدہٗ لا شریک کی، اور ہم اس کے مسلمان اور اور سراپا تسلیم ہیں"۔

حقیقت اسلام وہی فرمان خدا کو قبول کرنا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کے تمام فرمان ہمیشہ یکساں رہے ہیں؟یا فرق کرتے رہے ہیں ؟ ایک الگ مسئلہ ہے یہاں تک کہ ایک ہی دین میں بھی احکام خدا کا ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ میں الگ ہونا ممکن ہے دین اسلام میں بھی شروع میں تمام مسلمان بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے اس وقت بھی یہی اسلام تھا اور جب خداوند عالم نے فرمایا کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھو تو بھی اسلام کا تقاضا تھا کہ اس دوسرے حکم کو قبول کریں۔

اگر ادیان سابق میں بھی اس طرح کی چیزیں تھیں یعنی ایک دین میں ایک چیز حلال تھی اور دوسرے دین میں حرام تو یہ بھی اسی طرح کا نسخ ہے جو بعض وقت ایک ہی دین میں واقع ہوتا ہے۔

اس بناپر کہہ سکتے ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی روح وجان یہی خداوندعالم کے سامنے تسلیم ہونا ہے

1۔ سورۂ بقرہ 133۔

2۔ سورۂ بقرہ آیت133۔

اور یہی وہ چیز ہے جسکا انسانی فطرت تقاضا کرتی ہے یعنی فطرت انسانی تقاضا کرتی ہے کہ اپنے اختیار سے خداوندعالم کے سامنے تسلیم ہوں، دین اسکے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

(فَأَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفاً فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَالنَّاسَ عَلَیْھَالَاتَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ)[1]

"آپ اپنا رخ کسی انحراف کے بغیر دین کی طرف رکھیں یہ دین وفطرت الٰہی کہ جس پر اس نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے اور خلقت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور یہی پائدار دین ہے"۔

اس آیت سے صاف طور پرپتہ چلتا ہے کہ انسانی فطرت تقاضا کرتی ہے کہ اللہ کی طرف جھکاؤاور خود کو اس کے مقابل تسلیم کردیں اور اسی سورہ میںایک دوسری جگہ پھر خداوند عالم فرماتا ہے:

(فَاَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنَ الْقَیِّمِ)[2]

"اور آپ اپنے رخ کو مستقیم اور مستحکم دین کی طرف رکھیں"۔

تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان ضروری ہے

ایک مسلمان کوتمام انبیاء علیہم السلام کے احکام و قوانین کا مطیع اور فرمانبردار ہونا چاہئے اوران میں سے کسی کے درمیان اور نیزان کی کتابوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرنا چاہئے اسلئے کہ وہ سب خداوندعالم کی طرف سے مبعوث کئے گئے ہیں اور جس شخص نے اپنے کو خداوندعالم کے سامنے تسلیم کردیا ہواس کو اس کی نازل کردہ چیز بھی قبول کرنا چاہئے اور اس بات کو قرآن کریم میں اس طرح بیان کیاگیا ہے کہ خداوند عالم نے انبیاء علیہم السلام سے بھی فرمایا اور عہد لیاہے کہ وہ ایک دوسرے کی تائید کریں اورہرنبی کو اپنے پہلے کے نبی پر ایمان رکھنا چاہیے مومنین کو بھی گزشتہ انبیاء علیہم السلام اور ان پر وحی کئے جانے والے تمام قوانین پر ایمان رکھنا چاہئے۔خداوند عالم فرماتا ہے:

(وَاِذْاَخَذَاللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیِّیْنَ لَمَآئَ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَحِکْمَةٍ ثُمَّ جَائَکُمْ رَسُوْلُ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَکُمْ لِتُؤْمِنُنَّ بِہِ وَلَتَنْصُرُنَّہُ قَالَ ئَ أَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلَیٰ ذٰلِکُمْ أِصْرِیْ قَالُواأَقْرَرْنَاقَالَ فَاشْھَدُوْا وَاَنَاْمَعَکُمْ مِنَ الشَّاھِدِیْنَ فَمَنَّ تَوَلَّیٰ بَعْدَ ذٰلِکَ فَأُولٰئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ)[3]

1۔سورئہ روم آیت30۔

2۔ سورئہ روم آیت 43۔

3۔ سورئہ آل عمران آیت 81و82۔

"اور جب خدانے تمام انبیاء سے عہدلیا کہ ہم تم کو جو کتاب و حکمت دے رہے ہیں اس کے بعد جب وہ رسول آجائے جو تمھاری کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے تو تم سب اس پر ایمان لے آنا اور اس کی مدد کرنا اور پھر پوچھا کیا تم ان باتوں کا اقرار کرتے ہو اور ہمارے عہد کو قبول کرتے ہو سب نے کہاہم اقرار کرتے ہیں۔ارشاد ہوا: بس تم سب گواہ رہنا اورمیں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔اس کے بعد جو انحراف کرے گا وہ فاسقین میں ہوگا"۔یہ دین خدا ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام کو عطا کیا گیا اور ان سب سے عہد لیا گیا ہے کہ اس سلسلہ کو قبول کریں اور ان کی تصدیق اور تائید کریں۔کسی مخصوص نبی کی اتباع کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک سلسلہ ہے جو سب کو ایک خداکی طرف دعوت دیتارہا ہے اسکے بعد خداوندعالم فرماتا ہے:

(اَفَغَيْرَدِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهُ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ طَوْعَاًوَكَرْهاًوَ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ)[1]

"کیا لوگ دین خدا کے علاوہ کچھ اور تلاش کر رہے ہیں جب کہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے سب اپنے اختیار سے یا غیر اختیاری طور پر اسی کی بارگاہ میں سر خم کئے ہوئے ہیں اور سب کو اسی کی بارگاہ میں واپس جانا ہے"۔

اس آیت کے بعد فرماتا ہے:

(قُلْ ئَ امَنَّا بِاللّٰهِ وَمَااُنْزِلَ عَلَيْنَاوَمَااُنْزِلَ عَلَىٰ اِ بْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَ سْبَاطِ وَمَااُوْتِيَ مُوْسىٰ وَعِيْسَىٰ وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّ بِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ)[2]

"ان سے کہہ دیجئے کہ ہمارا اللہ پر، اور اس پرجو ہم پر نازل ہوا ہے اور(اسی طرح) جو ابراہیم اسماعیل، اسحاق ،یعقوب اور اسباط پرنازل ہوا ہے اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور انبیاء کو خدا کی طرف سے دیا گیا ہے ان سب پر ہمارا ایمان ہے ہم انکے درمیان کوئی تفریق نہیں رکھتے اور ہم سب خدا کے اطاعت گذار بندے ہیں"۔

اور اسکے بعد خداوندعالم فرماتا ہے:

(وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَالْاِسْلَامِ دِيْناً فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَفِيْ الْأٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ)[3]

"اور جو اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین اختیار کرے گا وہ دین اس سے قبول نہ کیا جائیگا اور وہ قیامت کے دن خسارہ اٹھانے والوں میں ہوگا"۔دوسری آیتوںسے بھی ادیان اور انبیاء علیہم السلام کی ایک دوسرے سے وابستگی کا پتہ چلتا ہے ایک جگہ خدا

1۔ سورۂ آل عمران آیت83۔

2۔ سورۂ آل عمران آیت84۔

3۔ سورۂ آل عمران آیت85۔

فرماتا ہے :

(شَرَعَ لَکُم مِنَ الدِّ یْنَ مَاوَصَّیٰ بِهِ نُوحاًوَّالَّذِ یْ اَوْحَیْنَآاِلَیْکَ وَمَاوَصَّیْنَابِهِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسَیٰ وَعِیْسَیٰ اَنْ اَقِیْمُوْاالدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْافِیْهِ کَبُرَعَلَیٰ الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِ اَللّٰهُ یَجْتَبِیْ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَاءُ وَیَهْدِیْ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُوَمَاتَفَرَّقُوْا اِلَّامِنْ بَعْدِ مَاجَا ئَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیاًبَیْنَهُمْ) (1)

"اس نے آپ کے لئے وہ آئین بنایا ہے جس کی نوح کو نصیحت کی تھی اور جس کی (اے نبی) آپ کی طرف وحی کی ہے اور جس کی نصیحت ابراہیم ، موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی کی ہے کہ دین کو قائم کریں اور اس میں تفرقہ نہ پیدا ہونے پائے مشرکین کو وہ بات گراں گذرتی ہے جس کی آپ انھیں دعوت دے رہیں اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رسالت کے لئے چُن لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اس کی اپنی طرف ہدایت کردیتا ہے اور لوگوں نے آپس میں تفرقہ نہیں کیا مگر یہ کہ جب ان کو علم و دانش ہاتھ آگیا اور ایک دوسرے پر تسلط مل گیا"۔

اوراس کے بعد آخر میں خداوندعالم ارشاد فرماتا ہے :

(وَقُلْ ئَ اٰمَنْتُ بِمَآاَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ) (2)

"اور کہہ دیجئے کہ میرا ایمان ہر اس کتاب پر ہے جو خدا نے نازل کی ہے"۔

یعنی الٰہی کتابوںاور وحی کے مطالب میں کوئی تعارض اور ٹکراؤنہیں ہے سب ایک ہی راہ کی نشاندہی کرتے ہیں اور ایک ہی چیز کی دعوت دیتے ہیں اور تمام لوگوں کو انھیں قبول کرنا چاہیئے۔

خداوندعالم، متّقین کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے :

(وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآاُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآاُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ) (3)

"وہ لوگ ان تمام باتوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو (اے رسول) آپ پر نازل ہوئی ہیں اور جو آپ سے پہلے نازل کی گئی ہیں"۔

ایک اور آیت میں فرماتا ہے :

(قُوْلُوْائَ اٰمَنَّابِاللّٰہِ وَمَآاُنْزِلَ اِلَیْنَاوَمَآاُنْزِلَ اِلَیٰ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَااُوْتِیَ مُوْسَیٰ وَعِیْسَیٰ وَمَآاُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّ بِّهِمْ لَاْنُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ

1۔ سورۂ شوریٰ آیت۔3ا۔14۔

2۔ سورۂ شوریٰ آیت 15۔

3۔ سورۂ بقرہ آیت4۔

مُسْلِمُوْنَفَاِنْ ئَ امَنُوْابِمِثْلِ مَآئَ امَنْتُمْ بِهِ فَقَدِاهْتَدَوْاوَاِنْ تَوَلَّوْافَاِنَّمَاهُمْ فِیْ شِقَاقٍ فَسَیَکْفِیْکَهُمُ اللّٰہُ وَھُوَالسَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ)[1]

"اور (مسلمانو) تم ان سے کہو کہ ہم اللہ پر اور جو اس نے ہماری طرف بھیجا ہے اور جو ابراہیم ، اسماعیل ، اسحٰق ، یعقوب ، اولادِ یعقوب کی طرف نازل کیا ہے اور جو موسیٰ ، عیسیٰ اور انبیاء کو پروردگار کی طرف سے دیا گیا ہے ان سب پر ایمان لے آئے ہیں ہم پیغمبروں میں تفریق نہیں کرتے اور ہم سب خدا کے سچے مسلمان ہیں ۔ اب اگر یہ لوگ بھی ان سب پر تمہاری طرح ایمان لے آئیں تو ہدایت یافتہ ہو جائیں گے لیکن اگر منھ موڑلیں تو یہ صرف تمہاری ہی مخالفت ہے پس اُن کے خلاف تمہارے لئے خدا کافی ہے وہ بڑا سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی"۔

(اٰ مَنَ الرَّ سُوْلُ بِمَااُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهِ وَالْمُوْ مِنُوْنَ کُلّ اٰمَنَ بِ اللّٰہِ وَمَلٰئِکَتِهِ وَکُتُبِهِ وَرُسُلِهِ)

"رسول خود بھی ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتا ہے جو کچھ اُن پر ان کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور تمام مومنین بھی اللہ، اس کے ملائکہ اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں" ۔

(یٰاَیُّهَاالَّذِیْن ئَ امَنُوْا ئَ امِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِهِ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهِ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ)[2]

"اے ایمان والو خدا اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول (محمد) پر نازل کی ہے اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے نازل کی ہے ایمان لاؤ"۔

بنابرین، جو لوگ اس طرح کا ایمان نہیں رکھتے اور مطلق طور پر کسی قید وشرط کے بغیر خدا کے سامنے تسلیم نہیں ہوسکتے ان کا ایمان قابل قبول نہیں ہوگا ۔

ہم نے اس سے پہلے توحید کی بحث میں کہا تھا کہ ایک خدا پرست مومن کے لئے اس بات پر ایمان ضروری ہے کہ پوری کائنات کا خالق ایک ہی ہے (خالقیت میں توحید) اور وہی پوری کائنات کے تخلیقی نظام اور شرعی نظام کا پروردگار بھی ہے (ربوبیت میں توحید)؛ اب اگر کوئی توحید خالقیت پر ایمان رکھتا ہو اور ربوبیت میں توحید کا انکار کرے تو گویا وہ اصل توحید کا ہی منکر ہے ۔ مومن کا ان دونوں پر ایمان ضروری ہے اور تجزیہ کریں تو اسی حقیقت کا پتہ چلے گا توحید، خدا کے سامنے خود کو تسلیم کردینے کا نام ہے "ایمان باللہ "کی توضیح کریںتو یہ تمام مطالب

1۔ سورۂ بقرہ آیت 136و137۔

2۔ سورۂ نساء آیت 136۔

سامنے آتے ہیں ورنہ ہم نے عرض کیا تھا کہ شیطان خدا پر ایمان کے با وجود تمام کفار و مشرکین سے بد تر تھا کیوں اس کا ایمان مطلق نہیں تھا ایسا نہیں ہے کہ ایمان کے متعلقات ایمان کے مدارج طے کرتے ہوں یعنی جو خدا کی خالقیت مانتا ہو اس نے ایک حد تک سعادت پا لی ہو جی نہیں، وہ ایمان کے کسی درجہ پر نہیں ہے اس کا ایمان زیرو ہے خدا وند عالم ارشاد فرماتا ہے:

(اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُ وْنَ بِ اللہ وَرُسُلِہِ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْابَیْنَ اللہ وَرُسُلِہِ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَکْفُرُ بِبَعْضٍ)[1]

"بیشک کچھ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کا انکار کرتے ہیں اور خدا اور رسول کے درمیان جدائی ڈالنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائیں گے اور بعض کو نہیںمانیں گے"۔

(وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَتَّخِذُوا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلاً)[2]

"اور وہ چاہتے ہیں کہ ایمان و کفر کے درمیان، کوئی نیا راستہ نکال لیں"۔

(اُولٰئِکَ ھُمُ الْکَافِرُوْنَ حَقًّاوَاَعْتَدْنَالِلْکَافِرِیْنَ عَذَ اباًمُّھِیْناً)[3]

"اس طرح کے لوگ در حقیقت کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے بڑا رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

(وَالَّذِینَ ئَ اٰمَنُوابِاللہ وَرُسُلِہِ وَلَمْ یُفَرِّقُوا بَیْنَ اَحَدٍ مِنْھُمْ اُولٰئِکَ سَوْفَ یُؤتِیْھِمْ اُجُوْرَھُمْ وَکَانَ اللہ غَفُوراًرَّحِیْماً)[4]

"اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے ہیں اور اس کے رسولوں کے درمیان جدائی کے قائل نہیں ہیںخدا عنقریب انھیں ان کا اجر عطا کرے گا اور وہ بہت زیادہ بخشنے والا اور مہربانی کرنے والا ہے"۔

معلوم ہوا جس طرح مقام توحید میں اُس کے تمام ضروری مراتب کا تسلیم کرنا ،ضروری ہے نبوت میںبھی جو کچھ اللہ کی طرف سے نازل ہو ان سب کا قبول کرنا ضروری ہے، اس لئے کہ بعض کا انکار گویا کل کا انکار ہے اور جن لوگوں نے خدا وند عالم کے تمام احکام کو قبول نہیں کیا خدا وند عالم نے ان کی سرزنش کی ہے:

1۔ سورۂ نساء آیت149۔

2۔ سورۂ نساء آیت150۔

3۔ سورۂ نساء آیت 151۔

4۔ سورۂ نساء آیت 152۔

(قُلْ يَااَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُونَ مِنَّااِلَّااَنْ ئَ امَنَّابِاللّٰهِ وَمَآاُنْزِلَ اِلَيْنَاوَمَآاُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ)[1]

"(پیغمبر آپ) کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب کیا تم ہم سے صرف اس بات پر ناراض ہو کہ ہم اللہ اور اس نے جو کچھ ہم پر یا ہم سے پہلے نازل کیا ہے ان سب پر ایمان لائے ہیں اور تمہاری (تو) اکثریت فاسق اور نافرمان ہے"۔

قرآن نے اسی پر اکتفاء نہیں کی ہے ،بلکہ جو لوگ دین میں یا اس کی کتابوں اور رسولوں کے درمیان جدائی کے قائل ہوئے ہیں انہیں مشرکین میں شمار کیا ہے :

(وَلَاتَكُوْنُوْامِنَ الْمُشْرِكِيْنَ)[2]

"اور خبردار مشرکین میں نہ ہوجانا"۔

اس کے بعد تفسیر و تشریح کرتا ہے:

(مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوا دِيْنَهُمْ وَكَانُواشِيَعاًكُلُّ حِزْبٍ بِمَالَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ)[3]

"وہ لوگ کہ جنھوں نے دین میں تفرقہ پیدا کیا ہے اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں پھر ہر گروہ جو کچھ اس کے پاس ہے اسی میں مست اور مگن ہے"۔

یہ بھی ایک قسم کا شرک ہی ہے کہ انسان دین کے بعض احکام کو تو قبول کرتا ہو اور بعض احکام کا انکار کردے، اس نے بعض احکام کو کس اساس و بنیاد پر ترک کیا ہے ؟اگر بعض احکام کو قبول کرنا اللہ کی تشریعی ربوبیت پر ایمان رکھنا ہے تو بعض احکام کا انکار اور ان کی جگہ کسی دوسری چیز کے تسلیم کرنے کا مطلب کسی دوسرے کو معبود تسلیم کرلینا ہے ۔ پس جو لوگ دین میں تفرقہ اندازی کے قائل ہیں وہ گویا حقیقت میں مشرک ہیں ۔

(وَ اَنَّ هَذَاصِرَاطِیْ مُسْتَقِيْماً فَاتَّبِعُوْهُ)[4]

"اور یہ ہمارا سیدھا راستہ ہے اس کا اتباع کرو ۔۔۔"۔

1۔ سورۂ مائدہ آیت59۔

2۔ سورۂ روم آیت 31۔

3۔ سورۂ روم آیت 32۔

4۔ سورۂ انعام آیت153۔

ایک دوسرے مقام پر خدائے یکتا ویگانہ کی پرستش کو"سیدھا راستہ"کہا گیا ہے۔

(وَاَنِ اعْبُدُونِیْ هٰذٰا صِرٰاط مُسْتَقِیْم)[1]

"اور میری ہی عبادت کرنا یہی صراط مستقیم اورسیدھا راستہ ہے"۔

(وَلَا تَّتبِعُّواالسُبُلَ فَتفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهِ)

"اور مختلف راستوں پر نہ چلوکیونکہ اس طرح راہ خداسے بھٹک کر بکھر جاؤ گے"۔

(ذٰلِکُم وَصَّکُمْ بِهِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُونَ)[2]

"اس لئے پروردگار نے ہدایت کی ہے کہ تم اس طرح شاید متقی اورپرہیزگار بن جاؤ"

یہاں سے ہم پر اُس آیت کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ جس میں خدوند عالم فرماتا ہے:

(وَاعْتَصِمُوْابِحَبْلِ اللہ جَمِیْعاً وَلَا تَفرَّقُوْا)[3]

"اور اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑے رہو اور آپس میں تفرقہ نہ پیدا کرو"۔

یہاں پر تفرقہ سے مراد اللہ کے دین اور اللہ کی راہ سے تفرقہ کرنا ہے۔خدا کے راستے سے منحرف نہ ہونا اس لئے کہ یہ اختلاف اور جدائی کا باعث ہے۔تمہاری وحدت اور یکجہتی کا وسیلہ یہی ہے کہ تم سب کے سب خدا کی راہ میں، ایک راستہ اور ایک مقصد کی طرف حرکت کرو۔دوسرے وسائل تمہارے متفرق ہونے کا باعث نہ بنیں۔

(اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَکَانُواشِیَعاً لَسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْ ءٍ)[4]

"جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کیا اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے ان سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے"۔

اس بنا پر اسلام کا تقاضا ہے کہ جو کچھ بھی خدا نے بھیجا ہے کسی بھی دور میں کسی بھی نبی پر کیوں نہ بھیجا ہو ان کو تسلیم کیا جائے ۔یہ بات اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں کوئی تناقض و تضاد نہیں پایا جاتا ، اس لئے کہ اگر ان میں تضاد ہوتا اور ایک کا قبول کرنا دوسرے کے قبول نہ کرنے کا سبب بنتا تو انسان کے لئے ہر ایک

1۔سورۂ یس آیت61۔

2۔سورۂ انعام آیت153۔

3۔سورۂ آل عمران آیت 103۔

4۔سورۂ انعام آیت 159۔

کا قبول کرنا ممکن نہیں تھا جب ہم خدا کی نازل کی ہوئی تمام چیزوں کو قبول کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اگر جزئی احکام میں بعض اختلاف ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حکم اُس زمانہ تک معتبر تھا یا کسی خاص شخص اورگروہ کے لئے خداوند عالم کی طرف سے ایک مخصوص حکم یا دستور آیا تھا اور دوسرے افراد بھی ان قوانین کا ان کے لئے صحیح اور بجا ہونا قبول کرتے ہیں ۔ تورات پر ایمان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم اس زمانہ میں بھی تورات کے حکم پر عمل کریں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بنی اسرائیل اور اُن کے زمانہ سے مخصوص تھا اور توریت میں بغیر کسی تحریف کے آیا ہے اس کو صحیح اور حق سمجھیں لیکن اس زمانہ میں خداوند عالم کے قوانین پر عمل کرنے کے متعلق ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس دور میں خداوندعالم ہم سے کیا چاہتا ہے ۔

پس کسی پیغمبر پر ایمان لانا تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان رکھنے کا بھی متقاضی ہے ، کیونکہ سب کا ایک ہی راستہ ہے ۔

اگر حقیقت میں کوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان رکھتا ہے تو اس کو تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا چاہئے ۔ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد آنے والے نبی کی لوگوں کو بشارت نہیں دی تھی ؟ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضرت محمد ﷺ کے آنے کی بشارت نہیں دی تھی ؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر تو ایمان رکھتا ہو لیکن جس نبی کا خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام تعارف کرائیں ان پر ایمان نہ لائے یہ انکار، حقیقت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا انکار ہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ جنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو قبول کیا ہے اور ان کے دین پر عمل کرتے ہیں حقیقت میں وہ مومن ہیں یا یہ کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ پیغمبر وہی پیغمبر ہے کہ جس کے آنے کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی تھی اور ان پر ایمان لانے کی سفارش کی تھی اور یہ ان کے مومن ہونے کے لئے کافی ہے ۔

بلکہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا اس کی بنیاد پر جو لوگ اس زمانہ میں اپنے کو کسی گزشتہ نبی کا پیرو سمجھتے ہیں اگر ان پر حجت تمام ہو گئی ہو اور حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ کی نبوت ان کے لئے ثابت ہو تو ان کا خود اپنے نبی پر ایمان لانا تقاضا کرتا ہے کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ پر بھی ایمان لائیں، آج کے دور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیرو حقیقی یہودی وہی ہے جو مسلمان ہو، اس لئے کہ یہودیت کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے اس کو تسلیم کریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں تو ان کی مدد کرنا اور ان کی دعوت پر لبیک کہنا ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا :

(وَ مُبَشِّراً بِرَسُوْ لٍ یَا تِیْ مِنْ بَعْدِیْ اِسْمُهُ اَحْمَد)

پس حقیقی نصرانی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کرنے والا وہ ہی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوت کو تسلیم کرتا ہو۔

کوئی فرق نہیں ہے چاہے یہودی ہو، نصرانی ہو یا مسلمان سب کو اسلام اور خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ حقیقی یہودی وہی ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان رکھتا ہو، اور حقیقی مسلمان وہی ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اقرار کرتا ہو لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس دور میں جو چاہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تابع ہو جائے اور جو چاہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تابع ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیرو وہ ہے جو حقیقت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوت اگر اس کے لئے ثابت ہو گئی ہو تو اس پر ایمان رکھتا ہو۔ ورنہ اس نے حضرت موسیٰ کی نبوت کے بعض حصہ کو قبول نہیں کیا ہے، اور جب ایک حصہ کو قبول نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے پوری نبوتِ موسیٰ علیہ السلام کو تسلیم نہیں کیا ہے، اس لئے ہم عرض کر چکے ہیں کہ کسی چون و چرا اور کسی قید و شرط کے بغیر قبول کرنا چاہئے۔ اگر ایسا ہو تو پھر کوئی اختلاف ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ حضرت موسیٰ پیغمبر ہیں اور جب تک آپ کی نبوت کے لئے کوئی ناسخ نہ آجائے اس وقت تک آپ کے لائے ہوئے احکام کی اطاعت واجب ہے۔ اگر ہم بھی اس زمانہ میں ہوتے تو تورات کے قوانین پر عمل کرتے۔ بعد کے زمانہ میں اگر بعض احکام تبدیل ہو چکے ہوں تو جدید احکام پر ہی عمل کرنا چاہئے ویسے ہی کہ جیسے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہو کہ اب اس کے بعد اس طرح عمل کرنا۔

پس معلوم ہوا کہ دین ایک ہے اور دین کے کچھ احکام میں جزئی قسم کا اختلاف دین کو دو نہیں کر دیتا، ہمیشہ سے یہی دین تھا اور ہمیشہ یہی دین رہے گا۔

ادیان کے اختلاف کی وجہیں

ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ ادیا ن الٰہی کے در میان بعض احکام میں جزئی اختلافات پا ئے جا تے ہیں لیکن تمام ادیان کی اساس و بنیاد ایک ہی ہے ، اور سب کو ایک ہی دین شمار کیا جا سکتا ہے پھر بھی کچھ ایسے اسباب پیش آئے جس کے تحت بنیادی طور پر ایک دین دو سرے دین کا مخا لف نظر آنے لگا ہم یہاں اس طرح کے بعض اسباب و عوا مل بیا ن کر رہے ہیں:

1۔بغا وت و سر کشی

قر آن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ اختلافات نا حق قسم کی دین سے بغا وت ا ور سر کشی اور ایک دوسرے پر تسلط کی ہوس سے وجود میں آئے ہیں ۔متعدد آیات میں اس بات کی تا کید ہے کہ ادیان کے ما بین اختلافات نہ جہالت کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں اور نہ ہی اس وجہ سے ہیں کہ ان کے درمیان حقیقت میں اختلافات موجود تھے بلکہ یہ اختلافات علما ئے اہل کتاب کی سر کشی اور نفسانی خو اہشات کی وجہ سے پیدا ہو ئے ہیں ، انھوں نے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی وجہ سے یہ اختلافات ایجا د کئے ہیں ۔آ ئیے اس موضوع سے متعلق آیات کا جا ئزہ لیتے ہیں :

(وَمَااخْتَلَفَ فيهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَاجَاۗئَ تْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاًبَيْنَهُمْ)[1]

"اس میں کسی نے اختلاف نہیں کیا سوائے ان لوگوں کے کہ جن کے درمیان کتاب نازل ہوئی ہے اور جن پر دلیلیں واضح ہوچکی تھیں،صرف آپس میں بغاوت اور تعدی کی بناء پر اختلاف کربیٹھے"۔

(وَمَااخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوتُواالكِتٰبَ اِلَّامِنْ بَعْدِ مَا جَاۗئَ هُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاًبَيْنَهُمْ)[2]

"اہل کتاب نے محض علم ملنے کے بعد تسلط کی ہوس میں،آیک دوسرے سے اختلاف کیا ہے"۔

(وَئَ اتَيْنٰهُمْ بَيِّنَاتٍ مِنَ الْاَمْرِ فَمَااخْتَلَفُوْااِلَّامِنْ بَعْدِمَاجَاۗئَ هُمُ الْعِلْمُ بَغْياً بَيْنَهُمْ)[3]

"اور انھیں اپنے امر کی کھلی ہوئی نشانیاں عطا کردیں پھر ان لوگوں نے اختلاف نہیں کیا مگر یہ کہ جب علم مل گیا آپس میں ایک دوسرے پر تسلط کی غرض سے اختلاف کربیٹھے"۔

(وَمَاتَفَرَّقُوْااِلَّامِنْ بَعَدَمَاجَاۗئَ هُمُ العِلمُ بَغياًبَينَهُمْ)[4]

" اور ان لوگو ں نے آپس میں تفرقہ اسی وقت پیدا کیا ہے جب ان کے پاس علم آچکا تھا اور یہ صرف تسلط پسندی کی وجہ سے تھا"۔

(وَمَاتَفرَّقَ الَّذِيْنَ اُوتُوْاالكِتٰبَ اِلَّامِنْ بَعْدِمَاجَاۗئَ تْهُمُ البَيِّنَةُ)[5]

''اور یہ اہل کتاب متفرق نہیں ہوئے مگر اس وقت جب ان کے پاس کھلی ہوئی دلیل آگئی"۔

پس امتوں پر خدا کی حجت تمام ہے، اس نے ایک ہی دین اور ایک ہی راستہ تمام امتو ں کیلئے معین فرمایا اوریکے

1۔ سورۂ بقرہ آیت213۔

2۔ سورۂ آل عمران آیت19۔

3۔ سورۂ جاثیہ آیت17۔

4۔ سورۂ شوریٰ آیت14۔

5۔ سورہ بینہ آیت 4۔

بعد دیگرے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ بھیج دیا (ثُمَّ اَرْسَلْنَارُسُلُنَا تَتْرٰیٰ) اور وہ سب ایک ہی راستہ ، اور ایک ہی دین کی دعوت دیا کرتے تھے خدا اور اس کے نبیوں کی جانب سے کوئی اختلاف نہیں تھا اور لوگوں پر حجتیں بھی تمام کی جا چکی تھیں مگر یہ اختلافات خود امتوں خاص طور سے علمائے اہل کتاب کی سرکشی کی بناء پر وجود میں آگئے ۔

اس بات کو پیش نظر رکھیں تو بعض آیات سے جو شبہہ پیدا ہوتا ہے اس کا جواب معلوم ہو جاتا ہے ۔

مثال کے طور پر ایک آیت میں ارشاد ہوتا ہے :

(اِنَّ الَّذِیْنَ ئَ اٰمَنُوْاوَالَّذینَ ھَادُوْاوَالصَّٰبِئُوْنَ والنَّصٰرَیٰ مَنْ ئَ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالیَوْمِ الآخِرِوَعَمِلَ صَالِحاًفَلَاخوف عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ)[1]

"بیشک جو لوگ ایمان لائے یا جو لوگ یہودی ، ستارہ پرست اور عیسائی بن گئے ہیں ان میں جو بھی اللہ اور آخرت پر واقعی ایمان لائے گا اور عمل صالح کرے گا اس کے لئے نہ خوف ہے اور نہ اُسے حزن ہوگا "۔

اس آیت سے بعض لوگوں کو شبہہ ہوا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم اِس زمانہ میں بھی مختلف ادیان کو قبول کرلے گا ، اور اس زمانہ میں بھی کسی کے یہودی یا نصرانی ہونے اور اپنے دین پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے ۔

جو باتیں ہم نے عرض کی ہیں انکے پیش نظر اگر کسی شخص کے لئے بعد کے دین کا صحیح ہونا ثابت ہو جائے (البتہ اگر ثابت نہ ہو تو وہ "مستضعف "ہے اور یہ ایک دوسری بات ہے)اور اسکے باوجود وہ پہلے دین کو اختیار کئے رہے تو کسی صورت میں بھی یہ دین قبول نہیں کیا جائے گا : (فَلَنْ یُقْبَلَ منہُ) کیونکہ وہ خود جانتا تھا کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے کہ اس دین کی پیروی کرو اور اس نے پیروی نہیں کی اسکا انکار کیا اور کسی ایک نبی کا انکار کرنا گویا تمام انبیاء علیہم السلام کا انکار کرنا ہے۔ لہٰذا اسکا کوئی مطلب نہیں ہوگا کہ اسلام جو فرماتا ہے تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان ضروری ہے، اگر تم نے ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کیا تو گویا تمام انبیاء علیہم السلام کا انکار کیا ہے اسکے باوجود اسکی نظر میں اسلام کے آنے کے بعد بھی اگر کوئی یہودی اپنے دین پر عمل کرے تو اسمیں کوئی حرج نہ ہو یہ تناقض ہے اور معقول نہیں ہے کہ اسلام آئین یہودیت اور نصرانیت پر عمل کرنے کی اس دور میں بھی اجازت دیدے ہاں اگر کسی نے خود اپنے زمانہ کے دین پر عمل کیا ہے تو اُسکا اجر محفوظ ہے اگر کہیں اس زمانہ میں بھی مستضعف افراد ہوں اور جس حد تک انکے لئے حجت تمام ہو چکی ہے اس پر عمل پیرا ہوں تو وہ مستضعفین کا حکم رکھتے ہیں اور بقیہ احکام اور

1۔ سورۂ مائدہ آیت69۔

فرائض دینیہ انکے لئے ثابت نہیں ہیں لیکن اگر کسی کے لئے ثابت ہوجائے یا اس نے دین کی معرفت اور تلاش میں واقعی طور پر کوتاہی کی ہو تو اس صورت میں اگر وہ دین سابق کے تمام دستورات پر مو بہ مو عمل کرے تو بھی اسکا عذر قبول نہیں کیا جائگا ۔"فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْہُ"۔

(اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْاوَالَّذِيْنَ هَادُوْاوَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْااِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْد)[1]

"بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے یہودیت اختیار کی یا ستارہ پرست ہو گئے یا نصرانی اور آتش پرست ہو گئے یا مشرک ہو گئے ہیں خدا قیامت کے دن ان سب کے درمیان یقینی فیصلہ کردے گا کہ اللہ ہر شئ کا نگراں اور گواہ ہے"۔

ظاہر ہے کہ یہ آیت ان تمام گروہوں کی تائیدمیں نہیں آئی ہے بلکہ یوم حساب سے خبردار کررہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جن لوگوں میں یہ اختلافات پائے جاتے ہیں اور وہ حق کو قبول کرنا نہیں چاہتے ایک دن خداوند ان کا فیصلہ کرے گا اور ہرایک کو (اس کے اعمال کے مطابق) جزاء یا سزاء دے گا ۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا ان کی تائید کر رہا ہے چونکہ اس میں "الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا"بھی موجود ہے حالانکہ قرآن کا صاف اعلان ہے (اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ)"اور شرک کرنے والوں کو نہیں بخشے گا"۔

پس واضح ہے کہ یہ آیت مقامِ تائیدمیں نہیں ہے ماقبل آیت میں بھی خدا نے کہاہے مومنین ،یہود، نصاریٰ ستارہ پرست اگر صرف اپنے با ایمان ہونے کا دعویٰ کریں یا اپنے کو یہودی یا نصرانی کہلائیں تو یہ کوئی میزان و معیار نہیں ہے بلکہ معیار یہ ہے کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہوںاور اس کے قوانین و احکام پر عمل پیرا ہوں، اب ان کا نام کچھ بھی ہو لیکن اللہ پر ایمان کا لازمہ یہ ہے کہ اس کی نازل کی ہوئی تمام چیزوں پرایمان ہو اور اگرخدا کی نازل کردہ چیزوں پر ایمان نہ ہو توخدا اور اسکی آیات کا انکار کفرہے۔

پس اگر اس آیت میں اپنی جگہ فرض کرلیں کہ کچھ ابہام پایا جاتا ہے تو بھی اس سے پہلے کی آیت کی روشنی میں ختم ہو جاتا ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت متشابہات میں سے ہے اور وہ آیت محکمات میں سے ہے جو اس شبہہ کو دور کرتی ہے حالانکہ اگر ہم خود آیت پر غور و فکر کریں تو اس مطلب کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ آیت اس بات کو بیان کر رہی ہے کہ یہ تمام عناوین اور گروہ بندیاں سعادت اور شقاوت (بد بختی)کا معیار نہیں ہیں۔ خدا ناموں کو

1۔ سورہ حج آیت 17۔

نہیں دیکھتا بلکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ کیا یہ شخص خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اور کیا اس نے عملِ صالح انجام دیا ہے یا نہیں ۔

سوال یہ ہے کہ عملِ صالح کس کو کہتے ہیں ؟ عملِ صالح اس عمل کو کہتے ہیںکہ جس کا خدا نے حکم دیا ہو ۔ اب اگر خداوند عالم اپنے کسی بندہ کو ایک کام انجام دینے کا حکم دے اور وہ اس کی مخالفت کرے تو کیا یہ مخالفت عملِ صالح ہے؟! عمل صالح کے تحت جس شخص کیلئے حجت تمام ہوچکی ہوچا ہے وہ کسی بھی زمانہ میں ہوئی ہو، اسے خداوند عالم کے دستور کے مطابق عمل انجام دینا چاہیئے ۔

اس بات کے قطع نظر ہم قرآنِ کریم میں دیکھتے ہیں کہ خداوند عالم نے صرف مشرکین اور انہی ادیان کے منکرین سے ہی جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ خدا تو اہلِ کتاب کی نسبت بھی فرماتا ہے "ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ دین حق کو قبول کرلیں یا جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں اگر وہ جزیہ دیں تو تم ان کو قتل نہ کرنا" یعنی ظاہری طورپروہ تمہارے سامنے سرِ تسلیم خم کردینگے اور اسلامی ملک میں زندگی بسر کرینگے لیکن یہ ان کی سعادت کی ضمانت نہیں ہے ۔ اب اگر ان کا دین حق ہے اوراسلام اسکی تائید کرتا ہے تو پھر خدا نے ان سے جنگ کرنے کا حکم کیونصادر فرمایا ہے ؟:

(قَاتِلُوْاالَّـذِيْنَ لَايُؤْمِنُـوْنَ بِـاللهِ وَلَابِالْيَـوْ مِ الْآخِرِوَلَايُحَرِّمُـوْنَ مَـاحَرَّمَ اللهُ وَرَسُـوْلُهُ وَلَايَـدِيْنُوْنَ دِيْـنَ الْحَـقِّ مِـنَ الَّـذِيْنَ أُوْتُوْاالْكِتَا بَ حَتَّىٰ يُعْطُوْاالْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُوْنَ)[1]

"اہل کتاب میں سے جو لوگ خدا اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جس چیز کو خدا اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں سمجھتے اوردین حق کو قبول نہیں کرتے ان سے جنگ کرویہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ذلت کے ساتھ تمہیں جزیہ ادا کرنے پر آمادہ ہو جائیں"۔

البتہ شیعی روایات مینہم دیکھتے ہیں کہ یہ حکم اُسی زمانہ سے مخصوص تھا اورآخری حکم جو حضرت امامِ زمانہ کے ذریعہ جاری ہوگا وہ یہ ہے کہ حضرت کے ظہور کے زمانہ میں ان (اہل کتاب) سے جزیہ بھی قبول نہیں کیا جائیگا بلکہ جو معاملہ تمام کافروں کے ساتھ ہوگا وہی معاملہ ان کے ساتھ بھی ہوگا ۔

بہرحال اس بات میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیئے کہ قرآن کی نظرمیں عصر حاضر کے تمام ادیان قابل قبول نہیں ہیں اس لئے کہ اگر دین، دین حق ہے تو تمام انبیاء علیہم السلام کو قبول کرے گا اور کسی بھی نبی اور کتاب کے بارے میں فرق کا قائل نہیں ہوگا ۔

1۔ سورۂ توبہ آیت 29۔

2۔ تحریف

آج الٰہی ادیان میںبہت سی باتیں تحریف کر دی گئی ہیں ۔ قرآنِ کریم نے یہ بات صراحت کے ساتھ بیان کی ہے کہ علمائے اہل کتاب بہت سی باتیں اپنی طرف سے گڑھ لیتے اور ان کو خدا کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے یہاں تک کہ کچھ مطالب لکھ کر کہدیا کرتے تھے کہ یہ کتابِ خدا ہے۔ تاریخی طور پر بھی یہ بات مکمل طور سے ثابت ہے کہ گزشتہ تمام ادیان تحریف کی نظر ہو چکے ہیں اور بنیادی طور پر اگر کوئی ان ادیان کی موجودہ کتابوں کا مطالعہ کرے تو اس کو ان کتابوں میں بہت سی متضاد باتیں مل جائینگی اور چونکہ ہم اس وقت تاریخی اسناد کی تحقیق نہیںکر رہے ہیں لہٰذا اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اس سلسلہ میں لکھی جانے والی متعدد کتابوں کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں[1] خود قرآن کریم کی آیات بھی اس بات کی شاہد ہیں کہ اہل کتاب تحریف سے کام لیتے تھے۔

(فَوَیْل لِلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتَابَ بِاَیْدِیْهِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَامِنْ عِنْدِاللهِ لِیَشْتَرُوْابِهِ ثَمَناً قَلِیْلاً فَوَیْل لَهُمْ مِمَّاکَتَبَتْ اَیْدِیْهِمْ وَوَیْل لَهُمْ مِمَّایَکْسِبُوْنَ)

"پس وائے ہو ان لوگوں پر جو اپنے سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کے یہاںسے (آئی) ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے تھوڑا فائدہ حاصل کرلیں پس تف ہے اس پر جو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے اور پھر تف ہے اس کمائی پر جو انھوں نے کمائی ہے"۔

ظاہر ہے کہ اس کام میں ان کے مادی مفادات تھے ۔ احتمال ہے کہ کچھ ایسے حُکّام تھے جو اپنے اغراض و مقاصد کے تحت علمائے اہلِ کتاب کو رقم دیا کرتے تھے کہ وہ وحی کے عنوان سے کچھ مطالب لکھیں اور لوگوں کے سامنے پیش کریں :

(وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِیْقاً یَلْوُوْنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْکِتَابِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْکِتَابِ وَمَاهُوَمِنَ الْکِتَابِ وَیَقُوْلُوْنَ هُوَمِنْ عِنْدِاللهِ وَمَاهُوَمِنْ عِنْدِاللهِ وَیَقُوْلُوْنَ عَلَی اللهِ الْکَذِبَ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ)[2]

"ان ہی یہودیوں میں بعض وہ ہیں جو کتاب خدا کے انداز میں باتیں کرتے ہیں تاکہ لوگ خیال کریں کہ ان کی باتیںکتاب خدا کی باتیںہیںحالانکہ وہ خدا کی کتاب نہیں ہے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب اللہ کی طرف سے

1۔ نمونہ کے طور پر ملاحظہ فرمائیں الھدیٰ الیٰ دین المصطفیٰ، شیخ جواد بلاغی ۔

2۔ سورئہ آل عمران آیت 78۔

ہے حالانکہ اللہ کی طرف سے ہرگز نہیں ہے اور خود جانتے ہیں کہ وہ خدا کے خلاف جھوٹ باندھ رہے ہیں"۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

(اَ فَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُوْمِنُوْا لَکُمْ وَقَدْکَانَ فَرِیْق مِّنْھُمْ یَسْمَعُوْنَ کَلاَ مَ اللہ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَہٗ مِنْ بَعْدِ مَاعَقَلُوْہُ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ)[1]

" کیا تمھیں امید ہے کہ یہ یہودی تم پر ایمان لے آئیں گے جب کہ ان کا ایک گروہ کلامِ خدا کو سن کر تحریف کر دیتا تھا حالانکہ سب سمجھتے بھی تھے اور جانتے بھی تھے"۔

اس تحریف میں تحریف لفظی اور تحریفِ معنوی دونوں ہی کا امکان پایا جاتا ہے یعنی ممکن ہے وہ حتی کلام کی لفظیں تو یاد رکھتے ہوں لیکن اس کلام کی تفسیر بالرّائے کرتے ہوں اور معانی بدل کر کلام پر حمل کرتے ہوں لیکن دوسری آیات میں آیا ہے کہ وہ لفظوں میں بھی ردّو بدل کیا کرتے تھے۔

معلوم ہوا قرآن کی رو سے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں ایسے جعلی اور تحریف شدہ مطالب موجود ہیں جو خداوند عالم کی طرف سے نازل نہیں ہوئے ہیں۔ ہم اجمالی طورپر آپ کی اطلاع کے لئے ان تحریفات کے دو نمونوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

توریت میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فلاں سال انتقال ہوا۔اب ان سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر یہ کتاب وہی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی ہے تو اس میں یہ کیسے لکھ دیا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فلاں سال انتقال ہوا؟کیا خود حضرت موسیٰ علیہ السلام فرما سکتے ہیں کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا فلاں سال انتقال ہوا ہے؟!

جہاں تک انجیل کا سوال ہے خود نصاریٰ بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ یہ وہی خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے۔ ان کے پاس اس وقت چار انجیلیں ہیںبلکہ اس سے پہلے ان کے پاس اس سے بھی زیادہ انجیلیں تھیں اور ان چاروں انجیلوں کو ایک خاص شخص نے تحریر کیا ہے کہ جن کے ناموں سے یہ انجیلیں منسوب ہیں۔ ان میں بھی اس طرح کی داستانیں موجود ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فلاں دن آئے اور اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھے ان سے کہا اور اس کے بعد فلاں جگہ چلے گئے وغیرہ کسی تاریخی کتاب کے مثل ہے۔خود وہ لوگ بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ

1۔ سورۂ بقرہ آیت75۔

یہ وہی کتاب ہے جو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی ۔ البتہ ان کا کہنا ہے کہ بعد میں حضرتِ عیسیٰ کے شاگردوں نے انجیل کے مطالب کو اس شکل میں منظّم و مرتّب کیاہے اور ان انجیلوں کا مطالعہ کرنے والا شخص خوب جانتا ہے کہ یہ خدا وند عالم کی نازل کی ہوئی کتابیں نہیں ہیں ۔

بہر حال ادیان سلف کی اتباع کرنے والوں کے پاس موجودہ کتابیں تحریف شدہ ہیں اور ان کا کوئی اعتبار بھی نہیں ہے ۔

احکام کے جزئیات میں ادیان ایک نہیں ہیں

ہم نے ملا حظہ کیا کہ اکثر ادیان میں اختلافات اہل کتاب کی سرکشی کی وجہ سے ظاہر ہوئے اور انھوں نے خدا کی کتاب میں تحریف بھی کی ، لیکن ایسا نہیں ہے کہ تمام ادیان کے جزئی احکام مشترک ہوں قرآن کریم اس مطلب کے متعلق فرماتا ہے :

(لِکُلٍ جَعَلْنَامِنْکُمْ شِرْعَةًوَمِنْھاجاًوَلَوْشَآئَ اللهُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّةً وَاحِدَةً وَلٰکِنْ لِیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآئَ اٰتٰکُمْ) [1]

"ہم نے سب کے لئے الگ الگ شریعت اور راستہ مقرر کردیا ہے اور خدا چاہتا تو سب کو ایک ہی امت بنادیتا لیکن وہ اپنے دیئے ہوئے قانون سے تمہاری آزمائش کرنا چاہتا ہے ۔۔۔"۔

شریعت وہ راستہ ہے جو نہر پر ختم ہوتا ہے اور شرعہ بھی اسی راستہ نیز اس راستہ کو کہا جاتا ہے جو کسی ہدف و مقصد تک پہنچتا ہے ۔ شرع ، شرعہ اور شریعت بھی ایک ہی مادہ سے ہیں ۔ شارع بھی اسی مادہ سے ہے جس کے معنی سڑک اور عام راستے کے ہیں ۔

اس آیۂ شریفہ کا مطلب یہ ہے کہ سب ایک ہی پروگرام نہیں رکھتے تھے اس بات کی تائید خداوند عالم کا یہ فرمان کرتا ہے :(وَلَوْشَآئَ اللهُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّةً وَاحِدَ ةً) یہ جملہ ممکن ہے دوسرے مطلب کی نشاندہی کر رہا ہو جو دوسری آیات میں موجود ہے کہ اگر خدا چاہتا تو سب کو ایک امت قرار دیتا یعنی سب کوزبردستی حق کی ہدایت کرتا لیکن یہ احتمال پایا جاتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اگر چاہتا تو امتوں پر نازل ہونے والے مختلف احکام کو یکساں و برابر قرار دیتا لیکن حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ احکام کے درمیان کم و بیش اختلافات پائے جائیں (لِیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَااٰتٰکُمْ)

1۔ سورۂ مائدہ آیت 48۔

تاکہ ان احکام کے متعلق یاجو کچھ خدا وند عالم نے تم کو عطا کیا ہے وسیلۂ آزمائش قرار پائیںٓایک امت کے لئے امتحان وآزمائش کے وسایل کچھ تھے اور دوسری امت کیلئے کچھ اور تھے پس معلوم ہوا کہ احکام جزئیات میں امتوں کے درمیان اختلافات پائے جا تے تھے ۔اس سے بھی زیادہ واضح یہ آیت ہے :

(لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَامَنْسَكاًهُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ) [1]

"ہر امّت کے لئے ایک طریقہ قرار دیا کہ اس پر وہ عمل کریں لہٰذا اس امر میں ان لوگوں کو آپ سے الجھنا نہیں چاہیئے آپ انھیں اپنے پروردگار کی طرف دعوت دیں"

اور تقریباً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لازم و ضروری بھی تھا کہ تمام امتوں کے لئے احکام کے جزئیات یکساں نہ ہوں، مثال کے طور پر مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ عربی زبان میں نماز پڑھیں توکیا بنی اسرائیل کی نماز بھی عربی زبان میں تھی ؟کسی شخص نے یہ دعویٰ نہیں کیا یا یہ کہ انھیں بھی کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم تھا ؟ ایسا نہیں ہے۔ قربانی کا طریقہ ،روزہ کا حکم ،وقت اور ان کی تعداد یکساں نہیں تھی ؟اس بارے میں متعدد روایتیں موجود ہیں پس معلوم ہوا یہ جو کہا جاتا ہے کہ تمام امتوں کا دین یا شریعت ایک ہے اس سے اصل احکام کا ایک ہونا مراد ہے ، لیکن ان کے انجام دینے کے طور طریقوں میں اختلاف ہو سکتا ہے۔

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کئے گئے تو آپ نے فرمایا :

(وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِىْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ) [2]

"اور میں بعض چیزوں کو حلال قرار دیتا ہوں جو تم پر حرام تھیں"۔

یہ آیت صاف صاف بیان کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بہت سے کام ان کی امّت کے لئے حرام تھے جن کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حلال قرار دیدیا تھا۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے :

(وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الخَبٰئِثَ) [3]

1۔ سورۂ حج آیت67۔

2۔ سورۂ آل عمران آیت50۔

3۔ سورۂ اعراف آیت157۔

"اورانھوں نے پاکیزہ چیزوں کو ان پر حلال قرار دیا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیا ہے"۔

فی الجملہ کچھ چیزیں حلال ہوئیں اور کچھ چیزیں حرام ہوئیں اس میں کوئی شک نہیںہے لیکن یہ منسوخ کیا جانا ویسے ہی ہے جیسے خود ایک شریعت میں کوئی ایک چیز بعد میں منسوخ کر دی جائے اور اسلام میں اگر کوئی کہے کہ نسخ نہیں ہے تو یہ تو قرآن کی نص ودلیل ہے کہ تغییر قبلہ ایک منسوخ کیا جانے والا حکم ہے اسی طرح کچھ دوسرے احکام بھی تھے جو منسوخ ہوئے ہیں۔ مختصر یہ کہ بعض احکام کا منسوخ ہونا خود ایک شریعت میں بھی ممکن ہے اور کئی شریعتوں میں بھی اس کا امکان پایا جاتا ہے ۔اگر ایک شریعت میں کوئی چیز منسوخ کردی جائے تو اس کا مطلب گزشتہ شریعت کی تکذیب نہیں ہے بلکہ وہ حکم بھی اپنے زمانہ میں حق تھا۔

پس شریعتوں کے ما بین جزئی احکام میں اختلاف کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دین کئی ہیں، بلکہ دین ایک ہے اور وہ اسلام ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام نے اسی دین کی دعوت دی ہے اور تمام مومنین اور مسلمانوں کو تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان رکھنا چاہئے ۔اس مقام پر یہ مطلب بیان کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ جب ہم کسی پیغمبر سے اس کا دین قبول کرلیں تو ہم کو اس کے احکام میں فرق کرنے کا کوئی حق نہیں ہے ،اس لئے کہ ایسا کرنا دین کے تمام پہلوؤں کا انکار کر دینے اور تمام انبیاء علیہم السلام کا انکار کرنے کے مثل ہے ، ایک دین کے تمام ارکان و دستور پر بغیر کسی قید و شرط کے ایمان رکھنا چاہئے۔

خداوند عالم اہل کتاب کی سرزنش کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے :

(اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتَابِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَاجَزَائُ مَنْ یَفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّاخِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَاوَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰیٰ اَشَدِّالْعَذَابِ وَمَااللّٰہ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ)[1]

"کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور ایک حصے کا انکار کردیتے ہو؟ ایسا کرنے والوںکی سزا سوائے اسکے کہ زندگانی دنیا میں ذلیل ہوں اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب کی طرف پلٹا دیے جائیں کچھ نہیں ہے اور اللہ تمہارے کرتوت سے بے خبر نہیں ہے ۔"

اس آیت سے بھی تائید ہوتی ہے کہ دین کے بعض احکام کو قبول کرنا اور بعض احکام کو رد کرنا گویا اس کے تمام احکام کو رد کردینا ہے اوراس سلسلہ میں ایک اہم بات یہ ہے کہ مرتد ضروریات اسلام میں سے کسی ایک ضرورت کا انکار کرنے سے کافر ہوجاتا ہے ، یعنی اس دنیا میں بھی اس کا خون ضائع ہو جاتا ہے اور آخرت میں بھی وہ کفار کے ساتھ محشور کیا جائے گا ۔

پس ہمارے لئے تمام انبیاء علیہم السلام کی نبوت اور ان کی تمام تعلیمات پر ایمان ضروری ہے اور ان بزرگواروں کے احکام میں سے کسی ایک حکم کا جان بوجھ کرانکار کرنا گویا تمام احکام کے انکار کرنے کے مانند ہے ۔

1۔ سورۂ بقرہ آیت85۔

رہنما کی پہچان

انبیاء علیہم السلام

معارف قرآن کے ذیل میں ہم اب تک چار موضوعات :

1۔ خدا کی معرفت

2۔دنیا کی پہچان

3۔انسان کی شناخت

4۔راستے کی پہچان پر گفتگو کر چکے ہیں۔

پیش نظر حصہ (رہنما کی معرفت) کے بارے میں ہے جو انبیاء علیہم السلام کے متعلق بحث کے لحاظ سے راستہ کی پہچان کا ہی ایک حصہ کہا جا سکتا ہے ۔اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے دو باتوں کا بیان کر دینا ضروری ہے :

قرآن میں تاریخی مباحث کا محور

قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام اور ان سے متعلق مطالب کے سلسلہ میں بہت سی آیات ہیں جن میں قرآن کے تاریخی زاویۂ نگاہ کا ایک اہم حصہ موجود ہے ۔یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مورخین نے اپنی تمام بحثوں میں (چاہے وہ داستان نویس ہوں یا تاریخ نگار) اپنے تاریخی جائزوں میں انسان کے مادی پہلوؤں کو محور قرار دیا ہے۔ وقائع نگاروں نے عام طور سے تاریخ کا محور بادشاہوں اور حکمرانوں کو بنایا ہے اور ان ہی کے حالات کے مطابق تاریخ قلمبند کی ہے البتہ ان کے ذکر کے ذیل میں معاشرے اور قوموں کے حالات بھی ذکر کر دیئے ہیں۔کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی تواریخ میں جن سے تاریخ نگاری کا ایک اہم حصہ تشکیل پاتا ہے بحث کا محور حکومت ہے البتہ جن افراد نے تاریخ کے بارے میں تجزیہ و تحلیل سے کام لیا ہے زیادہ تر عوام اور ملتوں کے مسائل پر زور دیا ہے ، ان میں ایک گروہ نے تاریخ کا محور اقتصاد کو قرار دیا ہے جیسے مارکسسٹ حضرات جو تاریخی حوادث کا اقتصاد کے محور پر معاشرے کے معاشی حالات کے پس منظر میں جائزہ لیتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ تاریخ کا اصل پہیّا اقتصاد ہے اور انسانی معاشروں میں جو تغیر و تبدل ہوتے ہیں پیداوار کے وسائل میں رونما ہونے والی تبدیلی کی وجہ سے ہوا کرتے ہیں۔ تجزیاتی تاریخ لکھنے والوں کے بعض دوسرے گروہ اگرچہ دوسرے اسباب و محرکات پر بھی زور دیتے ہیں لیکن انھوں نے زیادہ تر آدمی کے مادی پہلوؤں اور اس کی دنیاوی اور حیوانی زندگی پر اعتماد کیا ہے۔

قرآن مجید کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے تاریخ کا محور معنویت کو قرار دیا ہے ۔ قرآن کے تمام مباحث کے مانند قرآن کی تاریخی داستانوں کا محور بھی "توحید" ہے۔ اور قرآن کریم کے تاریخی واقعات اسی محور کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ یہی وجہ ہے قرآن کی تاریخی واقعات کے مرکزی کردار انبیاء ہیں جن کا معاشرہ میں اثر و رسوخ خدا کی وحدانیت اوریکتا پرستی کی دعوت کے ساتھ ، خدا کی اطاعت اور دوسرے تمام معنوی امور سے وابستہ ہے ۔ یہ بہت ہی اہم بات ہے جو ہم کو قرآن سے سیکھنا چاہیئے اور مادہ پرستوں کے نظریونکی اتباع کرنے سے پرہیز کرنا چاہیئے ، کیونکہ انسانوں کی انسانیت اس کے معنوی پہلوؤنکے گرد گھومتی ہے اور حق یہی ہے کہ انسان اور انسانی معاشرے کی تاریخ کا انسانی پہلوؤں کے اعتبار سے جائزہ لینا چاہیئے ، کیونکہ اس صورت میں خداوند عالم کی بندگی سے چاہیں یا نہ چاہیںٛبہر حال رابطہ پیدا ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام سے متعلق آیات کی تقسیم

قرآن کریم انبیاء علیہم السلام سے متعلق جو مطالب بیان ہوئے ہیں مجموعی طور پر تین حصوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں :

پہلے حصے میں وہ مطالب ہیںجو خود انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ہیں اس سے قطع نظر کہ اُن کا لوگوں کے ساتھ کیا رابطہ رہا ہے۔

دوسرا حصہ عوام الناس کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کے رابطہ کے سلسلہ میں ہے جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ عوام الناس کا انبیاء کے ساتھ کیا رویّہ رہا ہے اور جواب میں انبیاء علیہم السلام عوام کے ساتھ کس طرح پیش آئے ہیں ۔

تیسرے حصہ میں بھی اس میں بھی انبیاء علیہم السلام کی مختلف قوموں کا ذکر ہے اور ان کی زندگانی کے تغیرات اور ان کے انجام کے بارے میں خبر دی گئی ہے ۔

یقیناً یہ آخری حصہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت سے غیر مربوط نہیں کہا جا سکتا اگرچہ اس میں قومونکے ساتھ انبیاء علیہم السلام کے براہ راست رابطہ کو ملحوظ نظر نہیں رکھا گیا ہے ۔ یہ تینوں حصے بھی الگ الگ دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

پہلے حصہ کے ایک جزء میں مختلف انبیاء علیہم السلام میں عام طور پر مشترک بنیادی خصوصیات اور حالات بیان کئے گئے ہیں اور دوسرے جزء میں ہر نبی یا رسول کے مخصوص حالات بیان ہوئے ہیں۔

دوسرے حصہ کے بھی دو جزء ہیں ایک میں تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے ساتھ دوطرفہ مختلف پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے اور دوسرے حصہ میں مخصوص انبیاء علیہم السلام کے اپنی مخصوص قوم سے مخصوص رفتار کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرے حصہ کے پہلے باب میں مختلف قوموں کے عمومی اور بنیادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دوسرے باب میں قوموں کے خاص پہلوؤں کا بیان ہے ۔اس میںکوئی شک نہیں کہ مندرجہ بالا چھ قسموں کا تفصیلی جائزہ لینا قرآن مجید کی بیشمار آیات کے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اس طرح کا تفصیلی جائزہ موجودہ بحث کے دائرے سے باہر ہے اس لئے ہم نے انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے ایک دوسرے سے بنیادی قسم کے تعلقات کے ذکر پر ہی اکتفا کی ہے ۔

قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے اوصاف

قرآن کریم کی بہت سی آیات میں تقریباً تمام انبیاء علیہم السلام کے اجتماعی اوصاف بیان ہوئے ہیں ہم یہاں ان ہی عمومی اوصاف کا ذکر کررہے ہیں

رسول ،نبی اورنذیر

قرآن کریم میں تین صفات نبی، رسول اور نذیر تمام انبیاء علیہم السلام کیلئے ذکر ہوئے ہیں اسکے علاوہ دوسرے صفات بھی بیان کئے گئے ہیں جو یا تو عمومیت نہیں رکھتے یا پھر انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت کے عنوان سے تنہا ذکر نہیں ہوا ہے ۔مثال کے طورپر قرآن کریم میں "بشیر"کی صفت انبیاء علیہم السلام کے لئے ذکر ہوئی ہے لیکن وہ کہیں پر بھی تنہا استعمال نہیں ہوئی ہے۔اسکے بر خلاف نذیر کی صفت تنہا بھی ذکر ہوئی ہے حالانکہ بہت سی آیات میں بشیر اور نذیر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو ذکر ہوئے ہیں ۔ (بشرین ومنذرین،نَذِیْرًاوبشیرا) قرآن پیغمبروں کا نذیر کے عنوان سے تعارف کرتے ہوئے کہتا ہے:

(وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلاَ فِيْها نَذِير) [1]

"اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گذرا ہو"۔

لیکن قرآن کریم میں کہیں لفظ" بشیر "تنہا نہیں آیا ہے۔یہ ایک نفسانی اور تربیتی نکتہ ہے اور اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ انسان کی تعمیر اور تربیت کیلئے "انذار"یعنی خوف دلانا"تبشیر"یعنی بشارت دینے سے زیادہ اہم

1۔ سورہ فاطر آیت24۔

ہے۔دوسرے لفظوں میں ، انسان خوف کا عمل "امید" کے عمل سے بہت زیادہ مؤثر ہے ۔ انسان جہاں اپنی زندگی میں تغیر اور تبدیلی ایجاد کرنا، اپنے کسی ارادہ سے منصرف ہونا اور دوسروں کی پیشکش پر کوئی دوسری رفتار منتخب کرنا چاہتا ہے اس کیلئے (انداز) کا عمل "تبشیر" کے عمل سے کہیں زیادہ مؤثر ہے ۔ شاید اسی بنیاد پر قرآن نے پیغمبروں کے لئے صفات کے طور پر تنہا "نذیر" کی خصوصیت کو بیان کیا ہے "بشیر" کی خصوصیت تنہا بیان نہیں کی ہے ، بہر حال قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے لئے تین اسماء نبی، رسول اور نذیر عمومیت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں ۔

نذیر ڈرانے والے اور خوف دلانے والے کو کہتے ہیں ۔ ہر وہ پیغمبر جو انسان کی رہنمائی اور انسانوں کی ہدایت کیلئے مبعوث ہوتا ہے اس کی دعوت "انداز" کے ساتھ ہوتی ہے ۔ وہ لوگوں کو برے کاموں کے انجام سے ڈراتا ہے اور غلط قسم کے عقائد و افکار کے عقاب سے ان کو خوف دلاتا ہے تاکہ وہ ان کو اس طرح کے غلط کاموں سے روک سکے ۔

رسول اس شخص کو کہتے ہیں جو پیغام کا حامل ہوتا ہے اور ایک شخص کی طرف سے دوسرے شخص کی طرف بھیجا جاتا ہے اور یہ بات پورے مکمل یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ بہت سے انبیاء علیہم السلام خدا کی طرف سے لوگوں کیلئے رسالت یعنی (پیغام) کے حامل رہے ہیں ۔ خدا مرسل ہے ، لوگ "مرسل الیھم " ہیں اور انبیاء علیہم السلام بھی "رسول" یا "مرسل" ہیں ۔ درحقیت "پیغمبر" اور پیمبر فارسی میں "رسول" کو ہی کہتے ہیں ۔

ان تینوں صفات میں نبی کا مفہوم زیادہ وضاحت چاہتا ہے: جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ لفظ نبی کی اصل کے سلسلے میں بہت زیادہ اختلافات ہیں ۔ بعض کہتے ہیں کہ اس لفظ کا مادّہ "نبوت" رفعت یا (بلندی) کے معنی میں ہیں اور بعض دوسرے افراد کہتے ہیں کہ یہ "نبأ" سے مشتق ہے اور اس کے معنی "خبر" کے ہیں ۔ شاید دوسرا احتمال زیادہ قوی ہو اگرچہ معنویت اور انسانیت کے لحاظ سے تمام انبیاء علیہم السلام بہت ہی بلند و بالا مقام رکھتے ہیں اور وہ معاشرہ کے ممتاز افراد ہوتے ہیں لیکن خدا اور انسان کے مابین ان کی وساطت کے بیان میں ان کی رفعت و بلندی کی طرف اشارہ کرنے کی کوئی مناسبت سمجھ میں نہیں آتی ۔ لہذا قوی احتمال یہی ہے کہ نبی کا اصل مادّہ "نبأ" ہو اور نبی وہ ہے جس کے پاس ایسی خبریں ہوں کہ جن سے دوسرے بے خبر ہوں اور یہ مخصوص خبریں وہی غیب کی خبریں ہیں ۔ اس بیان کی روشنی میں ہم نبی اس شخص کو کہہ سکتے ہیں جو غیب کی اطلاع رکھتا ہو اور اسکے پاس غیب کی خبریں ہوں۔

رسول اور نبی کا فرق

نبوت اور رسالت کے مفہوم اور ان دونوں کے مصداق آپس میں کیا نسبت رکھتے ہیں اس پر بہت زیادہ بحثیں ہوئی ہیں ۔یقینا اگر نبوت اور رسالت کے مفہوم کے درمیان عام خاص مطلق کی نسبت پائی جاتی ہوتو قدرتی طور پر ان دونوں کے مصداق میں بھی وہی نسبت ہوگی لیکن ان دونوں لفظوں کے لغوی معنی سے یہ بات واضح اور روشن ہوجاتی ہے کہ ان دونوں مفاہیم کے درمیان کوئی اشتراک نہیں ہے ۔نبوت کا مطلب چاہے رفعت ہو اور چاہے حاملِ خبر ہونا ہو رسالت کا مفہوم یہ نہیں ہے ۔ہاں رسالت کا لازمہ یعنی خداوند عالم کی طرف سے پیغام کے حامل ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ رسول اس پیغام سے مطلع ہو۔ لیکن مفہوم رسالت میں نبوت کے معنی شامل نہیں ہیں۔ ہاں اس کے لوازم کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ نبوت کا مفہوم رسالت کے مفہوم میں شامل ہے۔

مصداق کے اعتبار سے بھی (جیسا کہ آیات اور ان سے بھی زیادہ صریح انداز میں روایات سے استفادہ ہوتا ہے)نبوت اور رسالت کے درمیان عام خاص مطلق کی نسبت ہے ممکن ہے کوئی کہے کہ نبوت کا رسالت سے اعم ہونے کا دعویٰ بعض آیات کے ظاہری مطالب کے ساتھ سازگار نہیں ہے مثال کے طور پر خداوند عالم بعض آیات میں ارشاد فرماتا ہے:

(وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِیًّ اِلَّا) [1]

"اورہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا رسول یا نبی نہیں بھیجا ہے کہ۔۔۔"۔

حالانکہ اگرنبی رسول سے اعم ہوتا تو خداوندعالم کو (وَمَااَرْسَلْنَامِنْ نَبِیٍّ) فرمانا چاہیے تھا اور رسول کا ذکر نہیں کرنا چاہئے تھا ۔اس لئے کہ جب عام کا ذکر کردیا جائے تو خاص بھی اس کے ضمن میں آجاتا ہے ۔اس بناء پر خاص کا عام کے پہلو میں ذکر کرنا بلاغت کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔اسی طرح خداوند عالم بعض انبیاء علیہم السلام کے بارے میں فرماتا ہے :

(وَکَانَ رَسُولًا نَبِیّاً) [2]

"۔۔۔اور رسول ونبی تھے"۔

حالانکہ مقام توصیف میں خاص کے بعد عام ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی ۔یہ ویسی ہی ہے کہ جیسے کہا جائے :"فلاں شخص(فقہا میں)اعلم ہے اور فقیہ بھی ہے "تو ظاہر ہے کہ (اَعْلَم)ْ کے اندر فقیہ کے معنی موجود ہیں۔

1۔ سورۂ حج آیت52۔

2۔ سورۂ مریم آیت51۔

اگر رسالت کیلئے نبوت لازمی ہوتو نبی ہونے کا رسول ہونے کے بعد ذکر کرنا مناسب نہ ہوتا۔

علامہ طباطبائی نے تفسیر المیزان میں اس اعتراض کا جواب دیا ہے ۔ان کا خیال ہے کہ "نبی"اور "رسول" دو متباین اور مختلف مفہوم رکھتے ہیں اگرچہ رسالت کیلئے نبوت بھی لازم ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ نبوت کا مفہوم رسالت کے مفہوم میں شامل ہو ۔رسول قاصد اور ایلچی کو کہتے ہیں یعنی وہ شخص جو ایک چیز کسی شخص سے لیکر دوسرے شخص تک پہنچانے کے لئے واسطہ ہو اور نبی اس کو کہا جاتا ہے جو اہم غیبی خبریں رکھتا ہے ۔یہ دو مفہوم ایک دوسرے سے جدا ہیں اور اگر مصداق کے اعتبار سے ایک دوسرے کیلئے اخص ہے تو اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ دونوں مفہوم کے اعتبار سے مشترک ہیں دوسرے لفظوں میں ان کے درمیان عام خاص کی نسبت مصداق کے اعتبار سے ہے مفہوم کے اعتبار سے نہیں ۔

ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ علامہ طبا طبائی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ما بین رسول اس شخص کو کہا جاتا ہے جو خاص رسالت کا حامل ہو کبھی انبیاء علیہم السلام کلی طور پر خداوند عالم کی عبادت ، اطاعت اور راہِ حق پر (جو خدا وند عالم کی بندگی کی راہ ہے)گامزن رہنے کی دعوت دیتے ہیں لیکن کبھی خدا وند عالم کی طرف سے امت کے لئے خاص پیغام رکھتے ہیں اس بناء پر جس کے پاس خدا وند عالم کی طرف سے مخصوص پیغام ہو رسول کہا جاتا ہے اور جو کلی طور پر لوگوں کو راہِ حق کی دعوت دیتا ہے اس کو "نبی"کہتے ہیں ان دونوں مفہوموں کے مدّنظر ("كَانَ رَسُوْلاً نَبِيًّا) "کی اس طرح توجیہ کی جا سکتی ہے :"رَسُوْلاً"یعنی خاص قوم کیلئے مخصوص رسالت رکھتا ہے اور"نَبِيًّا"یعنی غیبی خبروں سے آگاہ تھا ۔اس صورت میں تکرار کی مشکل پیش نہیں آئیگی۔ آیت (مَاارْسَلْنَامِنْ قَبْلِکَ مِنرَسُوْلٍ وَ لَانَبِیٍّ) میں ان ہی دو مقام کی طرف اشارہ ہے ۔ ممکن ہے دو مقام کسی شخص میں جمع ہو جائیں اور ممکن ہے کسی شخص میں جمع نہ ہوں ۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر رسول نبی بھی ہو آیت میں بھی مقامِ رسالت اور مقامِ نبوّت رکھنے والوںکا ذکر ہے لیکن یہ ثابت کرنے کیلئے تمام رسول مقامِ نبوّت کے بھی حامل ہوتے ہیں کسی دوسری دلیل کی ضرورت ہے ۔

مندرجہ بالا توجیہ نبوت اور رسالت کے لغوی مفہوم کے ساتھ بھی سازگار ہے ۔ البتہ علّامہ طبا طبائی نے ایک دوسرے فرق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو پہلے فرق کے بر خلاف اِن دونوں لفظوں کے لغوی معنی سے قابلِ استفادہ نہیں ہے بلکہ اس کا ماخذ روایات ہیں اس طرح کی روایات اصولِ کافی میں بھی ہیں جن میں سے ایک روایت میں آیا ہے :رسول وہ ہے جو فرشتۂ وحی کو بیداری کے عالم میں دیکھتا ہے اور اس سے گفتگو کرتا ہے لیکن نبی وہ ہے جس پر خواب میں وحی ہوتی ہے[1] جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یہ فرق لفظ رسول اور لفظِ نبی سے لغوی اعتبار سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک خصوصیت ہے جو الگ سے بیان ہوئی ہے

انبیاء علیہم السلام کی تعداد

قرآن کریم کی کچھ آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خدا وند عالم نے کثیر تعداد میں انبیاء مبعوث کئے ہیں اور قرآنِ کریم میں ان میں سے صرف چند انبیاء علیہم السلام کی داستان بیان کی گئی ہے۔ قرآنِ کریم میں صاف طورپر 25 انبیاء علیہم السلام کے اسمائے گرامی کا تذکرہ ہے لیکن یہ بھی صاف طورپر بیان کردیا ہے کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام بھی تھے جن کے نہ تو اسماء قرآنِ کریم میں بیان ہوئے ہیں اور نہ ہی ان کی داستانیں بیان ہوئی ہیں لیکن پیغمبروں کی تعداد کتنی تھی یہ قرآن کریم کے الفاظ سے معلوم نہیں ہوتا۔

روایات میں بھی انبیاء علیہم السلام کی کثرت کی طرف اشارہ ہے لیکن ان کی تعداد بہت کم روایتوں میں بیان کی گئی ہے۔ ایک روایت میں پیغمبروں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار اور رسولوں کی تعداد تین سو تیرہ معین کی گئی ہے۔[2] اب یہ روایت کتنی قابلِ اعتماد ہے یہ الگ بحث ہے۔ بہرحال اس طرح کی بات بعض روایتوں میں موجود ہے۔

اب ہم مجموعی طورپر، انبیاء علیہم السلام کے بارے میں نازل ہونے والی آیات کا تذکرہ کررہے ہیں ارشاد ہوتا ہے:

(وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِی كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا)[3]

"اور یقینا ہم نے ہر امّت میںایک رسول بھیجا ہے۔۔۔"۔

کلمۂ امت کی وضاحت

جس امت کے لئے رسول بھیجا جائے اس سے کیا مراد ہے؟ امت کے لغت میں متعدد معنی ہیں منجملہ یہ کہ: انسانوں کے کسی مجموعہ، پیشوا، راستہ اور زمانہ کو امت کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں "امۃً واحِدَۃً" ایک مشخص و معین زمانہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

1۔ ملاحظہ کیجئے یہ: کلینی، الکافی (الاصول)، کتاب الحجۃ، باب الفرق بین الرسول والنبیّ والمحدَث۔

2۔بصائر الدرجات صفحہ 121، الخصال صفحہ 300 اور 641۔

3۔ سورۂ نحل آیت36۔

اور ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

(اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً) "بیشک ابراہیم ایک مستقل امّت ہیں" شاید یہاں لفظ امت امام کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن قرآنِ کریم میں زیادہ تر مقامات پر یہ کلمہ "لوگوں کے ایک مخصوص گروہ" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اب یہ گروہ کن خصوصیات کا حامل ہو کہ اس کو امت کہا جا سکے اس کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ بعض افراد کہتے ہیں امت یعنی لوگوں کا وہ گروہ جن کا ہدف مشترک ہو یا ان کی زندگی بسر کرنے کا عنوان مشترک ہو یا ان کے ایک دوسرے سے کافی روابط مشترک ہوں لیکن قرآن کریم میں اس لفظ کا استعمال اس تفسیر کے ساتھ موافق نہیں ہے۔

قرآن کریم میں حیوانوں کے گروہ کو بھی (اُمَم) کہا گیا ہے:

(اِلَّآاُمَم اَمْثَالُكُمْ)[1]

"جو اپنی جگہ تمہاری طرح کی جماعت نہ رکھتا ہو"۔

اس بناء پر کلمہ امت قرآن کریم میں تقریباً جماعت کے مساوی ہے۔ یعنی کچھ افراد کا مجموعہ چاہے وہ انسان ہوں یا حیوان اب رہا قرآن کا یہ جملہ "کہ ہر امت کیلئے ایک رسول تھا، اس سے مراد انسانوں کا ہر گروہ" ہے لیکن قرآن نے اس اعتبار سے انسانوں کی کسی جماعت کو ایک مجموعہ یا گروہ شمار کیا ہے یہ بات واضح نہیں ہے۔ کسی شک و شبہ کے بغیر انسانوں کے مجموعہ پر "امت واحد" کا اطلاق ایک اعتباری امر ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس اعتبار کی بنیاد اور معیار کیا ہے؟ جس طرح ہم اسکول میں طلبہ کی ایک جماعت کو ایک ساتھ سبق پڑھنے کے لحاظ سے ایک جماعت یا کلاس کہتے ہیں یا ہم فوج کی ایک جماعت کو ان کے درمیان مخصوص قوانین میں اشتراک کی وجہ سے ایک یونٹ کہتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کے مجموعہ کو بھی مشترکہ طور پر ایک ہی دین کے پیرو ہونے کی وجہ سے ایک مجموعہ شمار کر سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی پیروی کرنے والوں کو شریعت میں اشتراک کی وجہ سے "حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت شمار کرتے ہیں" اب سوال یہ ہے کہ کیا ایک امت کے افراد کا ایک ہی زمانہ میں یا ایک ہی جگہ پر زندگی بسر کرنا یا ان کے درمیان اقتصادی روابط میں بھی اشتراک پایا جانا "ایک امت" شمار کریں یا اسی طرح جگہ کے اشتراک کا لحاظ کرتے ہوئے جو لوگ کسی مخصوص جغرافیائی حدود میں زندگی بسر کر رہے ہوں ان کو بھی "ایک امت" کہا جا سکتا ہے۔ اب یہ سوال پیش آتا ہے کہ لفظ "امت" سے مندرجہ ذیل قسم

1۔ سورۂ انعام آیت 38۔

کی آیات میں کیا مراد ہے؟

(وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلاً) [1]

"اور یقینا ہم نے ہر امّت میں ایک رسول بھیجا ہے ۔۔۔"۔

اور ایک آیت میں یہ ارشاد ہوتا ہے:

(وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْر) [2]

"اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گذرا ہو"۔

یہاں لفظ "امت "انسانوں کے کس طرح کے مجموعہ کے لئے استعمال ہوا ہے؟ اور اس مجموعہ کے درمیان وجہ اشتراک کیا ہے؟ کیا اس سے مراد یہ ہے کہ ہر زمانہ میں انسانوں کا ایک ایسا مجموعہ رہا ہے کہ جن کی ہدایت کے لئے پیغمبر مبعوث کئے گئے ہیں ؟یا امت سے مراد مخصوص جغرافیائی حدودمیںرہنے والے افرادیا ایک ایسی قوم ہے جو ایک ہی زبان بولتی ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ ان سوالات کے جوابات قرآن کریم کی آیات سے نہیں ملتے۔ہاں یہ بات مسلّم ہے کہ قرآنِ کریم نے انسانوں کے جن مجموعہ کو امت شمار کیا ہے ان کے بارے میں اعلان کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک امت کے لئے کوئی نہ کوئی پیغمبر ضرور مبعوث ہوا ہے لیکن قرآن کا کسی ایک مجموعہ کو امت میں شمار کرنے کا معیار ہمارے لئے آشکار نہیں ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی کثرت

قرآنِ کریم کی کچھ آیات صرف اس چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ لوگوں کے درمیان بڑی تعداد میں پیغمبر مبعوث کئے گئے ہیں۔

خداوند عالم کا ارشاد ہے:

(اِذْ جَائَتْهُمْ الرُّسُلُ مِنْ بَیْنِ اَیْدِ یْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ) [3]

1۔سورۂ نحل آیت36۔

2۔سورۂ فاطر آیت24۔

3۔سورۂ فصلّت آیت14۔

"جب ان کے پاس سامنے سے اور پیچھے سے ہمارے نمائندے آئے ۔۔۔"۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انبیائے الٰہی کی تعداد اس قدر زیادہ تھی گویا ان کے آگے پیچھے انبیاء علیہم السلام ہی انبیاء علیہم السلام تھے ۔ اسی طرح خدا وند عالم ارشاد فرماتا ہے :

(ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا) [1]

"اور اسکے بعد ہم نے مسلسل رسول بھیجے ۔۔۔"۔

یہ آیت بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کم و بیش ہر زمانہ میں پیغمبر موجود تھے اور خداوند عالم کا ارشاد ہوتا ہے :

(وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَسُوْل) ۔۔[2]

"اور ہر امّت یقیناًیک رسول ہوا ہے ۔۔۔"۔ان آیات میں مجمل طور پر یہ حقیقت بیان ہوئی ہے کہ خدا وند عالم نے قوموں اور امتوں کے درمیان بڑی تعداد میں نبیوں کو مبعوث کیا ہے لیکن اس بات کی وضاحت نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعداد کتنی تھی اور کیا ہر زمانہ میں صرف ایک ہی پیغمبر رہا ہے یا ایک ہی زمانہ میں ایک سے زیادہ پیغمبر بھی مبعوث کئے گئے ہیں ۔

قرآنِ کریم سے تو نہیں مگر کچھ دوسری دلیلوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ایک ہی وقت اور ایک ہی زمانہ میں متعدد پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے مربوط آیات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام آپ کے ہم عصر تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کی پیروی کرتے تھے ۔ علاوہ ازیں کچھ آیات سے کئی پیغمبروں کا ایک ہی زمانہ میں موجود ہونا پتہ چلتا ہے ۔خدا وند عالم کا ارشاد ہوتا ہے :

(اِذْاَرْسَلْنَا اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْ هُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ) [3]

"اس وقت جب ہم نے ان کے پاس دو رسولوں کو بھیجا لیکن ان لوگوں نے ان دونوں کو جھوٹا خیال کیاتو ہم نے ایک تیسرے پیغمبر کے ذریعہ ان دونوں کی تائید کردی"۔

ان تمام باتوں کے باوجود کچھ اور سوالات بھی ہیں جن کے جوابات قرآن کی آیات سے حاصل نہیں ہوتے جیسے گذشتہ امتوں میں ہر ایک کے درمیان مبعوث کئے جانے والے انبیاء کے نام اور دوسری تفصیلات کیا ہیں؟ کیا

1۔ سورئہ مومنون آیت44۔

2۔ سورئہ یونس آیت47۔

3۔ سورئہ یس آیت 14 ۔

کوئی زمانہ ایسا بھی گذرا ہے کہ جس وقت لوگوں کے درمیان کوئی پیغمبر موجود نہ رہا ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ جن کے صاف و صریح جوابات ظواہر آیات سے پتہ نہیں چلتے البتہ آخری سوال کے بارے میں کچھ اس طرح کے مشترک مضمون کی حامل روایات موجود ہیں" لَا تَخْلُوْالْاَرْضَ مِنْ حُجَّةٍ"[1]

"زمین کبھی حجتِ خدا سے خالی نہیں رہ سکتی"۔

لیکن اس روایت سے بھی مندرجہ بالا آخری سوال کا جواب صریح طور پر نہیں دیا جا سکتا چونکہ حجت نبی اور رسول دونوں کو کہتے ہیں اور اس میں امام (اور پیغمبر کے وصی) بھی شامل ہیں اس بناء پر اس روایت کے سہارے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ انسانوں کے درمیان کسی فاصلے کے بغیر ہمیشہ پیغمبر موجود رہے ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہم مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد زمین و زمان کا پیغمبر سے خالی ہونا مسلّم ہے اور یہ بات ضروریاتِ اسلام سے ہونے کے علاوہ جو آیات نبوّت کے ختم ہونے پر دلالت کرتی ہیں ان سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے لیکن ہم کو قرآنِ کریم سے کوئی ایسی دلیل نہ مل سکی جس کے تحت پیغمبر اسلام ﷺ سے پہلے ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی موجودگی ثابت ہو۔

قرآنِ کریم کی آیات سے ایک اور بات جس کا پتہ چلتا ہے یہ ہے کہ صرف کچھ ہی انبیائے الٰہی کے اسماء اور ان کے حالاتِ زندگی قرآنِ کریم نے بیان کئے ہیں، تمام انبیاء علیہم السلام کی داستان قرآنِ کریم میں بیان نہیں ہوئی ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے

(اِنَّآاَوْحَیْنَا اِلَیْکَ کَمٰاَاوْحَیْنَااِلیٰ نُوْحٍ وَالنَّبِیّٖنَ مِنْ بَعْدِہِ وَاَوْحَیْنَااِلیٰ اِبْرَاھِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبٰاطِ وَعِیْسٰی وَاَیُّوْبَ وَیُوْنُسَ وَ ھٰرُوْنَ وَسُلَیْمٰنَ وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْراً وَرُسُلاً قَدْ قَصَصْنٰھُمْ عَلَیْکَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلاً لَمْ نَقْصُصْھُمْ عَلَیْکَ وَکَلَّمَ اللہ مُوْسیٰ تَکْلِیْماً)[2]

"ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی نازل کی ہے جس طرح نوح اور ان کے بعد کے انبیاء کی طرف وحی کی تھی اور ابراہیم ،اسماعیل ،اسحاق ،یعقوب، اسباط، عیسیٰ، ایوب ،یونس، ہارون، اور سلیمان کی طرف وحی کی ہے اور داؤد کو زبور عطا کی ہے اور بہت سے رسول (بھیجے) جن کے قصے ہم آپ سے پہلے ہی بیان کر چکے ہیں اور بہت سے ایسے رسول (بھیجے) جن کا تذکرہ ہم نے تم سے نہیں کیا ہے اور اللہ نے تو موسیٰ سے (کھل کر) باتیں بھی کی ہیں"۔

1۔ الکافی (الاصول) کتاب الحجۃ باب ا نَّ الاَ رْ ضَ لَا تَخْلُوْ ا مِنْ حُجَّةٍ۔

2۔ سورۂ نساء آیت 163۔164۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَلَقَدْ اَرْسَلْنَارُسُلاً مِنْ قَبْلِکَ مِنْھُمْ مَنْ قَصَصْنَاعَلَیْکَ وِمنْھُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَیْکَ) [1]

"اور ہم نے آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیجے ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ آپ سے کیا ہے اور بعض کا تذکرہ بھی نہیں کیا ہے ۔۔۔"۔

ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی تعداد اُن سے کہیں زیادہ ہے کہ جن کی داستان قرآنِ کریم میں بیان کی گئی ہے ۔

انبیاء علیہم السلام کی جنس

قرآنِ کریم نے انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ایک بات عمومیت کے ساتھ یہ بیان کی ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام صرف مرد ہوئے ہیں:

(وَمَااَرْسَلْنَامِنْ قَبْلِکَ اِلّاَرِجَالًا نُوحِیْ اِلَیْھِمْ مِنْ اَھْلِ الْقُرَیٰ) [2]

"اور (اے رسول)آپ سے پہلے بھی ہم نے آبادیوں میں رہنے والے ان مردوں کے سواکہ جن پر وحی کی ہے کسی کو (رسول بناکر) نہیں بھیجا"۔

(وَمَااَرْسَلْنَامِنْ قَبْلِکَ اِلّاَرِجَالًا نُوْحِیْ اِلَیْھِم فَسْئَلُوْااَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَاتَعْلَمُوْ نَ)[3]

"اور ہم نے آپ سے پہلے بھی سوائے اُن مَردوں کے کہ جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے کسی کو پیغمبر نہیں بنایا پس اگر تم خودنہیں جانتے ہوتو اہل ذکر سے دریافت کرو"۔

(وَمَااَرْسَلْنَاقَبْلَکَ اِلّا رِجالًا نُوْحِیْ اِلَیْھِمْ) [4]

"اور ہم نے آپ سے پہلے بھی سوائے ان مردوں کے کہ جن پرہم وحی کیا کرتے تھے کسی کو رسول بناکر نہیں بھیجا"۔

چنانچہ جیساکہ آپ نے ملاحظہ کیا مذکورہ آیات کے ظاہر بلکہ ان کے صاف و صریح بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام پیغمبر مرد تھے اور عورتوں کے درمیان سے کوئی بھی پیغمبر مبعوث نہیں کیا گیا۔

1۔ سورۂ غافر آیت78۔

2۔ سورۂ یوسف آیت109۔

3۔ سورۂ نحل آیت43۔

4۔ سورۂ انبیاء آیت 7۔

اپنی قوم کا ہم زبان ہونا

قرآن کریم میں پیغمبروں کی ایک اور عمومی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ ہر پیغمبر کو امت کی زبان میں تبلیغ کے لئے بھیجا گیا ہے یعنی جو رسول جس مخصوص قوم کیلئے رسول بنا کر بھیجا گیا اس نے اسی قوم کی زبان میں گفتگو کی ہے یہاں تک کہ جو پیغمبر پوری دنیا کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ان کو بھی جس قوم کے درمیان بھیجا گیا ہے اور جس قوم کے درمیان انھوں نے زندگی بسر کی ہے اسی قوم کی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے ۔مندرجہ ذیل آیات انبیاء علیہم السلام کا خود اپنی قوم کا ہم زبان ہونا بیان کرتی ہیں۔

(فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِکَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ)[1]

"پس ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان میں آسان کردیا ہے کہ شاید یہ لوگ نصیحت مان لیں "۔

(نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُعَلَىٰ قَلْبِکَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَبِلِسَانٍ عَرَ بِيٍّ مُبِيْنٍ)[2]

"اسے جبرئیل امین لے کرنازل ہوئے ہیں یہ آپ کے قلب پر نازل ہوا ہے تاکہ آپ لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں یہ واضح عربی زبان میں ہے "۔

یہ دوسری آیت اس چیز پر دلالت کرتی ہے کہ قرآن کریم عام فہم عربی زبان میں نازل ہوا ہے:

(وَمَااَرْسَلْنَا مِنْ رَسُوْلٍ اِلَّا بِلِسانِ قَوْ مِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ)[3]

"اور ہم نے کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کو خود اس کی زبان دے کر بھیجا ہے تا کہ ان کے سامنے بیان کرسکے "۔

یہ آخری آیت اپنی قوم کا ہم زبان ہونے کے علا وہ پیغمبر کے بھیجے جانے کی غرض و غایت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے : پیغمبر کو مبعوث کرنے کا ہدف قوم تک اس (پیغمبر) کے ذریعہ الٰہی اہداف و مقاصد پہنچانا ہے ۔ بنابرایں اگر پیغمبر کی زبا ن (جو قوم کے ساتھ رابطے کا اصل ذریعہ ہے) اپنی قوم کی زبان سے مختلف ہو تو وہ کامل طور پر

1۔ سورۂ دخان آیت58۔

2۔ سورۂ شعراء آیت193۔195۔

3۔ سورۂ ابراہیم آیت4۔

رسالت کا فریضہ ادا کرنے اور اپنے مبعوث ہونے کے اہداف و مقاصد کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

دعوتِ توحید

قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے عمومی اوصاف میں سے ایک خدائے واحد کی عبادت کی دعوت بھی ہے اور قرآنِ کریم کی متعدد آیات اس چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ میں سرِ فہرست لوگوں کو توحید کی دعوت دینا رہا ہے ارشاد ہوتا ہے:

(وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُ مَّةٍ رَسُوْلاً اَنِ اعْبُدُوْااللهِ وَاجْتَنِبُوْا الطَّاغُوْتَ)[1]

" اور در حقیقت ہم نے ہر امت میں ایک (نہ ایک) رسول ضرور بھیجا کہ کہے: لوگو! خدا کی عبادت کرو اور طاغوت کی پرستش سے دور رہو"۔

(وَمَااَرْسَلْنَامِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَسُوْ لٍ اِلَّانُوْحِیْ اِلَیْهِ اَنَّهُ لَا اِلٰهَ اِ لَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ)[2]

" اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ ان پر وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری عبادت کیا کرو"

اوردوسرے سورہ میں ارشاد ہوتا ہے:

(اِذْجَائَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُ وْااِلَّا اللهِ) ۔۔)[3]

"جب ان کے پاس ان کے آگے، پیچھے ہمارے پیغمبر آئے (اور کہا) خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا"۔

ہاں ہر پیغمبر مسئلۂ توحید اپنے خاص طریقہ سے بیان کرتا تھا لیکن مجموعی طور پر ان کی تعلیم کا ماحصل وہی خدائے یکتا کی پرستش تھی ۔ چنانچہ بغیر کسی شک وشبہ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام الٰہی انبیاء کی دعوت کی اصل روح اور حقیقتِ مشترکہ یہی توحید مسئلہ اور خدائے وحدہُ لاشریک کی پرستش رہی ہے۔

معاشرہ میں رائج برائیوں اوربدعنوانیوں سے جنگ

تمام انبیاء علیہم السلام خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کی دعوت کے علاوہ کہ جس کی وہ سبھی عام طور پر دعوت دیا کرتے تھے اپنی امت میں رائج بدعنوانیوں سے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے ۔ نمونہ کے طور پر حضرت

1۔ سورۂ نحل آیت 36۔

2۔ سورۂ انبیاء آیت 25۔

3۔ سورۂ فصلت آیت 14۔

شعیب کے زمانہ میں "کم فروشی" کا رواج تھا۔ اس بناء پر حضرتِ شعیب علیہ السلام کو خاص طور پر اس اقتصادی بدعنوانی سے جنگ کے لئے بھیجا گیا تھا۔ وہ اپنی امت سے کہتے تھے:

(وَفُوا الْكَيْلَ وَلاَتَكُونُوا مِنْ الْمُخْسِرِينَ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِوَلاَتَبْخَسُوا النَّاسَ شْيَائَهُمْ وَلاَتَعْثَوْا فِی الْ ٔرْضِ مُفْسِدِينَ) [1]

"(جب کوئی چیز ناپ کر دو تو) پیمانہ بھر کر دیا کرو (کم نہ دیا کرو) اور (جب تول کر دو) ٹھیک ترازو سے (ڈنڈی سیدھی رکھکر) تو لو اور لوگوں کے مال کی قیمت کم نہ لگایا کرو"

حضرت لوط علیہ السلام کے زمانہ میں ان کی امت کے درمیان عام طور پر بدچلنی شائع و رائج ہو چکی تھی لہٰذا حضرتِ لوط علیہ السلام اس معاشرتی برائی سے مقابلے کے لئے مبعوث کئے گئے تھے خداوند عالم قرآنِ کریم میں ارشاد فرماتا ہے:

(اَتَاتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُوْنَ) [2]

"کیا تم سارے جہان کے لوگوں میں مردوں ہی کے پاس جاتے ہو؟ اور خداوند عالم نے جو بیبیاں تمہارے واسطے پیدا کی ہیں انھیں چھوڑے ہوئے ہو (نہیں) بلکہ تم لوگ اپنی حد سے نکل گئے ہو"۔

فضیلت کے اعتبار سے مراتب کا فرق

ایک اور اصول جس پر قرآنِ کریم نے بہت زیادہ زور دیا ہے یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت اور کمال کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

(تِلْكَ الرُّ سُلُ فَضَّلْنَا بعضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ) [3]

"ان میں بعض رسولوں کو ہم نے بعض دوسرے رسولوں پر فضیلت دی ہے۔۔۔"۔

اور اس آیت سے ملتی جلتی دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّيْنَ عَلَىٰ بَعْضٍ) [4]

1۔ سورۂ شعرا آیت 181۔ 183۔ 2۔ سورۂ شعرا آیت165۔166۔

3۔ سورۂ بقرہ آیت253۔ 4۔ سورۂ اسراء آیت55۔

"اور ہم نے یقینا بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت دی ہے"۔

ان آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام انبیائے الٰہی کمال کے اعتبار سے مساوی نہیں تھے اور معنوی مقام کے اعتبار سے ایک دوسرے سے فرق کرتے تھے۔

اجر طلب کرنے سے پرہیز

انبیاء علیہم السلام کی ایک اور مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ہرگز اپنی امت سے رسالت کی راہ میں اٹھائی جانے والی طاقت فرسا زحمتوں کے عوض کوئی اجر و مزدوری نہیں طلب کی۔ انبیاء کی زبانی یہ بات صاف طور پر نقل ہوئی ہے کہ وہ اپنی امت سے مخاطب ہو کر فرمایا کرتے تھے:

ہم تمہاری رہنمائی اور تعلیم و تربیت کے عوض تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے کیونکہ ہماری اجرت خداوند عالم کے ذمہ ہے۔

اس کے سلسلہ میں سب سے جامع سورہ، سورۂ شعراء ہے۔ جس میں پانچ مقامات پر پیغمبروں کی داستان بیان کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے:

(وَمَاۤ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ)[1]

"اور اس (تبلیغ رسالت) کے بدلے میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا میری اجرت تو بس سارے جہان کے پالنے والے (خدا) کے ذمہ ہے"۔

یہ آیت کہ جس میں حضرتِ نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام جیسے پیغمبروں کی حکایت بیان ہوئی ہے واضح طور پر اس واقعیت سے پردہ اٹھاتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کسی بھی طرح کی توقع یا مطالبہ اپنی زحمتوں کے سلسلے میں لوگوں سے نہیں رکھتے تھے اور ان کی امید صرف اور صرف خداوند عالم کے فضل و کرم سے وابستہ تھی۔ قرآن کریم کی چند آیات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ بھی گذشتہ انبیاء علیہم السلام کی مانند لوگوں سے کسی طرح کے اجر کی توقع نہیں رکھتے تھے:

(وَمَا تَسْئَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ هُوَ اِ لَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِيْنَ)[2]

"اور تم اس (کام) کے بدلے ان سے کوئی صلہ نہیں چاہتے۔ وہ (قرآن) دنیا والوں کے لئے نصیحت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے"۔

1۔ سورۂ شعراء آیت109،127،145،164،180۔

2۔ سورۂ یوسف آیت104۔

(قُلْ مَااَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَمَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ)[1]

"(اے رسول)آپ ان سے کہدیں میں تم سے نہ اس (تبلیغِ رسالت) کا کوئی بدلہ چاہتا ہوں اور نہ میں ان لوگوں میں ہوں کہ خود ساختہ چیزوں کی خدا کی طرف نسبت دیدوں"۔

بعض دوسری آیات میں اس حقیقت کو استفہامِ انکاری کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔

(اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًافَهُمْ مِنْ مَغْرَمٍ مُثْقَلُوْ نَ)[2]

"(اے رسول) کیا آپ نے ان سے (تبلیغِ رسالت کا) کوئی صلہ مانگا ہے اور ان لوگوں پر تاوان میں (وعدہ پورا کرنے کا) بھاری بوجھ پڑ رہا ہے ؟!"۔

بغیر کسی شک و شبہ کے دو سوروں میں دہرائی جانے والی اس آیت میں استفہام(اور سوالیہ انداز) استفہامِ انکاری کی قسم سے ہے۔ لہٰذا اس آیت میں بھی ایک دوسرے رُخ سے یہی حقیقت بیان ہوئی ہے کہ پیغمبر اسلام نے اپنی امت سے تبلیغ رسالت کے سلسلے میں کسی اجر کا مطالبہ نہیں کیا ہے۔

ابھی ذکر شدہ تمام آیات میں کسی بھی قسم کے اجر کی درخواست کا مطلق طور پر انکار ہے لیکن بعض دوسری آیات سے اس سلسلہ میں ایک طرح کے استثناء کا پتہ چلتا ہے:

(قُلْ لَاْ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْراً اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ)[3]

"(اے رسول) آپ کہدیں کہ میں اس (تبلیغ رسالت) کا اپنے قرابداروں کی محبت کے سوا تم سے کوئی صلہ نہیں چاہتا"۔

(قُلْ مَااَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍاِلَّا مَنْ شَاءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيْلاً)[4]

"(ان لوگوں سے)آپ کہدیں کہ اس (تبلیغ رسالت) پر تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا ہوں مگر یہ کہ جو چاہے اپنے پروردگار تک پہنچنے کی راہ اختیار کرے"۔پہلی نظر میں ممکن ہے کوئی یہ گمان کرے کہ مذکورہ دو آیتیں ایک استثنائے حقیقی ہیں اس معنی میں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے (تمام انبیاء علیہم السلام کے بر خلاف اور دوسری آیات میں مذکورہ خود اپنی گفتگو کے بر خلاف (کہ جن

1۔ سورۂ ص آیت 86۔

2۔ سورۂ طور آیت 40 اور سورۂ قلم آیت 46۔

3۔ سورۂ شوریٰ آیت23۔

4۔ سورۂ فرقان آیت57۔

میں کلی طور پر ہر طرح کے اجر کے مطالبہ کی نفی کی گئی ہے) ان دونوں آیات میں لوگوں سے تبلیغ رسالت کا اجر اور بدلا طلب کیا ہے لیکن پہلی نظر میں پیش آنے والا یہ تصور صحیح نہیں ہے کیونکہ ان دونوں آیتوں کے مطالب پر غور و فکر کرنے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ ان چیزوں میں سے نہیں ہے جو عام طور پر لوگ کسی عمل کے انجام دینے کے بعد مزدوری کے عنوان سے طلب کیا کرتے ہیں۔ عرف عام میں مزدوری اس منفعت کو کہتے ہیں جو مزدوری دینے والا کسی مزدور کو دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ مزدوری پانے والا شخص ہے جو وہ اپنے انجام دیئے گئے کام کے بدلے میں پاتا ہے اور اس کی منفعت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ اجرت کے اس مفہوم سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس میں جن چیزوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے یعنی' ('الَّا الْمَوَدَّةَ فِیْ الْقُرْبَیٰ) "اور" (مَنْ شَا ئَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهِ سَبِیْلاً) "استثنا نہیں ہے[1] اس لئے کہ یہ وہ اجرتیں ہیں جس کا فائدہ خود ذاتِ پیغمبر کی طرف نہیں پلٹتا بلکہ یہ تو امت اسلامی ہے جو خاندانِ پیغمبر اکرم ﷺ سے دوستی کے ذریعہ الٰہی راہ پر گامزن ہو کر فائدہ اٹھائے گی۔

مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں کسی کے ذہن میں یہ باطل خیال نہیں آنا چاہئے کہ (نعوذ باللہ) پیغمبر اکرم مقام و منصب کے خواہاں تھے اور ان کا مقصد لوگوں کے درمیان محبوبیت حاصل کرنا تھا اور چاہتے تھے کہ اُن کے بعد لوگوں کی نظر اُن کے خاندان پر مرکوز رہے۔

جی نہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ نبی اکرم ﷺ آپ کے اقرباء سے محبت و مودت اور آپ کے اہل بیت علیہم السلام سے دوستی ایک ایسا امر ہے جو بالآخر خود لوگوں کے فائدے میں ہے اور خود ان کی سعادت اور کمال کے لئے ہے اور اصولی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستثنیٰ کئے گئے دونوں امر کی برگشت بالآخر ایک ہی چیز کی طرف ہے۔ اس لئے کے کسی بھی شک و شبہ کے بغیر پیغمبر اکرم ﷺ کی طرف سے اپنے اہل بیت علیہم السلام کو لوگوں کی توجہ کا مرکز بنانے کی وصیت، آپ کا کوئی ذاتی کام نہ تھا بلکہ خدا کے حکم کے تحت تھا۔ پیغمبر اکرم ﷺ کو خداوند عالم کی طرف سے اس امر پر مامور کیا گیا تھا کہ آپ اہل بیت علیہم السلام کا رسالت کے تسلسل اور امت کی رہنمائی کے لئے جو اعلیٰ مقام رکھتے ہیں لوگوں کے گوش گذار فرمادیں اور بلاشبہ اہل بیت علیہم السلام سے تمسک خداوند عالم کی راہ پر چلنے کا کامل و واضح مصداق ہے۔

آخری دو آیتوں کی جو تفسیر بیان کی گئی ہے اور زیادہ صراحت کے ساتھ مندرجہ ذیل آیت میں بیان کی گئی ہے:

1۔(اجر) کے مذکورہ معنی کے مدِ نظر علمائے علم نحو کے اعتبار سے ان آیات میں استثنائے مذکور استثنائے منقطع کی قسم سے ہے کہ جس میں مستثنیٰ مستثنیٰ منہ کی جنس سے نہیں ہے۔

(قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ اَجْرٍفَهُوَ لَكُمْ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلَىٰ اللّٰه) [1]

اس آیت کی دو طرح سے تفسیر کی گئی ہے پہلی تفسیر کے مطابق جو مندرجہ بالا بیان سے مناسبت رکھتی ہے۔ آیت میں کہا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اجر و مزدوری کے طور پر جس چیز کا مطالبہ کیا ہے۔ حقیقت میں وہ وہی چیز ہے جس کا فائدہ خود لوگوں کی طرف پلٹتا ہے یعنی حقیقی اجر لینے والی خود امت ہے لیکن دوسری تفسیر کے مطابق آیت سرے سے اجرت کی نفی کررہی ہے یعنی آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں جو کچھ بھی تم سے اپنی رسالت کے عوض میرا مطالبہ ہے وہ میں نے تم ہی کو بخش دیا۔ (جیسے کوئی قرض دینے والا مقروض سے کہتا ہے: اگر میرا تم سے کچھ مطالبہ ہو تو وہ میں نے تم ہی کو بخش دیا)۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ آخر کی تین آیتوں کو دعائے ندبہ میں بڑے ہی اچھے اور خوبصورت انداز میں ایک دوسرے سے مرتبط کرکے بیان کیا گیا ہے:

ثُمَّ جَعَلْتَ اَجْرَمُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ مَوَدَّتَهُمْ فِيْ كِتَا بِكَ فَقُلْتَ قُلْ لَااَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًاِلَّاالْمَوَدَّةَ فِيْ الْقُرْبىٰ وَقُلْتَ مَاسَئَلْتُكُمْ مِنْ اَجْرٍفَهُوَلَكُمْ وَ قُلْتَ مَااَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَاءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلىٰ رَبِّهِ سَبِيْلاً فَكَانُوْاهُمُ السَّبِيْلُ اِلَيْكَ وَالْمَسْلَكَ اِلىٰ رِضْوَانِكَ

"اس وقت تو (اے پروردگار) نے اپنے قرآن میں رسالتِ محمد ﷺ کی اجرت امّت کی اہل بیت سے محبت دوستی قرار دی جہاں تونے فرمایاہے:

"اے رسول "آپ کہدیں کہ میں اس (تبلیغ رسالت) کا اپنے قرابتداروں (اہل بیت) کی محبت کے سوا تم (امتوں) سے کوئی صلہ نہیں مانگتا اور پھر تونے فرمایا: "اے رسول "آپ (یہ بھی) کہدینگہ (تبلیغ رسالت کی) میں نے تم سے جو اجرت مانگی ہے وہ تمہارے ہی فائدہ میں ہے اور پھر تونے فرمایا: "(اے رسول) آپ یہ بھی کہدیں کہ میں تم سے کوئی اجرت نہیں چاہتا مگر (یہ کہ) خدا کی راہ پر چلے۔ پس (آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ) اہل بیت پیغمبر تجھ تک اور تیری جنت رضوان تک پہنچنے کا راستہ (اور راہبر) ہیں"۔

1۔ سورۂ سبا آیت 47۔

اولوا العزم انبیاء علیہم السلام

انبیاء علیہم السلام سے متعلق ایک بحث یہ ہے کہ کیا تمام انبیاء علیہم السلام کی رسالت ساری دنیا کے لئے عمومی رسالت تھی یا ہر نبی ایک خاص گروہ کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اس مسئلہ کے جواب میں مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے پھر بھی مندرجہ ذیل دو باتوں پر سب کا اتفاق ہے

1۔ تقریباً تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی رسالت عالمی رسالت نہیں تھی دوسرے لفظوں میں کم از کم بعض انبیاء علیہم السلام کی رسالت ایک مخصوص قوم تک محدود تھی۔

2۔ بعض نا سمجھ افراد نے جس شبہ کا اظہار کیا ہے اس سے صرف نظر کرتے ہوئے سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ تمام دنیا والوں کیلئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور آپ کی رسالت کسی خاص قوم سے مخصوص نہیں ہے۔

علاّمہ طباطبائی نے قرآن کریم کی آیات سے استفادہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ انبیاء کے درمیان پانچ پیغمبر صاحبِ شریعت اور آسمانی کتاب یا صحیفے اور اجتماعی احکام لیکر آئے ہیں۔ وہ پانچ انبیاء علیہم السلام حضرتِ نوح علیہ السلام، حضرتِ ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، ان ہی پانچوں حضرات کو قرآن کریم نے اولو العزم پیغمبر کے نام سے یاد کیا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

(فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُوْلُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ) (1)

1۔ سورۂ احقاف آیت 35۔

"پس (اے رسول) جس طرح اولوا العزم (عالی ہمت) انبیاء صبر کرتے رہے تم بھی صبر کرو"۔

علامہ طباطبائی کی نظر میں یہ پانچ اولوا العزم پیغمبر وہ ہیں جن میں ہر ایک مندرجہ بالا خصوصیات کے علاوہ اپنے زمانہ میں پوری دنیا کے لئے رسول رہا ہے اور ان کی دعوت کسی خاص گروہ سے مخصوص نہیں رہی ہے اس کے برخلاف بقیہ تمام انبیاء علیہم السلام ہینجو ایک مخصوص گروہ کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ علامہ طباطبائی نے مندرجہ بالا دعوے کو ثابت کرنے کے لئے قرآنِ کریم کی آیات شاہد میں پیش کی ہیں۔ [1] یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان پانچ افراد کو بعض روایتوں میں بھی اولوا العزم انبیاء علیہم السلام کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور ان کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ [2]

کیا اولوا العزم انبیاء علیہم السلام ہی صاحبانِ کتاب و شریعت ہیں؟

جیسا کہ بیان کیا گیا اس میں کوئی شک نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے ایک گروہ کو قرآن کریم نے اولوا العزم انبیاء علیہم السلام کے نام سے یاد کیا ہے اور سورۂ احقاف میں (فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُوْلُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ) اس مسئلے پر واضح طور سے دلالت کرتی ہے لیکن کسی بھی قطعی دلیل کے ذریعہ پتہ نہیںچلتا کہ یہ اولوا العزم انبیاء علیہم السلام کون سے انبیاء علیہم السلام ہیں؟ آیا یہ اولوا العزم انبیاء وہی انبیاء علیہم السلام ہیں کہ جن پر آسمانی کتابیں نازل ہوئی ہیں؟ یا اولوا العزم انبیاء علیہم السلام سے مراد رسولوں کا وہ گروہ ہے جو صاحبِ شریعت ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات کے لئے ہمارے پاس کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآن کریم کی کوئی آیت یا تواتر کے ساتھ منقول کوئی بھی روایت ایسی نقل نہیں ہوئی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ صرف پانچ انبیاء علیہم السلام (یعنی حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ) ہی صاحبان کتاب و شریعت ہوئے ہیں۔ البتہ جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کرچکے ہیں بعض روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اولوا العزم انبیاء علیہم السلام صرف یہی پانچ انبیاء علیہم السلام ہیں لیکن یہ روایات حدّ تواتر تک نہیں پہنچتیں اس بنا پر ان

1۔ رجوع کیجئے: سید محمد حسین طباطبائی، المیزان فی تفسیر القرآن انتشارات اعلمی جلد 2 صفحہ 141 و 142۔)

2۔ نمونہ کے طور پر ملاحظہ کیجئے، کلینی کی الاصول من الکافی، کتاب الحجۃ باب طبقات الانبیاء والرسل والائمہ حدیث 3۔ علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول کہ اولوا العزم پیغمبر پانچ افراد ہیں اس مطلب پر روایت حد مستفیض پر دلالت کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہو المیزان جلد 2 صفحہ 145، 146 اور جلد 18 صفحہ 220۔

کو دلیل ظنی شمار کیا جاتا ہے دلیل قطعی نہیں ہیں۔ ان مطالب سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اگر ہم کو کوئی ایسی آیت یا روایت ملے جو اس چیز پر دلالت کرے کہ اولو االعزم انبیاء علیہم السلام صاحبانِ کتاب و شریعت ان پانچ انبیاء سے زیادہ ہیں تو وہ دلیل کسی معارض کے بغیر قابل قبول ہوگی اور اس کے مطالب کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ بہر حال اس وقت یہی کہا جا سکتا ہے کہ صاحبانِ کتاب و شریعت انبیاء علیہم السلام کو ان پانچ انبیاء علیہم السلام میں منحصر کرنا دلیلِ ظنی کے تحت ہے اور اس کا اظہار صرف بعض روایات سے ہوتا ہے۔

صاحبانِ کتاب اولو االعزم انبیاء علیہم السلام کی رسالت کا دائرہ

اب سوال یہ ہے کہ آیا اولو االعزم انبیاء علیہم السلام کی رسالت (چاہے وہ پانچ افراد ہوں یا زیادہ) ساری دنیا کے لئے تھی یا ان میں سے ہر ایک نبی کسی خاص قوم کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا تھا؟ جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت پوری دنیا کیلئے تھی لیکن دوسرے اولوا العزم انبیاء علیہم السلام کے بارے میںکیا کہا جائے؟ اس سوال کے جواب میں اسلامی دانشمندوں نے دو بنیادی نظریے پیش کئے ہیں:

الف: اولوا العزم انبیاء علیہم السلام کی رسالت عالمی رسالت نہیں تھی یعنی پوری دنیا کے لئے وہ رسول بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے مثال کے طور پر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام صرف بنی اسرائیل کیلئے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے اور ان کی دعوت اسی قوم سے مخصوص تھی۔ بعض آیات سے بھی ان کے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے

(وَ رَسُوْلاً اِلَیٰ بَنِیْ اِسْرَا ئِیْلَ)[1]

"اور (عیسیٰ کو) رسول کے عنوان سے بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گا"

(وَاِذْ قَالَ عِیْسَیٰ ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْ اِسْرَا ئِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللهِ اِلَیْکُمْ)[2]

"اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس خدا کا بھیجا ہوا (آیا) ہوں"۔[3]

مندجہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان انبیاء علیہم السلام کی رسالت پوری دنیا کیلئے نہیں تھی اس بناء پر ایک

1۔ سورۂ آلِ عمران آیت49۔

2۔ سورۂ صف آیت6۔

3۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میںبھی بہت سی آیات ہیں جو اس چیزپر دلالت کرتی ہیں کہ وہ خاص بنی اسرائیل کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے مثال کے طور پر سورۂ اسراء کی دوسری آیت میں ارشاد خداوندی ہے :

(وَآتَيْنَا مُوْسَىٰ الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاه هُدىً لِبَنِيْ اِسْرَائِيْلَ) "اور ہم نے موسیٰ کو کتاب(توریت)عطا کی اور اسکو بنی اسرائیل کا رہنما قرار دیا ۔۔۔" اسی طرح ملاحظہ فرمائیں سورۂ اسراء (آیت101)سورۂ طہ آیت47، سورۂ شعراء آیت 17۔اور سورۂ غافر آیت53۔

پیغمبر کے آسمانی کتاب کے حامل ہونے اور اس کے عالمی ہونے کے مابین کوئی لزوم نہیں پایا جاتا ۔

ب۔دوسرے نظریہ کی بنیاد پر اولوا العزم انبیاء علیہم السلام اور صاحبان کتاب دو طرح کے تبلیغی فرائض انجام دیتے تھے ۔

1۔خدا کی عبادت ،توحید اور شرک نہ کرنے کی دعوت ۔

2۔ایک خاص شریعت اور احکام کی دعوت ۔پہلی دعوت پوری دنیا کیلئے تھی اس کے برخلاف دوسری دعوت ایک خاص قوم سے مخصوص تھی مثال کے طورپر آیات قرآنی سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کوپیغام توحید کے ساتھ شرک نہ کرنے کی دعوت دی تھی اور اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت اپنے اعتقادی پہلو سے فرعون اور فرعونیوں کے لئے بھی شامل تھی حالانکہ ان کا بنی اسرائیل میں شمار نہیں ہوتا ۔ دوسری طرف بنی اسرائیل کے مصر سے خارج ہونے اور ان کے اس سرزمین میں پہنچنے کے بعد کہ جس کا خدا نے حکم دیا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کچھ تختیاں نازل ہوئیں ان الواح پر وہ احکام درج تھے جو قوم بنی اسرائیل سے مخصوص تھے اس بنا دوسرے قبیلوںاور قوموں کو خطاب نہیں کیا گیا تھا ۔

اس خیال کی بنیادپر حامل کتاب انبیاء علیہم السلام ایک طرف تو دعوت عام کے تحت پوری دنیا کو توحید یعنی خدائے لاشریک کی عبادت کی دعوت دیا کرتے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم والوں کو مخصوص احکام و شرائع کی دعوت دیا کرتے تھے اور قوم پر ان احکام کی اطاعت واجب تھی ۔

یہ دونوں نظریے اس باب میں بیان کئے گئے تمام نظریوں میں سب سے اہم نظریے ہیں۔ ان نظریوں کے تنقیدی جائزے اور اپنی رائے کے اظہار سے پہلے تمہید کے طور پر چند مقدموں کا بیان کردینا ضروری ہے ۔

ادیان الٰہی ایک ہیں یا کئی؟

پہلا مقدمہ دینوں اور شریعتوں کے اختلافات کے بارے میں ہے ۔گذشتہ بحثوں میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اصولی طور پر تمام ادیان اور آسمانی شریعتیں اس طرح ایک ہی دین میں پروئے ہوئے ہیں کہ ان کو متعدد ادیان شمار نہیں کیا جاسکتا ۔اب ممکن ہے کوئی کہے بہر حال آسمانی ادیان میں کچھ جزئی اختلافات دیکھنے میںآ تے ہیں جن کا کسی صورت میں انکار نہیں کیا جاسکتا اور ان اختلافات کو دیکھتے ہوئے آسمانی ادیان کے ایک ہونے کا دعویٰ کس طرح کیا جاسکتا ہے؟ اس کے جواب میں پہلے ادیان کے مابین ایک دوسرے سے اختلاف کی کیفیت کا جائزہ لیں اور اسکے بعد یہ دیکھیں کہ کیا یہ اختلافات خدا کے ادیان کی اصل روح میں بھی اختلاف کا باعث ہیں یا نہیں؟در اصل ادیان حق کے مابین جو اختلافات قابل تصوّر ہیں تین حصّوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں ۔

الف :پہلے حصے میں وہ فرق آتے ہیں جو دو ادیان کے احکام کے دائرے میں اختلاف کا نتیجہ ہیں :

ممکن ہے ایک دین کی آسمانی کتاب کے احکام و قوانین کا دائرہ دوسرے دین کی آسمانی کتاب کے دائرے سے زیادہ وسیع ہو۔اس صورت میں ہم کو کچھ ایسے احکام نظر آئینگے جو ایک دین میں تو بیان کئے گئے ہیں لیکن دوسرے دین میں ان کا کوئی نام و نشان بھی نہیں ہے ۔یہ اختلاف شاید دو امتوں کے درمیان ان کے پیچیدہ قسم کے معاشرتی روابط میں موجود اختلافات کا نتیجہ ہو بعض معاشرے سماجی طور پر سادہ زندگی بسر کیا کرتے تھے اور ان کے افراد کے درمیان معاشرتی روابط میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں تھی ۔ظاہر ہے اس طرح کے معاشرہ میں مخصوص معاشرتی قوانین بنانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی اور پیغمبر کے ذریعے اس طرح کے احکام کا بھیجا جانا بھی بیکار تھا۔ اسکے مقابل کچھ معاشرے بہت ہی پیچیدہ قسم کے معاشرتی امور میں الجھے ہوئے تھے اور یہ حقیقت اس بات کی متقاضی تھی کہ ان کیلئے مخصوص احکام و قوانین بنائے جائیں ۔اس بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالباً اس قسم کے اختلاف کی ایک دلیل مختلف امتوں اور معاشروں کا اپنی ساخت کے اعتبار سے مختلف ہونا رہا ہو جو اپنی جگہ خود شریعت اور معاشرتی احکام کے دائرہ میں شریعتوں کے اختلاف کا سبب ہوئے ہوں البتہ جیسا کہ ہم نے اپنی تحریر میں زور دیا ہے یہ بات صرف احتمال کے طور پر پیش کی گئی ہے جو پہلی قسم کے اختلاف کی دلیل کے عنوان سے ذہن میں آتی ہے۔

ب: اختلاف کی دوسری قسم ان امور سے تعلق رکھتی ہے جہاں شرعی حکم کے طور پر ایک دین میں بیان کیا ہوا قانون اور حکم دوسرے دین میں نسخ کردیا گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بہت سے امور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی موسوی شریعت کے زمانہ میں بنی اسرائیل پر حرام تھے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں حلال ہوگئے ۔ دوسرے لفظوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے بعض احکام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آئین و شریعت میں منسوخ کردیئے گئے قرآن کریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی، جب آپ بنی اسرائیل کے درمیان مبعوث کئے گئے، فرماتا ہے: (وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ (1))

"۔۔۔اور میں بعض ان چیزوں کو حلال قرار دوگاں جو تم پر حرام تھیں ۔۔۔"۔

اس طرح گذشتہ شریعت کے بعض احکام کا نئی شریعت میں نسخ کردیا جانا بھی دو شریعتوں میں ایک قسم کے اختلاف کا باعث بنا ہے۔

ج: اختلاف کی تیسری قسم ایسے مقامات سے تعلق رکھتی ہے جہاں کسی دین میں ایک حکم بنیادی طور پر جس وقت

1۔ سورۂ آلِ عمران آیت50۔

بیا ن کیا گیا ہے اسی وقت سے اس کو ایک خاص گروہ یا خاص قوم سے اس طرح مخصوص کردیا گیا ہو کہ حتیٰ اس حکم میں خود اس قوم کے معاصر دوسرے گروہوں یا قوموں کو شامل نہ کیا گیا ہو۔چنانچہ بنی اسرائیل پر حرام کی جانے والی بعض چیزیں اسی قسم کی تھیں :

(فَبِظُلْمٍ مِنْ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيلِ اللهِ كَثِيرًا وَأَخْذِهِمْ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا)[1]

"پس ان یہودیوں کے ظلم کی بناء پر ہم نے جن پاکیزہ چیزوں کو حلال کر رکھا تھا ان پر حرام کر دیا اور ان کے اکثر لوگوں کو را ہِ خدا سے روکنے کی بنا پر اور سود لینے کی بناء پر جس سے انھیں روکا گیا تھا اور ناجائز طریقہ سے لوگوںکا مال کھانے کی بناء پر(حلال چیزیں حرام کردیں) اور ہم نے کافروں کے لئے بڑا دردناک عذاب مہیا کیا ہے"۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا ان آیات میں بظاہر(من الذین ھادوا) سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بعض حلال امور کا حرام کہا جانا مخصوص طور پر بنی اسرائیل سے تعلق رکھتا ہے اور ان کے درمیان عام طور پر رائج بعض گناہ(جیسے ظلم و ستم کرنا اور سود لینا)اس کا سبب بنے تھے ۔اس بناء پراگر اسی زمانہ یا اس کے بعد والے زمانوں میں کوئی پیغمبر کسی دوسری قوم میں مبعوث کیا جائے گا تو اس کی شریعت میں یہ چیز حرام نہیں ہوگی ۔

یہاں یہ بات بیان کردینا ضروری ہے کہ اختلاف کی آخری دو قسموں کے درمیان بہت باریک سا فرق ہے۔دوسری قسم کے اختلافات ہمیشہ دو مختلف زمانوں کے لحاظ سے رو نما ہوئے ہیں کیونکہ اس کے ذیل میںبھی وہ مقامات آتے ہیں کہ جہاں ایک حکم کسی مخصوص شریعت میں ایک خاص زمانہ کیلئے بنایاجاتاہے اور کچھ مدت گذرجانے کے بعدوہ حکم دوسری شریعت میں منسوخ ہوجاتاہے لیکن تیسری قسم کا اختلاف ایک زمانہ میں بھی اس طرح واقع ہوسکتا ہے کہ فرض کیجئے دو شریعتیں ایک دوسرے کی معاصرہیں اور ان میں سے ایک شریعت میں ایسا حکم موجود ہے جو کسی ایک قوم سے مخصوص ہے لیکن دوسری شریعت میں (جو دوسری قوم کیلئے نازل ہوئی ہے)وہ حکم نہیں پایا جاتابہر حال یہ جو کچھ میں نے عرض کیا وہ مختلف طریقوں سے ادیان الٰہی کے درمیان ممکنہ یاواقعی اختلاف کی قسمیں ہیں اور اس مقام پر دونکتوں کی طرف توجہ لازم ہے :

1۔سورۂ نساء آیت 160۔161۔

ایک :جیسا کہ غور و فکر سے یہ بات آشکار ہوجاتی ہے کہ مختلف شریعتوں میں بیان شدہ تمام اختلافات مشیّت الٰہی کے تابع ہیں اور ان میں حقیقی مصلحتیں پائی جاتی ہیں جو مختلف قوموں کے درمیان موجود مخصوص حالات اور خصوصیّات کے تحت ہیں۔دوسرے لفظوںمیں یہ اختلافات امتوں پرزبردستی نہیں لادے گئے تھے اور نہ ہی شارع مقدّس کے دائرہ ارادہ سے خارج تھے

دو :ادیان الٰہی کے پیرؤوں کے درمیان کچھ اختلافات ان تحریفات کی وجہ سے وجود میں آئے ہیںجو خود آسمانی شریعتوں کے طرفداروں نے تاریخ کے طویل دور میں انجام دئے ہیں چنانچہ ہم نے اس سے قبل جو تقسیم بندی کی تھی اس میں اس طرح کے اختلافات کو مد نظر نہیں رکھا گیا ہے ۔

دین کے اندر اختلافات

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ مندرجہ بالا اختلاف کی تینوں قسمیں کیا ایک ہی دین میں راہ بنا سکتی ہیں الٰہی ادیان میں اختلاف کی پہلی قسم دینی احکام و قوانین کے دائرے میں اختلاف سے تعلق رکھتی ہے اور بظاہر اس طرح کے اختلاف ایک ہی دین میں پایا جانا ممکن ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی بعثت کی ابتداء میں تمام احکام ایک ساتھ نازل ہوئے ہیں بلکہ اسلامی احکام بعثت کے بعد کئی سال کے دوران پہنچائے گئے ۔ پیغمبر اکرم ابتداء میں محدود دائرے میں کچھ احکام لیکر آئے تھے اور پھر ان احکام میں آہستہ آہستہ قدم بہ قدم وسعت عطا کی ہے ۔اس تاریخی حقیقت کے پیش نظر ممکن ہے کہ ایک دین کے احکام کا دائرہ اس دین کے لانے والے پیغمبر کی زندگی کے دوران دو مختلف مرحلوں سے گذرے :

ایک مرحلہ میں دائرہ احکام محدود ہوا اور دوسرے مرحلہ میں دائرہ احکام وسیع اور پھیلاہوا ہو ۔

یہاں پہ یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس طرح کا اختلاف ایک دین کو کئی ادیان قرار دینے کا باعث نہیں ہوتا اور اسی وجہ سے الٰہی ادیان میں اس قسم کے اختلاف کو خدا کے دین میں بنیادی دوئی اور کثرت کی دلیل اور علامت نہیں سمجھناچاہئے ۔دوسرے لفظوں میں جس طرح یہ اختلاف اندرونی طورپر (اسلام جیسے) ایک دین میں ممکن ہے اس طرح کے اختلاف اگر دودین کے اندر ہوں تو اس کو ان کے درمیان کسی بنیادی اختلاف کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا ۔

دوسری قسم کے اختلاف میں بھی یہی بات صادق آتی ہے ۔اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ اسلام کے آغاز میںبعض احکام (جیسے قبلہ کا مسئلہ) ایک عنوان سے بیان کیاگیا اور اسکے بعد وہ حکم منسوخ کرکے دوسرا حکم دیدیا گیا اسی طرح سورئہ نور میں اکثر مفسرّین قرآن کے خیال کے مطابق ایک ایسا حکم بیان ہوا ہے جو بعد میں منسوخ کردیا گیا :

(اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَالزَّا نِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَااِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِک وَحُرِّمَ ذَالِکَ عَلَی الْمُوْمِنِیْنَ)[1]

"زانی مرد، زانیہ یا مشرکہ عورت ہی سے نکاح کرے گا اور زانیہ عورت زانی مردیا مشرک مرد ہی سے نکاح کرے گی کہ یہ صاحبانِ ایمان پر حرام ہیں"۔

اکثر مفسروں کے عقیدے کے مطابق مندرجہ بالا آیت سے ایک مسلمان زانی یا زانیہ کا کسی مشرک کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے لیکن یہ حکم بعد میں منسوخ ہوگیا اور موجودہ حکم شرعی کے تحت اس طرح کی شادی صحیح نہیں ہے۔یہاں یہ بات بھی بیان کردینا ضروری ہے کہ عصر حاضر کے بعض بزرگوں نے اس آیت کی ایک دوسرے طریقہ سے تفسیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس آیت میں حکم شرعی بیان نہیں ہوا ہے لیکن حق یہی ہے کہ یہ آیت حکم شرعی کے بیان میں ظہور رکھتی ہے یعنی بظاہر اس میں شرعی حکم بیان ہوا ہے۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کے بعض ابتدائی احکام منسوخ بھی ہوئے ہیں۔اس بناء پر خود ایک شریعت کے اندر نسخ واقع ہونا ایک ممکن امر ہے اور اس شریعت کی وحدت کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔اگر کسی شریعت میں کوئی حکم خدا ایک مدت تک ثابت رہے اور اسکے بعد منسوخ ہوجائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ شریعت ہی بدل گئی ہے۔اس بناء پر جس طرح ایک دین کے اندر کسی حکم کا منسوخ ہونا کسی شریعت یا دین کے منسوخ ہونے کا باعث نہیں ہوتا اسی طرح کسی پیغمبر کے ذریعہ ایک الٰہی دین کے گذشتہ احکام کا منسوخ کیا جانا ان دونوں شریعتوں میں کسی بنیادی اختلاف کی دلیل نہیں کہا جائے گا۔مثال کے طور پر یہ حقیقت کہ حضرت عیسیٰ کے آنے کے بعد حضرت موسیٰ کی شریعت کے بعض احکام منسوخ ہوگئے بالکل اسی طرح ہے کہ جیسے مذکورہ احکام خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور حیات میں منسوخ ہوگئے ہوں اور ان دونوں مفروضوں کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں ہے مختصر یہ کہ دو شریعتوں میں اختلاف کی یہ دوسری قسم بھی (پہلی قسم کی طرح)بنیادی طور پر کئی ادیان ہونے کا باعث نہیں ہے ۔اب اختلاف کی تیسری قسم کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟کیا اختلاف کی یہ قسم بھی کسی دین کے اندر واقع ہوئی ہے ؟ اسکے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہ ظاہر اس طرح کا اختلاف ایک دین کے اندر ممکن ہے اور اس میں کوئی عقلی قباحت نہیں ہے یعنی ممکن ہے ایک شریعت کے بعض احکام کسی مخصوص گروہ سے تعلق رکھتے ہوں اور بقیہ تمام احکام عام ہوں۔

بیان شدہ مطالب سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مختلف ادیان الٰہی کے درمیان موجود اختلافات کو ایک ہی دین میں

1۔سورۂ نور آیت3۔

اس کے مشابہ اختلافات کے وقوع یا امکان وقوع کی بنیاد پر ان کی ذات میں جدائی کا باعث نہیں قرار دیا جاسکتا ۔ اس اساس و بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ حقیقی دین ایک ہی ہے اوروہ اسلام کے علاوہ کچھ نہیں ہے لیکن زمانے کے تقاضوں کے اعتبار سے ان کے احکام کے دائرے اور ان پر عمل کرنے والوں کے لحاظ سے تبدیلی ہوئی ہے ۔ اس بناء پر تمام ادیان الٰہی کی اساس و بنیاد ایک ہے اگرچہ زیر بحث اختلافات کی موجودگی کے تحت ایک طرح سے ادیان الٰہی کا کئی یا الگ الگ دین ہونا نظر میں رکھا جاسکتا ہے اس سے زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ حقیقت دین ایک ہی ہے اور یہ حقیقت واحدہ وہی اسلام (اپنے معنائے عام میں)ہے: (اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللهِ الِاسْلَامُ) لیکن تاریخ کے طویل دور میں زمانہ کے تقاضوں کے لحاظ سے مختلف شریعتیں انسانوں کے درمیان نازل ہوئی ہیں ۔ اس بناء پر دین الٰہی کا ایک ہونا شریعتوں کے کئی ہونے کے ساتھ بالکل سازگار ہے ۔

عالمی رسالت کا مفہوم

اولوا العزم انبیاء علیہم السلام کی رسالت کے عالمی ہونے کے مسئلہ کا جواب عرض کرنے سے پہلے ایک اور بات مقدمہ کے طور پر بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ رسالت کے جہانی ہونے سے مراد کیا ہے ؟ اگر کسی بھی صورت سے تمام قوموں سے رابطہ اور ملتوں سے رابطہ برقرار کر کے ان تک خدا کا پیغام پہنچانا ایک رسول کے فرائض میں شامل ہو تو اس کو عالمی رسالت کا حامل رسول کہا جاتا ہے ۔ اس کے بالمقابل ایک پیغمبر کی رسالت اس وقت تک عالمی نہیں ہوگی کہ جب تک پوری دنیا تک اپنی دعوت پہنچانا اس کے فرائض میں شامل نہ ہو بلکہ وہ ایک خاص قوم کے لئے مبعوث کیا گیا ہو، یقینا ایک پیغمبر کے تمام لوگوں کے لئے مبعوث نہ کئے جانے کی مختلف وجہیں ہو سکتی ہیں :

ایک دفعہ ممکن ہے تمام قوموں سے رابطہ برقرار کرنے کے مروجہ وسائل اس کے پاس نہ ہوں ، یا پیغمبر کے اختیار میں اصولی طور پر اس طرح کا فریضہ انجام دینے کے لئے موقع نہ ہو ۔ سب جانتے ہیں کہ گزشتہ زمانوں میں دور دراز علاقوں سے رابطہ برقرار کرنا آسان کام نہیں تھا اور بعض دور دراز ملکوں کا سفر کرنا عام طور پر ایک غیر ممکن امر شمار کیا جاتا تھا ۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں جبکہ سفر کے وسائل بالکل ابتدائی تھے اور ایک شخص کے لئے پوری دنیا سے رابطہ برقرار کرنے کا امکان نہیں تھا ۔

ممکن ہے کوئی کہے اگرچہ گزشتہ زمانوں اور دور دراز علاقوں سے عام طور پر رائج طریقوں سے رابطہ برقرار کرنا ممکن نہ رہا ہو لیکن الٰہی انبیاء علیہم السلام کے لئے کسی غیر معمولی طریقے ، مثلاً معجزہ وغیرہ سے کام لیکر اس کام کا انجام دینا مسلم طور پر ممکن تھا ۔ اس کے جواب میں اس بات پر توجہ دینی چاہیئے کہ تاریخی شواہد کی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کی روش یہ رہی ہے کہ اس طرح کے موقعوں پر وہ غیر معمولی طریقے یعنی معجزے وغیرہ سے کام نہیں لیتے تھے ۔

خدا کے پیغمبر مخصوص مقامات پر ہی معجزہ دکھانے کا اقدام کیا کرتے تھے اور یہ مقامات بھی صرف ان کی رسالت اور دعوتِ تبلیغ کے الٰہی ہونے کی تائید سے تعلق رکھتے ہیں دعوت تبلیغ میں آسانی کے لئے وہ اعجاز کا سہارا نہیںلیتے تھے ۔

بہر حال یہ بات مسلّم ہے کہ تمام قوموں اور ملّتوں کے ساتھ رائج طریقہ سے رابطہ بر قرار کرنا تمام انبیاء کے لئے ممکن نہیں تھا اور بظاہر دنیوی وسائل سے ما فوق غیر معمولی طریقوں سے استفادہ کرنے پر وہ مامور بھی نہیں تھے ۔ مذکورہ مفہوم کی بنیاد پر یہ ادّعا کیا جا سکتا ہے کہ صرف پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت پوری دنیا کے لئے عالمی رسالت تھی اور آپ اپنی دعوتِ تبلیغ میں غیر عرب اقوام تک الٰہی پیغام پہنچانے کے لئے مامور کئے گئے تھے لیکن بقیہ تمام انبیاء کی رسالت بظاہر عالمی رسالت نہیں تھی ۔

یہاں ، چند باتوں پر توجہ ضروری ہے :

پہلی بات یہ کہ جن قوموں میں تبلیغ کے لئے پیغمبر بھیجے گئے تھے ان سے مراد قوموں کی ایک ایک فرد نہیں بلکہ جو کچھ ان سے توقع تھی نیز جو چیز پیغمبر کے فرائض میں شامل تھی اپنا پیغام قوموں کے سردار تک پہنچا دینا رہا ہے ۔

دوم یہ کہ تبلیغ رسالت کی ذمہ داری چاہے پیغمبر اکرم ﷺ کے دور حیات میں پوری ہو یا اُنکی وفات کے بعد آپ کی وفات کے بعد آپکے اوصیاء یعنی ائمہ معصوم کے ذریعہ پوری ہو دونوں کو شامل ہے۔

سوم یہ کہ پیغمبر اکرم ﷺ کا اپنی عمومی اور عالمی رسالت پر فائز ہونا اس معنی میں نہیں ہے کہ اب اس کام کی راہ میں حائل تمام عملی رکاوٹیں بر طرف ہو گئی ہیں بلکہ بہت سے مقامات پر آپ کو تبلیغ میں رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ایسی صورت میں مسلمہ طور پر پیغمبر اکرم ﷺ کے کاندھوںسے اس کی ذمہ داری اٹھالی گئی ہے ۔

تمام الٰہی انبیاء علیہم السلام پر ایمان ضروری ہے

ہم عرض کر چکے ہیں کہ تاریخی شواہد کے مطابق پیغمبر اکرم ﷺ سے پہلے کے انبیاء علیہم السلام کی رسالت عالمی نہیں تھی لیکن اس بات کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر ان انبیاء کی قوموں کے علاوہ کوئی شخص ان کی دعوت سے آگاہ ہو جائے تو اس کے لئے اس دعوت سے انکار جائز ہو ۔ جیسا کہ ہم نے اپنی کتاب "راہ کی معرفت "میں بحث کے آخری حصے میں عرض کیا تھا کہ نبوت ایک الٰہی سلسلہ ہے اور ہر مومن کے لئے تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا ضروری ہے اس بارے میں قرآن کریم فرماتا ہے :

(ئَ ا مَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْ مِنُوْ نَ كُ ُلّ ئَ ا مَنَ بِ اللهِ وَمَلٰئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ) [1]

"رسول ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا ہے جو اس(خدا) کی طرف نازل کی گئی ہیں اور مومنین بھی سب اللہ اور ملائکہ اور مرسلین پر ایمان رکھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہم رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔۔۔"۔

اس بناء پر اگر کوئی کسی کو کسی پیغمبر کی رسالت کا علم دے اور وہ اس پیغمبر کی رسالت پر ایمان نہ لائے تو گویا اس نے تمام انبیاء علیہم السلام کی رسالت کا انکار کردیا ہے۔یہ حکم اسی طرح ان افراد کے لئے بھی ہے جو کسی نبی کی قوم میں شمار نہیں ہوتے یعنی جس قوم کے درمیان پیغمبر مبعوث کیا گیا ہے۔ان میں نہیں ہیں مثال کے طور پر چین میں زندگی بسر کرنے والا اگر اس بات سے باخبر ہو کہ مشرقِ وسطیٰ میں اس علاقے کی قوموں کیلئے ایک پیغمبر مبعوث ہوا ہے تو اس پر اس پیغمبر اکرم ﷺ کی دعوت کا قبول کرنا لازم ہے۔

اب ممکن ہے یہ سوال پیدا ہو کہ مذکورہ اصول کے تحت ایک شخص جو دو پیغمبروں کے دور حیات میں زندگی بسر کررہا ہو اگر دونوں پیغمبروں کی رسالت سے آگاہ ہوجائے اور ان دونوں پیغمبروںکی شریعت کے بعض احکام میں اختلاف بھی پایا جاتا ہو تو ایسے ینّاس شخص کا کیا فریضہ ہے؟اس سوال کے جواب میں کہنا چاہیے کہ:اگر بالفرض دو ہم عصر انبیاء علیہم السلام کے درمیان اختلاف ہو تو یہ اختلاف صرف اسی صورت میں قابل تصور ہے کہ ان دونوں میں سے ایک پیغمبر کسی خاص گروہ کیلئے خاص احکام لیکر مبعوث ہوا ہو اس صورت میں اگر منظور نظر شخص مذکورہ گروہ سے الگ ہو(جیسا کہ کچھ خاص احکام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں صرف قوم یہود سے مخصوص تھے)تو اس پر ان مخصوص احکام کا بجالانا لازم نہ ہوگا مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں کوئی غیر یہودی شخص اگر آنحضرت کی رسالت سے باخبر ہوجائے تو اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن اس شخص پر یہودی قوم سے مخصوص احکام پر عمل کرنا لازم نہیںہے جبکہ اس پر بقیہ تمام احکام وقوانین کی اطاعت لازم ہے۔

قرآن کریم کی آیات کے مطابق اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جنوںکا ایک گروہ حضرت موسیٰ پر ایمان لے آیا اور اسکے بعد حضرت رسول خدا ﷺ کی رسالت کا علم ہوجانے کے بعد انھوں نے دین اسلام کو قبول کرلیا۔حالانکہ ہمارے پاس کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جو اس چیز پر دلالت کرتی ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جنوں کے لئے مبعوث نہیں کئے گئے تھے ان کا ایک گروہ توریت کے نازل ہونے کی خبر ملنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان

1۔ سورۂ بقرہ آیت 285۔

لے آیا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَاِذْصَرَفْنَااِلَیْکَ نَفَرًامِنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرآنَ فَلَمَّاحَضَرُوْهُ قَالُوْآأَنْصِتُوافَلَمَّاقُضِیَ وَلَّوْااِلَیٰ قَوْمِهِمْ مُنْذِرِیْنَ۔ قَالُوْایٰقَوْمَنَااِنَّاسَمِعْنٰا کِتَاباً اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسَیٰ مُصَدِّقاً لِمَابَیْنَ یَدَیْه یَهدِیْ اِلیٰ الحَقِّ وَاِلَیٰ طَرِیقٍ مُسْتَقِیْمٍ)[1]

"اور جب ہم نے جنات سے ایک گروہ کو آپ کی طرف متوجہ کیا کہ قرآن سنیں تو جب وہ حاضر ہوئے تو آپس میں کہنے لگے کہ خاموشی سے سنو پھر جب تلاوت تمام ہوگئی تو فوراً پلٹ کر اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر آگئے کہنے لگے کہ اے قوم والو ہم نے ایک کتاب کو سنا ہے جو موسیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے یہ اپنے پہلے والی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور حق و انصاف اور سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرنے والی ہے"۔

جنوں نے یہ جو کہا ہے کہ:"مِنْ بَعْدِ مُوسَیٰ""موسیٰ کے بعد"اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا درمیان میں کوئی ذکر نہ کرنا بتاتا ہے کہ ابھی تک وہ (جن)حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی پیروی کررہے تھے اور قرآن سے آشنا ہوجانے کے بعد انھوں نے اپنی قوم کے پاس جاکران کو اسلام کی دعوت دی۔ سورۂ مبارکہ جن میں بھی اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے:

(قُلْ أُوحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَر مِنَ الجِنِّ فَقَالُوْااِنَّاسَمِعْنَاقُرْآناًعَجَباًیَهْدی اِلیَ الرُّشْدِ فَآمَنَّابِهِ) [2]

"پیغمبر اکرم آپ کہہ دیجئے کہ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے کان لگا کر قرآن کو سنا تو کہنے لگے کہ ہم نے ایک بڑا عجیب قرآن سنا ہے جو نیکی کی ہدایت کرتا ہے پس ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں۔۔۔"۔

بہر حال یہ آیتیں اس بات کی شاہد ہیں کہ اگر کوئی مکلّف کسی پیغمبر کی رسالت سے باخبر ہوجائے تو اس کو اس پیغمبر ﷺ کی رسالت قبول کرنا چاہئے چاہے وہ پیغمبر اس قوم کی طرف مبعوث نہ کیا گیا ہو اور رسالت قبول نہ کرنے کے بعد اس پیغمبر کی تعلیمات کو بھی صحیح سمجھے اور اس کے عام احکام کی (جو کسی قوم یا گروہ سے مخصوص نہ ہوں) اطاعت و پیروی کرلے ۔

1۔ سورۂ احقاف آیت29۔30۔

2۔ سورۂ جن آیت1۔2۔

البتہ الٰہی انبیاء کی رسالت کے پیغامات پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ کسی قوم یا گروہ کے لئے مخصوص احکام انگلیوں پر گنے چنے ہی ملیں گے۔ مجموعی طور پر انبیاء کی تعلیمات کی روح سبھی کے لئے مشترک احکام اور اصول پر استوار ہوتی تھی ۔

مثال کے طور پر نماز اور زکوٰۃ کی مانند عبادتیں تمام ادیان میں تھیں اور ان میں زیادہ سے زیادہ اختلاف ان اعمال کی شکل و صورت میں رہاہے اسی طرح دوسرے احکام جیسے ظلم اور زیادتی کرنے کم تولنے، غیبت کرنے ،شراب پینے زنا کرنے وغیرہ کی ممانعت اور معاشرتی اور خاندانی تعلقات سے متعلق قوانین تمام دینوں میں بیان کئے گئے ہیں ۔

بہر حال مندرجہ بالامطالب سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ایک پیغمبر کی رسالت کے عالمی ہونے کا مسئلہ اور یہ کہ علم کی صورت میں ایک پیغمبر کی رسالت پر پوری دنیا کا ایمان لانا ضروری ہوتا یہ دو الگ الگ مسئلے ہیں اور ایک دوسرے سے جداہیں اس بناء پر بہت سے انبیاء کی رسالت کے عالمی رسالت نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عوام الناس ان کی تائیدیا تکذیب کے سلسلے میں آزاد و خود مختار ہوںبلکہ اگر کسی پیغمبر ﷺ کی رسالت پر ایمان لاناہر مکلّف کا فریضہ ہے اور نبی کی تکذیب کی صورت میں اسکا عذر ہرگز قابل قبول نہیں ہے ۔

ہم پہلے یہ بات عرض کرچکے ہیں کہ بعض علماء کے نزدیک بعض انبیاء علیہم السلام کے فرائض دو قسم کے تھے:

پہلافریضہ: توحید کی دعوت دیناتھا۔دوسرا فریضہ :ان تمام اصول اور احکام کی دعوت دینا تھا جو کسی خاص قوم سے مخصوص ہوتے تھے ۔مذکورہ گزارشات کے پیش نظریہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ خیال درست نہیں ہے اس لئے کہ انبیاء کے تمام احکام و قوانین ان تمام افراد کے لئے لازم العمل ہیں جو ان کی رسالت سے آگاہ ہوجائیں قرآن کریم کے مطابق خدا کے پیغمبر جس طرح لوگوں کو خداکی وحدانیت کی دعوت دیا کرتے تھے ان کو مطلق طور پر اپنی اطاعت اور پیروی کی دعوت بھی دیتے تھے قرآن کریم فرماتا ہے :

(وَمَاارْسَلْنَامِنْ رَسُولٍ اِلّالِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللہ) [1]

"اور ہم نے کسی بھی رسول کو نہیں بھیجا ہے مگر یہ کہ حکم خدا سے لوگ ان کی اطاعت کریں ۔۔۔"۔

1۔ سورۂ نساء آیت64۔

قرآن کریم نے بہت سے انبیائے الٰہی کی زبانی اعلان کیا ہے:

(فَاتَّقُوْا اللہ وَاَطِیْعُوْنِ)[1]

"پس تم خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو"۔

اور ایک آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

(تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَیٰ عَبْدِہِ لِیَکُوْنَ لِلْعَالَمِیْنَ نَذِیْراً)[2]

"بابرکت ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا ہے تاکہ وہ سارے عالمین کے لئے عذاب الٰہی سے ڈرانے والابن جائے"۔

اس بناء پر ایسا نہیں ہے کہ مثلاً مصر کے قبیلوں سے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت (چونکہ بنی اسرائیل کے ہم قوم نہیں تھے)اس بات میں محدودہوکہ وہ ان کو بھی بت پرستی چھوڑنے اور خدائے وحدہ لاشریک کی پرستش کرنے کی دعوت دیں لیکن ان کی اعتقادی یا عملی رخ سے اس منزل کی طرف رہنمائی سے پرہیز کریں ۔ ایسا نہیں ہے بلکہ (جیساکہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں)اگر یہ تسلیم کرلیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شروع میں صرف بنی اسرائیل کے لئے مبعوث کئے گئے تھے تو بھی آپ کی دعوت کے دائرے میں قبطیوں کے آجانے کے بعد موسیٰ علیہ السلام پرلازم ہوگیا تھاکہ ان کو بھی اپنی تعلیمات سے(تمام تفصیلات کے ساتھ)آگاہ کردیں اور خود ان (قبیلوں) کا بھی فریضہ تھاکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو قبول کریں اور اسکے تمام احکام پر (سوائے ان قوانین کے جویہودی قوم سے مخصوص تھے) عمل کریں۔

انبیاء علیہم السلام کی رسالت کا عالمی ہونا

گفتگو کے اس حصہ میں بیان کئے گئے مطالب سے صاف صاف یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ایک معنی کے لحاظ سے اگر رسالت کے عالمی ہونے کا جائزہ لیں تو بہت سے انبیاء علیہم السلام کوپوری دنیا کیلئے نہیں بھیجا گیاتھا لیکن

دوسرے معنی کے لحاظ سے تمام انبیاء علیہم السلام کی رسالت پوری دینا کیلئے تھی یعنی اگر رسالت کے عالمی ہونے کا

1۔یہ تعبیر متعدد آیتوں میں متعدد پیغمبروں کی زبانی نقل ہوئی ہے ۔مثال کے طورپر ملاحظہ فرمائیں سورۂ آل عمران آیت50 اور سورۂ شعراء آیت110، 144، 163۔

2۔سورۂ فرقان آیت 1۔

مطلب یہ ہو کہ پیغمبر کا فریضہ ہے وہ اپنی تعلیمات صرف اپنی قوم تک محدود نہ رکھے بلکہ دنیا کی تمام یا کم از کم اہم قوموں تک ضرور پہنچائے تو اس معنی میں بہت سے پیغمبر یہاں تک کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی رسالت بھی عالمی رسالت نہیں تھی لیکن اگر عالمی رسالت کا مطلب یہ ہو کہ متعلقہ تمام "قوموں تک سابقے کی صورت میں اپنی رسالت کا پیغام پہنچانا نبی پر لازم ہے اور کسی نبی کی نبوت سے آگاہ ہونے کے بعد تمام مکلفین پر اس کی اطاعت و پیروی لازم ہے "تو اس معنی میں تمام انبیاء کی رسالت عمومی اور عالمی رسالت تھی۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت کا عالمی ہونا

اگرچہ پیغمبر اسلام ﷺ کی عالمی رسالت پر گفتگو۔ نبوت خاصہ کی بحث میں(پیغمبر اسلام ﷺ سے متعلق بحث کے تحت) کی جاتی تو زیادہ مناسب ہوتا مگر یہاں مجموعی طور پر اس مسئلہ کا بیان کر دینا بھی شاید بے جا نہ ہو گا۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ " کیا پیغمبر اسلام ﷺ عالمی رسالت کے حامل تھے ؟"

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت کا عالمی ہونا اسلام کے ضروریات دین میں سے ہے۔ پھر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے (خاص طور سے مخالفین نے جو شبہات ایجاد کئے ہیں) ان کو برطرف کرنے کے لئے فریقین کی دلیلوں کا جائزہ لیں اور اپنا مدعا علمی دلائل سے ثابت کریں۔ اس بحث میں اُن آیات کا جو اسلام کی عالمی رسالت کو ثابت کرتی ہیں اور ان آیات کا جن سے مخالفین نے استفادہ کیا ہے تحقیقی جائزہ لینا ضروری ہے۔

قرآن کریم کی کچھ آیات بالکل واضح طور پر دعوت اسلام کے عالمی ہونے پر دلالت کرتی ہیں ایک آیت میں ارشاد ہوتا ہے :

(تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَیٰ عَبْدِهِ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیراً)[1]

"وہ ذات (خدا)بہت بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان (یعنی حق کو باطل سے جدا کرنے والی کتاب)نازل کی تاکہ تمام دنیاؤں کے لئے ڈرانے والا ہو"۔یہ آیت صاف طور پر دلالت کرتی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ تمام عالمین کے لئے "نذیر" بنا کر مبعوث کئے گئے ہیں اور انذار یعنی خبردار کرنے کا فریضہ (جو آپ کی رسالت اور پیغمبری کا حصہ ہے) کسی خاص قوم یا گروہ سے مخصوص نہیں ہے ایک اور مقام پر قرآن، نبی اسلام ﷺ کی زبانی کہتا ہے:

1۔ سورۂ فرقان آیت1۔

(وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھَذَا الْقُرآنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِهِ وَمنْ بَلَغَ)[1]

"۔۔۔اور یہ قرآن مجھ پر اس لئے وحی کیاگیا ہے کہ میںتمھیںاورجس شخص تک اس کاپیغام پہنچے اس کے ذریعہ اسے ڈراؤں۔۔۔"۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس آیت میں " مَن بَلَغَ "ایک عمومی تعبیر ہے "کہ جس تک بھی یہ پیغام پہنچے"یعنی اسلامی دعوت کے تحت آنے والے تمام افراد چا ہے (وہ کسی بھی قوم وگروہ اور وہ کسی بھی جگہ اور زمانہ سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں)سب شامل ہیں۔ قرآن ایک آیت میں فرماتا ہے:

(وَمَااَرْسَلْنَاکَ اِلَّا رَحْمَةًلِلْعَلَمِیْنَ)[2]

"اور(اے رسول)ہم نے آپ کو دنیاؤں کے لوگوں کیلئے سراپا رحمت بنا کر بھیجا ہے"۔

البتہ آخری آیت دلالت کے لحاظ سے پہلی دو آیتوں کے مانند نہیں ہے اس لئے کہ "پیغمبر کا تمام دنیاؤں کے لئے رحمت ہونا "صاف طورپر تمام دنیاؤں کے لئے مبعوث ہونے پر بھی دلالت نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود آخری آیت سے یہ ظاہریہ مطلب بھی نکلتا ہے کیونکہ پیغمبر اکرم ﷺ کے رحمت ہونے میں یقینی طورپر وہ رحمت شامل ہے جوراہِ حق کی ہدایت اور امت کی رہنمائی کے ذریعہ ان کو نصیب ہوتی ہے۔

قرآن کریم کی بعض آیتیں اس چیز کو بیان کرتی ہیں کہ دینِ اسلام تمام ادیان پر غالب آجائے گا۔ اور اس طرح کی آیات بھی اپنی جگہ پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت کے عالمی ہونے پر دلالت کرتی ہیں:

(هُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْ لَهُ بِالْھُدَیٰ وَدِیْنِ الْحَقّ لِیُظْھِرَهُ عَلَیٰ الدّ یْنِ کُلِّهِ وَ کَفَیٰ بِاللہ شَھِیْداً)[3]

"وہ وہی توہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت کے(قصد) سے سچادین دے کر بھیجا تاکہ اس کو تمام ادیا نِ عالم پر غالب بنائے اور گواہی کے لئے توبس خدا ہی کافی ہے"۔

1۔ سورۂ انعام آیت19۔

2۔ سورۂ انبیاء آیت107۔

3۔ سورۂ فتح آیت28۔

اسی مطلب کو قرآن حکیم کی دو آیتوں میں بھی بیان کیا گیا ہے خدا فرماتا ہے:

(هُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقّ لِیُظْهِرَهُ عَلَیٰ الدِّیْنِ کُلِّهِ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ)[1]

"وہ خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب بنائے چا ہے مشر کین کو کتنا ہی نا گوار کیوں نہ ہو"۔

یہ آیتیں صاف صاف اس چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ دین اسلام دنیا کے تمام ادیان پر غالب و کامران ہو گا اور ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا یا کم سے کم دوسرے ادیان پر دین اسلام چھا جائیگا اور یہ حقیقت دین اسلام کے عالمی ہونے کے علاوہ اور کچھ بیان نہیں کرتی۔

یہاں یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ "غلبہ" کے مفہوم میں دو احتمال پائے جاتے ہیں:

1۔ غلبۂ تشریعی۔

2۔ غلبۂ تکوینی۔

پہلے مفہوم سے جو بات لازم آتی ہے وہ ہمارے مدعا سے بہت قریب ہے اس لئے کہ اس کا کوئی مطلب ہی نہیں ہو گا کہ دین اسلام تو عالمی نہ ہو لیکن اس کے اصول و قوانین دوسرے تمام ادیان کے اصول و قوانین پر حاکم ہوجائیں اور اگر دوسرے معنی بھی مراد لئے جائیں تو آیت کا سیاق اس چیز کو بیان کر رہا ہے کہ یہ غلبہ وہ استحقاق ہے جو دین اسلام کی ذاتی صلاحیتوں کا نتیجہ ہے اور تمام ادیان پر غلبہ کی صلاحیت صرف اسلام کی عالمی دعوت کے ساتھ ہی معقول ہو سکتی ہے۔ بنا برایں اگر اسلام کے تمام ادیان پر غالب آجانے سے مراد حتی اس کا تکوینی غلبہ ہو تو یہ غلبہ بھی اسلامی احکام و شریعت کے دوسرے تمام احکام و قوانین پر غالب آجانے کو فرض کئے بغیر قابلِ تصور نہیں ہے۔

قرآن کی آیات کا دوسرا مجموعہ وہ ہے جس میں پیغمبر اسلام کا "ناس" یعنی (انسانوں) کے درمیان مبعوث ہونا اور قرآن کا "ناس" کے لئے نازل ہونا ذکر ہوا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ ابراہیم کا اس طرح آغاز ہوا ہے:

(کِتَابٌ اَنْزَلْنا هُ اِلَیْکَ لِتُخْرِ جَ النّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَیٰ النُّوْرِبِاِ ذْنِ رَبِّهِمْ اِلَیٰ صِراطِ الْعَزِیْزِالْحَمِیْدِ)[2]

1۔ سورۂ صف آیت9،اور سورۂ توبہ آیت33۔

2۔ سورۂ ابراہیم آیت1۔

"(اے رسول یہ قرآن وہ) کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف اس لئے نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں کو حکمِ خدا سے تاریکیوں سے نکال کر روشنی یئنلایئناس کی سیدھی راہ پر لائیں جو سب پر غالب اور سزاوار حمد ہے"۔

اسی طرح دوسری آیت میں بیان ہوا ہے:

(هَٰذابَلَٰغ لِلنَّا سِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهِ)[1]

"یہ قرآن لوگوں کے لئے ایک پیغام ہے (تاکہ اسی کے ذریعہ ہدایت یافتہ ہو جائیں) اور اس کے ذریعہ (عذاب خدا سے) ڈرتے رہیں"۔

کچھ دوسری آیتوں میں قرآن کریم کا ایک ایسی کتاب کے عنوان سے ذکر ہے جو ساری دنیا کے لئے بھیجی گئی ہے:

(اِنْ هُوَ اِلَّاذِكْرلِلْعٰا لَمِيْنَ)[2]

" اوریہ (قرآن) تو عالمین کے لئے سوائے نصیحت کے (کچھ نہیں) ہے"۔

(وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْر لِلْعٰلَمِيْنَ)[3]

"اور حالانکہ یہ (قرآن) تو سارے جہان کے واسطے سوائے نصیحت کے اور کچھ نہیں ہے"۔

چونکہ "ناس" یعنی "لوگ" اور عالمین "یعنی تمام دنیائیں" جیسے الفاظ صاف طور پر قرآن کریم اور پیغمبر کی رسالت کے مخاطبین کی عمومیت پر دلالت کرتے ہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیات بھی رسالت اسلام کے مکمل طور پر عالمی ہونے کی دلیل ہیں۔

1۔ سورۂ ابراہیم آیت 52۔

2۔ سورۂ یوسف آیت 104، سورۂ ص آیت 87 اور سورۂ تکویر آیت 27۔

3۔ سورۂ قلم آیت 52۔

مخالفین کی دلیلوں پر ایک نظر

مذکورہ آیتوں کے پہلو بہ پہلو دوسری آیات بھی ہیں جو ممکن ہے پہلی نظر میں دین اسلام کے عالمی نہ ہونے پر دلالت کرتی محسوس ہوں چنانچہ ان آیات کو بعض نے پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت اسلام کے مخصوص ہونے کے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے ثبوت کے طور پر پیش بھی کیا ہے یہ شبہ اس لئے پیدا ہوا ہے کہ ان آیات میں عرب قوم یا ان کے کسی مخصوص گروہ کو "انذار کرنے یعنی ڈرانے کی بات کی گئی ہے جیسا کہ سورۂ شوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ قُرْآناً عَرَبِیّاً لِتُنْذِرَاُمَّ الْقُرَیٰ وَمَنْ حَوْلَهَا)[1]

"اور ہم نے اسی طرح آپ پر عربی قرآن کی وحی بھیجی کہ آپ مکہ اور اس کے اطراف والوں کو ڈرائیں"۔

(وَهٰذٰاکِتَا بٌاَنْزَلْنَاهُ مُبارَک مُصَدِّ قُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَاُمَّ الْقُرَیٰ وَمَنْ حَوْلَهَا)[2]

"اور یہ (قرآن) وہ کتاب ہے جس کو ہم نے برکت کے ساتھ نازل کیا ہے اور (یہ کتاب) ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس کے پہلے آچکی ہیں اور اس لئے نازل کیا ہے کہ آپ مکہ اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو ڈرائیں"۔ ان آیات میں پیغمبر کے ذریعہ انذار یا ڈرائے جانے کے مخاطب مکہ اور اس کے اطراف کے لوگ بیان کئے گئے ہیں۔ سورۂ مبارکۂ یس اور قصص میں بھی آیا ہے:

(لِتُنْذِرَقَوْماًمَا اُنْذِرَئَ اٰبٰاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُوْ نَ)[3]

"تاکہ آپ ان لوگوں کو کہ جن کے باپ دادا ڈرائے نہیں گئے اور غفلت میں پڑے رہ گئے ڈراؤ"۔

(لِتُنْذِرَقَوْماًماَ اَتٰهُمْ مِنْ نَذِیْرٍ مِنْ قَبْلِکَ)[4]

"آپ ان لوگوں کو جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا ڈراؤ"۔

یہ آیتیں بھی اس چیز کو بیان کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ اس قوم کے انذار کے لئے مبعوث کئے گئے تھے کہ جس کے درمیان آپ سے پہلے خداوند عالم کی جانب سے کوئی انذار کرنے والا نہیں آیا تھا اور بہ ظاہر اس قوم سے مراد بھی اہل عرب ہیں۔

سورۂ شعراء میں بھی آیا ہے کہ پیغمبر ﷺ اپنے اقرباء کو انذار کرنے کے لئے ہی مبعوث کئے گئے تھے:

(وَاَنْذِرْعَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ)[5]

"پیغمبر آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے"۔

1۔ سورۂ شوریٰ آیت 7۔ 2۔ سورۂ انعام آیت 92۔3۔ سورۂ مبارکۂ یس آیت 6۔ 4۔ سورۂ قصص آیت 46۔5۔ سورۂ شعراء آیت 214۔

جیسا کہ ہم اشارہ کرچکے ہیں پہلی نظر میں ان آیات سے یہی گمان پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت رسالت ایک خا ص جماعت سے مخصوص تھی لیکن ان آیات کے اسلوب و روش پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی آیت پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت کو کسی جماعت میں منحصر و مخصوص ہونے پر دلالت نہیں کرتی ۔ ان میں کچھ آیتیں اس بات کو بیان کرتی ہیں کہ پیغمبر عربوں کے درمیان کیوں مبعوث ہوئے ؟ اور بیان کرتی ہیں کہ اس کی ایک وجہ عربوں کا ایک عرصہ سے انبیائے الٰہی سے محروم ہونا تھا اور یہ مسئلہ خود اپنی جگہ اس بات کا سبب بنا کہ وہ عام طور پر جہالت و بے خبری کی زندگی بسر کر رہے تھے ۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا عربوں کے درمیان مبعوث ہونا کسی بھی طرح آپ کی رسالت کا ان (عربوں)سے مخصوص ہونا نہیں کہا جا سکتا ۔ یہ آیات بھی کچھ دوسری آیات سے ملتی جلتی ہیں جو بیان کرتی ہیں کہ عربوں کے درمیان کیو ں خود ان ہی کی قوم سے پیغمبر مبعوث ہوئے ارشاد ہوتا ہے :

(وَلَوْنَزَّلْنٰهُ عَلٰی بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ فَقَرَاَهٗ عَلَیْهِمْ مَاکَانُوْابِهٖ مُؤْمِنِیْن) [1]

"اور اگر ہم اس قرآن کو کسی غیر عرب زبان قوم میں نازل کرتے اور (پیغمبر) ان کے سامنے پڑھتا تو وہ اس پر ایمان نہ لا تے"۔

ہماری بحث سے مربوط بعض دوسری آیتیں پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت کے مختلف مرحلوں کو بیان کرتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت اگرچہ سبھی کے لئے تھی پھر بھی تبلیغ کی راہ ہموار کرنے اور عملی رکاوٹوں کو بر طرف کرنے کی غرض سے پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت کا آغاز ایک خاص دائرہ میں ہوا اور پھر بعد کے مرحلوں میں دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ اپنے دور کی سب سے بڑی تہذیب و تمدن کو اس نے اپنا مخاطب قرار دیا۔ یہی وجہ ہے بعثت کے آغاز میں (وَاَنْذِرْعَشِیْرَتَکَ الْاَ قْرَبِیْنَ)"اپنے قریبی خاندان والوں کو ڈرائیے"والی آیتیں صرف پیغمبر اسلام ﷺ کی تبلیغ کے ابتدائی مراحل کے دائرے کو بیان کرتی ہیں [1] بہرحال اگرچہ پہلی نظر میں ممکن ہے کہ ان آیات سے رسالت اسلام کے محدود ہونے کا گمان ہو لیکن ان آیات انذار پر غور و

1۔ سورۂ شعراء آیت 98۔199۔

1۔ظاہری طور پر سورۂ شوریٰ کی (آیت 7) کو سورۂ انعام کی (آیت 92) پر حمل کرتے ہوئے رسالت کے عالمی ہونے کے دوسرے مرحلہ کو جانا جا سکتا ہے۔

فکر کرنے سے (خاص طور سے ان آیات پر توجہ کے بعد کہ جن میں رسالت کے عام ہونے کا ذکر ہے) یہ گمان بھی ختم ہو جاتا ہے کسی غرض یا تعصب سے عاری وہ شخص جو عمومیت پر دلالت کرنے والی آیات کو ان آیات کے پہلو میں قرار دے کر دیکھتا ہے تو تصدیق کرتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت اسلام عربوں سے مخصوص نہیں تھی۔ اس کے علاوہ تاریخ کے مسلم الثبوت شواہد بھی (مثلاً پیغمبر اکرم ﷺ کی جانب سے تمام ممالک کے سربراہوں کے پاس دعوت اسلام کے لئے اپنے سفیروںکا بھیجا جانا) اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔

تبلیغ اسلام کے تئیں جنوںکا کردار

یہاں تک یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ تمام لوگ (ناس) پیغمبر اسلام ﷺ کی تبلیغ کے مخاطب تھے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ دعوت اسلام جنات کو بھی شامل ہے؟

بہ ظاہر قرآن کریم میں یہ بات صاف طور پر بیان نہیں ہوئی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیںکہ لفظ "ناس" (یعنی لوگ) (جو بعض آیات میں آیا ہے جیسے "هُدىً لِلنَّاسِ"، "كَافَّةً لِلنَّاسِ" اور "بَلَاغٌ لِلنَّاسِ" بہ ظاہر انسانوں کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے اور جنوں کو شامل نہیں ہے البتہ سورۂ "ناس" کی آخری آیتوں میں یہ احتمال پایا جاتا ہے کہ ممکن ہے "ناس" میں جنوں کو بھی شامل رکھا گیا ہو:

(مِنْ شَرِّالْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِالَّذِىْ يُوَسْوِسُ فِىْ صُدُوْرِالنَّاسِمِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ)[1]

"اندر سے وسوسہ کرنے والے کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتا ہے۔ وہ (وسوسہ پیدا کرنے والا) جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے"

عبارت "مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ" میں حرف "مِنْ" "مِن بیانیہ ہے۔ اس عبارت میںدو احتمال پائے جاتے ہیں: ایک تو یہ کہ اس میں "خنّاس" کی وضاحت کی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس "ناس" کے ذریعہ "في صدور الناس" کی وضاحت کی گئی ہو، چنانچہ دوسری صورت میں آیات کے معنی یہ ہوں گے "لوگوں کے دلوں میں" یعنی "جنات اور انسانوں کے دلوں میں" البتہ حق یہ ہے کہ دوسرا احتمال بہت ضعیف ہے اور لفظ "ناس" کا ظاہری طور پر انسان سے مخصوص ہونا نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن دوسرے احتمال کو صرف احتمال کی حد تک رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔

1۔ سورۂ ناس آیت 4-6۔

بہر حال جن آیات میں لفظ "ناس "استعمال ہو ا ہے وہ صاف طور پر دلالت کرتی ہیں کہ جنات اسلام کی دعوت میں شا مل نہیں تھے لیکن جن آیات میں لفظ "عالمین "استعمال ہو ا ہے ان سے یہ مطلب نکا لا جا سکتا ہے ۔اس لئے کہ "عالمین "ہو ش و خرد رکھنے والے تمام عاقلوں کو شا مل ہے اور اس اعتبار سے اس میں جنات کی جماعت بھی شامل ہے ۔

ان آیات کے علا وہ بعض روایات میں بھی آیا ہے کہ پیغمبر اسلام (ص) "ثقلین "کی جانب مبعوث کئے گئے ہیں[1] سورۂ احقاف کی آیات بھی اسی مفہوم کی تائید کرتی ہیں ارشاد ہوتا ہے :

(وَاِذْصَرَفْنَااِلَیْکَ نَفَراًمِنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْآنَ) [2]

"اور جب (قوم)جن سے کچھ افراد آپ کے پاس بھیجے کہ قرآن کو سنیں ۔۔۔"۔

اس آیت کو اپنا مدعا ثابت کرنے اور اس پر دلیل لا نے کے لئے میں نے اس لئے نہیں پیش کیا کہ معلوم ہے آیت میں اس بات کی کوئی تصریح نہیں کی گئی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے جنوں کو اپنا پیغام سنا نے کے لئے دعوت دی ہو بلکہ ممکن ہے خدا وند عالم نے خود کوئی سبیل نکا لی ہو کہ جنوں کا ایک گروہ خود آئے اور پیغمبر کی باتیں غور سے سنے ۔

دوسری بات یہ کہ حتی اگر ہم اس بات کو تسلیم کر لیں کہ جن پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت کے مخا طب نہیں تھے اور آپ کی تبلیغ انسانوں سے مخصوص تھی تو بھی گزشتہ مطالب کی بنیاد پر جنوں کا فریضہ تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت سے آگا ہی کے بعد اس کو قبول کرے اور اس پر ایمان لائے ۔

ظہور اسلام کے بعد بقیہ تمام ادیان کا غیر معتبر ہو نا

قرآن کریم کی بعض آیات سے گما ن ہو تا ہے کہ ان آیات کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ کے مبعوث ہونے کے بعد بھی دو سرے ادیا ن کی قا نونی حیثیت باقی ہے ۔

گذشتہ بحثوں سے یہ وا ضح ہے کہ اس طرح کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے اور ظہور اسلام کے بعد اسلام سے باخبر ہو نے وا لے ہر بالغ و عاقل پر اسلام قبول کرنا اور مسلمانوں کی صف میں شا مل ہونا وا جب ہے ۔

اسی طرح قرآن میں ایسی آیات مو جو دہیں جن میں اہل کتا ب کے بعض گروہ کی تعریف کی گئی ہے ۔

1۔ ملا حظہ فرمائیے: بحار الانوار جلد 63 صفحہ 297 ،حدیث نمبر 4 ۔ اور جلد 102 صفحہ 105 حدیث 13۔

2۔ سورۂ احقاف آیت 29۔

نمونہ کے طور پر ہم سورۂ آلِ عمران میں پڑھتے ہیں :

(لَيْسُواسَوَائً مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّة قَائِمَةيَتْلُوْنَ ئَ ايٰتِ الله آنَائَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ)[1]

"یہ لوگ بھی سب ایک جیسے نہیں ہیں ۔(بلکہ) اہلِ کتاب میں کچھ لوگ درست کردار بھی ہیں جو راتوں کو اُٹھکر خدا کی آیتیں پڑھا کرتے اور سجدے کیا کرتے ہیں"۔

اس آیت میں بعض اہل کتاب کی تعریف سے ممکن ہے یہ گمان پیدا ہو کہ دین اسلام کے ساتھ ہی قرآن نے ان کی بھی تائید کی ہے اور ان کے دین کی قانونی حیثیت کو قبول کیا ہے لیکن یہ خیال غلط ہے اس لئے کہ اس آیت کا مطلب دو حال سے خارج نہیں ہے :

پہلا احتمال تو یہ ہے کہ اس آیت میں ان اہل کتاب کو مدنظر نہیں رکھا گیا ہے کہ جنھوں نے رسول اسلام کے دورحیات میں دین اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تھا ۔ بلکہ اس کلیہ کو بیان کیا ہے کہ اہل کتاب کے درمیان بھی (چاہے ماضی کی بات ہو یا حال کی)اچھے اور برے دونوں طرح کے افراد رہے ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ تمام یہودی یا عیسائی خدا نا شناس انسان رہے ہوں ۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ تمام اہل کتاب کی تمام زمانوں میں، ایک ہی طرح سے مذمت نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان میں ایک گروہ خدا کی عبادت اور آیات الٰہی کی تلاوت کرنے والا بھی رہا ہے ۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت ان لوگوں کے بارے میں ہو کہ جن تک اس وقت دعوت اسلام نہ پہنچی ہو یا جن پر اللہ کی حجت تمام نہ ہوئی ہو ۔ لہٰذا جب بھی حجت تمام ہو جائے تو اہل کتاب کے اچھے افراد بغیر کسی شک و شبہہ کے اسلام قبول کر لیں گے ۔ سورۂ مبارکۂ مائدہ میں نصاریٰ کے ایک گروہ کی اس طرح صفت بیان کی گئی ہے :

(وَاِذَاسَمِعُوْامَااُنْزِ لَ اِلَىٰ الرَّسُوْ لِ تَرىٰ اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّ مْعِ مِمَّاعَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ)[2]

"اور جب یہ لوگ اس (قرآن)کو سنتے ہیں جو ہمارے رسول پر نازل کیا گیا ہے تو دیکھو کس طرح حقیقت سے آشنا ہو جانے کے سبب انکی آنکھوں سے بیساختہ آنسو جاری ہو جاتے ہیں"۔

یہ گروہ ان ہی لوگوں کا ہے جو حجت تمام ہونے سے پہلے اہل عبادت و دعا تھے :

(اُ مَّةً قَائِمَةً يَتْلُوْنَ آيَا تِ الله)

1۔ سورۂ آل عمران آیت113۔

2۔ سورۂ مائدہ آیت 83۔

"جو راتوں کو اٹھکر خدا کی آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں" اور جب وہ قرآن سے آشنا ہو جاتے ہیں تو(تَرىٰ اَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ " ان کی آنکھوں سے بیساختہ آنسو جاری ہو جاتے ہیں"۔

اس بنا پر اہل کتاب کا وہ گروہ جو حجت تمام ہو جانے کے بعد بھی اپنے دین پر ڈٹا رہے قرآن کی نظر میں کسی بھی صورت قابل ستایش و تعریف نہیں کہا جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام کی امتیں

انبیاء علیہم السلام کے عام طورپر مشترک اوصاف کی تحقیق و جستجو کے بعد اب "انبیاء"کی قوموں کے بارے میں گفتگو ضروری ہے لیکن بحث کے آغاز سے پہلے خود اس بحث کے طریقہ و روش سے متعلق چند نکتے بیان کردینا مفید ہیں۔میری نظر میں انبیاء علیہم السلام کی امتوں کے بارے میں کسی قرآنی تحقیق و جستجو کے دوطریقے ہوسکتے ہیں :

ایک تو یہ کہ مختلف امتوں سے متعلق آیات کو تفصیل کے ساتھ الگ الگ رکھ کر تحقیق کی جائے اور پھر آیات کی تقسیم بندی اور تحقیقی جائزے کے بعد ان سے حاصل ہونے والے نتیجوں کا جائزہ لیا جائے۔ تحقیق کا یہ طریقہ طویل گفتگو کا طالب ہے اور اس مقام پر اس کی گنجائش نہیں ہے۔

دوسرا طریقہ جس کو ہم نے اپنایا ہے یہ ہے کہ پہلے تو تمام امتوں کے مابین بعض مجموعی اور مشترک موضوعات کو پیش نظر رکھا جائے اور پھر قرآن کریم کی آیات کی بنیاد پر ان کا جائزہ لیا جائے۔

انبیاء علیہم السلام کی امتوں کے بارے میں قرآن کریم سے ایک تو اس نکتہ کا پتہ چلتا ہے کہ ان تمام قوموں میں ہر ایک نے اپنے پیغمبر کے ساتھ کسی نہ کسی طرح مخالف موقف اپنایا اور ان کا مقابلہ کرنے کے لئۓ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں بعض آیات اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ تمام الٰہی انبیاء کو ان کی امتوں نے جھٹلایا ہے۔ اس تاریخی حقیقت کو دیکھ کر جس کی قرآن کریم نے تائید فرمائی ہے چند سوال پیدا ہوتے ہیں، کیا ایک قوم کے تمام افراد یکساں طور پر ایک دوسرے کے ہمراہ ہو کر اپنے پیغمبر سے مقابلہ کے لئۓ اٹھ کھڑے ہوتے یا شروع میں معاشرہ کے مخصوص افراد مخالفت کا پرچم بلند کرتے اور اس کے بعد دوسرے گروہ ان سے آکر مل جایا کرتے تھے۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت انسانی فطرت کے مطابق ہوا کرتی تھی اور دین اسلام (اپنے عام معنی کے لحاظ سے)چونکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے اور دین فطرت ہے

لہذا دیکھنا چاہیئے کہ انبیاء علیہم السلام کی طویل تاریخ میں وہ کونسے اسباب تھے جن کی وجہ سے تمام قومیں اپنے پیغمبر کی مخالفت کے لئے کھڑی ہوجایا کرتی تھیں ؟ مخالفین کا رویہ انبیاء علیہم السلام سے کس طرح کا تھا اور وہ انبیاء علیہم السلام سے مقابلہ کے لئے کن طریقوں سے فائدہ اٹھاتے تھے ؟ان گروہوں کا انجام کیا ہوا؟اور وہ کس عاقبت کے منتظر ہیں ؟

موجودہ بحث کا علوم سماجیات ونفسیات سے رابطہ !

مذکورہ سوالوں کے جوابات تلاش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے اس بحث کے ساتھ مختصر طورپر علوم سماجیات اور اجتماعی نفسیات کے تعلق کے بارے میں کچھ گفتگو ہو جائے چنانچہ اس سلسلہ میں چند سبق آموز نکات کہ جن کا قرآن کریم سے استنباط کیا جا سکتا ہے ہم بیان کرتے ہیں ۔ ہم کو معلوم ہے کہ قرآن کریم کی روش یہ نہیں ہے کہ ہربات تفصیل سے ، مختلف عنوانوں کے تحت اور جدا جدا بیان کرے بلکہ کبھی کبھی قرآن کریم بعض اہم مطالب صرف اشارہ میں بیان کرجاتا ہے کہ اگر ان کے بارے میں غور کریں تو انسان کے سامنے معرفت کے بہت سے ابواب کھل جائیں ۔ ایسے موقعوں پر ہم اگر اپنے سوالات قرآن کے سامنے پیش کریں تو قرآن کے مخصوص طریقہ کو سامنے رکھ کر اپنے سوالات کے جوابات حاصل کر سکتے ہیں ۔ اس صورت میں اشاروں میں بیان کی گئی قرآنی تعبیریں ایسی بیش قیمت کنجی ثابت ہوں گی کہ جن سے علوم و معارف کے بیش بہا خزانوں سے بھرے بڑے بڑے دروازوں کے قفل کھولے جا سکتے ہیں اور شاید موجودہ بحث کچھ اسی انداز کی ہے اگر اس موضوع سے متعلق قرآن کریم کی آیات پر غور کریں تو سماجیات ، فلسفۂ تاریخ ، اجتماعی اور انفرادی نفسیات وغیرہ سے متعلق بہت سی ایسی باتیں معلوم ہو جائیں گی کہ جن سے ہر ایک کے بارے میں عرصۂ دراز تک تحقیق و جستجو کی ضرورت محسوس کی جا سکتی ہے ۔ آئندہ بحثوں میں ایسے بعض مطالب جو قابل استنباط ہیں ہم اشارہ کریں گے ۔

اب ہم مختصر طورپر موجودہ بحث کے ساتھ دو اہم علوم یعنی سماجیات اور اجتماعی نفسیات کے تعلق پر گفتگو کرتے ہیں ۔ ہم کو معلوم ہے کہ سماجیات میں بنیادی ترین بحث یہ ہے کہ اس میں مختلف موجودات کے وجود کے اسباب ، پیدائش کی کیفیت نشو ونما کے مراحل اور تغیرات اور ان کے نتائج و اثرات پر گفتگو ہوتی ہے ۔ اس بنیاد پر مختلف معاشروں میں لوگوں کا پیغمبروں کی مخالفت کرنا یہ خود ایک عجیب اور قابل توجہ اجتماعی مسئلہ ہے کہ جس کی علم سماجیات کے نقطۂ نظر سے علل و اسباب کی تحقیق، سماجی ڈھانچے کی بناوٹ ، اس میں رونما ہونے والے تغیرات اور آثار و نتائج کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ اس بارے میں قرآن کریم سے سوالوں کے جوابات حاصل کئے جاسکتے ہیں ، قرآن کریم کا مخصوص تبصرہ معلوم کیا جا سکتا ہے ۔

چنانچہ اس طرح کی تحقیقات ایک طرف تو سماجیات کے مباحث کو کہیں زیادہ مالا مال کردے گی اور دوسری طرف ان سے حاصل شدہ نتیجوں کی بنیاد پر علم سماجیات کے بہت سے اسلامی یا قرآنی نظریات کا ایک بڑا حصہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

یہ بحث اجتماعی نفسیات کے ساتھ بھی اسی بنیاد پر تعلق پیدا کر لیتی ہے کہ اجتماعی مسائل جیسے لوگوں کا انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنا، اس حیثیت سے کہ انسان کے ہی ایجاد کردہ مسائل ہیں اور مخصوص دماغی اور نفسیاتی وجوہات کے تحت پیدا ہوتے ہیں اس بنا پر کوئی بھی اجتماعی عمل جو معاشرے کے کسی ایک طبقہ میں یا پورے معاشرے میں رونما ہوتا ہے اس طبقے یا معاشرے کی نفسیاتی خصوصیات کا نتیجہ ہوتا ہے اور ان نفسیاتی اسباب و عوامل کا مطالعہ اجتماعی نفسیات کے فرائض میں سے ہے

۔

اس بناء پر امتوں کی انبیائے الٰہی کے ساتھ مخالفت اِن قوموں کی کونسی نفسیاتی خصوصیت سے متأثر ہے اس بات کی تحقیق اجتماعی نفسیات کی بحثوں کے دائرے میں شمار ہوگی، علاوہ بر این انبیاء کے خلاف اجتماعی مقابلہ آرائی کے ساتھ افراد اور معاشرے کے باہمی ارتباط کا مطالعہ بھی ایک اور اہم مسئلہ ہے جس کو قرآن کریم میں علم سماجیات کے اصول و نظریات یا اجتماعی نفسیات کے نقطۂ نظر سے تحقیق و جستجو کا محور قرار دیا جا سکتا ہے۔

خود امتوں کے ذریعے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب

سوشل سائنس کے بعض علوم کے ساتھ بحث کے بعض پہلو وَ نکے رابطہ کی طرف اشارہ کے بعد ہم گفتگو کے اس حصہ میں پہلے اُن آیات کا ذکر کر رہے ہیں جن میں گذشتہ امتوں کی جانب سے اپنے انبیاء علیہم السلام کی اصل مخالفت کو بیان کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں ایسی بہت سی آیات ہیں کہ جو کسی نہ کسی انداز سے اس تاریخی حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہیں۔ ان میں سے بعض آیات میں (نمونہ کے طور پر) بعض قوموں کے نام لئے گئے ہیں اور پھر ان کی طرف سے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے خلاف مشترکہ رد عمل کو بیان کیا گیا ہے:

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: (اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَعَادٍوَثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّااللهُ جَا ئَتْهُمْ رَسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوْااَيْدِيَهُمْ فِىْ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْااِنَّا كَفَرْنَا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهِ وَ اِنَّالَفِىْ شَكٍ مَّا تَدْعُوْنَنَااِلَيْهِ مُرِيْبٍ)[1]

1۔ سورۂ ابراہیم آیت 9۔

"کیا تمہارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو ہم سے پہلے تھے (جیسے) نوح کی قوم اور عاد و ثمود اور جو ان کے بعد ہوئے ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی جانتا ہی نہیں؟ ان کے پاس ان کے انبیاء علیہم السلام واضح دلیلیں لیکر آئے لیکن ان لوگوں نے (اعتراض کے عنوان سے منھ بند کرنے کے لئے) ان کے ہاتھ ان کے منھ پر رکھ دیئے اور کہنے لگے: تم کو خدا کی طرف سے جو ذمہ داری دے کر بھیجا گیا ہے ہم اس کو نہیں مانتے اور جس دین کی طرف تم ہم کو بلا رہے ہو تو اس کے بارے میںہم بڑے گہرے شک میں ہیں"۔

آیت میں (وَالَّذین من بعد هم) کی عبارت سے واضح ہے کہ یہ بات کچھ خاص قوموں سے مخصوص ہیں۔ بلکہ بہت سی قوموں میں جاری رہی ہے۔ اسی طرح صیغۂ جمع (انبأئ) کے مقام پر صیغۂ مفرد (نبأ) کا استعمال اس چیز کی غمّازی کرتا ہے کہ ان تمام قوموں کی ایک مشترک داستان ہے: ان سب کے درمیان خدا کے پیغمبر مبعوث ہوئے لیکن ان سب نے ان نبیوں کو جھٹلایا۔ عبارت (فَرَدُّوا اَیدِیَهُم فِی اَفوَاهِهِم) عربی زبان کی ایک ضرب المثل ہے جو ایسے مقام پر بولی جاتی ہے جہاں بات بالکل صاف صاف دوٹوک کرنا ہوتا ہے چنانچہ اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے نبیوں سے بالکل صاف و واضح طور پر کہدیا تھا کہ ہم آپ کی رسالت کو تسلیم نہیں کرتے اور ہمیں آپ کی دعوت کے صحیح ہونے میں شک ہے۔

قرآن کریم کی بعض دوسری آیات میںپیغمبر اسلام ﷺ کی تسلی اور دلداری کی گئی ہے کہ آپ کی رسالت کی مخالفت اور تکذیب صرف ان عرب مشرکوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ گذشتہ اقوام نے بھی اپنے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی ہے سورۂ حج میں قرآن کریم رسول اسلام ﷺ سے فرماتا ہے:

(وَاِنْ یُکَذِّبُوْکَ فَقَدْ کَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَعَاد وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ اِبْرٰهِیْمَ وَ قَوْمُ لُوْطٍ وَاَصْحَابُ مَدْیَنَ وَکُذِّ بَ مُوْسیٰ فَاَمْلَیْتُ لِلْکَافِرِیْنَ ثُمَّ اَخَذْ تُهُمْ فَکَیْفَ کَانَ نَکِیْرِ)[1]

اور اگر پیغمبر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیںتو ان سے پہلے قوم نوح نے اور ابراہیم کی قوم اور لوط کی قوم نے اور اسی طرح مدین کے رہنے والوں نے (اپنے اپنے پیغمبروں کو) جھٹلایا ہے۔ اور موسیٰ (بھی) جھٹلائے جا چکے ہیں پس میں نے کافروں کو کچھ مہلت دیدی اور پھر (ان کا گریبان) کس دیا دیکھئے تو میرا عذاب کیسا تھا"۔

1۔ سورۂ حج آیت 42۔44۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَاِنْ یُکَذِّ بُوْکَ فَقَدْ کُذِّبَتْ رُسُل مِنْ قَبْلِکَ) [1]

"اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلائیں تو یقین مانئے آپ سے پہلے (بھی) بہتیرے پیغمبر جھٹلائے جا چکے ہیں۔۔۔"

ارشاد ہوتا ہے:

(کَذَّ بَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَاَصْحَا بُ الرَّ سِّ وَثَمُوْ دُوَعَاد وَفِرْعَوْ نُ وَ اِخْوَانُ لُوْط وَاَصْحَا بُ الْاَ یْکَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ کُلُّ کَذَّ بَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِیْدِ) [2]

" ان سے پہلے قوم نوح کی قوم اصحاب رس اور ثمود نے بھی تکذیب کی تھی اور قوم عاد و فرعون اور برادرانِ لوط نے بھی اور اصحابِ ایکہ اور قوم تبع نے (مختصر یہ کہ) سبھی نے ہمارے پیغمبروں کو جھٹلایا (نتیجہ میں) ہمارا (عذاب کا) وعدہ پورا ہو کر رہا"۔

سورۂ فاطر میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَاِ نْ یُکَذِّ بُوْکَ فَقَدْکَذَّبَ الَّذِ یْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ جَائَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنَاتِ وَبِالزُّبُرِوَبِالْکِتَابِ الْمُنِیْرِ ثُمَّ اَخَذْ تُ الَّذِ یْنَ کَفَرُوْافَکَیْفَ کَا نَ نَکِیْرِ) [3]

"اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلائیں تو یقینا ان سے پہلے والوں نے بھی (اپنے اپنے پیغمبروں کو) جھٹلایا ہے (حالانکہ) جب ان کے پاس ان کے پیغمبر واضح و روشن دلیلیں، صحیفے اور کھلی کتاب لیکر آئے تھے پس ہم نے ان لوگوں کو جو کافر ہو بیٹھے تھے جکڑ لیا (دیکھئے تو) میرا عذاب (ان پر) کیسا (سخت) ہوا؟"۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

(فَاِنْ کَذَّ بُوْکَ فَقَدْ کُذِّ بَ رُسُل مِنْ قَبْلِکَ جَائُ وْابِا لْبَیِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالکِتَابِ الْمُنِیْرِ) [4]

"اگر انھوں نے آپ کو جھٹلایا تو آپ یقین رکھئے آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول روشن معجزے، صحیفے

1۔ سورۂ فاطر آیت 4۔

2۔ سورۂ ق آیت 12۔14۔

3۔ سورۂ فاطر آیت25۔26۔

4۔ سورۂ آلِ عمران آیت 184۔

اورنو رانی کتاب لیکر آچکے ہیں(جن کو جھٹلایا گیا ہے)"۔

سورۂ سبا میں ارشاد ہوتا ہے: (وَکَذَّ بَ الَّذِ یْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَمَابَلَغُوْامِعْشارَمَاآ تَیْنٰھُمْ فَکَذَّبُوْارُسُلِی فَکَیْفَ کا نَ نَکِیْرِ)[1]

"اورجو لوگ ان سے پہلے تھے انھوں نے بھی (پیغمبروں کو) جھٹلایا تھا حالانکہ ہم نے جتنا ان لوگوں کو دیا تھا یہ کفار (ابھی)اس کے دسویں حصہ کو (بھی) نہیں پہو نچے پس ان لوگوں نے میرے پیغمبر کو جھٹلایا تو (دیکھا کہ) ہمارا عذاب (ان پر) کیسا (سخت) ہوا"۔

مندرجہ بالا آیات کے علاوہ دوسری آیات میں بھی مخصوص قوموں کے جھٹلانے کا ذکر ہے اور خدا وندعالم کے پیغمبروں کی مخالفت کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ہم یہاں ان آیات کے کچھ نمونے پیش کر رہے ہیں :

سورۂ شعراء میں ارشاد ہوتا ہے: (کَذَّ بَتْ قَوْمُ نُوْ حِ الْمُرْ سَلِیْنَ)[2]

"نوح کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا"۔

اس کے بعد اسی سورہ میں فرماتا ہے:

(کَذَّ بَتْ عَا د الْمُرْسَلِیْنَ)[3]

"(قوم) عاد نے خدا کے پیغمبروں کو جھٹلایا"۔

اور آگے بڑھکر کہتا ہے:

(کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِیْنَ)[4]

"(قومِ) ثمود نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا "۔

اور اسی سورہ کی ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

(کَذَّ بَتْ قَوْمُ لُوْطِ الْمُرْسَلِیْنَ)[5]

"اور قوم لوط نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا "۔[6]

1۔سورۂ سبا آیت45۔ 2۔سورۂ شعراء آیت 105۔3۔سورۂ شعراء آیت123۔ 4۔سورۂ شعراء آیت 141۔ 5۔سورۂ شعراء آیت160۔ 6۔اسی طرح سورۂ قمر آیت 9، 18، 23 اور33 ملاحظہ فرمائیں۔

انبیاء علیہم السلام سے جنگ کرنے والے سرداروں کی پہچان

گذشتہ گفتگو کے پیش نظر قرآن کریم کی آیات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ تمام قوموں نے نبیوں کو جھٹلایا اور انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنا ان کا معمول تھا۔اب یہ سوال ہے کہ کیا اس مخالفت میں معاشرہ کے تمام افراد برابر سے شریک تھے یا ابتداء میں کسی مخصوص طبقہ کے افراد مخالفت کیلئے اٹھتے اور پھر ان کی دعوت پر دوسرے لوگ پیغمبر کی مخالفت میں ان کے ساتھ ہوجایا کرتے تھے ؟

اس سوال کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ قرآن نے دوسرے مفروضے پر زور دیا ہے اور کچھ مخصوص گروہوں کا انبیاء علیہم السلام سے جنگ کی ابتدا کرنے اور انبیاء علیہم السلام کو جھٹلانے میں پیش پیش رہنے کے عنوان سے تعارف کرایا ہے ۔چنانچہ قرآن کے مطابق پہلے ایک خاص طبقہ کے لوگ ہی انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کیا کرتے تھے اور اس کے بعد مختلف طریقوں سے یہ گروہ یا افراد عامل لوگوں کے افکار کو منحرف کرنے کے وسائل فراہم کیا کرتے تھے ۔ قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے والے سرداروں کے کچھ اوصاف بیان کئے ہیں جن میں سب سے اہم صفت" اتراف " ہے ۔"اتراف"کا مطلب یہ ہے کہ انسان نعمتوں کی فراوانی کی وجہ سے سرکشی اور طغیان پر تُل جائے اور مترف اس شخصکو کہتے ہیں جو مادی نعمتوں اور لذّتوں میں غرق ہو جائے قرآن کریم کی متعدد آیات میں انبیاء کی مخالفت کرنے والوں میں سب سے پہلے مترفوں کا تذکرہ ہوا ہے :

سورۂ سبامیں ارشاد ہوتا ہے :

(وَمَااَرْسَلْنَافِیْ قَرْیَةٍ مِنْ نَذِیْرٍ اِلّاَقَا لَ مُتْرَفُوھَااِنَّابِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهِ کٰافِرُوْنَوَقَالُوْانَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوٰالاً وَاَوْلَاداً وَمٰانَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ) [1]

"اورہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا(پیغمبر)نہیں بھیجامگر یہ کہ وہاں کے عیش پسندبڑے لوگ یہ کہہ اٹھے کہ جو چیزدے کر تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے اور(یہ بھی)کہتے ہمارے پاس تو مال اور اولاددوسروں سے کہیں زیادہ ہے اور ہم پر عذاب نہیں ہوگا "۔

اس آیت سے چند نکتے حاصل ہوتے ہیں :

1۔ہر قوم کے درمیان سب سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے والا گروہ اس قوم کے آرام پسند بڑے لوگوں کا ہوتا تھا ۔یہ گروہ بالکل صاف صاف انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول نہ کرنے کا اعلان کرتا تھا ۔

1۔ سورۂ سبا یٔت 34 ۔35۔

2۔اِن بڑے لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ ہمارے خاندان کاقوم و قبیلہ کے لحاظ سے طاقتور،دولتمند اور اجتماعی اقتدار کا حامل ہونا انبیاء علیہم السلام سے ہر طرح بلند و برتر اور ہر طرح کے عذاب سے محفوظ ہونے کا معیار ہے۔

اُن کے اس فلسفے سے ایک دوسرا نکتہ یہ نکلتا ہے کہ ان معاشروں میں کسی طبقہ کی دوسرے طبقوں سے بلندی و برتری کا معیار دولت و ثروت اور انسانی طاقت و قوت کا زیادہ ہونا تھا۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَکَذٰلِکَ مَاأَرْسَلْنَامِنْ قَبْلِکَ فِیْ قَرْیَةٍ مِنْ نَذِیْرٍاِلَّاقَالَ مُتْرَفُوهَااِنَّاوَجَدْ نَا اٰبَائَ نَاعَلَیٰ اُمَّةٍ وَاِنَّاعَلَیٰ آثَارِهِمْ مُقْتَدُوْنَ)[1]

"اور اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے آرام پسند لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کوایک آئین اور طریقہ پر پایاہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں"۔

اس آیت میں بھی دولتمند طبقہ کے بارے میںگفتگو ہے اور ان کے ایک دوسرے بہانہ کا ذکر ہے کہ ہم اپنے دادا کے طریقہ کو ہی جاری رکھیں گے اور ہم کو کسی نئے طریقہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بعض آیات میں "ملأ" کا لفظ بھی آیا ہے نمونہ کے طور پر قرآن کریم میںنوح کی قوم کے متعلق خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

(قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ اِنَّا لَنَرَاکَ فِیْ ضَلَالٍ مُبِیْنٍ)[2]

"ان کی قوم کے سرداروں نے کہا حقیقت یہ ہے کہ ہم تم کو کھلم کھلا گمراہی میں بتلا دیکھتے ہیں"۔

اس بنیاد پر انبیاء علیہم السلام کی مخالفت میں پیش پیش افراد کی ایک صفت یہ ہے کہ قوم کے سردار اپنے نبی پر کھلم کھلا گمراہی میں بتلا ہونے کی تہمت لگاتے تھے ہم اس بارے میں انبیاء علیہم السلام کے مخالفوں کے طریقوں سے متعلق بحث میں تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

(قَالَ الْمَلَأُ الَّذِیْنَ کَفَرُوامِنْ قَوْمِهِ اِنَّالَنَرَاکَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَاِنَّالَنَظُنُّکَ مِنَ الْکَاذِبِیْنَ)[3]

1۔سورۂ زخرف آیت23۔

2۔سورۂ اعراف آیت60۔

3۔سورۂ اعراف آیت66۔

قوم ثمود کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

"قوم کے سردار جو کافر تھے کہنے لگے ہم تو بیشک تم کو ایک طرح کی حماقت میں بتلا دیکھتے ہیں اورپوری سنجیدگی سے تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں"۔

اس آیت میں بھی ایک خاص طبقہ "ملأ "یعنی وہی قوم کے سرداروں پر زور دیا گیا ہے اور یہ زور دینا اس چیز کو بیان کرتا ہے کہ یہ گروہ مخالفت کرنے میں آگے آگے تھا ایک اور آیت میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ یہ طبقہ" ملأ "اہل استکبار کا مغرور و سر کش گروہ تھا خداوند عالم قرآن میں ارشاد فرماتا ہے:

(قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُونَ اَنَّ صَلِحاً مُرْسَلٌ مِنْ رَّبِّه قَالُوْااِنَّابِمَااُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُوْنَ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا اِنَّابِالَّذِیْ اٰمَنْتُمْ بِهِ كَافِرُوْنَ)[1]

"ان کی قوم کے سردار نے جن کو قوت و اقتدار نے بڑا بنا دیا تھا کمزور و محروم لوگوں سے جو ان میں ایمان لائے تھے کہا کیا تمھیں معلوم ہے کہ صالح اپنے پروردگار کی طرف سے بھیجے گئے سچے رسول ہیں انھوں نے جواب دیا کہ بلا شبہ جن باتوں کا وہ پیغام لائے ہیں ہمارا تو اس پر ایمان ہے تب جن لوگوں کو (اپنی استکباری طاقت و قوت پر) گھمنڈ تھا کہنے لگے ہم تو جس پر تم ایمان لائے ہو اسے نہیں مانتے"۔

مستکبرین بذات خود حق قبول کرنے اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت پر لبیک کہنے سے انکار کے علاوہ دوسروں کو بھی بہکانے ،چنگل میں جکڑلینے اور ان کے دل و دماغ میں شک و شبہ کے بیج بو کر ان کے ایمان کو کمزور کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

بہرحال مذکورہ تمام آیتوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ خاص طبقہ جو انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کا جھنڈا بلند کرنے میں پہل کیا کرتا تھا معاشرے میںخوش حال آرام پسند اور عیاش طبقہ تھا جو اپنی دولت اور اپنے قوم و قبیلہ کے بل بوتے پر افتخار و گھمنڈ کرتا تھا۔

1۔ سورۂ اعراف آیت 75۔76۔اور سورۂ اعراف آیت 88۔

انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کے نفسیاتی اسباب

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قوم کے سردار اور مستکبرین کس وجہ سے انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کیا کرتے تھے ؟ اس بارے میں قرآن کریم میں بہت سے نکات ذکر ہوئے ہیں جن پر غور و فکر کرنے سے انسان علوم نفسیات کے بہت سے انفرادی اور اجتماعی مسائل سے واقف ہو سکتا ہے قرآن نے کچھ امور جذبۂ مخالفت کے عنوان سے بیان کئے ہیں کہ جن کی بنیادپر شاید کچھ اصل اور بنیادی قسم کے اسباب و عوامل ہاتھ آجائیں ۔ہم اس جگہ مخالفت کے چند اہم جذبوں کو بیان کر رہے ہیں

استکبار (خود کو بڑا سمجھنا)

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے والے قوم کے سردار اپنی ممتاز سماجی حیثیت کی وجہ سے بڑائی میں بتلا تھے اور اسی جذبہ سے وہ انبیاء علیہم السلام کے پیغام سننے اور ان کی اطاعت کرنے سے دریغ کرتے تھے ۔گویا اس گروہ کے لئے انبیاء علیہم السلام کے کلام کو دل میں جگہ دینا ایک قسم کا ننگ و عار تھا یہ لوگ ہمیشہ دوسروں کو اپنے راستہ پر لگانے اور ان کو ہر طرح سے اپنے افکار کا تابع بنانے کی فکر میں لگے رہتے تھے اوریہی بڑائی کا تصور انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول کرنے میں رکاوٹ بنتا تھا ۔قرآن کریم میں " استکبار"کی لفظ اسی مفہوم کو بیان کرتی ہے :

(قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ)[1]

"جو لوگ بڑائی میں بتلا تھے کہنے لگے ہم تو جس پر تم ایمان لائے ہوا سے نہیں مانتے "۔ہم جانتے ہیں کہ کسی حکم کا کسی موضوع پر معلق اور وابستہ ہونا اس کی سببیت کا پتہ دیتا ہے ۔یعنی اس گروہ کا استکبار (خود کو دوسروں سے بڑا سمجھنا)ہی ان کے کفر کا سبب تھا اور استکبار کا سرچشمہ ان کی وہی غرور و تکبر کی حالت ہے جو ان کے دل و دماغ میں رچ بس گئی تھی البتہ بعض مقامات پر "استکبار" کو علت کے طور پر بیان بھی کیا گیا ہے ۔(وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ جَاۗءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَۨا اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ)[2]

"اور یہ لوگ تو خدا کی بڑی بڑی قسمیں کھا (کر کہتے) تھے کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) آئیگا تو وہ ضرور دوسری کسی بھی امت سے زیادہ راہ یافتہ بن جائیں گے پھر جب ان کے پاس ڈرانے والا (رسول) آپہنچا تو نفرت کے سوا ان کے یہاں کسی بھی چیز کا اضافہ نہ ہوا اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ روئے زمین پر خود کو سب سے

1۔سورۂ اعراف آیت76۔ 2۔سورۂ فاطر آیت42و43۔

بڑا سمجھتے تھے ۔۔۔"۔

اِس آخری آیت میں لفظ " استکبار "مفعول لہ کے عنوان سے آیا ہے اور صاف طور پر بیان کرتا ہے کہ ان کے کفر (یعنی انکار)کی وجہ ان کا جذبۂ استکبار ہے ۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بارے میں آیا ہے کہ وہ آپ کی دعوت کے جواب میں حالت کفر پر باقی رہنے پر زور دیتے تھے اور " استکبار " سے کام لیتے تھے:

(وَاَصَرُّوْاوَاسْتَکْبَرُواسْتِکْبِاراً) [1]

"۔۔۔اور اَڑ گئے اور بہت شدت سے اپنی استکباری اکڑ کو بڑھاتے چلے گئے "۔

اور فرعون کی قوم کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے :

(ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِ ہِمْ مُوْسَیٰ وَھَارُوْنَ اِلَی فِرْعَوْنَ وَمَلاَئِہِ بِآیَاتِنَا فَاسْتَکْبَرُوْا وَکَانُ ُوْا قَوْماً مُجْرِمِیْنَ) [2]

"پھر ہم نے اِن (پیغمبروں) کے بعد موسیٰ وہارون کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس (کی قوم) کے سرداروں کے پاس بھیجا لیکن انھوں نے اکڑدکھائی اور یہ جرائم پیشہ برے لوگ تھے "۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونیوں کو توحید کی دعوت دی تو انھوں نے آپ کی اس دعوت کے جواب میں اکڑ اور بڑائی دکھائی اور وہ بلند مقام جس پر وہ خود کو فائز سمجھتے تھے جناب موسیٰ علیہ السلام کی بات کو قبول کرنے میں مانع ہوا ۔ مذکورہ آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی ہارون کے مبعوث ہونے کا ذکر کرنے کے فوراً بعد کہا گیا ہے "فَاسْتَکْبَرُوْا "یہ انداز اس چیز کی علامت ہے کہ ان کی مخالفت کی وجہ ان کا وہی استکبار اور اکڑپن تھا ۔ ضمناً لفظ "مجرمین "سے بھی یہ استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی رسالت کے انکار کا ایک اور سبب گناہوں اور جرائم کا ارتکاب ہے ۔

کچھ دوسری آیات کہ جن میں انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کا سبب غرور وتکبر بیان کیا گیا ہے ان میں ایک مندرجہ ذیل آیت بھی ہے ارشاد خداوندی ہے:

(اِنَّ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْ آیَاتِ اللّٰہ بِغَیْرِسُلْطَانٍ اَتَاھُمْ اِنْ فِیْ صُدُوْرِھِمْ اِلّاَکِبْر مَاھُمْ بِبَ ٰالِغِیْہِ) [3]

1۔ سورۂ نوح آیت7۔ 2۔ سورۂ یونس75۔3۔ سورۂ غافر آیت56۔

"بیشک جو لوگ خدا کی طرف سے کوئی دلیل آئے بغیر خدا کی آیتوں کے بارے میں (خواہ مخواہ) جھگڑتے ہیں ان کے دلوں میں بڑائی جھاڑنے کے سوا کچھ نہیں ہے حالانکہ وہ لوگ اس بڑائی تک کہ جس کی وہ آرزو رکھتے ہیں کبھی نہیں پہنچیں گے ۔۔۔"۔

کچھ دوسری آیتوں میں بھی انبیاء علیہم السلام کے مخالفوں کے استکبار کے بارے میں ذکر ہے مثال کے طور پر قرآن مشرکوں کی صفت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

(اِنَّھُمْ کَانُوْااِذَاقِیْلَ لَھُمْ لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یَسْتَکْبِرُوْنَ)[1]

"ان سے جب کہا جاتا تھا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو اکڑ دکھاتے تھے"۔

ظاہر ہے صرف خدائے وحدہ لا شریک کی پرستش کی دعوت، استکبار کا سبب نہیں ہو سکتی لیکن جب اس دعوت کا مطلب مشرکوں کا گمراہ اور ان کے آباء و اجداد کے دین کا غلط ہونا اور اس سے اپنے دیرینہ اعتقادات سے ہاتھ دھو بیٹھنا لازم آرہا ہو تو ان کا جذبۂ استکبار حق کو تسلیم کرنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ بنا بر این مشرکوں کے توحید کو نہ ماننے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ خدا کی وحدانیت پر کوئی معقول اور واضح دلیل نہیں پائی جاتی یا حق ان پر پوشیدہ تھا، ایسا نہیں ہے بلکہ ان کے اندر کچھ ایسے جذبات مخفی تھے جو ان کو کفر کی طرف کھینچ لے جاتے تھے۔ ایک دوسری آیت میں استکبار کو عالم آخرت کے وجود سے انکار کا سبب قرار دیا گیا ہے:

(اِلٰھُکُمْ اِلٰہ وَاحِد فَالَّذِیْنَ لَایُؤمِنُونَ بِالْآخِرَةِقُلُوبُھُمْ مُنْکِرَة وَھُمْ مُسْتَکْبِرُوْنَ)[2]

"تمہارا پروردگار ایک اور اکیلا ہے پس جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں ان کے دل حق کے منکر ہیں اور وہ ذاتی طور پر بڑے مغرور ہیں"۔

ظاہری طور پر آیت کے آخری جملے "وَھُمْ مُسْتَکْبِرُوْنَ" میں وجہ بیان کی گئی ہے کہ وہ دل سے قیامت کے منکر کیوں ہیں۔ یعنی آخرت پر ایمان لانے میں رکاوٹ مشرکوں کا جذبۂ استکبار ہے جو ان کے وجود میں پنہاں ہے۔

دوسری طرف قرآن کریم بعض عیسائی علماء اور پادریوں کی اس طرح تعریف کرتا ہے:

(وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَھُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِیْنَ آمَنُوْاالَّذِیْنَ قَالُوْااِنَّانَصٰرٰی ذَلِکَ بِاَنَّ مِنْھُمْ قِسِّیْسِیْنَ وَرُھْبَانًاوَّاَنَّھُمْ لَایَسْتَکْبِرُوْنَ)[3]

1۔ سورۂ صافات آیت35۔ 2۔ سورۂ نحل آیت22۔3۔ سورۂ مائدہ آیت82۔

"اور قطعی طور پر وہ لوگ جو کہتے ہیں ہم عیسائی ہیں مومنین سے دوستی کے میدان میں سب سے زیادہ مردم دوست نظر آئیں گے کیونکہ ان میں بعض وہ مذہبی رہنما اور دانشور ہیں کہ جن میں بڑائی ہانکنے کی عادت نہیں ہے"۔

قرآن کی نظر میں اس گروہ کا امتیاز یہ ہے کہ ان میں غرور اور گھمنڈ نہیں ہے۔ وہ منکسر المزاج افراد ہیں جب ان کو حق کی معرفت ہو جاتی ہے تو وہ اس کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

احساس برتری

انبیاء علیہم السلام کو جھٹلانے کا ایک اور سبب جو کسی حد تک کبر و غرور سے مشابہ ہے دوسروں پر برتری کا جذبہ ہے۔ قرآن فرعون کی حالت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(ثُمَّ اَرْسَلْنَامُوْسیٰ وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ بِاٰ یٰتِنَاوَسُلْطٰنٍ مُبِیْنٍاِلٰی فِرْعَوْ نَ وَمَلَا ئِهِ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَا نُوْا قَوْماًعَا لِیْنَ)[1]

"پھر ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور واضح دلیل کے ساتھ فرعون اور اس کے دربار کے امرا کے پاس (رسول بنا کر) بھیجا تو ان لوگوں نے بڑائی دکھائی اور وہ تھے ہی بڑے سرکش لوگ"۔

یہ لوگ معاشرہ میں دوسروں سے برتری اور بلند و بالا مقام کی خواہش رکھتے تھے اور اگر وہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو قبول کر لیتے تو ان کا کھوکھلا جاہ و حشم چھن جاتا لہٰذا انبیاء علیہم السلام پر ایمان نہیں لاتے تھے۔

ظلم

انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کا ایک اور سبب "ظلم" ہے۔ قرآن کریم کی بعض آیات میں دوسروں سے برتری کی ہوس کے ساتھ ظلم و ستم کی روش کا بھی انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی مخالفت کے دو سبب کے عنوان سے ذکر ہوا ہے:

(وَ جَحَدُوْابِهَاوَاسْتَیْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْماًوَعُلُوًّا) [2]

"باوجودیکہ ان کا دل ان کے معجزات کا قائل تھا ان لوگوں نے سرکشی اور تکبر کے سبب سے ان کا انکار کیا" (بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّ ةٍ وَ شِقَاقٍ)[3]

"ہاں جنھوں نے کفر اپنایا تکبر اور عداوت میں ہیں"

1۔ سورۂ مومنون آیت45و46۔2۔ سورۂ نمل آیت14۔3۔ سورۂ ص آیت2۔

" عزۃ کے دو معنی ہو سکتے ہیں :

1۔ ایک تو عمل کے اعتبار سے بہت زیادہ اکھڑ اور اڑیل ہو جس کو جمود کہا جاتا ہے ۔

2۔ دوسرے معنی غرور اور خود پسندی کے ہیں دوسرے معنی کے اعتبار سے آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ پیغمبر کی اطاعت کو ایک طرح کی ذلت سمجھتے تھے ، غرور اور خود کو دوسروں سے بالاتر سمجھنے کے سبب ان کو نظر میں نہیں لاتے تھے ۔

کچھ اور آیات میں آیا ہے کہ اصل میں ، کافروں اور مشرکو ںکے لئے پیغمبر کی دعوت قبول کرنا بہت سخت و گراں ہوتا تھا :

(كَبُرَ عَلَىٰ الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْ عُوْ هُمْ اِلَيْهِ) (1)

" تم مشرکین کو جس کی طرف بلاتے ہو اُن پر بہت شاق گزرتا ہے " ۔

بیشک شاق گزرنا ان ہی نفسیاتی اور اندرونی حالات یعنی تکبر و غرور اور برتری کے تصور کی وجہ سے تھا ۔

حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی امت کے ساتھ بحث ومناظرہ کرتے وقت اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ سورۂ یونس میں ارشاد ہوتا ہے:

(و ۨ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبأَنُوْ حٍ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يٰقَوْ مِ اِنْ كَا نَ كَبُرَعَلَيْكُمْ مَقَامِىْ وَتَذْكِيْرِىْ بِآيَا تِ اللهِ فَعَلَى اللهِ تَوَكَّلْتُ) (2)

"تم ان کے سامنے نوح کا حال پڑھ دو جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم والو ! اگر میرا (تمہارے درمیان) ٹھہر نا اور خدا کی آیتوں کے ذریعہ نصیحت کرنا تم پر شاق وگراں گزرتا ہے تو(یادرکھو) میٔں صرف خدا ہی پر بھروسہ کرتا ہوں" ۔

نفسانی خواہشات

انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے کا ایک اور اہم سبب نفسانی خواہشات کا غلبہ ہے البتہ یہ نفسانی خواہشات تمام معنوی عیوب کو جنم دیتی ہے۔ چنانچہ اس کو ظلم تکبر ، غرور اور جاہ طلبی کی مانند تمام برائیوں کا سرچشمہ شمار کیا جاسکتا ہے ۔ چونکہ جو کچھ انبیاء علیہم السلام فرماتے تھے وہ مخالفین کی خواہشات نفسانی سے میل نہیں کھاتا تھا لہٰذا وہ ان کے مقابل اکڑدکھاتے تھے اور ان کے فرمان قبول کرنے میں اپنی بے عزتی سمجھتے تھے ۔

1۔ سورۂ شوریٰ آیت 13۔ 2۔ سورۂ یونس آیت 71۔

سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

(اَفَكُلَّمَاجَا ئَ كُمْ رَسُوْل بِمَا لَا تَهْوٰ ى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ)[1]

"پس کس لئے جب بھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس تمہاری نفسانی خواہشات کے خلاف کوئی حکم لے کر آیا تو تم نے اکڑ دکھانی شروع کر دی"۔

اس آیت میں بنی اسرائیل سے خطاب ہے اور اُن کی سرزنش ہے کہ کیوں صرف اتنی سی بات پر کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت تمہاری خواہش کے مطابق نہیں ہے تم اکڑ دکھانے لگتے ہو۔

گناہ میں آلودہ ہونا

بعض آیات بیئروز قیامت اہل عذاب سے خداوند عالم کے سوال اور احتجاج کا ذکر ہے، کہ ایسا کیوں کیا ؟ اور ان میں بھی ان کی مخالفت کے دو اسباب تکبر اور گناہ میں آلودہ ہونے کا ذکر ہے سورۂ جاثیہ میں خدا فرماتا ہے :

(وَاَمَّا الَّذِ يْنَ كَفَرُوْا اَ فَلَمْ تَكُن آ يَا تِيْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُم فَا اسْتَكْبَرْ تُمْ وَكُنْتُمْ قَوْماً مُجْرِمِيْنَ)[2]

"اور جنھوں نے کفر اختیار کیا (ان سے کہا جائے گا) کیا تمہارے سامنے ہماری آیتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں (لیکن) تم نے تکبر کیا اور تم لوگ تو گناہگار اور بدکار افراد تھے"۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ جرائم اور گناہوں کا مرتکب ہونا بھی آیات الٰہی کے قبول نہ کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا سرچشمہ وہ رابطہ ہوتا ہے جو انسان کے عمل اور اس کے نفسانی ملکات کے درمیان برقرار ہے اور اس قدرتی رابطہ کی بنیاد پر انسان کا گناہ میں آلودہ ہونا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ اس کے نفس میں کچھ ایسے رذائل اخلاقی پیدا ہو جاتے ہیں جو اس کو حق سے روگردانی کی طرف رغبت دلاتے ہیں۔ ایک اور آیت میں حق سے منھ موڑنے میں تکبر کے اثر کو ایک دوسرے طریقے سے بیان کیا گیا ہے:

(قَدْ كَا نَتْ ءَ ايَا تِيْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلَىٰ اَعْقٰبِكُمْ تَنْكِصُوْ نَ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهِ سٰمِراً تَهْجُرُوْ نَ)[3]

"درحقیقت (جب) ہماری آیتیں تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاتے تھے تمہاری

1۔ سورۂ بقرہ آیت 87۔ 2۔ سورۂ جاثیہ آیت 31۔ 3۔ سورۂ مومنون آیت 66۔ 67۔

حالت غرور ونکبت کی ترجمانی کرتی اور تم وقت شب (اپنی نشستوں میں) بدخلقی کی باتیں کیا کرتے تھے"۔

بعض آیات میں تعلیمات انبیاء علیہم السلام کو جھٹلانے میں گناہ کے اثر کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

(اَلَّذِیْنَ یُکَذِّ بُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ وَمَا یُکَذِّبُ بہ اِلَّا کُلُّ مُعْتَدٍ اَثِیْمٍ)[1]

"جو لوگ روزِ جزاء کو جھوٹ سمجھتے ہیں اور اِس گناہ میں مبتلا ہوتے سے گزر جانے والے افراد کے سوا کوئی جھوٹ نہیں سمجھتا"۔

اس آیت میں قیامت کے انکار کی ایک نفسیاتی وجہ کی طرف اشارہ ہے۔ انسان جب گناہ کا عادی ہو جاتا ہے، ظلم و زیادتی اور ستمگری اس کا پیشہ بن جاتا ہے تو آہستہ آہستہ ظلم اور گناہ کے آثار و نتائج سے اس کے دل و دماغ مانوس ہو جاتے ہیں اور وہ دل سے ان کا بندہ بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں جو بھی اس کے عیش و آرام میں خلل پیدا کرے یا اس کے گناہوں کی راہ میں رکاوٹ ڈالے وہ اس سے جنگ کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور چونکہ حساب و کتاب اور روز آخرت پر یقین، ظلم و زیادتی اور گناہ کے جاری رہنے میں ایک اہم ترین رکاوٹ ہے اس لئے آسودہ خاطر ہو کر اپنے گندے اعمال انجام دیتے رہنے کے لئے برائی کا عادی انسان حیات اخروی کا ہی سرے سے انکار کردیتا ہے۔ اس بناء پر مندرجہ بالا آیت کی رو سے قیامت کے انکار کا سبب ایک نفسیاتی محرک ہے جو انسان کے وجود میں گناہ اور ظلم و زیادتی کے زیر اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی نکتہ پر سورۂ قیامت میں زور دیا گیا ہے۔

(بَلْ یُرِیْدُ الاِ نْسا نُ لِیَفْجُرَاَ مَا مَہُ)[2]

"مگر انسان تو یہ چاہتا ہے کہ اپنے آگے بھی (ہمیشہ) برائی کرتا چلا جائے"۔

قیامت کے انکار کا سبب یہ نہیں ہے کہ قیامت کا انکار کرنے والے قیامت میں اپنی نئی زندگی کے سلسلے میں خداوند عالم کے ہاتھوں کو بندھا ہوا پاتے ہیں کہ خدا ان کو دوبارہ کیسے زندہ کرے گا بلکہ اس کا اصل سبب وہی نفسیاتی محرک یعنی گناہ کی عادت اور آزادانہ طور پر فسق و فجور کے ارتکاب کا شوق ہے۔

بے نیازی (بے فکری) کا احساس

انبیائے الٰہی کے خلاف اڑ جانے کا ایک اور سبب اپنے کو دوسروں سے بے نیاز سمجھنا ہے۔ آدمی جب اپنے کو دوسروں خاص طور پر خدا کے نبیوں اور الٰہی رہنماؤں سے بے نیاز سمجھنے لگتا ہے تو اس میں تکبر و غرور کی آگ کے

1۔ سورۂ مطففین آیت 11۔12۔ 2۔ سورۂ قیامت آیت 5۔

شعلے بھڑک اٹھتے ہیں اور وہ حق کے مقابلہ میں اکڑتا اور سرکشی کرنے لگتا ہے قرآن کریم اس حقیقت کو بڑے ہی اچھے انداز میں بیان کرتا ہے :

(كَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغَىٰ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنَىٰ)[1]

"بیشک انسان جیسے ہی اپنے کو غنی سمجھنے لگتا ہے سرکش ہو جاتا ہے"۔

اب تک ہم نے امتوں کی جانب سے انبیاء علیہم السلام سے مخالفت کے اصل عوامل کا قرآن کی روشنی میں جائزہ پیش کیا ہے اب اگر ہم ان امور کے متعلق غور وفکر کریں تو ان عوامل کے ایک ایسے مرکزی نقطہ پر پہنچیں گے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان عوامل کا ایک دوسرے سے خاص رابطہ ہے ان عوامل کا دوسرے بہت سے عوامل کے ساتھ طول میں رابطہ ہے یعنی ایک عامل دوسرے عامل کو اکساتا ابھارتا)ہے دوسرے گروہ کے اندر بھی یہ عوامل اسی طرح کا رابطہ رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر بہت سے نفسیاتی اسباب (خاص کاموں کے انجام دینے کا سبب ہوتے ہیں اور وہ کام اپنے وقت ومقام پر مذکورہ حالات کی عطاکردہ قوت کے ذریعے انجام پاتے ہیں۔ مذکورہ عوامل کے رابطہ کے بارے میں ایک طولانی بحث کی ضرورت ہے اور بہت زیادہ وسعت چاہتی ہے جو ہماری اس بحث کے دائرہ سے باہر ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کے چند نمونے

اب تک ہم اس نتیجہ پرپہونچے ہیں کہ ملأ، مترفان اور مستکبرین کی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخالفت کی وجہ ان نفسیاتی ملکات یعنی مادیات سے وابستگی اور نفسانی خواہشات تھی بیشک یہ حالات اور ملکات ایک خاص سانچے میں ظہور کرتے تھے اور ایک خاص عمل کا باعث بنتے۔ قرآن کریم کی بعض آیات میں ان نفسانی حالات کے کچھ جلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔مثال کے طور پر کچھ مقامات پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب کافروں کے درمیان کسی شخص کو مبعوث کیا جاتا تھا تو وہ تعجب کیا کرتے تھے۔قرآن مجید حضرت نوح علیہ السلام کی زبانی نقل کرتا ہے کہ آپ اپنی قوم سے عتاب آمیز لہجہ میں خطاب فرماتے تھے:

(اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَاۤءَكُمْ ذِكْرٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ)[2]

1۔سورۂ علق آیت 6۔7۔2۔سورۂ اعراف آیت63۔

"کیا تمھیں اس بات پر تعجب ہے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم ہی میں سے ایک مرد پر ذکر (پند و نصیحت) نازل ہو جائے کہ وہ تمھیں ڈرائے اور یہ کہ تم متقی بن جاؤ اور شاید تم پر رحم کیا جائے"۔

حضرت ہود علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے گفتگو کرتے ہوئے اسی مسئلہ پر زور دیا ہے:

(اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَا ئَ کُمْ ذِکْر مِنْ رَ بِّکُمْ عَلَیٰ رَجُلٍ مِنْکُمْ لِیُنْذِرَکُمْ وَاذْکُرُوْاذْجَعَلَکُمْ خُلَفَائَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَزَادَکُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْطَةً) [1]

"کیا تم لوگوں کو اس بات پر تعجب ہے کہ تم تک ذکر خدا تمھارے ہی کسی آدمی کے ذریعہ آجائے تاکہ وہ تمھیں ڈرائے اور (وہ وقت) یاد کرو جب (اس نے) تم کو قوم نوح کے بعد اُن کا خلیفہ (جانشین) بنایا اور تمہاری خلقت و قوت میں اضافہ کر دیا"۔

بہ ظاہر ان کے متعجب ہونے کی اصل وجہ (علیٰ رجل منکم)ہی ہونا چاہیئے اس لئے کہ علی القاعدہ کوئی صرف اس بات پر کہ خداوند عالم نے اُن ہی کے درمیان سے ایک شخص کو کیوں پیغمبر قرار دیا ہے ؟کیوں حیرت میں پڑسکتا ہے انبیائے الٰہی بھی اس مسئلہ سے اچھی طرح واقف تھے اور ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ اس مسئلہ پر اُن کے تعجب اور حیرت کا بے بنیاد ہونا آشکار کر دیں اور اپنی امت کو متنبہ کریں کہ ان کے تعجب کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔یہی بات پیغمبر اسلام ﷺ کی امت کے بارے میں بھی ذکر ہوئی ہے ۔

(اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَباً اَنْ اَوْحَیْنَااِلَی رَجُلٍ مِنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِالنَّاسَ) [2]

"کیا لوگوں کو اس بات پر تعجب ہے کہ ہم نے ان ہی میں سے ایک مرد پر وحی کی ہے تاکہ وہ لوگوں کو ڈرائے ۔۔۔"۔

اس بات پر کافروں کی حیرت کا مسئلہ کہ اُن ہی کے درمیان سے ایک شخص کو پیغمبر بنا دیا گیا ہے اس قدر سنجیدگی اختیار کر گیا تھا کہ سورۂ ص کی ابتدائی آیات میں اس پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے

(وَعَجِبُوْاَنْ جَائَ هُمْ مُنْذِرِمِنْهُمْ وَقَالَ الْکَافِرُوْنَ هَذَاسَاحِرکَذَّاب) [3]

"اور انھیں اس بات پر حیرت ہے کہ انھیں میں کا ایک ڈرانے والا ان کے درمیان آیا ہے اور کافر لوگ کہتے ہیںکہ یہ تو بڑا جادو گر اور پکّا جھوٹا ہے"۔

1۔ سورۂ اعراف آیت 69۔2۔ سورۂ یونس آیت 2۔3۔ سورۂ ص آیت 4۔

ظاہر ہے کہ جس کا نفس پاک اور سالم ہو کبھی اس بات پر حیرت نہیں کرے گا کہ خداوند عالم نے امت کے ایک سب سے قابل شخص کو دوسروں کی ہدایت کے لئے منتخب فرمایا ہے ۔ لیکن جو انسان حالات اور غلط قسم کے نفسانی جذبوں میں محصور اور مقید ہو اور استکباری تصورات ، دوسروں پر برتری کی خواہش اور خواہشات نفسانی کی پیروی میں زندگی بسر کررہا ہو اُس کو ضرور اس مسئلہ پر حیرانی ہوگی بہر حال یہ حیرانی کافروں اور منکروں کی نفسیاتی کیفیت کو ظاہر و آشکار کرتی ہے کہ جس سے قرآن نے پردہ اُٹھایا ہے ۔ مذکورہ حالات اسی طرح کے کافروں کے مختلف بہانوں میں بھی جلوہ نما ہیں ۔ ان میں سے بعض بہانے خداوند عالم اور بندوں کے مابین تعلقات کے طریقۂ کار سے تعلق رکھتے ہیں مثال کے طور پر کفار کا ایک ناروا مطالبہ یہ تھا کہ خداوند عالم ان سے براہ راست کلام کرے یا اُن پر معجزہ ظاہر کرے :

(وَقَالَ الَّذِیْنَ لَایَعْلَمُونَ لَوْ لَایُکَلِّمُنَااللهُ اَوْتَتِینَا ئَ ایَة کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ مِثْلَ قَوْلِھِمْ) [1]

"یہ جاہلوں کا کہنا تھاکہ خدا ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا خود ہمارے لئے کوئی معجزہ کیوں نہیںآتا ؟ اسی طرح ان ہی جیسی باتیںوہ لوگ (بھی) کرچکے ہیں جو ان سے پہلے تھے"۔

آیت میں (کذلک قال الذین) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہانے تلاش کرنا کسی قوم سے مخصوص نہیں تھا جی ہاں یہ وہ بہانہ ہے جو عام طور پر رائج تھا لوگ کہتے تھے کہ خداوند عالم جو کچھ اپنے انبیاء علیہم السلام کو عطا کرتا ہے وہ ہم کو کیوں نہیں عطا کرتا ۔:

(وَاِذَاجَائَتْھُمْ آیَة قَالُوْالَنْ نُؤْمِنَ حَتَّی نُؤتَیٰ مِثْلَ مَااُوْتِیَ رُسُلُ اللهِ) [2]

"اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی تو کہتے :جب تک ہم کوا(بھی)وہی چیز نہیں دی جائے گی جو پیغمبران خدا کو دی گئی ہے ہم ہر گز ایمان نہیں لائیں گے۔۔۔"۔

قرآن نے بھی اس احمقانہ مطالبے کا جواب فیصلہ کن انداز میں دیا ہے :

(اللهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهُ) [3]

1۔ سورۂ بقرہ آیت118۔2۔ سورۂ انعام آیت124۔3۔ سورۂ انعام آیت124۔

"۔۔۔خدا بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں قرار دے ۔۔۔"۔

کفّار کا دوسرا بہانہ یہ تھا کہ چونکہ انبیاء علیہم السلام بھی انسان سے بالاتر نہیں ہیں لہٰذا اُن پر ایمان نہیں لائیں گے ۔ قرآن کریم نے متعدد آیات میں ان بہانوں کو نقل کیا ہے:

(قَالَتْ رُسُلُهُمْ فِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰاتِ وَالْرَضِ) ۔۔۔ (قَالُوْااِنْ اَنْتُمْ اِلَّابَشَر مِّثْلُنَا) [1]

"ان کے پیغمبروں نے کہا کیا تم کو خدا کے بارے میں شک ہے جو سارے آسمان و زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟ ۔۔۔وہ کہنے لگے : تم بھی تو ہمارے ہی ایسے آدمی کے سوا کچھ نہیں ہو ۔۔۔"۔

(وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُؤمِنُوْااِذْ جَائَ هُمُ الْهُدَیٰ اِلَّااَنْ قَالُوْا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَراً رَسُوْلاً) [2]

"اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آچکی تو ان کو ایمان لانے سے کوئی شے مانع نہیں ہوئی مگر یہ کہ وہ کہنے لگے کہ کیا خدا نے کسی بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے"۔

(ذَلِکَ بِاَنَّهُ کَانَتْ تَاْتِيهِمْ رُسُلَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالُوْاأَبَشَر يَهْدُوْنَنَافَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوا) [3]

"یہ (برا نتیجہ) اس وجہ سے ہے کہ ان کے درمیان ان کے انبیاء واضح اور روشن دلیلیں لے کر آچکے ہیںلیکن وہ لوگ کہہ دیا کرتے تھے کیا ایک آدمی ہماری ہدایت کرے گا ؟ پس یہ لوگ کافر ہوبیٹھے اور منھ پھر لیا ۔۔۔"۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کفار کا اس طرح کے بہانہ تلاش کرنا اُن کے اُسی غرور و تکبر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ حقیقت میں وہ انبیاء علیہم السلام سے کہتے تھے کہ تم بھی تو ہمارے ہی ایسے آدمی ہو اور جب تم کو ہم پر کوئی برتری وفوقیت حاصل نہیں ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ تمہاری بات مان لیں ۔

یہ وہ چند باتیں ہیںجو انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کی نفسانی کیفیت کو ظاہر کرتی ہیں اب ہم یہ دیکھنا چاہیں گے کہ انھوں نے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ کرنے کے لئے کن طریقوں کو اپنایا لیکن اس سے پہلے مناسب ہے کہ استکبار کی بحث کو (انبیاء علیہم السلام سے جنگ و مقابلہ کرنے کی ایک علت کے عنوان سے) مکمل کرنے کے لئے ہم قرآن کریم کے اندر مستکبروں اور مستضعفوں کا ایک جائزہ پیش کردیں اور اس کے بعد اصل بحث کو آگے بڑھائیں۔

1۔ سورۂ ابراہیم آیت10۔2۔ سورۂ اسراء آیت94۔3۔ سورۂ تغابن آیت6۔

مستکبر اور مستضعف قرآن کی نگاہ میں

گذشتہ بحث میں قرآن کریم کی رو سے یہ بات واضح و روشن ہو گئی کہ تقریباً تمام معاشروں میںنسب سے پہلے معاشرہ کے مستکبر افراد ہی انبیاء علیہم السلام سے جنگ و مقابلے کے لئے اٹھتے رہے ہیں اور اس کے بعد وہ محروموں اور کمزوروں کو اپنے ساتھ کر لیتے اور ان کو انبیاء علیہم السلام کے خلاف ابھارتے تھے ۔ قرآن کریم میں ان دونوں اصطلاحات "مستکبر"اور "مستضعف" کے استعمال اور اس کے مفہوم کی اہمیت نیز ہمارے آجکل کے معاشرے میں ان دونوں لفظوں کو جو خاص مقام حاصل ہے اُن کے پیش نظر ان دونوں اصطلاحات کے مفاہیم کا قرآن کے نقطۂ نظر سے مختصر طور پر ایک جائزہ نامناسب نہ ہوگا ۔ اس بحث میں ہم پہلے استکبار اور استضعاف کے لغوی مفہوم کو بیان کریں گے اور اس کے بعد قرآن کریم میں ان دونوں لفظوں کے محل استعمال کا جائزہ لیں گے تاکہ ہم ان دونوں لفظوں کے بارے میں قرآن کریم کے آخری فیصلے تک پہونچ سکیں ۔

استضعاف اور استکبار کے لغوی معنی

"استکبار"اور "استضعاف "دونوں اصطلاحیں ، مصدر اور باب استفعال سے ہیں ۔ استکبار کا مادہ "کِبر" "بڑائی "کے معنی میں ہے ۔ اس بنا پر "استکبار"مصدر متعدی " ہے جو مفعول کا محتاج ہوتا ہے ۔عام طور سے مستکبر کسی چیز یا کسی شخص کو بڑا شمار کرتا ہے اگرچہ اکثر مقامات پر استکبار کا مفعول بیان نہیں کیا جاتا ۔ مثال کے طور پر قرآن کریم شیطان کے بارے میں فرماتا ہے :(اَبَیٰ وَا سْتَکْبَرَ وَ کَا نَ مِنَ الْکَا فِرِیْنَ)[1]

" اس نے نافرمانی کی اور اکڑ دکھائی اور کافرین میں سے ہوگیا "۔

1۔ سورۂ بقرہ آیت34۔

اس آیت میں فعل "استکبَرَ"کا کوئی مفعول نہیں آیا ہے عام طور سے ایسے مقامات پر استکبار کا مفعول وہی فاعل ہوتا ہے۔یعنی وہی شخص اپنے کو بڑا سمجھتا ہے۔

یہاں ایک دوسری بات جس کو مد نظر رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کبھی کلمۂ استکبار اور اس کے دوسرے مشتقات میں دوسرے فعل کے معنی شامل ہوتے ہیں۔یا نحویوں کی اصطلاح میں دوسرے فعل کے معنی متضمن ہوتے ہیں اور زیادہ تر ایسے مقامات پر اس فعل کو حرف جر "عن"یا "علیٰ" کے ذریعہ متعدی کیا جاتا ہے مثال کے طور پر قرآن کریم کے سورۂ غافر میں ارشاد ہوتا ہے:

(اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْ نَ عَنْ عِبَا دَتِیْ)[1]

"در حقیقت جو لوگ ہماری عبادت کرنے میں اکڑ دکھاتے ہیں وہ عنقریب ذلیل و خوار ہو کر جہنم واصل ہوجائیں گے"۔

کلمۂ "استکبار"کا حرف جر کے ساتھ متعدی ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اس میں دوسرے فعل کے معنی متضمن اور شامل ہیں اور اکثر مقامات پر حرف "عن "لا کر "اعراض اور اضراب (منھ پھیر لینا یا پیٹھ دکھانا)اور حرف "علیٰ "کا استعمال کر کے "زیادتی "اور جارحیت "کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔اس بنا پر "اِسْتَکْبَرَ عَلٰی فُلَانٍ "کا مطلب ہے اس نے خود کو بڑا سمجھا اور یہ اپنے کو بڑا دیکھنا ہی سبب بنا کہ وہ دوسرے پر ظلم اور اس کے حقوق میں زیادتی کرے۔

("اِسْتَکْبَرَ عَنْ شَیْئٍ) "یعنی خود کو بڑا دیکھا اور اس کی وجہ سے اس نے ایک چیز سے منھ موڑ لیا روگردانی کی۔

لیکن لفظ "استضعاف "کا مادہ "ضعف "ہے اور اس کے معنی سستی اور ناتوانی کے ہیں۔"استضعاف " اپنی ہیئت کے اعتبار سے دو معنی رکھتا ہے:ایک تو کمزور شمار کرنا یا کمزور جاننا ہے۔"اِسْتَضْعَفَہُ"یعنی " راٰہُ ضَعِیْفاً " عَدَّہُ ضَعِیْفاً "اس کو کمزور دیکھا اس کو کمزور شمار کیا۔

استضعاف کے دوسرے معنی: کسی شخص کو یا کسی چیز کو کمزور بنانا یا کمزور کر دینا ہے۔اس صورت میں "اِسْتَضْعَفَہُ"یعنی " حَمَلَہُ عَلَیَ الضَّعْف "یعنی اس کو کمزور بنا دیا۔

دوسرے لفظوں میں کلمۂ استضعاف اپنے دو محتمل معنی کی وجہ سے لفظ "استخفاف " کے مشابہ ہے۔ استخفاف بھی کبھی "ہلکا شمار کرنے "اور کبھی "ہلکا کر دینے "کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔قرآن کریم نے فرعون کے بارے

1۔سورۂ غافر آیت60۔

میں دونوں لفظیں استعمال کی ہیںیعنی فرعون اپنی قوم کے ساتھ استضعاف بھی کرتا تھا اور استخفاف بھی :

(فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَاَطَاعُوْهُ)[1]

"پس فرعون نے اپنی قوم کو (ذہن کا) ہلکا کردیا اور وہ اس کے تابعدار ہو گئے"۔

(وَجَعَلَ اَهْلَهاَ شِيَعاً يَسْتَضْعِفُ طَا ئِفَةً مِنْهُمْ)[2]

" اور اس نے وہاں کے رہنے والوں کو طبقات میں بانٹ دیا اور ان میں سے ایک طبقہ کو محروم اور زبوں حال کردیا"۔

مذکورہ مطالب کی رو سے "مستضعف" کے دو معنی ہیں :

1۔جس شخص کو کمزور شمار کیا جائے ۔

2۔جس شخص کو کمزور کردیا جائے ۔

مستکبروں اور مستضعفوں کی گفتگو

اس حصہ میں ہم پہلے ان آیات کو تحریر کریں گے جن میں مستکبرین اور مستضعفین ایک دوسرے کے مقابل کھڑے نظر آتے ہیں ۔ ان آیات کی رو سے ہر معاشرہ میں دو بنیادی طبقے کے افراد پائے جاتے ہیں : مستکبرین اور مستضعفین ۔اس کے بعد بحث سے متعلق تمام آیات کا جائزہ بھی لیں گے اور آخر میں نتیجۂ بحث کے عنوان سے یہ دیکھیں گے کہ قرآن کریم میں اصولی طور پر استضعاف اور استکبار کے معنی کیا ہیں اور مستضعفوں کی کتنی قسمیں ہیں ۔

قرآن کریم کی کچھ آیات میں آخرت کی اس طرح نقشہ کشی کی گئی ہے کہ وہاں مستکبرین اور مستضعفین ایک دوسرے کے آمنے سامنے (مقابل کھڑے ہو کر) گفتگو کریں گے ۔ یہ بات تین مقامات پر بیان ہوئی ہے ۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :

(وَ لَوْ تَرَىٰ اِذِ الظَّا لِمُوْ نَ مَوْ قُوْ فُوْ نَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْ لَ يَقُوْ لُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلاَ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ)[3]

"اور اے کاش جب ظالموں کو ان کے پروردگار کے سامنے حاضر کیا جائے گا تم دیکھتے (کہ کس طرح ان کے

1۔سورۂ زخرف آیت 54۔ 2۔سورۂ قصص آیت 4۔ 3۔سورۂ سبأ آیت 31۔

بعض افراد بعض)دو سرے افراد سے گفتگو کرتے ہیں ان میں جو کمزور اور ما تحت تھے بڑے لوگوں سے جو سرداری کیا کرتے تھے کہہ رہے ہوں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان دار ہوتے "۔

اس آیت میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں ابتداء میں تو مستکبروں اور مستضعفوں دونوں کو ظالموں اور ستم گروں کے زمرہ میں شمار کیا ہے اور اس کے بعد ان کی آخرت میں ہونے والی گفتگو کو نقل کرتا ہے ۔پہلے مستضعفین اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے متکبروں سے خطاب کریں گے :

اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایماندار ہوتے اور آج اہل دوزخ نہ شمار ہوتے ۔اس طرح مستضعفین مقام عذر میں اپنی گمراہی کا ذمہ دار متکبروں کوٹھہرائیں گے اور ان کو اصلی قصوروار کے عنوان سے پیش کریں گے ۔ لیکن مستکبرین بھی چپ نہیں رہیں گے اور ان کا جواب اس طرح دیں گے :

(أَنَحْنُ صَدَدْنا کُم عَنِ الْهُدَیٰ بَعْدَ اِذْجا ئَ کُمْ بَلْ کُنْتُمْ مُجْرِ مِیْنَ) [1]

"کیا ہم نے (جب تمہارے پاس خدا کی طرف سے ہدایت آئی تھی) تم کو راہ ہدایت سے زبردستی روکا تھا ؟ (نہیں)بلکہ تم خود گنہگار ہو "۔

مستکبرین استفہام انکاری کے ذریعہ مستضعفوں سے سوال کریں گے کہ کیا ہم نے تم پرہدایت کا راستہ بند کردیا تھا ۔ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ تم خود مجرم ہو اور اس قصور کے تم خود ذمہ دار ہو مستضعفین دوبارہ لب کشائی کرتے ہوئے جواب دیں گے :

(بَلْ مَکْرُاللَّیْلِ وَالنَّها رِاِذْ تَا مُرُوْنَنَا اَنْ نَکْفُرَبِا اللهِ وَنَجْعَلَ لَهُ اَنْدَا داً)

"۔۔۔(نہیں) بلکہ (تمہاری)رات دن کی چال بازیوں نے ہم کو (گمراہ کیا کہ)اس وقت جبکہ تم لوگ ہم کو خدا کے نہ ماننے پر ورغلاتے اور اس کا شریک ٹھہرانے کا حکم دیتے رہتے تھے "۔

اور اس طرح دونوں گروہوں کا مناظرہ ختم ہوتاہے۔سورئہ مبارکہ ابراہیم میں بھی ان دونوں گروہوں کی گفتگو اس طرح نقل کی گئی ہے :

1۔ سورئہ سبأ آیت 31۔

(وَبَرَزُوْاللهِ جَمِيْعاً فَقَالَ الضُّعَفٰاءُ لِلَّذِ يْنَ اسْتَكْبَرُوْااِنَّا كُنَّالَكُمْ تَبعاً فَهَلْ اَنْتُمْ مُغْنُوْنَ عَنَّامِنْ عَذَابِ اللّهِ مِنْ شَيئٍ قَالُوْالَوْهَدٰنَااللّهُ لَهَدَيْنَاكُمْ سَوَاءٌ عَلَيْنَاأَجَزِعْنَااَمْ صَبَرْنَامَالَنَامِنْ مَحِيْصٍ)[1]

" اور تمام لوگ خدا کے سامنے آکھڑے ہونگے ۔پس کمزور و محروم لوگ متکبّرین سے کہیں گے :ہم تو بس تمہارے قدم بقدم چلاکرتے تھے تو کیا (آج) تم خداکا عذاب دور کرنے میں بھی ہمارے کچھ کام آسکتے ہو؟وہ جواب دینگے :خدانے ہماری ہدایت کردی ہوتی تو ہم بھی ضرور تمہاری رہنمائی کردیتے خواہ بیقراری سے کام لیں خواہ صبر کریں اب تو ہمارے لئے (دونوں) برابر ہیں (کیونکہ عذاب سے)تو اب ہمیں چھٹکارا نہیں مل سکتا "۔

اس آیت میں اگرچہ "مستضعفین "کے مقام پر کلمہ"ضعفائ"استعمال کیا گیا ہے لیکن قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ضعفاء سے مراد وہی مستضعفین ہیں۔اس آیت کی بنیادپر مستضعفین مستکبرین سے کہیں گے کہ:ہم تمہاری پیروی کرنے سے ہی گمراہ ہوئے اور اس دوزخ کے عذاب میں گرفتار ہوئے ہیں تو کیا اب یہ ممکن ہے کہ تم ہمارے عذاب میں بھی کچھ حصہ بانٹ سکو۔

متکبرین جواب دیتے ہیں :اگر خدا نے ہماری ہدایت کی ہوتی تو ہم بھی تمہاری راہ راست کی طرف ہدایت کرتے اور دوسرا احتمال یہ ہے :اگر خداوند عالم نے (یہاں آخرت میں) ہماری جنت کی طرف راہنمائی کی ہوتی تو ہم بھی اپنے پیچھے پیچھے تم کو اپنے ساتھ جنّت میں لے جاتے اوردوزخ کے عذاب سے چھٹکارا دلادیتے ۔

بہر حال متکبرین مستضعفین کی نجات سلسلے میں اپنی ناتوانی کا اظہار کریں گے اور وہ نجات کے راستے اپنے لئے بھی اور ان کے لئے بھی بند پائیں گے لہذا وہ آخر میں کہیں گے:خواہ بیقراری دکھائیں خواہ صبر کریں جس چیز میں گرفتار ہوچکے ہیں اس کے تحمل کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔"مالنامن محیص"ہمارے لئے فرار کی کوئی راہ نہیں ہے ۔

1۔سورۂ ابراہیم آیت21۔

ایک تیسرے مقام پر جہاں قرآن کریم نے ان دونوں گروہونکی گفتگو نقل کی ہے سورۃ غافر میں ارشاد ہوتا ہے :

(وَاِذْ يَتَحَاجُّوْنَ فِی النَّارِفَيَقُوْلُ الضُّعفآؤُلِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْاِنَّا كُنَّالَكُمْ تَبَعاً فَهَلْ اَنْتُمْ مُغْنُونَ عَنَّانَصِيْباًمِنَ النَّارِقَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْااِنَّا كُلّ فِيْهَااِنَّ اللهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ)[1]

"اور جب یہ لوگ جہنم میں آتے وقت ایک دوسرے سے کٹ حُجتّی کریں گے تو کم حیثیت والے بڑے آدمیوں سے کہیں گے:ہم تمہارے ماتحت اور مطیع تھے تو کیا تم اس وقت دوزخ کی آگ کا کچھ حصہ ہم سے دور کرسکتے ہو سرکشی کرنے والے بڑے لوگ کہیں گے(اب تو)ہم اور(تم) سب ہی اس آگ میں پڑے ہیں خدا ہے جس نے بندوں کے بارے میں (جو کچھ)فیصلہ (کرنا تھا) کیا ہے"۔

جیسا کہ آپ نے دیکھا آیات کی روسے متکبرین اور مستضعفین دونوں قصوروار ہیں اور دونوں میں کوئی بھی دوسرے کے عذاب کا بوجھ اٹھانے کیلئے تیار نہیں ہے اس سلسلے میں دونوں بے بس ہیں۔ہاں مستکبرین جنھوںنے کام کی ابتداء کی اور مستضعفین کو عذاب کے دہانے پر لاکر کھڑا کردیا لیکن یہ عمل متکبرین کی زبردستی اور (مستضعفین)کی بے بسی اور ان کا اختیار سلب کرلینے کا مفہوم نہیں رکھتا اگر مستعضعفین چاہتے تو ان کی پیروی سے انکار کرسکتے تھے۔مختصر یہ کہ ایسا نہیں ہے کہ مستضعفین زبردستی کافر بنادئے گئے ہوں بلکہ وہ اپنے ارادئہ و اختیار سے کافر ہوئے ہیں لہٰذا اسکے وہ خودذمہ دار بھی ہونگے۔

قرآن میں مستکبر اور مستضعف کا مطلب

اب یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم کی مذکورہ آیات میں " ضعفاء "یا "مستضعفان "سے کون لوگ مراد ہیں ؟

جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ جس وقت انبیاء ٪ لوگوں کے سامنے اپنی رسالت کا اعلان کرتے تھے تو ان کا ایک گروہ جو خود کو قوی اور برتر سمجھتا تھا اپنی بڑائی جتانے پر اترآتا تھایہی "مستکبرین"ہیں لیکن ان کے نزدیک خود کو بڑا سمجھنے کا معیار و ملاک کیا تھا؟ یہ تو بعید ہے کہ وہ اپنی جسمانی خصوصیتوں (جیسے قد اور وزن وغیرہ)کی وجہ سے اپنے کو مستکبر سمجھتے رہے ہوں ۔ بلکہ معقول بات یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے کو بڑا سمجھنے کا معیار و ملاک یا تو اپنے پاس مال و دولت کی زیادتی کو بناتے ہوں یا پھر وہ اپنی سیاسی معاشرتی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوں دوسرے لفظوں میں ان معاشروں پر حکمراں اقدار و معیارات اس کا تقاضا کرتے تھے کہ ایک انسان کی بزرگی اور اہمیت کا معیار

1۔ سورئہ غافرآیت 47۔48۔

اس کی دولت اور مقام و منصب ہے ۔ایسے معاشروں میں جن کے ہاتھ مال و دولت سے خالی تھے اور جن کی پشت پر کوئی گروہ ، خاندان اور قبیلہ نہیں تھا ان کو مستضعفین کے گروہ میں شمار کیا جاتا تھا کیونکہ وہ بزرگی اور طاقت کے معیار و ملاک سے عاری تھے ۔

اس طرح یہ معاشرے عملی طورپر دو اہم گروہ میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور ایسے حالات میں گروہ (مستکبرین) کی معاشرتی حیثیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ان کی باتیں بڑی (حدتک) دوسرے گروہ پر اثر انداز ہوں اور خود مستضعفین بھی سماج پر حکمراں معیارات کو تسلیم کرتے ہوں اور ان کے ذہنوں میں مستکبروں کی برتری کا تصور ایک سماجی حقیقت کا روپ اختیار کر چکا ہو ،اور وہ بڑے آرام وسکون کے ساتھ مالداروں کی پیروی کر رہے ہوں (اِنَّا کُنَّا لَکُمۡ تَبَعاً)۔یہی نفسیاتی عمل (معاشرے پر حکمران جھوٹے اقدار و معیارات اور یہ کہ دولتمند اور بڑے قوم و قبیلہ کا مالک ہونا برتری اور بزرگی کا معیار و ملاک ہے) سبب ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں مستکبرین کی طرف سے کفر کی دعوت مستضعفین کے گروہ پر کارگرثابت ہوتی تھی ۔

البتہ یہ اثر اتنا قوی نہیں تھا کہ وہ اپنا اختیار کھو بیٹھیں اور کفر پر مجبور ہو جائیں ۔ بیشک یہ گروہ مجرم نہ ہوتا صرف قاصر ہوتا تو ہرگز اہل دوزخ نہ قرار پاتا ۔خدا وند عالم اس سے کہیں زیادہ مہربان و کریم ہے کہ وہ ایک مجبور و قاصر شخص کو ان کے دشمن مستکبرین کے عذاب میں سزا دے ۔ لیکن جیسا کہ آخری آیت میں بیان ہوا ہے : (اِنَّ اللّٰہَ قَدۡ حَکَمَ بَیۡنَ الۡعِبَاد) خدا وند عالم کا فیصلہ ہے کہ دونوں گروہ دوزخ میں ڈال دیئے جائیں ۔ معلوم ہوا دونوں گروہ قصوروارہیں لہٰذا دونوں کو اپنے عمل کا بدلا ملے گا اور وہ ایک کے عمل کا بوجھ دوسرے اپنے کاندھے پر نہیں اٹھا سکیں گے ۔

مندرجہ بالا مطالب کے مدنظر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مستضعفین گروہ نے ایک لحاظ سے خود بھی کمزوری دکھائی ہے اور شاید اسی وجہ سے مذکورہ دو آیات میں ان کو ضعفاء کے نام سے یاد کیا گیا ہے ۔اسی بناء پر یہ نہیں ہے کہ صرف دوسروں نے اس گروہ کو کمزور و محروم بنا دیا ہے بلکہ وہ خود بھی کمزور تھے ۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ ان کی یہ کمزوری صرف دولت اور قوم قبیلے اور معاشرتی جاہ وحشم کے اعتبار سے تھی یا اس سے بھی بالاتر وہ عقل و معرفت کے اعتبار سے بھی ضعیف تھے ؟

تو بہ ظاہر ذکر شدہ آیات کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس گروہ کی کمزوری صرف پہلی جہت سے تھی یعنی مال و دولت اور معاشرتی جاہ و حشم کا کم ہونا کیونکہ اگر کمزوری مذکورہ حالات یعنی اعتباری اور قراردادی جہت سے ہو تو اُن کے اور مستکبرّوں کے عذاب میں فرق کا سبب نہیں ہو گا ورنہ عقل اور معرفت میں کمی یا کمزوری انسان کے فرائض اور ذمہ داری کو کم کردیا کرتی ہے جو عذاب میں تخفیف چاہتی ہے ۔ بنابر ایں چونکہ آیات سے اِن دونوں گروہو نکے مابین عذاب کی شدت میں کسی فرق کا پتہ نہیں چلتا اس لئے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مستضعفین کی عقل اور ہوش میں کوئی نقص نہیں تھا بلکہ اُن پر ماحول کے صرف وہی نفسانی حالات طاری تھے جو ان کو سرمایہ دار طبقے اور معاشرہ کے قوی و طاقت افراد کی اطاعت و پیروی میں لگائے ہوئے تھے ۔ دوسرے لفظوں میں اس گروہ میں اندھی تقلید کا جذبہ حکمراں تھا یعنی جو کچھ معاشرہ کی صاحب اقتدار اقلیت انجام دے گی وہی یہ بھی انجام دیں گے : اور یہ جذبہ ان معاشروں پر ہی حکمراں ہوتا ہے جو تربیت الٰہی سے محروم ہوں ۔ افسوس کی بات ہے کہ آج بھی بہت سے ایسے مسلمان معاشرے ہیں جن میں مغربی معاشروں کی اندھی تقلید کا جذبہ موجود ہے ۔ مختصر یہ کہ ان آیات کی بنیاد پر (مستضعفین) اور (ضعفائ) کا مصداق ایک ہی ہیں یعنی ان سے (معاشرتی اور اقتصادی اعتبار سے) معاشرہ کا وہ کمزور طبقہ مراد ہے عام طور سے محرومی کا شکار بھی بنائے جاتے رہتے ہیں ۔

مستضعفین سے متعلق آیات کا ایک جائزہ

قرآن کریم کی بعض آیات میں استضعاف کے با لمقابل استکبار کی طرف اشارہ کئے بغیر استضعاف کے بارے میں بحث کی گئی ہے ۔ ان میں سے ایک آیت مدینہ کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے مکہ میں مسلمانونکی صورت حال سے متعلق ہے :

(وَاذْكُرُوْااِذْاَنتُمْ قَلِيْل مُستَضْعَفُونَ فِی الاَ رْضِ تَخَا فُوْنَ اَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَئَاوٰكُمْ وَاَیّدكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِنَ الطِّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ)[1]

" اور (مسلمانوں)وہ وقت یاد کرو جب سر زمین (مکہ)میں بہت مختصر اور کمزور و بے بس تھے تم ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تم کو اُچک نہ لے جائیں تو (خدا)نے تم کو پناہ دی اور اپنی مخصوص مدد سے تم کو قوی کیا اور تمھیں پاک و پاکیزہ روزی عطا کی تا کہ تم شکر گزار رہو "۔

اس آیۂ شریفہ میں مکہ کے مسلمانوں کو بے بس و کمزور کہا گیا ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کے با لمقابل کسی کا ذکر نہیں ہے ۔ یقیناً ان کو مکہ کے مشرکوں نے محروم و مستضعف بنا رکھا تھا ۔ یقیناً یہ کہنا درست ہوگا کہ مسلمان واقعی طور پر مشرکوں کے مقابلہ میں کمزور و محروم تھے ۔ نہ یہ کہ صرف مشرکین مکہ اُن کو کمزور شمار کرتے تھے ۔ مسلمان افراد اور تعداد کے لحاظ سے بھی اور اسلحہ اور جنگی ساز و سامان کے اعتبار سے بھی کمزور و محروم تھے ۔ لہٰذا یہاں پر بھی " مستضعف "اور "ضعیف "دونوں کا مصداق ایک ہے۔ قرآن مسلمانوں کو متوجہ کر رہا ہے کہ تم اپنے دشمنوں کی نظر میں بھی اور حقیقت

1۔ سورہ انفال آیت 26۔

علمی میں بھی کمزور و بے بس تھے لیکن خدا وند عالم نے تمہاری مدد کی اور تم پر اپنی نعمتیں نازل کیں ۔

یہ نکتہ بھی روشن ہے کہ مشرکوں کی بہ نسبت مسلمانوں کے کمزور ہونے سے مراد عقلی اور فکری اعتبار سے کمزور ہونا نہیں ہے اس لئے کہ بلا شبہ مسلمانوں میں عقلی رشد و ارتقا کافروں کی نسبت کہیں بہتر اور زیادہ تھا اور اسی عقلی ارتقا نے ان کو شرک و بت پرستی چھوڑنے اور اسلام قبول کرنے کی طرف مائل کیا تھا ۔ بلکہ مسلمانوں کو مکہ میں ان کی معاشرتی حیثیت کمزور ہونے کے لحاظ سے کمزور کہا گیا ہے۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ آیت میں لفظ "مستضعف "ان مسلمانوں کے لئے استعمال ہوا ہے جو معاشرہ میں مقام و حیثیت اور وسائل و امکانات کے اعتبار سے دشمنوں کے مقابلہ میں کمزور تھے ۔

قرآن میں وہ دوسرا مقام جہاں استضعاف کا مسئلہ ، اس کے بالمقابل استکبار کا ذکر کئے بغیر بیان کیا گیا ہے ، حضرت ہارون علیہ السلام کے بارے میں ہے ۔قرآن کریم کی آیات کی بنیاد پر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مناجات کے لئے کوہ طور پر گئے ہوئے تھے ، بنی اسرائیل نے ایک گوسالہ کا مجسمہ بنا کر اس کی پرستش شروع کردی ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور سے واپس پلٹے تو آپ نے دیکھا کہ بنی اسرائیل ایک گوسالہ کی پرستش کر رہے ہیں۔ اس وقت آپ نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی سرزنش کی کہ انھوں نے بنی اسرائیل کو بت کی پرستش کرنے سے کیوں نہیں روکا :

(وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهُ اِلَيْهِ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ) (1)

"۔۔۔اور (حضرت موسیٰ) نے اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو (ہارون) نے کہا: اے میرے ماں جائے اس قوم نے مجھ کو ناتواں سمجھ لیا اور قریب تھا کہ مجھکو قتل کرڈالیں ۔۔۔"۔

یعنی حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں کہا : لوگوں نے مجھکو ناتواں سمجھا اور قریب تھا کہ مجھکو مارڈالیں ۔۔۔گویا اس آیت میں بھی "استضعاف "کا مطلب ضعیف و ناتواں شمار کرنا ہے البتہ یہاں بھی حضرت ہارون علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے ضعیف و ناتواں شمار کرنے کے ساتھ حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ ضعیف و ناتواں تھے اس لئے کہ وہ بنی اسرائیل سے جنگ و مقابلہ کرنے اور بت پرستی سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کلمۂ "استضعاف "اس آیت میں بھی اور اس سے پہلے والی آیت میںبھی

1۔ سورۂ اعراف آیت150۔

کوئی منفی پہلو نہیں رکھتا بلکہ اس بات کی حکایت کرتا ہے کہ ایک شخص اور ایک گروہ کو دوسرے افراد کی نظروں میں کمزور وناتواں شمار کیا گیا ہے۔

قرآن کریم کی بعض آیات میں (ضعیف شمار کرنے کا) مسئلہ مصدر کی حیثیت سے کلمۂ استضعاف کا استعمال کئے بغیر بھی بیان کیا گیا ہے۔نمونہ کے طور پر حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم آپ سے کٹ حجتی کے دوران اس نکتہ پر بہت زیادہ زور دیا کرتی تھی کہ حضرت شعیب علیہ السلام ان کی نظر میں ایک کمزور شخص کے علاوہ کچھ اور نہیں ہیں اگر قوم کے درمیان ان کے رشتہ دار نہ ہوتے تو وہ کسی وقت بھی ان کو قتل کرڈالتی :

(قَالُوْا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيراً مِّمَّاتَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰيکَ فِيْنَاضَعِيْفاً وَلَوْلَا رَهْطُکَ لَرَجَمْنَاکَ وَمَااَنْتَ عَلَيْنَابِعَزِيْزٍ)[1]

"ان لوگوں نے کہا:اے شعیب جو باتیں تم کہتے ہو ان میں اکثر ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ہمارے درمیان بہت کمزور ہو ، اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تم کو (کب کا) سنگسار کرچکے ہوتے اور تم ہم پر کامیاب نہیں ہوسکتے"۔

جس وقت حضرت شعیب علیہ السلام لوگوں کو توحید، خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت ،فتنۂ وفساد سے پرہیز اور کم فروشی نہ کرنے کی دعوت دیا کرتے تھے لوگ کہتے تھے کہ ہم کو تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں اور تم توہمارے مقابلے میں بہت کمزور وناتواں ہو:"انا لنرٰیک ضعیفاً "ہم تم کو کسی شمار میں نہیں لاتے لہٰذا آیت سے ظاہر ہے کہ جناب شعیب کی قوم نے بھی ان کو ضعیف شمار کیا اور وہ ان کے لئے کسی طاقت و قدرت کے قائل نہیں تھے۔ لیکن قرآن نے لفظ "استضعاف" کے بجائے "لنرٰیک فینا ضعیفاً" جیسے جملہ سے استفادہ کیا ہے۔

بعض آیتوں میں لفظ "مستضعف "معاشرہ کے ضعیف و کمزور افراد کے لئے استعمال ہوا ہے :

(وَمَا لَکُمْ لَاتُقَتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَائِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِيّاً وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِيْراً)[2]

"اور تم کیوں خدا کی راہ میں اور کمزور اور بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں (کی نجات) کے واسطے جہاد

1۔ سورۂ ہودآیت 91۔

2۔ سورۂ نساء آیت 75۔

نہیں کرتے؟ وہی جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پالنے والے ہم کو اس شہر سے کہ جس کے باشندے بڑے ظالم ہیں باہر نکال دے اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا سرپرست قرار دے اور تو خود ہی کسی کو اپنی طرف سے ہمارا مددگار بنائے"

اس آیہ شریفہ میں بھی مستضعفین وہی بوڑھے مرد بوڑھی عورتیں اور بچّے ہیں جو مکّہ کے مشرکوں اور کافروں کے مقابلہ میں ضعیف و ناتواں تھے، ان میں اپنا دفاع کرنے کی طاقت نہیں تھی وہ نہ تو کفار سے جنگ و جدل کی طاقت رکھتے تھے نہ ہی ان میں مکّہ سے ہجرت کی ہمّت تھی، وہ بڑی بیچارگی کے ساتھ خداوند عالم کی نصرت کا انتظار کر رہے تھے۔

اور اللہ نے مکہ سے باہر رہنے والے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ کفّار کے ساتھ جنگ کریں اور کمزور و ناتواں و بے بس مسلمانوں کو نجات دلائیں۔

قرآن کی بعض آیات کی روشنی میں مستضعفین کے دو گروہوں کے درمیان فرق رکھا گیا ہے مستضعفین کا ایک گروہ وہ ہے جو اپنی ذمہ داری اور فرائض سے فرار کے لئے اپنے کو کمزور و ناتواں ظاہر کرتا تھا اور دوسرا گروہ وہ ہے کہ جس کی کمزوری کا عذر خداوند عالم نے قبول کیا ہے۔ ان دونوں گروہوں کی حکایت سورۂ مبارکہ نساء کی آیات میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

(اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰئِکَةُ ظَالِمِیْ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَا کُنْتُمْ قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا فَاُوْلٰئِکَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاۗءَتْ مَصِیْرًا)[1]

"بیشک جن لوگوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے جس وقت ان کی قبض روح فرشتوں نے کی ہے اُن سے سوال کیا! تم کس حال میں تھے؟ تو وہ کہنے لگے: ہم کو زمین پر کمزور بنا دیا گیا تھا (جواب میں فرشتے کہتے ہیں) کیا خداوند عالم کی زمین میں وسعت و گنجائش نہیں تھی کہ تم (کہیں) اور ہجرت کر کے چلے جاتے؟ پس ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کتنا برا ٹھکانا ہے"۔

آیت میں پہلے تو قرآن کریم نے فرشتوں کی کافروں سے ان کے مرنے کے بعد کی گفتگو نقل کی ہے۔ یہ گروہ" اپنے آپ پر ظلم کرنے والے"" (ظَالِمِیْ اَنْفُسِهِمْ) "ہیں کیونکہ خود کو کفر میں غرق کر دینا اور راہ حق سے روگرداں ہو جانا در حقیقت بہت بڑا ظلم و ستم ہے جو کافر خود اپنے اوپر کرتا ہے فرشتے اس گروہ سے کہتے ہیں: تم کس حال میں تھے؟ یعنی تم ایمان کیوں نہیں لائے؟ راہ حق پر کیوں نہیں چلے؟ مومنوں کی صف میں شامل نہ ہونے کا تمہارے

1۔ سورۂ نساء آیت 97۔

پاس کیا عذر تھا ؟کفار اپنے استضعاف کا بہانہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :ہم جس سرزمین پر زندگی بسر کررہے تھے وہاں مستضعفوں کے گروہ میں تھے ۔ اس وقت فرشتے اُن پر حجت قائم کرتے ہوئے کہتے ہیں !کیا تمہارے لئے سرزمین کفر سے ہجرت کرکے مومنوں سے مل جانا ممکن نہیں تھا اتنی بڑی زمین تنگ نظر آرہی تھی ۔چنانچہ استضعاف کا دعوی کرنے والے اس گروہ کا ٹھکانا مندرجہ ذیل(سورۂ نساء کی آیت98) کی شہادت کی بنیاد پر جہنم ہے ۔چونکہ وہ واقعاً قصوروار ہیں جس جگہ وہ کفر کی زندگی بسر کررہے تھے وہاں سے ان کے لئے ہجرت کرنا ممکن تھا ۔پھر بھی ایسا نہیں کیا اور پھر قرآن نے حقیقی مستضعفوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان کو خداوند عالم کی طرف سے بخش دیئے جانے والے افراد میں شمار کیا ہے :

(اِلَّاالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَايَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةًوَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيلاً فَأُوْ لَئِکَ عَسىَ اللہ اَنْ يَعْفُوَعَنْهُمْ وَکَا نَ اللہ عَفُوّاً غَفُوْراً)[1]

"مگروہ کمزور و محروم مرد اور عورتیں اور بچے کہ جن کے سامنے کوئی راہ تدبیر نہیں ہے جنھیںرہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ،جو لوگ (فی الجملہ معذور ہیں)خدا ایسے لوگوں سے درگزر کرے گا اورخدا تو بڑا معاف کرنے والا بخشنے والا ہے "۔

حقیقی مستضعفین وہ لوگ ہیں جو جسمانی ضعف و ناتوانی کی وجہ سے کافروں کا مقابلہ کرنے سے معذور و عاجز تھے اور مکہ میں رہنے ، جلنے اور کڑھنے اور حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرلینے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ تھا ۔یہ گروہ اگر اپنے فرائض کو سمجھنے یا اس پر عمل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو خداوند عالم کے نزدیک معذور ہو گا ۔

سورۂ مبارکۂ نساء میں ضعیف و ناتواں ، بے سہارا بچوں کے بارے میں گفتگو ہے اور ان کو مستضعفین کا مصداق کہا گیا ہے

:

(وَ مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِيْ يَتا مَى النِّسَاءِ الَّتِيْ لَا تُوْتُوْ نَهُنَّ ما كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالمستَضْعَفِينَ مِنَ الوِلْدَانِ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتَٰمَىٰ بِا لْقِسْطِ)[2]

"۔۔۔اور قرآن میں تمہیں جن سے متعلق تلاوت کے ذریعہ بتایا جا چکا ہے :ان یتیم لڑکیوں کے بارے میں ہے کہ جنھیں تم ان کا معین کیا ہوا حق نہیں دیتے اور ان سے نکاح کر لینا چاہتے ہو اور ان کمزور اور ناتواں بچوں کے

1۔سورۂ نساء آیت 98۔99۔

2۔سورۂ نساء آیت 127۔

بارے میں ہے اور یہ کہ یتیموں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرو۔۔۔"۔

اس آیت میں خدا وند عالم فرماتا ہے کہ لا وارث بچے ضعیف و ناتواں ہیں اور اپنے حق کا دفاع نہیں کر سکتے پس ان پر ظلم و ستم نہ کرو یہ ظاہر ہے کہ اس مقام پر بھی جن افراد کو مستضعف کہا گیا ہے ۔ حقیقت میں بھی وہ کمزور و ناتواں ہیں ، اور اپنی محدود فکری اور جسمانی طاقت کی وجہ سے وہ اپنے حقوق سے پوری طرح استفادہ کرنے سے قاصر و ناتواں ہیں ۔

ہم نے یہاں تک جن آیات کی وضاحت کی ہے ان میں "مستضعف" سے مراد وہ افراد ہیں۔ جن کو دوسروں نے کسی بھی دلیل کے تحت ، کمزور خیال کیا ہے ۔ (یہ استضعاف کے مذکورہ دو معنی میں سے ایک ہے) البتہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ان آیات میں جن افراد کو مستضعف کہا گیا ہے وہ واقعی معنی میں ایک طرح کی کمزوری و ناتوانی کا شکار رتھے ۔ مثال کے طور پر آخری آیات میں بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے بارے میں گفتگو ہے جن میں عام طور پر جسمانی اور فکری کمزوری پائی جاتی ہے اور دوسرے بھی ان کو ضعیف شمار کیا کرتے ہیں ۔ بنا بر این مذکورہ آیات میں استضعاف صرف "ضعیف شمار کرنے" کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن اب سوال یہ ہے کہ کیا کچھ آیات ایسی بھی ہیں کہ جن میں استضعاف دوسرے معنی میں یعنی "کسی کو ناتواں کردینے" کے معنی میں استعمال ہوا ہو؟

اسکا جواب یہ ہے کہ ہاں، بعض آیات میں دوسرے معنی کا بھی احتمال موجود ہے۔ اگرچہ پہلے معنی میں ہونا بھی مکمل طور پر قابل انکار نہیںہے۔ ان آیات میں سے ایک فرعون اور اس کی قوم کے بارے میں ہے سورۂ قصص میں ارشاد ہوتا ہے :

(اِنَّ فِرعَونَ عَلاَ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَ‌هَاشِیَعاً یَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِنْهُمْ) [1]

"فرعون نے (مصر کی) سرزمین میں بہت سر اٹھایا تھا اور وہاں کے رہنے والوں کو طبقوں میں تقسیم کردیا اور ایک طبقے کو بہت ہی کمزور و ناتواں کر رکھا تھا۔۔۔"۔

اس آیت میں احتمال پایا جاتا ہے کہ "یستضعف" سے مراد ضعیف و ناتواں شمار کرنا ہو لیکن زیادہ قوی احتمال یہ ہے کہ یہاں استضعاف کے دوسرے معنی یعنی ضعیف و ناتواں بنا دینا مراد ہیں اس احتمال کے تحت فرعون نے اپنی قوم کو کئی طبقوں میں تقسیم کردیا ۔ ایک گروہ تو وہی اس کے درباریوں اور امیروں کا تھا جن کو اس نے علیٰ عہدوں پر فائز کررکھا تھا اور اس کے خاص الخاص افراد، شرفا اور امرائمیں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کے بر خلاف فرعون نے ایک طبقے کو

1۔ سورۂ قصص آیت 4۔

معاشرہ میں کسی بھی مقام و منصب اور سماجی اقتصادی اقتدار سے محروم کررکھا تھا اور اس طرح اس نے ان کے کمزور کرنے کے اسباب فراہم کردیئے تھے ۔پس احتمال قوی کی بنیاد پر اس آیۂ شریفہ میں استضعاف سے مراد کمزور و ناتواں کرنا ہے۔ قرآن کریم اس کے بعد کی (آیت5)میں آگے بڑھ کر مستضعفین کے بارے میں خداوندعالم کے وعدے کو اس طرح بیان کرتا ہے:

(وَنُرِيدُ اَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتَضْعِفُوافِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ ائِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ) [1]

"اور ہم یہ چاہتے تھے کہ جو لوگ روئے زمین میں کمزور کردیئے گئے تھے ان پر احسان کریں اور ان ہی کو (لوگوں کا)پیشوا بنائیں اور ان ہی کو اس (سرزمین)کا مالک بنائیں"۔

اگرچہ اس آیۂ شریفہ میں ظاہری طورپر "الذین استضعفوا" کے ذریعے پہلی آیت کی طرف اشارہ ہے اور اس سے مراد وہ مستضعفین ہیں جن کو فرعون نے ناتوان اور کمزور کردیا تھا لیکن بعض روایات میں بیان شدہ مطلب کے پیش نظر تاویل یا بطن آیہ امام زمانہ عج کے ظہور سے متعلق ہے اور اس میں خبر دی گئی ہے کہ امام مہدی عج کے زمانہ میں خداوندعالم ان افراد کو جو دوسروں کی نظر میں کمزور و ناتواں ہیں یا کمزوروناتواں کردیئے گئے ہیں طاقت و قوّت عطا کرے گا اور لوگوں کا ولی و سرپرست قرار دے گا۔بہر حال ان دو آیتوںمیں لفظ "یستضعف " اور "استضعفوا" سے مراد استضعاف کے دونوں معنی ہوسکتے ہیں اور دونوں کا احتمال موجود ہے۔

ایک دوسری آیت میں بھی بنی اسرائیل کو مستضعفین کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے:

(وَاَوْرَثْنَاالْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْايُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَٰرِقَ الْاَرْضِ وَمَغَٰرِبَهَاالَّتِى ْ بٰارَكْنَافِيْهَا) [2]

"اور وہ گروہ کہ جن کو ہمیشہ کمزور و محروم رہنا پڑا تھا ،سرزمین فلسطین کا کہ جس میں ہم نے برکت پیدا کردی تھی اسکے پورب پچھم سب کا وارث بنا دیا"۔

1۔ سورۂ قصص آیت5۔

2۔ سورۂ اعراف آیت 137۔

نتیجۂ بحث

استکبار اور استضعاف سے متعلق آیات پر سرسری نظر کے بعد اب حاصل شدہ کلی نتائج کو بیان کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ استکبار کے معنی اور اسی طرح استضعاف کے معنی میں ایک طرح کا تقابل ملحوظ رکھا گیا ہے۔یعنی جو شخص اپنی بڑائی جتاتا ہے فطری طور پر خود کو کسی شخص یا گروہ کے مقابلہ میں برتر اور بڑا سمجھتا ہے۔چونکہ اگر اس طرح کا مقابلہ اور تقابل نظر میں نہ ہو تو بڑا اور چھوٹا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اس بناء پر مستکبر وہ شخص ہے جو خود کو بڑا سمجھتا ہے اور دوسروں کو چھوٹا اور حقیر۔

اب یہ سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ مستکبرین خود کو کس اعتبار سے بڑا سمجھتے تھے۔ بعض آیات میں مستکبرین اور مستضعفین کے درمیان مقابلہ اس بات کی غماضی کرتا ہے کہ پہلا گروہ اس قوت و اقتدار کی بنیاد پر جو ان کو حاصل تھا اور دوسروں کو حاصل نہیں تھا ان کو ضعیف و ناتواں شمار کرتا تھا۔بعض آیات میں کہ جن کا ہم نے ذکر کیا طاقت کا معیار و ملاک افرادی قوت کی زیادتی اور فراوانی تھی اور اسی بنیاد پر مکہ کے مسلمان مکہ کے مشرکوں کے مقابلے میں بہت کمزور و ناتواں تھے:" (فَاذْكُرُوْٓااِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌمُّسْتَضْعَفِيْنَ ') یہ لوگ ممکن ہے بعض حالات میں جسمانی قوت یا مادی دولت و ثروت کے اعتبار سے قوی رہے ہوں لیکن چونکہ ان کی تعداد بہت کم تھی، قدرتی طور پر ان کی قوت و دولت مشرکین کی مجموعی دولت و طاقت کے مقابلے میں کسی شمار میں نہیں آتی۔

لیکن اکثر آیات میں افراد کا کم ہونا کمزور ہونے کا ملاک اور بنیاد نہیں ہے اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عقلی اعتبار سے کم ہونا بھی کلمہ استضعاف کے استعمال کا معیار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ زیادہ تر آیات میں سماجی حیثیت اور معاشرتی جاہ و حشم ملاک و بنیاد ہے جو مال و دولت کی فراوانی اور حسب و نسب کے افتخار اور خاندانی اور قبیلہ کے بڑے ہونے کے سبب ایک مخصوص گروہ کے استکبار اور خود کو بڑا سمجھ لینے کا باعث بنا ہے مختصر یہ کہ ایسے نظام میں جو کسی خاص اصول و معیار کی بنیاد پر (کہ جن کی قوانین و مذہب نے تائید نہ کی ہو)استوار ہوئے ہوں۔ایک گروہ کو معاشرہ میں خاص حیثیت اور اقتدار مل جاتا ہے اور دوسرا گروہ محرومی اور ناتوانی کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے یعنی ان کو ضعیف و ناتواں شمار کیا جانے لگتا ہے اور کبھی کبھی معاشرہ میں ان کو کمزور و محروم کرنے کے اسباب بھی فراہم کئے جاتے ہیں۔

استکبار اور استضعاف کی اہمیت

قرآن کی رو سے استکبا ر اور استضعاف کا مطلب بیان کرنے کے بعد یہ مطلب بیان کر دینا ضروری ہے کہ کیا قرآن کی رو سے استکبا ر اور مستضعفین کی خاص اہمیت ہے ؟ یا اخلاقی لحاظ سے ان کا بذات خود کوئی مثبت یا منفی رخ نہیں ہے ؟

جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ استکبا ر میں چونکہ اپنے کو بڑا سمجھنے ، فخر و مباہات کرنے اور ایک دوسرے پر برتری جتانے کے معنی پائے جاتے ہیں لہذا یہ اخلاقی اعتبار سے ایک بری صفت سمجھی جاتی ہے اور ہم یہ پہلے عرض کر چکے ہیں کہ (يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِى) کے مثل تعبیرو ں میں حق سے رو گردانی کرنا اور طغیان و سرکشی کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں اور اخلاقی اعتبار سے یہ تمام صفتیں مذموم ہیں ۔ اس بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم میں (استکبار) ایک گرا ہوا ، ناپسند اور منفی رخ کا حامل امر ہے ۔

لیکن استضعاف کا مسئلہ دوسرا ہے استضعاف میں بذات خود منفی مفہوم نہیں پایا جاتا ۔ کیونکہ یہ کلمہ حقیقت میں ایک شخص کے بارے میں دوسرے اشخاص کے رویہ اور طرز فکر کو بیان کرتا ہے خود کسی شخص کی صفت بیان کرنا نہیںہے اور اسی وجہ سے استضعاف کے افعال مجہول استعمال ہوتے ہیں معروف میں استعمال نہیںہوتے : (اُسْتُضْعِفُواْ) یعنی کمزور شمار کیے گئے یا (کمزور) بنادیئے گئے ؛ (اِسْتَضْعَفُوْا) "یعنی کمزوری کا اظہار کرنا استعمال " نہیںکرتے البتّہ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ زیادہ تر مقامات پر جہاں مستضعفین یعنی (کمزور و بنادیئے گئے یا شمار کئے گئے) استعمال ہوا ہے ، اس کے مصادیق حقیقت میں بھی بعض پہلو سے کمزور و محروم تھے لیکن یہ کمزوری اور محرومی (مثال کے طور پر مادی اعتبار سے فقیر ہونا یا معاشرہ میں کسی عہدہ پر فائز ہونا) بذات خود بری بات نہیں ہے ۔

دوسرا قابل توجہ نکتہ "استکبار"اور دولتمند ہونے کا تعلق ہے ۔بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ تمام دولتمند افراد مستکبرہیں اور کبھی کبھی ان دونوںلفظوں کو ایک دوسرے کے مترادف شمار کرلیتے ہیں لیکن یہ تصور غلط ہے ۔جیسا کہ ہم عرض کرچکے ہیں کہ"استکبار" اس اعتبار سے کہ اس کا مطلب خود کو بڑا سمجھ لینا ہے اور اس کے اندر حق کے مقابلہ میں طغیان و سرکشی کرنا شامل ہے جو ایک مذموم بات ہے اورایک منفی رخ پایاجاتا ہے لیکن استکبار کا مطلب نہ تو دولتمند ہوناہے اور نہ ہی دونوںایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں لہٰذا استکبار سے متعلق آیات کی بنیادپر قطعی نہیں کہا جاسکتا کہ دولتمند ہونا بالذات ناپسند چیز ہے اور ہم یہ بات بھی جانتے ہیں کہ تاریخ میں سب سے زیادہ دولت رکھنے والوں میں سے ایک حضرت سلیمان علیہ السلام بھی ہیں ۔تو کیا پیغمبر خدا کو، صرف ان کے پاس دولت ہونے یا معاشرہ میں ممتاز مقام و حیثیت ہونے کی وجہ سے مستکبر کہا جاسکتا ہے؟قطعاً ایسا نہیںکہا جاسکتا ۔تو معلوم ہواکہ کسی کو صرف اسکے دولتمندہونے یاکسی سماجی عزت و منصب پر فائز ہونے کے سبب مستکبر نہیں سمجھناچاہئے ۔اس مدعا کا دوسرا شاہدیہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ایک روزخود مستضعفین مقام ولایت وحکومت پر فائز ہونگے اور معاشرہ میں اعلی سماجی حیثیت حاصل کرینگے :(وَنَجْعَلَهُمْ ائِمةً وَنَجْعَلُهُمْ) [1]

"اورہم ان کو (لوگوں کا)پیشوا قراردیں گے اور ان کو (زمین کا)وارث بنادیں گے "

کیا یہ گروہ صرف وعدئہ الٰہی پورا ہوتے ہی واضح متکبروں کی صف میں شمارکیا جانے لگے گا ؟

اسی طرح قرآن کے بقول مستضعفین مستکبروں کے وارث ہو نگے اور ان کا اموال و اسباب سب کچھ اپنے اختیار میں لینگے :(وَاَوْرَثْنَاالْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْايُسْتَضْعَفُوْنَ مَشٰرِقَ الْاَرْضِ وَمَغٰرِبَهَاالَّتِیْ بٰرَكْنَافِيْهَا) [2]

"اورجن گروہ کو مسلسل محروم وکمزور رکھا گیا انھیں (سرزمین فلسطین کا)ایک مغربی اور مشرقی حصہ ہم نے وراثت میں عطا کردیا ۔۔۔"۔

1۔سورئہ قصص آیت5۔

2۔سورئہ اعراف آیت 137۔

عوام کا انبیاء علیہم السلام کے ساتھ برتائو

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کرچکے ہیں کہ قرآن کریم کی بعض آیات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ امت کے تمام لوگ انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور بعض آیات یہ بھی بتاتی ہیں کہ اس کام کا آغاز لوگوں کے ایک خاص طبقے یعنی مترفین اور مستکبرین کے ذریعے ہوتا اور پھر ان کے پروپگنڈوںاور دوسروں کے مطیع بن جانے کے سبب انبیاء علیہم السلام کی وسیع پیمانے پر مخالفت اورا نہیںجھٹلانا شروع ہوجاتا۔ انبیاء علیہم السلام سے جنگ کرنے والے مستکبروں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے جھوٹے معیارات کی بنیا دپر معاشرہ میں اپنا خاص مقام بنائے ہوئے تھے اور اپنی دولت کی بنیادپر عیش و عشرت میں زندگی بسر کرنے میں مصروف رہتے تھے، کمزور طبقہ کے لوگوں پر فخر و مباہات جتاتے اور معاشرہ میں اپنے مقام و منصب سے فائدہ اٹھاکر دوسروں کوبھی اپنی اطاعت پر مجبور کرکے لوگوں کو انبیاء علیہم السلام کے خلاف جنگ کی دعوت دیا کرتے تھے ۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ انبیائے الٰہی کی تعلیمات کفر و شرک کے علم برداروں کے ظالمانہ اقتدار کو نیست و نابود کرتی ،ان کے تسلّط کو پاش پاش کردیتی اور لوگوں کو خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت اور اس کے قوانین کی اطاعت و پیروی کی دعوت دیا کرتی تھیں ۔ اس طرح کے ماحول میں ظاہر سی بات ہے کہ کفّار و مشرکین مختلف طریقوں سے انبیا ء کے خلاف جنگ میں مشغول ہوجایا کرتے تھے وہ سمجھتے تھے اس طرح ان کی تبلیغ کے فروغ کو روک دیں گے اور اپنے طاغوتی تسلّط کو ہمیشہ برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے ہم گفتگو کے اس حصّہ میں قرآن کریم کی آیات کی روشنی میںّانبیاء علیہم السلام کے خلاف (کفّار و مشرکین)کی جنگ کے اہم طریقوں کا جائزہ لیں گے۔

مذاق اڑانا

بعض آیات میں ملتاہے کہ بلاکسی استثناء کے لوگوں نے تمام انبیاء علیہم السلام کا مذاق اڑانے کی کوشش کی ہے:

(یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبادِمَایَا تِیْهِمْ مِنْ رَسُوْلٍ اِلّاَ کَانُوْا بِهِ یَسْتَهْزِئُ وْنَ)[1]

" افسوس ان بندوں کے حال پر کہ جس کے درمیان کوئی رسول نہیں آیا مگر یہ کہ ان لوگوں نے اسکے ساتھ مسخرا پن ضرور کیا "

(وَمٰا یَأْتیهِمْ مِنْ نَبیٍ اِلّاٰکٰانُوا بِه یَسْتَهْزِؤُنَ)[2]

"اور ان کے پاس کوئی نبی نہیں آیا مگر یہ کہ ان لوگوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو "

(وَمَا یَ ْ تِیْهِمْ مِنْ رَسُوْلٍ اِلّاٰکَانُوْا بِهِ یَسْتَهْزِئُ وْنَ)[3]

"ان کے پاس کوئی رسول نہیں آیا مگر ان لوگوں نے اس کی ضرور ہنسی اڑائی "

ان تینوں آیات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کا ایک طریقہ ان کا مذاق اڑانا تھا لیکن یہ مذاق اڑانے کا اندازکیا تھا ؟اس کے جواب میں ہماری راہنمائی کے لئے قرآن کریم کی بعض آیات موجودہیں ۔نمونہ کے طورپر پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ کافروں کے رویہ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَاِذَارَئَ اکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْااِنْ یَتَّخِذُوْنَکَ اِلّاَهُزُواً هٰذَاالَّذِی یَذْکُرُ اٰلِهَتَکُمْ)[4]

"اور جب تمھیں کفّار دیکھتے ہیں تو بس تم سے مسخرا پن کرتے ہیں (اور کہتے ہیں)کیا یہ وہی شخص ہے جو تمہارے معبودوں کو (برا بھلا)کہتا ہے ؟۔۔۔"

مشرکین اپنے ان حقارت آمیز الفاظ سے (کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو تمہارے معبودوں کو برے الفاظ سے یاد کرتا ہے ؟پیغمبر اسلام کامذاق اڑانے کی کوشش کیا کرتے تھے کہ ان کو لوگوں کی نظروں میں گرادیں ۔اسی سے ملتی جلتی یہ تعبیر ایک اور آیت میں بھی نقل ہوئی ہے :

1۔ سورۂ یس آیت30۔

2۔ سورۂ زخرف آیت7۔

3۔ سورۂ حجر آیت11۔

4۔ سورۂ انبیاء آیت36۔

(وَاِذَارَئَ اکَ الَّذِیْنَ کَفرُوْا اِنْ یَّتَّخِذُوْنَکَ اِلَّا ھُزُواًاَھَذاالَّذِی یَذْکُرُ ئَ الِھَتَکُمْ)[1]

" اور (اے رسول) یہ لوگ جب آپ کو دیکھتے ہیں تو محال نہیں کہ آپ کا مذاق نہ اڑائیں (کہ) کیا یہ وہی شخص ہے جو تمہارے معبودوں کو (برا بھلا) کہتا ہے؟"۔

مشرکین اپنے ان حقارت آمیز الفاظ سے (کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو تمہارے معبودوں کو برے الفاظ سے یاد کرتا ہے ؟) پیغمبر اسلام کا مذاق اڑانے کی کوشش کیا کرتے تھے کہ ان کو لوگوں کی نظروں میں گرادیں ۔ اسی سے ملتی جلتی تعبیر سورۂ فرقان میںبھی نقل ہوئی ہے :

(وَاِ ذَارَئَ وْک اِن یتَّخِذُ وْنَکَ اِلَّا ھُزُواً اَھٰذاَالَّذِی بَعْثَ اللہ رَسُوْ لاً) [2]

" اور (اے رسول) یہ لوگ جب آپ کودیکھتے ہیں تو محا ل نہیں کہ آپ کا مذاق نہ اڑائیں (کہ) : کیا یہ وہی ہیں جنھیں (اللہ نے) رسول بنا کر بھیجا ہے "

بعض آیات میں مومنین کا مذاق اڑانے کی باتیں بھی ملتی ہیں :

(اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْاکَانُوْامِنَ الَّذِیْنَ آمَنُوْایَضْحَکُوْ نَوَاِذَامَرُّوْابِھِم یَتَغَامَزُوْ نَوَاِذَا انْقَلَبُوْااِلَیٰ اَھْلِھِمُ انْقَلَبُوْافَکِھِیْنَ وَاِذَارَأَوْھُمْ قَالُوْااِنَّ ھٰؤُ لَائِ لَضَالُّوْنَ)[3]

"ہاں، دنیا میں جو گنہگار، مومنوں کی ہنسی اڑایا کرتے تھے اور جب ان کے پاس سے گذرتے تو آپس میں آنکھیں مارا کرتے تھے اور جب اپنے گھر والوں میں لوٹ کر آتے تو ٹھٹے لگاتے اور جب ان (مومنین) کو دیکھتے تو کہتے تھے کہ(دیکھو) یہ لوگ توگمراہ ہو چکے ہیں"۔

بہرحال انبیاء علیہم السلام کے مخالفوں میں رائج عام روش یہ تھی کہ وہ اپنے نبیوںاور ان کے پیروؤں کی رفتار و گفتار کا مذاق اڑایا کرتے تھے ۔ وہ ان کا اتنا زیادہ مذاق بناتے کہ اگر انبیاء علیہم السلام عام افراد ہوتے اور خداوند عالم کی قدرت اور حمایت پر اعتماد نہ کرتے تو یقیناًپیچھے ہٹ جاتے اور میدان چھوڑ کر باہر ہو جاتے ۔ اس لئے کہ جب معاشرہ میں کسی شخص کا خاص و عام تمام افراد مضحکہ کرنے لگیں تو وہ بڑی مشکل سے ہی ان کے سامنے ٹھہرپاتا ہے اور ایسے مواقع پر اگر کوئی مصلحت اندیش ہو اتو وہ عام طورپر مسخرہ کرنے والے گروہ سے دوری اختیار کرلیتا ہے بلکہ اس معاشرہ ہی کو ترک کردیتا ہے لیکن چونکہ انبیاء علیہم السلام کی رسالت خداوند عالم کی عطا کردہ رسالت تھی اور انھیںخدا

1۔ سورۂ انبیا آیت 36 ۔2۔ سورۂ فرقان آیت41۔3۔ سورۂ مطففین آیات 29۔ 32۔

کی طرف سے صبر و استقامت کا حکم تھا وہ جان پر بن آنے کے با وجود دشمنوں کی ہنسی مذاق کا مقابلہ کرتے تھے ۔

تہمت

جب مخالفوں کو ہنسی مذاق چھچھوری حرکتوںؔسے کوئی فائدہ نہ ملتا اور انبیاء علیہم السلام اسی طرح محکم و استوار اپنا کام جاری رکھتے تو وہ دوسرا طریقہ اختیار کرتے تھے جس کو آج کل کی اصطلاح میں " شخصیت کا قتل "یا خاتمہ کہا جاتا ہے ۔اس کا ایک طریقہ یہ تھا کہ ناروا تہمتیںؔلگائی جاتی تھیں ۔ مخالفین تہمتوں اورناروا نسبتوں کے ذریعہ یہ کوشش کرتے تھے کہ انبیاء علیہم السلام کی کارکردگی کو مناسب اور الٹی تصویرپیش کریںؔاور لوگوں کو انبیاء علیہم السلام کے قریب نہ ہونے دیں ۔ قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام کے بارے میں عام طورپر رائج جس تہمت کا ذکر کیا ہے وہ جادوگری "سحر" اور دیوانگی "جنون"کی تہمت ہے ۔ قرآن کریم کی بعض آیات سے پتہ چلتا ہے کہ خداوند عالم کے تمام انبیاء علیہم السلام پر یہ دو تہمتیں لگائی گئی ہیں :

(كَذٰلِکَ مَا اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَسُوْلٍ اِلَّاقَالُوْاسَاحِراَوْمَجْنُوْ ن)[1]

" اسی طرح ان سے پہلے کے لوگوں کے درمیان بھی کوئی نبی نہیں آیا مگر یہ کہ اس کو جادو گرکہتے یا دیوانہ کہہ دیا گیا "۔

اس کے بعد خدا وند عالم فرماتا ہے :

(اَتَوَاصَوْابِهِ بَلْ هُمْ قَومطَاغُوْنُ)[2]

" کیا یہ لوگ ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کردیا کرتے ہیں ؟ (نہیں) بلکہ یہ لوگ ہیں ہی سرکش "۔

جادوگری اور دیوانگی کے الزام کا منصوبہ اس وسیع سطح پر رواج پا چکا تھا کہ لگتا تھا لوگوں نے ایک دوسرے کو اس کام کی وصیت کردی ہو اور گویا لوگوں نے ہر پیغمبر کو ان دو آفتوں سے متہم کرنے کی سازش رچ رکھی ہو البتہ حقیقت پوچھئے تو پہلے سے کسی سازش کے رچے جانے کی بات نہیں تھی "بل ھم قوم طاغون" بلکہ اس گروہ کی لوگوں سے سرکشی اس طرح تہمتیں لگانے کا باعث ہوتی تھیں۔

بعض آیات میں مخصوص انبیاء علیہم السلام کو جنون اور(دیوانگی) سے متہم کرنے کا ذکر بھی موجود ہے مثال کے طور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بارے میں آیا ہے :

1۔ سورۂ ذاریات آیت 52 ۔2۔ سورۂ ذاریات آیت 53۔

(كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّ بُواعَبْدَنَاوَقَالُوْامَجْنُوْن وَازْدُجِرَ)[1]

" ان سے پہلے نوح کی قوم نے (بھی) جھٹلایا تھا اور انھوں نے ہمارے بندے (نوح) کو جھٹلایا اور کہنے لگے : یہ تو دیوانہ ہے ۔ اور اس کے بعد ان کو جھڑ کا بھی " ۔

اور یہ بھی امت نوح کی زبانی نقل ہو ا ہے:

(اِنْ هُوَاِلَّارَجُل بِهِ جِنَّة فَتَرَ بَّصُوْابِهِ حَتّٰى حِيْنٍ)[2]

" وہ تو یوں ہی بس ایک آدمی ہے جسے جنون ہوگیا ہے پس ایک خاص وقت تک اس سے دست بردار ہوجاؤ"

اور کبھی ان پر گمراہی اور ضلالت کی تہمت لگایا کرتے تھے :

(قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ اِنَّا لَنَرٰيکَ فِيْ ضَلَالٍ مُبِيْنٍ)[3]

"ان کی قوم کے چند سرداروں نے کہا : ہم تو یقین ہے کہ تم کُھلم کُھلّا گمراہی میں ہو" ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی اسی طرح کی آیات موجودہیں کہ جن میں ان پردیوانگی کی تہمت کو نقل کیا گیا ہے ۔ منجملہ ان کے سورۂ مبارکہ شعراء میں ہے :

(قَالَ اِنَّ رَسُوْلَکُمْ الَّذِی اُرْسِلَ اِلَيْکُمْ لَمَجْنُون)[4]

"(فرعون)نے کہا (لوگو!)واقعاً یہ رسول جو تمہارے پاس بھیجا گیا ہے ۔ ہونہو دیوانہ ہے"۔ جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کٹ حجتی کی اور آپ ﷺ کے محکم و استوار جوابات کے مقابلہ میں کوئی بس نہ چلا تو اس کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیوانہ کہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا ۔ اگر ہم غور کریں تو مندرجہ بالا آیت فرعون کی تہمت نقل کرنے کے ساتھ اس کے مذاق اڑانے کے لہجے کو بھی بیان کرتی ہے اس لئے کہ فرعون کی گفتگو کا اندازیہ ہے کہ جو شخص حقیقت میں پیغمبر نہ ہو بلکہ صرف پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرے تو وہ دیوانہ ہے ۔

فرعون کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر دیوانگی اور جادو گری کی تہمت لگانے کا قصہ دوسری آیت میں بھی نقل ہوا ہے :

1۔ سورۂ قمر آیت 9۔2۔ سورۂ مومنون آیت 25۔3۔ سورۂ اعراف آیت60۔4۔ سورۂ شعراء آیت27۔

(فَتَوَلّیٰ بِرُکْنِہِ وَ قَالَ سٰحِراَوْمَجْنُوْن)[1]

"پس(فرعون) نے منہ پھیر لیا اور کہا:(یہ شخص)جادوگر دیوانہ ہے"۔

چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے دربار میں داخل ہونے کی اجازت بڑی مشکلوں کے ساتھ ملی تھی فرعون نے ایک دم لاپرواہی کے ساتھ منہ موڑتے ہوئے کہا:وہ یا توجادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔عربی میں "تولّی بُرکنہ" اس مقام پر استعمال کیا جاتا ہے جہاں ایک شخص کسی دوسرے شخص یا چیز کی طرف سے لاپرواہ ہوکر منہ پھیر لے۔

حضرت ہود علیہ السلام پر بھی بے وقوفی اور کم عقل ہونے کی تہمت لگائی گئی ہے:

(قَالَ الْمَلَأُ الَّذِینَ کَفَرُوْامِنْ قَوْمِہِ اِنَّالَنَرَاکَ فِی سَفَاھَةٍ وَاِنَّالَنَظُنُّکَ مِنَ الْکَاذِبِیْنَ)[2]

"ان کی قوم کے چند سردار کافر تھے کہنے لگے:ہم کوتو تم حماقت میں (بتلا) نظر آرہے ہو اور ہم کو یقین ہے کہ تم جھوٹے ہو"۔

جنون و دیوانگی کی تہمت تو پیغمبر اسلام ﷺ پر بھی لگائی گئی ہے:

(وَقَالُوایَاایُّھَاالَّذِی نُزِّلَ عَلَیْہِ الذِّکْرُاِنَّکَ لَمَجْنُون)[3]

"اور انھوں نے کہا:اے وہ شخص کہ جس پر قرآن نازل ہوا ہے یقینا تو دیوانہ ہے"۔

اس آیت میں کفار کا لہجہ فرعون کے لہجہ کی مانند ہے۔وہاں اُس نے کہا تھا:

(اِنَّ رَسُولَکُمْ الَّذِی اُرْسِلَ اِلَیْکُمْ لَمَجْنُون)

"(لوگو)یہ رسول جو تمہارے درمیان بھیجا گیا ہے ہو نہ ہو دیوانہ ہے"اور یہاںکفّار تمسخر آمیز لہجہ میں پیغمبر اسلام ﷺ سے کہتے ہیں:اے وہ شخص کہ جس پر قرآن نازل ہوا ہے یعنی اے وہ جو خود پر آسمان سے کتاب نازل ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے تو حقیقت میں دیوانہ ہے(ورنہ ایسی بات نہ کرتا)گویا یہاں بھی مخالفین نے پیغمبر پر بڑے پُرزور لہجے میں دیوانگی اور جنون کی تہمت لگائی ہے اس لئے کہ جملہ اسمیہٴ (اِنَّکَ لَمَجْنُونْ) اور حرف تاکید(اِنَّ)اور "لام"کا استعمال بتا تا ہے کہ انھیں اپنے دعوے پر زیادہ اصرار تھا ۔

1۔سورئہ ذاریات آیت39۔2۔سورئہ اعراف آیت66۔3۔سورئہ حجر آیت6۔

(وَيَقُولُونَ اِنَّهُ لَمَجْنُون)[1]

"۔۔۔اور وہ کہا کرتے تھے :وہ واقعاً دیوانہ ہے :

(ثُمَّ تَوَلَّوْاعَنْهُ وَقَالُوامُعَلَّم مَجْنُون)[2]

"پھر انھوں نے اس سے منھ چراتے ہوئے کہا یہ تو تعلیم یافتہ دیوانہ ہے "۔

دیوانگی کی تہمت کے علاوہ وہ لوگ پیغمبر کو بعض وقت سر پھرا شاعر بھی کہا کرتے تھے اور شاعری کی تہمت کو خاص طور پر اس وقت اور زیادہ بڑھتی تھی جب پیغمبر اکرم ﷺ فصاحت و بلاغت سے لبریز قرآنی آیات زبان پر جاری فرماتے تھے ۔ اس مقام پر پیغمبر اکرم ﷺ کے مخالفوں نے آپ کو ایک شاعری جاننے والا پیغمبر ہی نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھکر آپ کو(اشعار کا) گویا قرار دیا ہے :

(وَ يَقُولُونَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْاءَ اٰلِهَتِنَالِشَاعِرٍمَجْنُوْنٍ)[3]

"اور یہ لوگ کہتے تھے کہ کیا ایک پاگل شاعر کے لئے ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ بیٹھیں ؟"۔

(بَلْ قَالُوْااَضْغٰثُ اَحْلٰمٍ بَلِ افْتَرٰيهُ بَلْ هُوَشَاعِر) ۔۔۔"[4]

"بلکہ کہتے:(یہ قرآن تو) اس کے خوابہائے پریشان کا مجموعہ ہے (نہیں)بلکہ اس نے (اپنے جی سے) جھوٹ موٹ گڑھ لیا ہے بلکہ یہ شخص (خالص) شاعر ہے"۔

(اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِر نَتَرَبَّصُ بِهِ رَيْبَ الْمَنُوْنِ)[5]

"یا یہ لوگ کہتے کہ (یہ)شاعر اور ہم اب اس کی موت کا انتظار کررہے ہیں یعنی موت کے سوا اب کوئی چیز اس کا علاج نہیں کر سکتی"۔

پیغمبر اکرم ﷺ پر نا روا تہمتیں اور طرح طرح کی نسبتیںلگائی جاتی تھیںحتیٰ کہہ دیا کہ پیغمبر پر جادو کیا گیا ہے اور آپ پر جادو گروں کے جادو کا اثر ہے:

(ذْيَقُوْلُ الظَّالِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلّارَجُلاً مَّسْحُوْراً)[6]

1۔ سورۂ قلم آیت51۔ 2۔ سورۂ دخان آیت14۔3۔ سورۂ صافات آیت36۔ 4۔ سورۂ انبیاء آیت5۔5۔ سورۂ طور آیت30۔ 6۔ سورۂ اسراء آیت47۔

"اور جب ظالم کہتے ہیں کہ تم تو بس ایک (دیوانے) آدمی کے پیچھے بھاگ رہے ہو جس پر کسی نے جادو کردیا ہے"۔

اس طرح ایک طرف تو کفار پیغمبر اکرم ﷺ پر جادوگری کا الزام لگاتے تھے اور دوسری طرف آپ کی رسالت کو بے اعتبار کرنے کے لئے آپ کو جادو سے متاثر اور مسحور شخص کہا کرتے تھے۔

پیغمبر اکرم ﷺ پر کاہن ہونے کا الزام بھی لگایا گیا۔ کاہن اس شخص کو کہتے ہیں جس کا جنوں سے رابطہ ہو یا جس نے جن کو قبضہ میں کر رکھا ہو اور وہ ان (اَجِنَّہ) کے سکھائے پر عمل کرتا ہو چنانچہ مشرکین نے جب دیکھا کہ پیغمبر کو ساحر، شاعر اور دیوانہ کہنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے تو انھوں نے آپ کو کاہن کہنا شروع کر دیا۔

یہ بھی بیان کردینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے پیغمبر اکرم ﷺ پر لگائی جانے والی تہمتوں کے جواب میں چپ رہنا جائز نہیں سمجھا اور آپ کی ذات گرامی کا دفاع کرتے ہوئے جواب دیا ہے:

(اِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ وَمَاهُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍقَلِیلاً مَّا تُؤْمِنُوْنَ)[1]

"بے شک یہ (قرآن) ایک محترم ایلچی کا پہنچایا ہوا قول ہے کسی شاعر کی تک بندی نہیں ہے (کہ) تم میں بہت کم لوگ ایمان لائے ہیں"۔

(وَمَاعَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَوَمَا یَنْبَغِیْ لَهُ)[2]

"اور ہم نے نہ اس (پیغمبر) کو شعر کی تعلیم دی ہے اور نہ شاعری ان کی شایان شان ہے"۔

(فَذَکِّرْفَمَااَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّکَ بِکَاهِنٍ وَلاَمَجْنُونٍ)[3]

"تو (اے رسول) تم نصیحت کئے جاؤ (کیونکہ) تم اپنے پروردگار کے فضل سے نہ کاہن ہو اور نہ مجنون"

(وَلاَبِقَوْلِ کَاهِنٍ قَلِیْلاً مَا تَذَکَّرُونَ)[4]

"اور نہ کسی کاہن کی (خیالی) بات ہے کہ تم لوگ (اس سے) کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو"۔

یہ جو کچھ بیان ہوا ہے وہ انبیائے الٰہی پر لگائے گئے سب سے اہم الزامات کا محض ایک حصہ ہے۔ یقیناً انبیاء پر دوسری تہمتیں بھی لگائی گئی ہیں جو بہت زیادہ رائج نہیں تھیں لہٰذا ہم ان کے بیان کرنے سے قطع نظر کرتے ہیں۔

1۔ سورۂ حاقہ آیت 40۔ 41۔ 2۔ سورۂ یس آیت 69۔ 3۔ سورۂ طور آیت 29۔ 4۔ سورۂ حاقہ آیت 42۔

بہانہ تلاش کرنا

گذشتہ قوموں کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے اپنے انبیاء کا مذاق اڑا تے اور اس کے بعد ان پر دیوانگی اورجادوگری کی ناروا نسبتیں دیتے لیکن جب انبیاء علیہم السلام سے معجزے ظاہر ہوتے اور مخالفین کی سازشیں ناکام بنا دی جاتیں تو وہ دوسرا طریقہ اپنا تے اور بہانے بنانا شروع کردیتے تھے کہ پیغمبر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے اور اپنی دعوت تبلیغ سے باز آجائے چنا نچہ ہم اس حصّہ میں مختصر طور پر ان بہانوں کو بیان کریں گے جو عام طور پر مختلف امتوں کے درمیان رائج تھے ۔

مخالفین کا ایک عام بہانہ اپنے آباؤ اجداد کے دین پر باقی رہنا اور نئے دین کے انتخاب پر تیار نہ ہونا تھا :

(وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْامَااَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاوَجَدْ نَاعَلَيْهِ آبَائَ نَا) [(1)]

"اور جب ان سے کہا جاتا :جو خدا نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو (چھوٹتے ہی)کہتے : (نہیں!)بلکہ ہم تو اسی (طریقہ)پرچلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ داداؤں کو پایا"

کافروں کا ایک اوربہانا جس کا وہ سہا را لیتے یہ تھا :خدا کو ہم سے براہ راست گفتگو کرنا یا ہمارے لئے براہ راست معجزے بھیجنا چاہیئے:

(وَقَالَ الَّذِيْنَ لاَيَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُکَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْتَ۠يْنَا آيَة کَذَلِکَ قَالَ الذين مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ) [(2)]

"اور جاہل و نادان افرادکہتے ہیں کہ خدا ہم سے (خود) کلام کیوں نہیں کرتا ؟ یا ہمارے پاس معجزہ کیوں خود نہیں آتا ؟ اسی طرح کی باتیں وہ لوگ کر چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے اُن سب کے دل اور فکریں آپس میں ملتی جلتی ہیں ۔۔۔"

اس طرح کفار پیغمبر اکرم ﷺ کی دعوت قبول کرنے سے بچنے کے لئے نارو اقسم کی خوا ہشیں کیا کرتے تھے بعض(خواہشوں)کے تو پورا نہ ہونے سے وہ خود بھی آگاہ ہوتے تھے ۔

قرآن نے اس آیت میں بیان کیا ہے کہ اس طرح کے بہانے تلاش کرنا مکہ کے مشرکوں سے مخصوص نہ تھابلکہ گذشتہ قوموں کے درمیان بھی ایسے لوگ موجود تھے اور یہ یکسانیت جو کافروں کے دلوں اورنیتوں کی مشابہت کا

1۔ سورۂ لقمان آیت21۔

2۔ سورۂ بقرہ آیت118۔

نتیجہ تمام زمانوں میں رہی ہے ۔

قرآن کریم نے سورئہ مبارکہ انعام کی آیات میں بھی اسی کے مشابہ بہانے تلاش کرنے کی طرف میں اشارہ کیاہے :

(وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَافِی کُلِّ قَرْیَۃٍاَکَابِرَمُجْرِمِیۡ ہَالِیَمْکُ ۡرُوْافِیْھَاوَمَایَمْکُرُوْنَ اِلَّابِاَنْفُسِھِمْ وَمَایَشْعُرُوْنَوَاِذَاجَائَتْھُمْ آیَۃ قَالُوْالَنْ نُؤمِنَ حَتّیٰ نُوْتَیٰ مِثْلَ مَااُوْ تِیَ رُسُلُ اللّٰہ) [1]

" اسی طرح ہم نے ہر بستی میں بڑے بڑے قصور واروں کواس کام میں لگادیاکہ ان میں مکاری کیا کریں اور وہ لوگ جو بھی مکاری کرتے ہیںخود اپنے ہی خلاف کرتے ہیں اور اس کا شعور نہیں رکھتے اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں : جب تک ہم کو وہ چیز نہ دی جائیگی جو پیغمبرانِ خدا کو دی گئی ہے ہم ہرگز ایمان نہ لائینگے ۔۔۔" ۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر جس شہر اور جس جگہ بھی مبعوث کئے جاتے تھے وہا ں کے غنڈوں اور بد معاشوں کے سردار اور بڑے بڑے مجرمین مکروحیلے سے کام لیتے تھے اور ان کا ایک بہانہ یہ تھا کہ وہ اپنے ایمان لانے کے لئے یہ شرط لگاتے تھے کہ خدا کو ان کے ساتھ بھی اپنے انبیاء جیسی رفتار کرنا چاہیئے اور جس طرح اس نے اپنے رسولوں کو معجزے عطا کئے ہیں ان کو بھی معجزے عطا کرے ۔

اور کبھی کبھی مشرکین وکفار اس طرح کی بے عقلی کے مطالبے بھی کیا کرتے تھے کہ خود ان کے پاس فرشتے کیوں نہیںنازل ہوتے یا وہ براہ راست اپنے پروردگار کو کیوں نہیں دیکھتے!

(وَقَالَ الَّذِیْنَ لَایَرْجُوْ نَ لِقَائَ نَالَوْلَااُ نْزِلَ عَلَیْنَاالْمَلَا ئِکَۃُاَوْنَریٰ رَبَّنَا)[2]

" اورجن لوگوں کو ہماری ملاقات کی امید نہیں ہے کہا کرتے ہیں کہ آخر ہم پر فرشتے کیو ں نہیں نازل کئے گئے یا ہم اپنے پروردگار کو(کیو ں نہیں) دیکھتے ؟"

(لَوْمَاتَاتِیْنَابِالْمَلٰئِکَۃِ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصَّادِقِیْنَ)[3]

" اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو فرشتے کو ہمارے سامنے کیو ں نہیں لاکھڑا کرتے"۔

بعض اوقات ان کا یہ بہانہ ہوتا کہ پیغمبر پر (کیوں ایسا) فرشتہ نہیں نازل ہوتا کہ جس کو ہم بھی دیکھیں ؟یا ان

1۔ سورئہ انعام آیت 123۔124۔2۔ سورئہ فرقان آیت 21۔3۔ سورئہ حجر آیت 7۔

کے ساتھ (فرشتہ) کیوں نہیں چلتاپھرتا ؟اوریا خدا وند عالم آسمان سے اپنے پیغمبر پر خزانہ کیوں نہیں نازل کرتا :

(وَقَالُوْالَوْلَااُنْزِلَ عَلَیْہِ مَلَکٌ) [1]

"اور انھوں نے کہا : ان پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں نازل کیا گیا ؟۔۔۔"۔

سورئہ ہود میں ارشاد ہوتا ہے :

(لَوْلَااُنْزِلَ عَلَیْہِ کَنْزاَوْجَائَ مَعَہُ مَلَکٌ) [2]

"ان پر خزانہ کیوں نہیں نازل کیاگیا یا ان کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا ؟۔۔۔"۔

بعض آیات میں کفار کی زبانی یہ بھی نقل ہوا ہے کہ وہ پیغمبر اکرم ﷺ پر اعتراضات کیا کرتے کہ آخر ان پر کوئی آیت یا معجزہ کیوں نہیں نازل ہوتا :

(وَیَقُوْلُ الَّذِینَ کَفَرُوْالَوْلَااُنْزِلَ عَلَیْہِ آیَةٌ مِنْ رَبِّہِ) [3]

"اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں کہتے ہیں کیوں ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر کوئی معجزہ نازل نہیں ہورہا ہے ؟۔۔۔"۔

(وَقَالُوالَوْلَا اُنْزِلَ عَلَیْہِ آیَاتٌ مِنْ رَبِّہِ) [4]

"اور انھوں نے کہا :کیوں ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے معجز نمانشانیاں نازل نہیںہوتیں ؟۔۔۔"

اس طرح کی گفتگو سے کافروں کا مقصد کیا تھا اس بارے میں دو احتمال پائے جاتے ہیں:

1۔ اولاً:وہ یہ جتانا چاہتے تھے کہ قرآن معجزہ نہیںہے اور اس کی کوئی اہمیّت نہیں ہے اور پیغمبر اکرم ﷺ اپنے ساتھ کوئی معجزہ لیکر نہیں آئے ہیں ۔

2۔دوسرا احتمال یہ ہے کہ (آیات من ربہ) سے ان کی مراد مطلق طورپر معجزہ نازل ہو نے سے انکار نہیں تھا بلکہ ان کے مد نظر مخصوص قسم کا معجزہ تھا جس کے بعد کوئی بھی پیغمبر کی مخالفت کی جرأت نہ کرے اور سب ان کے سامنے

1۔ سورئہ انعام آیت 8۔2۔ سورئہ ہودآیت12۔3۔ سورئہ رعد آیت 7۔27۔4۔ سورئہ عنکبوت آیت50۔ سورئہ انعام آیت37۔ سورئہ طٰہ آیت133۔

سر تسلیم جھکانے پر مجبور ہو جائیں ۔قرآن کریم نے سورۂ مبارکۂ شعراء میں اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگرچہ یہ کام قدرت الٰہی کے دائرہ سے دور نہیں ہے لیکن خدا نے خود ایسا نہیں چاہا ہے :

(اِنْ نَشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَآئِ آيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَاخَاضِعِيْنَ)[1]

"اگر ہم چاہیںتو آسمان سے ان پر ایسا معجزہ نازل کردیں کہ اس کے سامنے ان لوگوں کی گردنیںجھک جائیں"۔

بہر حال بہانہ ڈھونڈنے والے مشرکین اسی طرح کی باتیں بنایا کرتے تھے کہ خداوند عالم اپنے پیغمبر پر معجزہ کیوں نہیں نازل کرتا ۔

کفّار کا ایک گروہ وہ بھی تھا جو قرآن سے متعلق بہانے تلاش کیا کرتا تھا کبھی وہ پیغمبر اکرم ﷺ سے دوسرا قرآن لانے یا موجودہ قرآن میں تغیر و تبدل کرنے کی درخواست کرتے ہوئے کہتے:

(وَذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ئَ ايَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِ يْنَ لَايَرْجُوْنَ لِقَائَ نَاائْتِ بِقُرْئَ انٍ غَيْرِهَذَااَوْبَدِّلْهُ)[2]

"اور جب ان لوگوں کے سامنے ہماری روشن آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو جن کو ہماری ملاقات کی امید نہیں ہے کہتے ہیں :(اس قرآن کے بجائے کوئی اور دوسرا قرآن لاؤیا اس کو بدل ڈالو)"۔

کفّار کا یہ عمل بڑا ہی ہوشیارانہ تھا وہ کہا کرتے تھے اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئیں تو دوسرا قرآن لے آیئے یا اس قرآن کو بدل دیجئے ۔اب اگر پیغمبر اکرم ﷺ ان مطالبوں کو قبول کرلیتے ۔تو وہ یہ نتیجہ نکالتے کہ یہ حقیقی پیغمبر نہیں ہیںکیونکہ یہ جس کتاب کے آسمانی ہونے کے مدعی تھے اس پیناُنھوں نے اپنے ہی ہاتھوں سے ردّو بدل کردی ہے یا اس کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

اور اگر پیغمبر ان کے مطالبے کو قبول نہیں کرتے (اور حقیقتاً ایسا ہی ہوا)تووہ کہہ سکتے ہیں :چونکہ آپ نے ہماری درخواست قبول نہیں کی لہٰذا ہم آپ پر ایمان نہیں لائے ۔قرآن کے بارے میں کفّار کے دوسرے بہانوں میں ایک اعتراض قرآن کے تدریجی طور پر نازل ہونے کے متعلق تھا :

(وَقَالَ الَّذينَ كَفَرُوالَوْ لَانُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً)[3]

1۔ سورۂ شعراء آیت 4۔ 2۔ سورۂ یونس آیت15۔3۔ سورۂ فرقان آیت32۔

"اور کفّار کہنے لگے کہ: ان پر قرآن ایک ساتھ کیوں نہیں نازل کیا گیا۔۔۔؟"۔

کبھی کبھی اُن کے لبوں پر یہ شکوہ بھی ہوتا کہ یہ قرآن ایک عام انسان پر (کہ جس کے پاس نہ مال ہے نہ دولت اور نہ ہی معاشرہ میں کوئی مقام) کیوں نازل کیا گیا اور شہر مکہ یا مدینہ کی کسی بڑی شخصیت پر کیوں نہیں نازل ہوا:

(وَقَالُوا لَوْلَانُزِّلَ هَذَاالْقُرآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِنَ الْقَرِيَتَيْنِ عَظِيٍمٍ)[1]

"اور (کفّار) کہتے: یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا"۔

کفار کے کچھ اور بہانے جن کو الزامات کی ہی ایک قسم شمار کیا جا سکتا ہے یہ تھا کہ پیغمبر اکرم ﷺ اپنی دعوت کے تمام مطالب دوسرے انسانوں سے ہی سیکھے ہیں خداوند عالم کی جانب سے نہیں ہیں لہذا آپ پر ایمان لانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی:

(ثُمَّ تَوَلَّوْاعَنْهُ وَقَالُوْامُعَلَّم مَّجْنُون)[2]

"پس لوگوں نے ان سے روگردانی کی اور کہنے لگے: یہ تو سکھایا پڑھایا ہوا دیوانہ ہے"۔

کفّار کے اس بہانہ کو سورۂ مبارکۂ نحل میں ذرا صاف طور پر بیان کیا گیا ہے:

(وَلَقَدْ نَعْلَمَ نَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَايُعَلِّمُهُ بَشَر)[3]

"اور ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ (کفّار) کہا کرتے ہیں: بجز اس کے کچھ نہیں کہ کوئی آدمی ان کو پڑھاتا ہے۔۔۔"

قرآن کریم کی بعض آیات میں کفّار کے مختلف بہانوں کو ایک ساتھ بھی بیان کیا گیا ہے:

(وَقَالُوْالَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَفْجُرَلَنَامِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعاً اَوْتَكُونَ لَكَ جَنَّة مِنْ نَخِيْلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَالْاَنْهَارَخِلَٰلَهَاتَفْجِيْرًااَوْتُسْقِطَ السَّمَائَ كَمَازَعَمْتَ عَلَيْنَاكِسَفًااَوْتَتِيَ بِاللهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلاًاَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتمِنْ زُخْرُفٍ اَوْتَرْقَىٰ فِي السَّمَائِ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَاكِتَابًانَقْرَؤُهُ)[4]

1۔ سورۂ زخرف آیت31۔ 2۔ سورۂ دخان آیت14۔ 3۔ سورۂ نحل آیت103۔ 4۔ سورۂ اسراء آیت90،93۔

"اور انھونّنے کہا :جب تک تم ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ نہبنّہانکالوگے ہم ہر گزتم پر ایمان نہ لائیں گے یا کھجوروں اور انگوروں کا تمہارا اپنا باغ ہواوراس میں تم سب کے سامنے بیچ سے نہرینّجاری کرکے دکھادویا جیسا تم ادعا کرتے ہو ہم پرآسمان ہی کو ٹکڑے (ٹکڑے) کرکے گرادو یا خدا اور فرشتوں کو (ہمارے روبرو) گواہ میں پیش کرو یا تمہارے پاس کوئی طلائی محل ہو یا تم آسمان پر چڑھ کے دکھاؤ اور ہم تمہارے اوپر چلے جانے سے (بھی) مطمئن نہ ہونگے جب تک ہمارے پڑھنے کے لئے آسمان سے کو ئی کتاب نازل نہ کرو"۔

قارئین کرام جیسا کہ آپ نے دیکھاکہ قرآن کریم نے ان آیات میں کفّار کے نا روا مطالبوں کو اورناقابل قبول توقعات کو بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ کیسے اس گروہ نے اپنا ایمان لانا ان ناروا مطالبونکے پوراہونے کے ساتھ مشروط کردیا ہے مندرجہ ذیل آیت میں بھی اسی طرح کے کچھ اور بہانے نقل کئے ہیں:

(وَقَالُوامَالِ هٰذَاالرَّسُولِ یَ ْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ لَولَاأُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَک فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيْرًااَوْ يُلْقَىٰ اِلَيْهِ كَنْزاَوْتَكُونُ لَهُ جَنَّة يَ ْكُلُ مِنْهَا)[1]

"اور انھوں نے کہا :یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ؟ان کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں نا زل ہواتا کہ وہ بھی ان کے ساتھ ڈرایا کرتا ؟یا ان کے پاس کوئی خزانہ ہی نا زل کردیا جاتا یا ان کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا کہ اس سے کھاتے(پیتے)؟۔۔۔"۔

یہاںیہ بات بیان کردینا بھی مناسب ہے کہ یہ بہانے تلاش کرنا مکہ کے مشرکوں سے مخصوص نہیں تھا بلکہ اہل کتاب کا بھی ایک گروہ اسلام قبول نہ کرنے کے لئے بہانے تلاش کیا کرتا تھا۔ قرآن کریم نے ان بہانوں کو بطور مفصّل بیان کیا ہے یہ پہلی آیت یہودیوں کے بارے میں ہے :

(اَلَّذِيْنَ قَالُوْااِنَّ اللّٰہَ عَهِدَاِلَيْنَااَلاَّ نُؤمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّیٰ يَ ْتِيَنَابِقُرْبَانٍ تَ ْكُلُهُ النَّارُ)[2]

"انھوں نے کہا کہ:خدانے تو ہم سے عہد باندھاہے کہ ہم اس وقت تک رسول پر ایمان نہ لائیں کہ جب تک وہ ہمارے لئے قربانی نہ لائے اور اس (قربانی) کو (آسمانی)آگ (قبول ہو جانے کی نشانی کے طور پر) بھسم نہ کردے"۔

1۔سورۂ فرقان آیت7۔8۔2۔سورۂ آل عمران آیت183۔

اس طرح اہل کتاب اپنے لئے ایک مخصوص آسمانی کتاب کے خواہاں تھے :

(يَسْئَلُکَ اَهْلُ الْکِتَابِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ کِتٰبًامِنَ السَّمَآ ءِ فَقَدْسَأَلُوْامُوسَیٰ اَکْبَرَمِنْ ذٰلِکَ فَقَالُوْااَرِنَااللّٰہَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصَّعِقَةُ بِظُلْمِهِمُ)[1]

"اہل کتاب تم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ تم ان پر آسمان سے کوئی کتاب پوری (ایک ساتھ) اترو ادو البتّہ یہ لوگ موسیٰ سے تو اس سے بھی بڑے مطالبے کرچکے ہیں چنانچہ وہ کہتے تھے :ہمیں خداکو کھلم کھلا دکھادو تب اُن کو اُن کی شرارت کی (سزا کے طورپر) بجلی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا"۔

ڈرانا اوردھمکانا

جب مخالفین کی طرف سے تمسخر، تحقیر اور تہمت کچھ بھی کارگر ثابت نہ ہوسکی اور ان کی بہانے بازیاں ان کے کسی کام نہ آئیں تو انھوں نے پیغمبر اکرم ﷺ کو ان کے اہداف سے روکنے لئے دوسرے حربے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا یہ نیا حربہ انبیاء علیہم السلام کو ڈرانا، دھمکانا اور خوف زدہ کرنے کا حربہ تھا :

(وَقَالَ الَّذِ يْنَ کَفَرُوْالِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّکُمْ مِنْ اَرْضِنَااَوْلَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَاْ فَاَوْحَیٰ اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِکَنَّ الظَّالِمِيْنَ)[2]

"اورجن لوگوں نے کفر اختیار کیا اپنے پیغمبروں سے کہا :ہم تم کواپنی سرزمین سے نکال باہر کریں گے مگر یہ کہ تم پھر ہمارے مذہب کی طرف پلٹ آئو۔پس ان کے پروردگار نے ان پر وحی کی کہ ہم ان ظالمین کو ضرور ہلاک کردیں گے"۔

جملہ "لِرُسُلِهِمْ" سے یہ بات واضح ہے کہ ڈرانے یادھمکانے کا مسئلہ ایک یادو انبیاء سے مخصوص نہیں رہا ہے بلکہ کفّار کی تمام قوموںکایہی شیوہ تھاکہ جب مقابلے کے تمام راستے بے نتیجہ رہ جاتے تووہ اپنے انبیاء سے کہا کرتے تھے :یا تو تم اپنی دعوت سے باز آجائو اور ہمارے ہم مذہب بن جائو یا ہم تم کو اپنی سرزمین سے باہر نکال دینگے

1۔ سورئہ نساء آیت153۔2۔ سورئہ ابراہیم آیت13۔

البتہ جب یہ نوبت آجاتی تو خدا اپنے انبیاء علیہم السلام کو اطمینان دلاتا تھا کہ وہ ان کے مخالفین کو ہلاک کردے گا: دوسری آیت میں خداوند عالم ارشادفرماتا ہے:

(كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَالْأَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ وَجَادَلُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ)[1]

"ان سے پہلے نوح کی قوم نے اور ان کے بعد مخالفین کے (دوسرے گروہوں) نے (اپنے پیغمبروں کو) جھٹلایا اور ہر امت نے اپنے پیغمبر کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کو گرفتار کرلیں اور باطل باتوں کے ذریعہ جنگ و جدل سے کام لیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے حق کو اکھاڑ پھینکیں تو ہم نے بھی ان کو گرفت میں لے لیا پھر تم نے (دیکھا کہ ان پر) ہمارا عذاب کیسا (سخت) ہوا ؟"۔

مندرجہ بالا آیت حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے کہ نہ صرف پیغمبر اسلام ﷺ کی قوم بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی قوموں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو گرفتار کرلیں اور ان کو باطل و بیہودہ بحثو نکے ذریعہ شکست دیدیں۔

یہی طریقہ پیغمبر اسلام ﷺ کے مقابل بھی اختیار کیا گیا ارشاد ہوتا ہے:

(وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذًا لَا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا)[1]

"اور تم کو اس سرزمین سے اکھاڑنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی تاکہ تم کو اس سے نکال باہر کریں اور اس صورت میں وہ (بھی) تمہارے بعد یہ لوگ چند روز کے سوا ٹھہرنے بھی نہ پاتے"۔

مندرجہ بالا آیات سے اس اہم نکتہ کا پتہ چلتا ہے کہ خداوند عالم کی سنّت انبیاء علیہم السلام کو جھٹلانے والوں اور ڈرانے دھمکانے والوں سے مقابلہ کرنے میں ہے۔ یہ خداوند عالم کی ایک سنّت ہے کہ جب بھی انبیاء کا مقابلہ اس حد تک پہنچ جائے کہ کوئی گروہ ان کی جان لینے کا قصد کرلے اور عملی طورپر ایسے حالات پیدا ہوجائیں جس سے لوگوں کی ہدایت کے تمام راستے بند ہوجائیں اور حق کے کامل طورپر مخفی ہونے کا خوف پیدا ہوجائے تو اس وقت خداوند عالم دشمنوں اور مخالفوں کی جماعت پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے۔ یہ وہ سنت ہے جو گذشتہ تمام اقوام میں جاری تھی:

1۔ سورۂ غافر آیت5۔ 2۔ سورۂ اسراء آیت76۔ 77۔

سورۂ احزاب میں ارشاد ہوتا ہے:(وَلَنْ تَجِدلِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً)[1]

"اور تم خدا کی سنّت میں ہرگز تغیر و تبدیلی نہ پاؤگے"۔

اور اصولی طورپر قرآن کریم میں اکثر وہ مقامات جہاں پر سنت خدا کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے وہ ان قوموں اور گروہوں پر عذاب نازل ہونے سے مربوط ہے جہاں ان کی مخالفت خداوندعالم کے رہبروں سے انتہا کو پہنچ چکی ہو اور ان کی ہدایت کی کوئی امید کی کرن باقی نہ رہ گئی ہو۔

یہاں یہ سوال ممکن ہے کہ اگر اس طرح کی سنّت موجود ہوتی تو کوئی پیغمبر ہی قتل نہ کیا جاتا اس لئے کہ جب تک انبیاء علیہم السلام کو شہربدر کرنے اور قتل کرنے کی بات نہ چھڑے وہ اس وقت تک تبلیغ کرتے رہیں، مخالفوں کا مقابلہ کرنے میں مقاومت کریں اور جب کام اس منزل (ان کو شہربدر کرنے یا قتل کرنے کی نوبت آجائے)تک پہنچ جائے تو عذاب الٰہی نازل ہو جائیگا اورانبیاء علیہم السلام کے تمام دشمن نیست و نابود ہو جائیں گے۔

حالانکہ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے کے بارے میں آیات موجودہیں :

(وَقَتْلِهِمُ اْلَنبِيَاءَ بِغَيْرِحَقِّ)[2]

"۔۔۔اور ان (بنی اسرائیل)کا ناحق انبیاء کو قتل کرنا۔۔۔"۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے: (فَلِمَ تَقْتُلُونَ اَنْبِيَاءَ اللّٰه)[3]

"۔۔۔پس تمہارے بزرگ کیوں خدا کے پیغمبروں کو سابق میں قتل کیا کرتے تھے ؟۔۔۔"۔

جواب:قرآن کریم میں یہ مطلب صاف طورپر بیان نہیں ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی مخالفت اور ان کا مقابلہ دو طریقوں سے ہوتا:

کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ لوگوں کے مابین خداوندعالم کی طرف سے کوئی کتاب شریعت نہیں ہوتی تھی اور ایسے ہی حالات میں ایک پیغمبر مبعوث کیا جاتا تھا تا کہ ان کو کفر و شرک سے نجات دلائے۔ ان پر اپنی حجت تمام کرے اور چراغ ہدایت کو روشن رکھے ۔ان حالات میں اگر وہ پیغمبر اپنی قوم کے ہاتھوں قتل کردیا جاتا تو چراغ ہدایت مکمل طورپر خاموش ہوجاتا اور خداوند عالم کی پیغمبر کو مبعوث کرنے کی غرض نقض ہوجاتی۔

1۔احزاب آیت62۔2۔سورۂ نساء آیت155۔3۔سورۂ بقرہ آیت91۔

اور جب لوگوں پر خدا کی حجت تمام ہوجاتی اور وہ حق قبول کرنے سے انکار کردیتے تو عذاب الٰہی نازل ہوتا تاکہ پیغمبر اور مومنین کو چھٹکارا مل جائے اور زمین، خدا کی حجت سے خالی نہ رہنے پائے۔

لیکن بعض زمانوں میں لوگوں کے درمیان کتاب خدا اور شریعت الٰہی موجود تھی اور حق کے طالبوں کے لئے حق کی معرفت کا راستہ ہموار تھا۔ اس طرح کے تاریخی دور میں مبعوث ہونے والے انبیاء علیہم السلام کا فریضہ لوگوں کو اسی دین اور کتاب کی دعوت دینا اور ارشاد کرنا تھا۔ مثال کے طور پر بنی اسرائیل کے درمیان حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت رائج تھی اور آپ کے بعد جو متعدد پیغمبر مبعوث کئے گئے وہ لوگوں کو آپ کی ہی کتاب و شریعت کی دعوت دیا کرتے تھے اور حقیقت میں وہ مولوی دین کے مبلّغین تھے ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ایک یا چند انبیاء علیہم السلام کا قتل ہونا حق کے کلی طور پر محو ہوجانے، سارے معاشرے کے گمراہ ہوجانے اور ہدایت کے تمام راستوں کے مسدود ہوجانے کے مساوی نہ تھا۔ خداوند عالم ایسے حالات میں اپنی حکمت بالغہ کی بنیاد پر لوگوں کے انبیاء علیہم السلام کی شان میں گستاخی کرنے یہاں تک کے لوگوں کو ان کے قتل کرنے تک کی فرصت عطا کرتا تھا اور اسی وجہ سے بنی اسرائیل کے بہت سے پیغمبر کافروں اور اپنے دشمنوں کے ہاتھوں قتل کئے گئے۔

ہم نے جو کچھ مندرجہ بالا حصّہ میں بیان کیا مختلف طریقوں سے لوگوں کے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ برتاؤ کرنے کے بارے میںتھا۔ اب ہم یہ بیان کریں گے کہ خداوند عالم نے انبیاء کی قوموں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے۔

امتوں کے ساتھ خدا کا طریقۂ کار (الٰہی سنّتیں)

اس حصّہ میںہم خداوندعالم کی ان سنّتوں کا تذکرہ کریں گے جو تمام انبیاء علیہم السلام کی امتوں کے درمیان یکساں طورپر جاری رہی ہیں ۔ البتہ اس موضوع میں داخل ہونے سے پہلے سنّت کی (اس بحث کے مطابق حال) مختصر تعریف بیان کردینا بہتر ہے!!

یہاںسنّت سے مراد خداوند عالم کے وہ افعال ہیں جو کسی زمان، مکان اوریا کسی خاص قوم سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ ہردور کے لوگوں کے مختلف گروہ کے ساتھ واقع ہوتے رہتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان عمومی افعال کو سنّت کے نام سے یاد کیا ہے

ارشاد ہوتا ہے: (سُنَّةَ اللهِ فِی الَّذینَ خَلَوامِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَلِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِیْلاً) [1]

"جو لوگ پہلے گذر گئے ان کے بارے میں بھی خدا کی (یہی) سنت رہی ہے اور تم خدا کی سنّت میں ہرگز تغیر تبدل نہیں پائو گے"

۔

البتّہ قرآن کریم میں جس مقام پر بھی الٰہی سنّتوں کا تذکرہ ہے وہاں سنت سے مراد اکثر وہ عذاب ہیں جو گذشتہ قوموں پر نازل ہوئے ہیں پھر بھی سنّت کا مفہوم نزول عذاب سے کہیں زیادہ عمومیت رکھتا ہے اس وضاحت کے بعد ہم ان آیات کاذکر کریں گے جن میں انبیاء کی امتوں کے درمیان خدا کی سنّتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

قرآن کریم کی آیات کے دو دستے جو تقریباً ایک دوسرے کے مشابہ ہیں ان میں خداوندعالم کی تین سنّتوں کی طرف اشارہ ہے جو معمولاًترتیب سے اورتین مراحل میں متحقق ہوتے ہیں پہلے دستہ کے متعلق سورۂ مبارکۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَمَاأَرْسَلْنَافِیْ قَرْیَةٍ مِنْ نَبِیٍّ اِلَّااَخَذْنَاأَهْلَهَابِالْبَسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُونَ ثُمَّ بَدَّ لْنَا)

1۔ سورۂ احزاب آیت62۔

(مَكَانَ السَّيِّئَةِ الحَسَنَةَ حَتَّىٰ عَفَوْاوَّقَالُواقَدْ مَسَّ أَبَائَ نَاالضَّرَّائُ وَالسَّرَّائُ فَاَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَايَشْعُرُوْنَ)[1]

"اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر وہاں کے رہنے والوں کو سختی اور مصیبت میں بتلا کیاتاکہ وہ لوگ گڑگڑائیںپھر ہم نے بڑی (مصیبت) کو نیکی (نعمت) میںتبدل دیا یہاںتک کہ وہ لوگ (حد سے) بڑھ نکلے اور کہنے لگے :"ہمارے باپ دادائوں کو (بھی یقینا حکم قدرت سے) اس طرح کا تکلیف و آرام پہونچ چکا ہے پس ہم نے ان کو بے خبری کی حالت میں اچانک اپنے (عذاب میں) گرفتار کردیا "۔

مفسرین بیان کرتے ہیں "عَفَ"، "عَفَوْا" طول اور کثرت اور یہ "عفی النبات " سے ماخوذ ہے یعنی "گھاس اور بڑھکر لمبی ہوگئ "۔چنانچہ بعض روایات میں بھی جو "اعفاء اللحیۃ"کا لفظ استعمال کیاگیا ہے وہ بھی اسی مادہ سے ہے اور اسکے معنی لمبی ڈاڑھی رکھنے کے ہیں ۔اس بناء پر" عَفَوْا"کا مطلب ان کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی اوروہ سختی کے منھ سے نکل کر راحت وآرام کے مرحلہ میں پہونچ گئے ۔

بہر حال مندرجہ بالاآیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خداوند عالم لوگوں کے ساتھ تین طریقوں سے پیش آیاہے :

پہلے مرحلہ میں خداوندعالم نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا تاکہ وہ انسانوں کی ہدایت کریں اوران کے لئے استکبار و سرکشی سے دور رہنے کے راستہ فراہم کریں لیکن اکثر افرادنے ان راستوںسے استفادہ نہ کیااورہدایت کا طریقہ اختیارنہیں کیا ۔

دوسرے مرحلہ میں خداوندعالم نے بندوں پر نعمتیں نازل کیں یہاں تک کہ وہ اپنی زندگی کی سختیوں اور مشکلوں کوعام بات شمار کر کے وہ خداوندعالم کی یاد سے غافل ہوگئے تیسرے مرحلے میں ان کی بڑھتی ہوئی سخت غفلت کی وجہ سے ان پر اچانک عذاب نازل ہونا اور ان سب کو نیست و نابود کردینا ذکر ہوا ہے۔

دوسری قسم کی آیات میں بھی اسی قسم کی ملتی جلتی تعبیرات موجود ہیںارشاد ہوتا ہے :

(وَلَقَدْاَرْسَلْنَااِلَیٰ اُمَمٍ مِنْ قَبْلِکَ فَاَخَذْ نَا هُمْ بِالْبَاْسَائِ وَالضَّرَّائِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ فَلَوْلَا اِذْجَائَ هُمْ بَاْسُنَاتَضَرَّعُوْاوَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَاكَانُوا يَعْمَلُونَفَلَمَّا نَسُوْامَاذُكِّرُوابِهِ فَتَحْنَاعَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْ ئٍ حَتّیٰ اذا فَرِحُوابِمَااُوْتُوْااَخَذْنَا هُمْ بَغْتَةً فَاِذَاهُمْ مُبْلِسُونفَقُطِعَ دَابِرُالْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْاوَالْحَمْدُلِلّٰهِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ)[2]

1۔ سورۂ اعراف آیت94۔95۔

2۔ سورۂ انعام آیات42۔ 45۔

اور جو امتیں تم سے پہلے گذر چکی ہیں ہم ان کے پاس بھی بہت سے رسول بھیج چکے ہیںپھر ہم نے ان کو سختی اور تکلیف میں گرفتار کیاکہ شاید وہ روئیں اور گڑگڑائیں پس جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو انھوں نے تضرع و زاری کیوں نہیں کی؟ لیکن (حقیقت یہ ہے) ان کے دل سخت ہوگئے تھے اور ان کے کاموں کو شیطان نے آراستہ کردکھایا تھا۔پھر جس کی انھیں یاددہانی کی گئی تھی جب اس کو بھول گئے تو ہم نے ان پر امتحان کے طور پر ہر طرح کی نعمتوں کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جو نعمتیں انھیں دی گئی تھیں جب ان کو پاکر خوشی میں کھوئے تو ہم نے انھیں اچانک اپنی گرفت میں لے لیا اور وہ ناامید ہو کر رہ گئے پھر ظلم و ستم کرنے والے گروہ کی جڑکاٹ دی گئی اور تمام تعریفیں سارے جہان کے مالک اللہ کیلئے ہیں"۔

جملہ "ما ذُکِّرُوا بِہِ""جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی"میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خداوند عالم نے انھیں سختیوں اور مشکلات سے دوچار تھا کہ وہ بیدار ہو جائیں اپنے کو سنوار سکیں اور ان میں خداوند عالم کی بارگاہ میں گریہ و زاری کرنے کا جذبہ پیدا ہوجائے۔

جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں ان دونوں دستوں کی آیات میں تین اہم الٰہی سنّتوں کا تذکرہ ہے ہم ان کو ذیل میں ترتیب سے بیان کررہے ہیں۔البتہ اس سے پہلے ان نکات کو بیان کردینا بھی مناسب سمجھتے ہیں جن سے علوم نفسیات، سماجیات اور فلسفہ تاریخ وغیرہ کے بارے میں استفادہ کیا جاتاہے۔

پہلا نکتہ انسانی نفسیات سے تعلق رکھتا ہے اگرچہ وہ بظاہر انسان کی انفرادی زندگی سے مربوط ہے لیکن جب معاشرہ کے اکثر افراد میں سرایت کرجائے توپھر سماجی پہلو بھی اختیار کرلیتا ہے کیونکہ انسان کی سرشت ہی ایسی ہے کہ جب اس کے پاس بہت زیادہ نعمتیں اور آسائش وآرام آجاتا ہے تو اس کی روح میں استکبار، سرکشی اور طغیان آجاتاہے۔جیساکہ قرآن سورۂ علق میں ارشاد فرماتا ہے:

(کَلَّااِنَّ اِلانْسَانَ لَیَطْغَیٰ اَنْ رَآہُ اسْتَغْنَیٰ)[1]

"بیشک جب انسان اپنے کوغنی دیکھتا ہے تو سرکش ہوجاتا ہے"۔

دوسری طرف عام طورپر انسان سختیوں اور مشکلات میں گھر جانے کے بعد خضوع اور خشوع کرنے لگتا ہے اور اس کی انانیت ختم ہونے لگتی ہے اوریہ حالت انسان میں آہستہ آہستہ وہ حالات فراہم کرتی ہے کہ انسان خود بخود اپنے رب سے لولگانے لگے۔اس بناء پر قرآن کریم کی آیات سے نفسیات کے اس راز اور قاعدہ کا پتہ چلتا ہے کہ

1۔ سورۂ علق آیت6۔7۔

راحت و آرام غرور و سرکشی کا سرچشمہ ہے ، اور مشکلوں میں گرفتار ہونے سے خضوع و خشوع پیدا ہوتا ہے۔ البتّہ ہم اس بات پر زور دینا لازم سمجھتے ہیں کہ مندرجہ بالا حالات میں سے کوئی ایک حالت بھی اس طرح کے نفسیات کیلئے علّت تامّہ نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف ایک عام سبب اور ذریعہ ہے ۔ اسی بناء پر ممکن ہے کہ کوئی شخص عیش و عشرت کی زندگی اور نعمتوں میں غرق رہکر بھی خدا کی یاد سے غافل نہ ہو اور اس میں غرور و تکبر کی بو بھی نہ پائی جاتی ہو اور اس کے بالمقابل یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص مشکلات سے دوچار ہونے کے باوجود بھی خضوع اور خشوع سے محروم رہے جیسا کہ مندرجہ بالا آیات میں بیان ہوچکا ہے ۔

نفسیات کے ہی بارے میں سورۂ انعام کی آیات سے اس نکتہ کا بھی استفادہ ہوتا ہے کہ انسان گناہ کا عادی ہوجانے اور عیش و عشرت میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے قساوت قلب اور سخت دلی سے دوچار ہوجاتا ہے جبکہ اس کے بالمقابل غم و آلام کی حالت خشوع و نرم دلی لاتی ہے ۔ جیسا کہ خداوندعالم حقیقی مومنوں کے صفات اس طرح بیان فرماتا ہے :

(قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤمِنُونَالَّذِ یْنَ هُمْ فِیْ صَلَا تِهِمْ خَاشِعُوْنَ)[1]

"بہ تحقیق وہ مومنین رستگار ہوئے جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے ہیں"۔

قلب خاشع وہ قلب ہے جس میںدوسروں کے لئے جھکاؤ پیدا ہوجائے اور سخت دل وہ دل ہے جو کسی کے لئے نہ جھک سکے اور اس حالت میں انسان کی روح اور اس کے وجود میں پوشیدہ مہر و محبت کے پہلو پر سخت اثر پڑتا ہے اور قرآن سورۂ بقرہ میں ارشاد فرماتا ہے :

(فَهِیَ کَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً) [2]

"۔۔۔پس اسکے بعد (تمہارے دل)پتھر کے مثل یا اس سے بھی زیادہ سخت (ہوگئے)۔۔۔"۔

ان آیات سے ایک اور بات واضح ہوجاتی ہے کہ سنگدلی اور قساوت قلب کے شکار افراد کے اندر شیطانی وسوسہ

1۔ سورۂ مومنون آیت1۔2۔

2۔ سورۂ بقرہ آیت74۔

کا اظہار ہونے لگتا ہے اور شیطان بھی ان کے اعمال کو خود ان کی نظر میں اور خوبصورت بنا کر پیش کردیتا ہے۔
ان تمام نکات کے علاوہ ان آیات میں ہماری بحث سے مربوط مندرجہ ذیل تین الٰہی سنّتوں کا پتہ چلتا ہے۔

مشکلات کے ذریعہ ہدایت

الٰہی سنتوںمیں سے ایک ہدایت و رہنمائی بھی ہے ۔خداوندعالم اپنی سب کے لئے عام تکوینی ہدایت کی بنیادپر تمام مخلوقات کی کمال مطلوب کی طرف راہنمائی کرتا ہے ارشاد ہوتا ہے:

(قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطَیٰ کُلَّ شَیْ ئٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَیٰ)[1]

"کہا:ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اسکے مناسب حال خلقت عطا فرمائی پھر اسکے بعد اسکی ہدایت فرمائی "۔

اس عام طریقۂ ہدایت کے علاوہ خدا وندعالم نے انسان کی ہدایت، ایک اور مخصوص طریقہ سے فرمائی ہے۔

اس ہدایت کا کچھ حصّہ انسان کے وجود میں قوۃ ادراک کے ذریعہ ودیعت کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے :

(وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصٰرَوَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ)[2]

"۔۔۔اور تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل قرار دیا شاید تم شکر کرو"۔

اور اس ہدایت کا دوسرا حصّہ انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کر کے انجام دیا لیکن اس سے پہلے ایک دوسری سنّت یہ رہی ہے کہ خداوندعالم نے لوگوں کے لئے حق کے سامنے تسلیم ہونے اور انبیاء کی دعوت کو قبول کرنے کی کچھ شرطیں معین فرمادی ہیں ۔جیسا کہ مندرجہ بالا آیات سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی روح کی خاصیت یہ ہے کہ وہ سختی اور مشکلات کی حالت میں تضرع اور خضوع و خشوع کرنے پر مجبور ہوجاتی ہے اور غرور وتکبّر کو فراموش کردیتی ہے چنانچہ خدا وند عالم کی یہ سنت ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کرنے کے بعد قحط ،بیماری اورزلزلہ وغیرہ جیسی مصیبتیں اور معاشرتی بعض مشکلات پیدا کردیتا ہے تاکہ سوئے ہوئے انسان خوابِ غفلت سے بیدار ہوجائیں اور اپنی ذلت وناتوانی کا احساس کرکے خدا سے نزدیک ہوجائیں ۔

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہدایتِ الٰہی کے دو پہلو ہیں :

1۔ سورۂ طٰہ آیت50۔

2۔ سورۂ نحل آیت78۔

ایک شناخت و معرفت کا مرحلہ جس میں انسان کی عقل درونی انبیاء علیہم السلام کا کردار اور انبیا ئے الٰہی بیرونی ہدایت و رہنما ئی کا کام انجام دیتے ہیں۔

دوسرا پہلو جذبات و احساسات کا ہے: اس یعنی بیرونی حالات اس طرح فراہم کرنا لازم ہے کہ انسان کے دل و جان ہدایت الٰہی سے متاثر ہو سکیں اور وہ حق قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں اور جب بھی یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ ہو جائیں راہ راست کے انتخاب کے لئے مناسب زمین فراہم ہو جائے گی اور خداوند عالم نے تمام انسانوں کے لئے ان تمام راستوں کو کھول رکھا ہے اور جیسا کہ مندرجہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے سختیوں اور مشکلات کے نزول کی صورت میں جذبات اور احساسات کے ذریعہ ہدایت کا راستہ ہموار کر دیا ہے۔

املاء اور استدراج کی روش

جب انسانوں میں حق قبول کرنے کے احساسات اور جذبات برانگیختہ ہو جائیں تو قاعدے کے تحت انسان کو انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول کر کے صحیح راستہ منتخب کر لینا چاہیئے لیکن یہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ مذکورہ حالات راہ حق میں قدم اٹھانے کے لئے علتِ تامّہ نہیں ہیں بلکہ باطل کے انتخاب کا راستہ بھی اسی طرح کھلا ہوا ہے خاص طور سے اگر معنوی امراض کی بناء پر ہدایت کا سدّباب ہو جائے۔ ان میں بعض رکاوٹیں درونی ہوتی ہیں جیسے سنگدلی (سخت دل ہونا) اور بعض رکاوٹیں ظاہری ہیں جیسے شیطان دنیا کو سجا بنا کر پیش کرتا ہے اور باہر سے حملے کرتا ہے اور یہ عوامل ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہیں کہ انسان کے اندر ہدایت حاصل کرنے کی صلاحیت کو کارگر نہیں ہونے دیتے۔

اب اگر پہلے طریقۂ کار کا کوئی نتیجہ حاصل نہ ہو سکے اور انسان مشکلوں اور مصیبتوں کے باوجود خضوع و خشوع نہ کرے بلکہ اس کی سنگدلی اور شیطان کی آراستہ و پیراستہ کی ہوئی چیزیں خداوند عالم سے نزدیک ہونے میں رکاوٹ بنی رہیں تو خدا دوسری سنت جاری کرتا ہے۔ یعنی مادی نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اس کے بعد بھی اگر انسان آسائش و آرام کی زندگی میں خدا کو بھولا رہے تو اس کی غفلت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ پہلے سے اور زیادہ اپنے خدا سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ سنتِ الٰہی کے اس عمل کو بعض آیات میں "املا" اور "استدراج" کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَالَّذِ یْنَ کَذَّ بُوْابِآیَاتِنَاسَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِنْ حَیْثُ لَایَعْلَمُوْ نَوَاُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْن)[1]

"اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہم انھیں اس طرح آہستہ آہستہ (جہنم) میں لے جائیں گے کہ انھیں خبر بھی نہ ہوگی میں ان کو مہلت دے رہا ہوں کیونکہ بیشک میری تدبیر بہت محکم و استوار ہے"۔

"استدراج "یعنی کسی کو زینہ بہ زینہ، درجہ بدرجہ مرحلہ وار کسی مقام تک لیجانا اور "املاء "آزاد چھوڑ دینے کو کہتے ہیں یعنی مہلت اور ڈھیل دیدینا۔"اَمْلَیْتُ للفرس"یعنی "اَرْخَیْتُ عِنَانَہُ""میں نے گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑدی۔"

وہ لوگ جو اتمام حجّت کے بعد بھی انبیاء علیہم السلام کو جھٹلاتے ہیں یا حق کی معرفت کے باوجود اس کی اتباع نہیں کرتے اور حق کو قبول کرنے میں اکڑدکھاتے ہیں اور جو لوگ سخت دلی کی وجہ سے اپنے لئے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو قبول کرنے میں مدد گار تمام جذباتی اور احساساتی راستے بند کردیتے ہیں وہ خداوند عالم کی نصرت وہدایت قبول کرنے کے قابلیت کھودیتے ہیں۔ اس لئے کہ خدا کی مدد اسی وقت تک شامل حال رہتی ہے کہ جب تک حق کی تلاش میں جبری اور زبردستی کا پہلو نہ پیدا ہو جائے اسی طرح کے انسانوں کے لئے خداوند عالم اِملاء اور استدراج کی روش اپناتا ہے۔

استدراج کے شکاریوں کی اس طریقہ سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس کے تحت شکاری پہلے اپنا جال کسی مقام پر پھیلاتے ہیں، اس کے بعد اپنے شکار اور جال کے درمیان تھوڑے فاصلے سے مختلف مقامات پر اپنے شکار کا من پسند چارا ڈال دیتے ہیں۔ شکار ایک مقام کا چارا ختم کرنے کے بعد دوسرے مقام کی طرف بڑھتا ہے اور اس کی حرص بڑھ جاتی ہے، وہ اسی طرح آگے بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ آخری چارے کی فکرمیںجال کے اندر جاکر پھنس جاتا ہے۔ الٰہی استدراج یعنی خدا کی دی ہوئی درجہ بہ درجہ چھوٹ میں گرفتار افراد کا قصّہ بھی کچھ یوں ہی ہے۔ وہ ہر دن اپنی نعمتوں میں اضافہ دیکھکر بہت خوش ہوتے ہیں اور بسا اوقات تو وہ اپنے کو سب سے خوش قسمت سمجھنے لگتے ہیں اور اس بات سے غافل رہتے ہیں کہ ہر نعمت وہ دانہ ہے جسکو حاصل کرنے میں وہ جال سے چند قدم اور نزدیک کرتا جارہا ہے۔یہاں تک کہ جب وہ آخری مرحلہ پر پہونچتے ہیں

(اَخَذْ ناھُم بَغْتَۃً وَھُم لَا یَشْعَرُوْنَ)[2]

"اچانک الٰہی عذاب کی گرفت میں آجاتے ہیں اور انھیں اس کا شعور بھی نہیں ہوتا کہ وہ نعمتیں اس عذاب کا مقدمہ تھیں"۔

1۔سورۂ اعراف آیت 182۔183۔2۔سورۂ اعراف آیت 95۔

الٰہی جال اور اخلاقی اقدار کی ہم آہنگی

اس مقام پر سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا خداوند عالم کا یہ عمل جس سے بعض لوگ فریب کھا جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ عذاب اور تاریکی میں ڈوب جاتے ہیں کیا یہ اخلاقی اصولوںسے مطابقت رکھتا ہے ؟ اس سوال کا کلّی جواب تو اس حقیقت پر توجہ سے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جس گروہ کا ذکر ہے در اصل ایسے ہی برتاؤ کا سزاوار ہے چونکہ خداوند عالم نے ان کے لئے ہدایت کے تمام راستے کھول دیئے اور ان پر اپنی حجت تمام کردی پھر بھی انھوں نے خداوند عالم کی نعمتوں کا شکریہ ادا نہ کیا اور اپنی دشمنی اور کٹ حجتی کی بنیاد پر حق سے منھ موڑے رہے ظاہر ہے املاء اور استدراج کی سنت ایسے ہی افراد کے لئے ہے اورچونکہ یہ خود انھیں کے اعمال کا نتیجہ ہے ان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ صرف یہ کہ نادرست نہیں ہے بلکہ بالکل صحیح اور مناسب روش ہے ۔ مکر وفریب کی تدبیر اخلاقی اعتبار سے وہاںبری اور ناپسندہے جب مقصد باطل کی حمایت اور حق کی مخالفت کرنا ہو۔ حالانکہ الٰہی جال عین حق ہے اور اسی وجہ سے خداوندعالم اپنے مکر وجال کے متعلق ارشاد فرماتاہے:

(اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْن)[1]

"بیشک میرا جال بہت محکم اور استوار ہے"۔

اور شیطان کے جال کو باطل ہونے کی وجہ سے ضعیف اور کمزور شمار کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے :

(اِنَّ کَیْدَالشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفاً)[2]

"۔۔۔بیشک شیطان کا مکر(نہایت ہی)کمزور ہے"۔

املاء اور استدراج کی روش قرآن کریم کی دوسری آیات میں بھی بیان کی گئی ہے منجملہ سورۂ مبارکہ رعدمیں اعلان ہوتا ہے :

(وَلَقَدْاِسْتُھْزِیَ بِرُسُلٍ مِنْ قَبْلِکَ فَاَمْلَیْتُ لِلَّذِیْنَ کَفَرُواثُمَّ اَخَذْتُھُمْ فَکَیْفَکَانَ عِقَابِ)[3]

1۔ سورۂ اعراف آیت 183۔

2۔ سورۂ نساء آیت76۔

3۔ سورۂ رعد آیت 32

"تم سے پہلے (بھی) بہت سے پیغمبروں کی ہنسی اڑائی جاچکی ہے پس میں نے کافروں کو مہلت دیدی پھر انھیں (عذاب میں) گرفتار کر دیا۔ پس (دیکھا) میرا عذاب کیسا تھا؟"۔

اس آیت میں پیغمبر اسلام ﷺ کے دشمنوں کو یہ پیغام دیا جارہاہے کہ گذشتہ امتوں کے کفّار نے جب اپنے زمانے کے انبیاء علیہم السلام کا مذاق اڑایا اس کے باوجود خداوند عالم نے ان کو مہلت دی کہ وہ جتنا چاہیں کفر میں اترجائیں اور اس کے بعد عذاب الٰہی نے ان کو گھیر لیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ عذاب کوئی مطلوب اور پسندیدہ چیز ہے؟ اگر ایسا ہے تو تم بھی انھیں کا راستہ اختیار کرکے انھیںکے انجام سے دوچار ہونا پسند کرلو۔ اور اگر عذاب پسندیدہ انجام نہیںہے تو اپنے کفر سے پلٹ آئو اور اپنے کو خداوند عالم کے عذاب سے نجات دیدو۔۔۔

بہرحال اس آیت میں بھی کافروں کو املاء یعنی (مہلت دینے) کی بات کی گئی ہے اور یہ ایسی مہلت ہے جس کا انجام خداوندعالم کے سخت عذاب کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

سورۂ قلم میں بھی املاء اور استدراج کی روش کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے:

(فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُکَذِّبُ بِھٰذَاالْحَدِیْثِ سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِنْ حَیْثُ لَایَعْلَمُونَ وأُمْلیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْن)[1]

"پس مجھے اس کلام کے جھٹلانے والے کے ساتھ چھوڑدو ہم ان کو آہستہ آہستہ اس طرح جکڑلیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی اور میں ان کو مہلت دیتا ہوں اسلئے کہ میری تدبیر (سخت و) استوار ہے"۔

اس آیت کی بنیاد پر خداوندعالم کا مکراورتدبیر تقاضا کرتا ہے کہ قرآن کو جھٹلانے والوں کے ساتھ استدراج سے کام لے۔ یعنی آہستہ آہستہ ان کی نعمتوں میں اضافہ کیا جائے اور ان کو چھوڑدے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق جتنا چاہیں پیغمبر اکرم ﷺ اور قرآن کی مخالفت کریں لیکن آخرکار ایک دن یہ مہلت ختم ہوجائیگی اوریہی تدبیر ان کو خداوند عالم کے عقاب و عذاب کے جال میں پھنسا دے گی۔

دوسری آیات میں خداوندعالم کا ارشاد ہوتا ہے

(وَاِنْ یُکَذِّبُوکَ فَقَدْ کَذَّبَتْ قَبْلَھُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادوَثَمُودُوَقَوْمُ اِبْرَاھِیْمَ وَقَوْمُ لُوطٍوَ)

1۔ سورۂ قلم، آیت44۔45۔

(اَصْحَابُ مَدْيَنَ وَكُذِّبَ مُوسَىٰ فَاَمْلَيْتُ لِلْكَافِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ)[1]

"اور اگر یہ تم کو جھٹلاتے ہیں تو یقینا ان سے پہلے نوح کی قوم اور قوم عاد، ثمود اور ابراہیم کی قوم اور لوط کی قوم اور (اسی طرح) اہل مدین (بھی) (اپنے اپنے پیغمبروں کو) جھٹلا چکے ہیں اور موسیٰ بھی جھٹلائے جا چکے ہیں تو میں نے کافروں کو مہلت دی اسکے بعد ان کا (گریبان) پکڑ لیا تو تم نے دیکھا میرا عذاب کیسا تھا ؟"۔

یہ آیت پیغمبر اکرم ﷺ کو گذشتہ قوموں کی جانب سے ان کے پیغمبروں کی تکذیب کی یاددہانی کراتی ہے اور اس حقیقت کا انکشاف کرتی ہے کہ وہ سب صرف ایک سنّت الٰہی کے دائرے میں آتے تھے یعنی خداوند عالم نے ان کو مہلت دی اور پھر ان پر اپنا عذاب نازل فرمایا "نکیر" اور "انکار" کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں اور یہ اس کام کو کہا جاتا ہے جو دوسروں کے برے اور نا پسند فعل کے بالمقابل انجام دیا جاتا ہے۔(فکیف کان نکیر) یعنی ان کے برے کردار کے مقابلے میں میرا عکس العمل کیسا تھا؟ البتہ اس آیت میں "نکیر" سے مراد خداوند عالم کا عذاب ہی ہے۔

سورۂ مبارکۂ آل عمران یںنارشاد ہوتا ہے

(وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوْا اِثْماً وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِيْنٌ)[2]

"اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ ہم نے ان کو جو مہلت اور فارغ البالی دے رکھی ہے وہ ان کے حق میں بہتر ہے۔ ہم نے مہلت اور فارغ البالی صرف اسی وجہ سے دی ہے تاکہ وہ خوب گناہ کرلیں اور ان کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے"۔

اس آیت میں آشکارا طور پر یہ بیان کردیا گیا ہے کہ کافروں کو مہلت دینا تدبیر الٰہی ہے جو نہ صرف ان کے لئے فائدہ مند نہیں بلکہ اس دوران وہ اپنے گناہوں میں اضافہ کرتے ہیں اور ان کو جو فرصت ملتی ہے اس میں وہ قدم بہ قدم ہدایت الٰہی سے دور ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ رسوا کرنے والے عذاب کے مستحق ہو جائیں۔

1۔ سورۂ حج آیت42۔ 44۔

2۔ سورۂ آل عمران آیت178۔

سنّت عذاب

الٰہی سنتوں سے متعلق آیات جن کے بارے میںگفتگو چل رہی ہے ان میں تیسری سنّت، سنّتِ عذاب ذکرکی گئی ہے ۔ جب پیغمبروں کے مخالفین خداوند عالم کی تدبیر کے جال میں آگئے اور اس کی طرف سے ملنے والی تمام
مہلتوں سے بے پروا اپنے گناہوں میں اضافہ ہی کرتے چلے گئے تو ان پر عذاب نازل ہونا ضروری ہو گیاتو سزا کے طورپر خدا کے عذاب کے علاوہ اور کچھ نہ پایا ۔ متعدد آیات میں گذشتہ قوموں کے اوپر عذاب نازل ہونے کے تذکروں کے ذیل میں اس سنّت الٰہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ متنبّہ کردیا گیا ہے کہ قرآن کے مخالفین بھی اگر گذشتہ لوگوں کی عاقبت کے بارے میں غورو فکر سے کام نہ لیں گے تو انھیں کے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا لہٰذا اس بد بختی سے محفوظ رہنے کے لئے قرآن مجید میں باربار"سیروا فی الارض"یا "یسیروا فی الارض "کے ذریعہ گزشتہ لوگوں کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کاحکم دیا گیا ہے جیسا کہ سورۂ مبارکہ فاطرمیں ارشاد ہوتا ہے :

(وَاَقسَمُوابِاللّٰہِ جَھْدَ اَیمَٰنِھِم لَئِنْ جَائَ ھُم نَذِیْرُ لَیَکُونُنَّ اَھدَیٰ مِنْ اِحدَیٰ الأُ مَمِ فَلَمَّاجَا ئَھُم نَذِیْرمَازَادَھُم اِلَّانُفُوراً) [1]" اور یہ لوگ خدا کی بڑی بڑی سخت قسمیں کھاتے تھے کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانیوالا آئیگاتو وہ ضرور (دوسری) کسی بھی امت سے زیادہ راہ پانے والے ہوں گے (لیکن) جب ان کے پاس ڈرانیو الا آیا تو ان کی نفرت میں ترقی کے علاوہ اور کچھ نہ ہوا "

۔

یہ آیت پیغمبر اکرم ﷺ کی امت کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس میں یہ بیان کیاگیا ہے کہ وہ لوگ پیغمبر اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے اپنی پوری طاقت وقوت کے ساتھ قسم کھایا کرتے تھے کہ اگر خداوند عالم کی طرف سے ان کے لئے کوئی رسول مبعوث کیاگیا تو وہ دوسری امتوں سے بہتر طریقہ سے ہدایت الٰہی قبول کریں گے لیکن جب ان کے درمیان رسول اکرم ﷺ مبعوث ہوئے تووہ حق سے فرار کرگئے۔ بعد والی آیت ان کے فرارکرنے اور جو سرنوشت ان کے انتظارمیں ہے اس سے پردہ اٹھارہی ہے ارشادہوتا ہے :(اِسْتِکْبَاراًفِی الْاَرْضِ وَمَکْرَالسَّیِّئِ وَلَایَحِیقُ الْمَکْرُالسَّیِّئُ اِلَّابِاَھْلِہِ فَھَلْ یَنْظُرُونَ اِلّاسَنَّتَ الْاَوَّلِیْنَ فَلَنْ تَجِدَلِسُنَّتِ اللہ تَبْدِیْلاًوَلَنْ تَجِدَلِسُنَّتِ اللہ تَحْوِیلاً) [2]

"ان کے اس کام کا (مقصد)روئے زمین پر فقط سرکشی اور شرمناک حرکتیں تھیں اور شرمناک سازش توسازش کرنے والے کی طرف ہی پلٹتی ہے ۔تو کیا یہ لوگ اگلے لوگوں کی روش اور (بری سرنوشت) کے ہی منتظر ہیں؟

1۔ سورۂ فاطرآیت 42۔2۔ سورۂ فاطر آیت43۔

اور تم خدا کی سنّت میں ہر گز تبدیلی نہ پاؤ گے "۔

ان کی مخالفت کا سبب ان کا تکبّر، غرور اور فریب کا ریاں تھیںٓایسی سا زشیں جو سا زش رچنے والونکے سوا کسی دوسرے کے دا منگیر نہیں ہوتیں اور ان کا انجام بھی عذاب الٰہی ہی ہے ۔ اس آیت کے آخری حصّہ میں بھی سنّت عذاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

یہاںٓیہ بات .بیان کردینا مناسب ہوگا کہ لفظ "سنّت " کبھی خداوندعالم کے بارے میں استعمال ہوا ہے اور کبھی لوگوں کے با رے میں استعمال ہوا ہے اور جیسا کہ اہل ادب نے اضافت کی بحث میں .بیان کیا ہے کہ اضافت کے صحیح ہونے کے لئے معمولی اضافت بھی کافی ہے چنانچہ خداوندعالم کی طرف سنت کی نسبت اس لئے دی جاتی ہے کہ اس نے اس کوجاری کیا ہے اور آدمیوں سے اس لئے نسبت دی جاتی ہے کہ سنّت ان کے بارے میں جاری ہوئی ہے اس آیت میں دونونٓسبتوں کا استعمال ہوا ہے "سنّۃالاولین "اور "سنّۃ اللہ "البتّہ ان دونوں سے مراد وہی سنّت سزا اور عذاب الٰہی ہے لہٰذا اس آیت کے بعد خداوندعالم فرماتا ہے :

(اَوَلَمْ يَسِيْرُوْافِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْاكَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْااَشَدَّمِنْهُمْ قُوَّةً وَمَاكَانَ اللّٰه لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْئٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَافِى الْاَرْضَ اِنَّهُ كَانَ عَلِيْماً قَدِيْراً) [1]

"توکیا ان لوگوں نے روئے زمین پر سیر نہیں کی کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے اور ان سے زور و قوت میں بھی کہیں بڑھ چڑھ کے تھے دیکھیں ان کا کیا انجام ہوا؟اور آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز خدا کو عاجز نہیں کر سکتی کیونکہ .بیشک وہ بڑا باخبر (اور)بڑی قدرت والا ہے "۔

خدا کی سنّتوں کا ایک دوسرے میں مؤثر ہونا

مندرجہ بالاآیات اور اس کے مشابہ دوسری آیات دیکھنے کے بعد ممکن ہے ذہن میں یہ سؤال پیدا ہو : ان آیات کے مخاطبین کی کثیر تعداد گذشتہ قوموں کی راہ پر گامزن رہی اور وہ اسی طرح انبیاء کی مخالفت بھی کرتی رہی پھر ان پر خدا کا عذاب کیوں نہیں نازل ہوا ؟ کیا یہ بات سنّتِ الٰہی کے تبدیل ہونے کی نشاندہی نہیں کرتی ؟ اس سوال کا جواب بعد والی آیت سے واضح ہو جاتا ہے ۔

خدا وندعالم ارشاد فرماتا ہے :

(وَلَوْيُوَاخِذُ اللّٰه النَّاسَ بِمَاكَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَامِنْ دَابَّةٍ وَلٰكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ اِلىٰ اَجَلٍ)

1۔ سورۂ فاطر آیت44۔

(مُسَمّی فَاِذَاجَائَ اَجَلُھُمْ فَاِنَّ اللہ کَانَ بِعِبَادِہِ بَصِیْراً)[1]

"اور اگر خدا لوگوں کے کرتوتوں کی گرفت کرتا اور سزا دیتا رہتا تو روئے زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا باقی نہ چھوڑتا لیکن وہ تو لوگوں کو ایک معین مدت تک مہلت دیتا ہے اور جب ان کا وقت آجائے گا تو خدا اپنے بندوں کے افعال کو دیکھ رہا ہے ۔

اس آیت اور اس کے مانند قرآن میں موجود دوسری آیات پر غور و فکر کرنے سے خدا وند عالم کی سنتوں کے بارے میں ایک بنیادی قاعدے تک رسائی ہو سکتی ہے اور اس اصل کی بنیاد پر اگرچہ کافروں اور گنہگاروں پر عذاب ہونا خدا وند عالم کی ایک ناقابل تغییر، ثابت و استوار سنت ہے لیکن اس کا عملی جامہ پہنانا کچھ اور معینہ اصولوں سے وابستہ ہے جو خدا وند عالم کی دوسری سنتوں کے ذریعہ وقوع پذیر ہوتے ہیں ۔ در حقیقت خدا وند عالم کی سنتوں میں (عام معنی کے لحاظ سے نہ کہ اُس خاص معنی میں جو قرآن میں صرف سنتِ عذاب سے مخصوص ہے) کچھ ایسے رابطے حکمرانہیں جو ان کے عمل میں آنے کا طریقہ معین کرتے ہیں مثال کے طور پر ممکن ہے ایک سنت (اقتضائی) پہلو رکھتی ہو اور اس کا ظہور ایک وجودی یا عدمی شرط کے ساتھ اس طرح مشروط ہو کہ خود اس شرط کا محقق ہونا کسی اور سنت کے جاری ہونے پر موقوف ہو، ظاہری طور پر کافروں پرعذاب کی سنت بھی اسی قسم سے ہے اس لئے کہ عذاب کا عملی ہونا ان کی موت آجانے کی شرط پر موقوف ہے جبکہ خود ان کی موت کا وقت معین کرنا خود دوسری سنتوں اور مخصوص مصلحتوں اور بد عنوانیوں سے وابستہ ہے ان ہی سنتوں میں سے ایک سنت کی بنیاد پر، اہل زمین تناسل اور تولید مثل کے ذریعہ دوسرے انسانوں کو پیدا کرتے ہیں اور اسی طریقہ سے بہت سے مومنین کفر کی آغوش میں آنکھ کھولتے ہیں

اور اپنے والدین کے بر خلاف حق کا راستہ منتخب کرلیتے ہیں ۔ اب اگر خدا وند عالم صرف تمام کافروں کو ان کا کفر ظاہر ہونے کے ساتھ ہی ہلاک کردے تو اُن کے اُن مومن فرزندوں کے پیدا ہونے کا وسیلہ قطع ہو جائیگا جو ان کی نسل میں ہیں چونکہ عام طور سے انسانوں کے پیدا ہونے کی سنت تناسل کے ذریعہ ہی چل رہی ہے ۔ اس بنا پر بسا اوقات مومن فرزندوں کی پیدائش اور نیک و صالح افراد کے بعد کی نسلوں میں ظاہر ہونے کی مصلحت ان کے کافر اور گنہگار باپ دادا کی ہلاکت میں رکاوٹ بن جاتا ہے ۔ اسی وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام نے خدا وند عالم سے اپنی قوم کے کافروں پر عذاب کی درخواست اس وقت کی ہے جب ان کو یہ اطمینان ہو گیا کہ ان کی نسل میں کوئی مومن نہیں ہو گا :

(اِ نَّکَ اِنْ تَذَرْھُمْ یُضِلُّوْاعِبَا دَ کَ وَلَا یَلِدُوْااِلَّا فَاجِراً کَفَّاراً)[1]

1۔ سورۂ فاطر آیت45۔ 2۔ سورۂ نوح آیت 27۔

"کیونکہ اگر تو ان کو چھوڑدے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور نا شکرے کافروں کے علاوہ ان سے کوئی پیدا نہیں ہو گا"۔

یقیناً کچھ دوسری سنتیں بھی ہوں گی جو عذاب نازل ہونے میں موثرہیں لیکن ہم ان کو نہیں جانتے اوریہ تمام سنتیں، بھلائیاں اوربرائیاں مل کرعذاب کے نازل ہونے کا وقت معین کرتی ہیں۔

اس بات پر بھی توجہ ضروری ہے کہ الٰہی سزاؤں کی مختلف قسمیں ہیں جیسا کہ دنیاوی عذاب دو طرح کے ہیں:

ایک تو جڑ کاٹ دینے والا عذاب عذابِ استیصال ہے جس کے ذریعہ لوگوں کی ایک جماعت ہلاک اور نیست و نابود کردی جاتی ہے۔

دوسرے وہ مشکلات و مصائب ہیں جو عذاب میں بتلاء افراد کی موت کا سبب نہیں ہوتے۔ اس طرح کے عذاب کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے، کبھی کبھی معاشرہ کے تمام افراد یا کسی خاص طبقہ کے لوگو ں یا کسی خاص شخص پر بھی نازل ہوجاتا ہے۔ اس قسم کے عذاب لوگوں کے گناہوں کی سزا کا صرف ایک حصہ ہیں جیسا کہ آپ نے آخری آیت میںملاحظہ کیا کہ اگر خداوندعالم انسانوں کو ان کے تمام برے اعمال کی سزا اسی دنیا میں دیدیتا تو کوئی بھی انسان زندہ نہ بچتا:

(مَاتَرَکَ عَلَیْهَا مِنْ دَابَّةٍ)[1]

"تو روئے زمین پر کوئی ایک جاندار کو باقی نہ چھوڑتا"۔

چنانچہ سنت الٰہی یہ ہے کہ آدمیوں کے صرف کچھ گناہوں کی سزا اس دنیا میں دیدی جائے اور باقی سزا کو جہانِ آخرت (قیامت) کے لئے چھوڑدی جائے اور اللہ کی یہ سنت بھی ایک ایسی سنت ہے جو سنت عذاب کو محدود اور اس کے وقت کو معین و مشخص کرتی ہے۔ اس بنا پر الٰہی سنتوں کی آخری حدیہ ہے کہ صرف کچھ لوگ وہ بھی مشخص و معین زمانوں میں عذابِ استیصال میں بتلا کئے جائیں تاکہ اس طریقہ سے دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں۔ سورۂ نحل کی ایک آیت میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے:

(وَلَوْیُوَاخِذُ اللهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَاتَرَکَ عَلَیْهَامِنْ دَابَّةٍ وَلٰکِنْ یُؤَخِّرُهُمْ اِلَیٰ اَجَلٍ مُسَمّیً فَاِذَاجَائَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَةً وَلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ)[2]

1۔ سورۂ نحل آیت 61۔ 2۔ سورۂ نحل آیت 61۔

"اور اگر خدا وند عالم (سزا کے ذریعہ) لوگوں کے ستم کا مواخذہ کرتا رہتا تو روئے زمین پر کوئی ایک جاندار باقی نہ چھوڑتا لیکن وہ ان کے (کیفر) کو ایک معین وقت کے لئے ٹالے رکھتا ہے اور جب ان کی اجل (موت) آپہنچتی ہے تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹا سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھا سکتے ہیں"۔

بعض آیات ایک دوسرے نکتہ پر زور دیا گیا ہے وہ یہ کہ انسان کا برا کردار ہی اس کو دنیا میں عذاب اور مصیبتوں میں بتلا کرتا ہے اور یقیناً ایسا نہیں ہے کہ یہ عذاب اس کے تمام برے اعمال کا نتیجہ ہو بلکہ یہ صرف وہ عذاب ہے جو اُس کے بعض اعمال کے بدلہ میں مقرر کیا جاتا ہے اور اس کا مقصد بدکاروں کی تنبیہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے ۔ نمونہ کے طور پر سورۂ مبارکۂ شوریٰ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ موجود ہے ارشاد ہوتا ہے :

(وَمَاأَصٰبَکُمْ مِن مُصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَت اَیْدِیْکُم وَیَعفُوْاعَن کَثِیْرٍ)[1]

" اور جو مصیبت تم پر پڑی ہے وہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی بلائی ہوئی ہے اور (خداتو) بہت کچھ درگزر کردیتا ہے"۔

بہت سے عذاب کے مستحق گناہوں سے خدا وند عالم کا چشم پوشی کرنا سورۂ نحل کی اسی آیت کا مصداق ہے جس میں اعلان ہوا ہے: اگر خداوند عالم انسانوں کو ان کے تمام برے اعمال کی سزا دینا چاہے تو روئے زمین پر کوئی جاندار منجملہ کوئی بھی آدمی باقی نہ رہتا ۔ بنا بریں اس آیت سے دو نکتوں کا استفادہ ہوتا ہے :

1۔ انسان پر آنے والی ہر مصیبت اور عذاب خود اسی کے برے اعمال اور گناہوں کا نتیجہ ہے۔

2۔ اگرچہ انسانوں کے تمام ناپسند اور برے اعمال پر ایک مخصوص سزا اور عذاب ہونا چاہئے لیکن خداوند عالم (اپنی حکمت بالغہ کی بنیاد پر) ان کے بہت سے اعمال کو بخش دیتا ہے اور ان کے مرتکب افراد کو اس دنیا میں عذاب دینے سے چشم پوشی کرتا ہے ۔

اس نکتہ کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ کبھی کبھی گناہگاروں کے بُرے اعمال کا اثر اتنا زیادہ وسیع ہوتا ہے کہ اس کی لپیٹ میں صرف ان اعمال کے مرتکب ہی نہیں بلکہ دوسرے بھی آجاتے ہیں ۔ اس حقیقت کو مندرجہ ذیل آیت میں صاف طور پر بیان کیا گیا ہے:

(ظَھَرَالفَسَادُ فِی البَرِّوَالبَحْرِ بِمَاکَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِ یْقَھُم بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوالَعَلَّھُم یَرْجِعُوْنَ)[2]

1۔ سورۂ شوریٰ آیت 30۔ 2۔ سورۂ روم آیت 41۔

" خود لوگوں کے اپنے ہاتھوں کرتوت کی بدولت خشک و تر میں برائی اور تباہی پھیلی ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کرچکے ہیں ان میں سے بعض کا مزہ (خدا) انھیں چکھا دے کہ شاید یہ لوگ باز آجائیں " ۔

اور اسکے بعدکی آیت میں خداوند عالم نے انسان کو زمین کی سیر کرنے اور گذشتہ لوگوں کے انجام کے بارے میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے :

(قُلْ سِيْرُوافِى الاَرْضِ فَانْظُرُوْاكَيفَ كَانَ عٰقِبَةُ الَّذِيْنَ مِن قَبلُ كَان اَكثَرُهُمْ مُشْرِكِيْنَ)[1]

" کہدیجئے کہ ذرا روئے زمین پر چل پھر کر دیکھو تو کہ وہ لوگ کہ جن میں اکثریت مشرکین کی تھی اور اس کے قبل گذر چکے ہیں ان کا انجام کیا ہوا ۔

جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمارہے ہیںکہ آیت میں جن لوگوں پر عذاب کیا گیا ان کے مشرک ہونے کی طرف اشارہ ہے ۔ البتّہ عبارت (کان اکثرھم مشرکین) میں دو احتمال پائے جاتے ہیں :

پہلا احتمال یہ ہے : گذشتہ قوموں کی اکثریت جو مشرک تھی عذاب الٰہی میں بتلاہوئی ۔ اس بنیاد پرآیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جن افراد پر عذاب ہوا وہ سب مشرک تھے اور یہ بھی کہ تمام مشرکوں پر عذاب ہوا ہے ۔

دوسرا احتمال یہ ہے :جن افراد پر عذاب ہوا ان میں سے اکثر مشرک تھے ۔ اس صورت میں مطلب ہوگا کہ جن لوگوں پر عذاب ہوا ان میں سے بعض موحّد بھی تھے البتّہ اہل عذاب مشرکوں کے مقابلہ میں ان کی تعداد بہت کم تھی اور عذاب کے درمیان وہ اقلیت میںتھے اب اگر ہم اس احتمال کو قبول کرلیں تو یہ سوال ذہن میں آتاہے کہ خدائے واحد کو ماننے والے افراد اقلیت میں سہی کس بناء پر خداوندعالم کے عذاب کے مستحق قرارپائے ؟

اس سوال کے جواب میںیہ کہاجاسکتاہے کہ موحّدوںکا یہ گروہ فسق وفجور کا مرتکب ہونے کی وجہ سے خداوندعالم کے عذاب کا مستحق قرارپایا ہوگاجیسا کہ قرآن میں اصحاب "سبت"کی داستان سے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے، یہ جماعت مشرک نہیں تھی یہاں تک کہ وہ ظاہری طورپر خداوندعالم کے احکام کی پیروی کا ادعا بھی کرتی تھی یہی وجہ ہے جب سنیچر کے دن مچھلی کا شکار ممنوع ہوا تو انھوں نے شکار سے ہاتھ کھینچ لیا لیکن اس کے ساتھ چال یہ چلی کہ حوض کے مانند گڑھے کھوددئے جن میں مچھلیاں پھنس جاتی تھیں اور پھر ان کا اتوار کے دن شکار کرلیا کرتے تھے یہ گروہ شرک کی وجہ سے نہیں بلکہ احکام الٰہی سے کھلواڑکی وجہ سے مستحق عذاب ہوا اور قرآن کی گواہی کے اعتبار سے یہ لوگ بندر بنا دیئے گئے ۔

1۔ سورۂ روم آیت 42۔

(فَلَمَّاعَتَوْاعَنْ مَّانُهُوْاعَنْهُ قُلْنَالَهُمْ كُونُواقِرَدَةً خَاسِئِينَ)[1]

"پھر جس بات سے انھیں منع کیا گیا تھا جب ان لوگوں نے اس میں سرکشی کی تو ہم نے حکم دیا کہ تم ذلیل اور راندے ہوئے بندر بن جاؤ"۔

بہر حال اگر ہم دوسرے احتمال کو تسلیم کرلیں تو بھی آیت کے معنی یہ ہونگے کہ گذشتہ لوگوںپر جو عذاب کیا گیا ان میں سے اکثر کے مشرک ہونے کی وجہ سے کیا گیا اگر چہ ان کے درمیان کچھ فاسق موحّد افراد بھی موجود تھے۔

بہر حال آخری آیات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کفر، ظلم اور انبیاء علیہم السلام کو جھٹلانا و غیرہ آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیاوی عذاب کا باعث بھی ہیں جو کبھی انسانوں کی پوری ایک جماعت کی تباہی اورہلاکت کا سبب بنتے ہیںلیکن یہ عذاب خداوندعالم کی دوسری سنّتوں کے زیر اثرہیں اور بعض اوقات مصلحتوں یا بد عنوانیوں کی وجہ سے کافروں اور گنہگاروں کی ہلاکت میں تاخیر کردی جاتی یا کبھی کبھی بالکل ہی ٹال دی جاتی تھی اور ان کے عذاب کو آخرت کیلئے چھوڑدیا جاتا تھا۔جیسا کہ ہم اشارہ کرچکے ہیں انسانوں کی موت کا وقت جو خود بھی علم الٰہی کے خاص قوانین وضوابط کی اساس و بنیادپر معین ہوتاہے ایک اصول ہے جو عذاب استیصال کے نازل ہونے کے وقت کو معین و محدود کردیتاہے ۔اس حقیقت کو قرآن کریم کی بعض آیات میں صاف طورپر بیان کیا گیاہے:

(لَوْلَاكِتَاب مِنَ اللهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَااَخَذْتُمْ عَذَابعَظِيْم)[2]

"تم نے جو کہا ہے اگر خدا کی طرف سے پہلے لکھا نہ جاچکا ہوتاتو یقیناتم پربڑا عذاب نازل ہوتا"۔

اس آیت سے یہ پتہ چلتاہے کہ اگر اس گروہ کی موت کا وقت پہلے سے لکھا نہ ہوتا تو یقینا ان کے برے اعمال کی وجہ سے ان پر بہت بڑا عذاب نازل ہوگیاہوتا۔متعددآیات میں (لَولَاکَلِمَۃ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّکَ)کا جملہ استعمال ہوا ہے۔یہ آیات اس چیز کی عکاسی کرتی ہیں کہ اگر چہ آدمیوں کے بعض گروہ سخت عذاب وہلاکت کے مستحق کیوں نہ ہوںچونکہ ابھی ان کی موت کا وقت نہیں آیاہے اور خداوندعالم کی جانب سے ان کی موت میںتا خیر کا فیصلہ ہو چکاہے لہٰذا ان پر عذاب الٰہی نازل نہیں ہوتا اور وہ اپنی موت کے معینہ وقت تک زمین پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ لہٰذا لوگوں کی موت کے وقت کا معیّن و مشخّص ہونا بھی خداوندعالم کی ایک ایسی سنّت ہے جو سنّت عذاب پر حاکم ہے اور اس کو معیّن و مشخّص کرتی ہے ۔

1۔سورۂ اعراف آیت166۔2۔سورۂ انفال آیت68۔

معلوم ہوا یہ کہ خداوندعالم اپنی بعض مصلحتوں کی وجہ سے جس کا علم صرف اسی کو ہے، اپنے عذاب اور سزا کو اسکے مستحق افراد سے کچھ مدّت کیلئے اٹھا لیتا ہے البتہ قرآن کریم کی ہی آیات سے جیسا کہ پتہ چلتا ہے کہ خداوندعالم کا یہ منصرف ہونے کا عمل مستحقین عذاب سے مخصوص ہے، اور خداوندعالم کی نعمتوںمیں جاری نہیںہوتا۔ یعنی اگرچہ خداوندعالم اپنا عذاب ایک مدت کے لئے مستحقین سے دور کردیتا ہے لیکن کبھی اپنی نعمتوں کو نعمتوں کے مستحق بندوں کو عطا کرنے میں دریغ نہیں کرتا۔

قرآن کریم کی بعض آیات میں صاف طور پر موجود ہے کہ خداوندعالم جب اپنے بندوں کو نعمت عطا کردیتا ہے تو پھر واپس نہیں لیتا مگر خود بندوں کے اندر کوئی ایسی تبدیلی آجائے کہ وہ اپنی پہلی لیاقت سے ہاتھ دھو بیٹھیں:

(ذٰلِکَ بِاَنَّ اللہ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِم)[1]

"یہ سزا اس وجہ سے ہے کہ جب خدا کسی قوم کو کوئی نعمت دیتا ہے تو جب تک وہ لوگ خود اپنی قلبی حالت (نہ) بدلیں خدا بھی اسے نہیں بدلتا"۔

اور سورۂ رعد میں مطلق طور پر تغیر و تبدل نہ ہونے کی بات کی گئی ہے:

(اِنَّ اللہ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ) [2]

"درحقیقت خداوندعالم کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جبتک وہ لوگ خود اپنی حالت نہ بدلے"۔

البتہ مفسرین کے ایک گروہ نے آیت کے مطلق ہونے کی بنیاد پر کہا ہے کہ یہ آیت نعمت اور عذاب دونوں کو شامل ہے اب اگر یہ خیال درست مان لیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ خداوندعالم کسی گروہ کی طرف نازل ہونے والے عذاب کو بھی نہیں بدلتا مگر یہ کہ وہ گروہ خود مستحق عذاب نہ رہ جائے۔ یہ مفہوم اگرچہ آیت کے مطلق ہونے سے سازگار ہے لیکن آیات کے سلسلۂ کلام سے مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ ان آیات کے سلسلۂ گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تغیر و تبدّل کا مسئلہ نعمت سے مخصوص ہے یعنی خداوندعالم نعمتوں میں تغیّر و تبدّل نہیں کرتا مگر یہ کہ خود مستحقین نعمت اپنے استحقاق سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ نہ یہ کہ اگر کسی قوم پر کوئی عذاب ہونے والا ہو تو اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی مگر یہ کہ وہ قوم خود اپنے کو بدل ڈالے اور اس نظریہ کی تائید سورۂ مبارکۂ اعراف کی اس آیت سے ہوتی ہے:

(ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ) [3]

1۔ سورۂ انفال آیت53۔ 2۔ سورۂ رعد آیت11۔3۔ سورۂ اعراف آیت95۔

"پھر ہم نے برائی (مصیبت)کی جگہ، نیکی (اور نعمت) دیدی۔۔۔"۔

اس بناء پر لگتا ہے کہ سورئہ رعد کی گیارہویں آیت اور سورئہ انفال کی ترپنویں آیت دونوں کا مفہوم ایک ہی ہو لہٰذا یہ امکان پایاجاتاہے کہ خدا وند عالم مستحقین عذاب سے کسی مصلحت منجملہ املا اور استدراج کی وجہ سے بعض عذاب کودور کردے لیکن یہ عمل نعمتوں میں جاری نہیں ہوتا۔

قرآن کریم کی آیات سے ایک دوسرے اہم مسئلہ کا پتہ چلتاہے کہ مصیبت اور سختی ہمیشہ عذاب اور الٰہی سزا نہیں ہوتی۔اگر سختی اور مصیبت آدمی کے برے اعمال کا نتیجہ ہوتو یہ خداوندعالم کا عذاب ہوگی لیکن کبھی کبھی بعض سختیاں خود ایک قسم کی رحمت اور نعمت ہوتی ہیں جیسا کہ آپ نے پہلے کی آیات میں مشاہدہ کیا ہوگاکہ خداوندعالم انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کرنے کے بعد سختیوں اوربلائونکو نازل کرتا تھاجن کا مقصد انسانوں کو خداوندعالم کی طرف متوجہ کرنا اور ان میں خضوع و خشوع کی حالت پیدا کرنا تھا: (لَعَلَّهُمْ یضَرَّعُون) اور ظاہر ہے کہ یہ سختی اور مصیبت عین نعمت ہے۔پس ایسا نہیں ہے کہ ہمیشہ سختیاں گذشتہ اعمال کا نتیجہ اور سنّت عذاب کے تحت ہو بلکہ کبھی کبھی زیادہ عمومیت کی حامل سنت یعنی آزمائش اور امتحان کی سنت کے تحت ہو تی ہے۔ہم قرآن کی رو سے جانتے ہیں کہ اس دنیا میں انسان کے پیدا کئے جانے کا مقصد اسکا امتحان لیناہے۔

(لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً) [1]

"۔۔۔تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں عمل (کے اعتبار سے)بیتزیادہ اچھا کون ہے۔۔۔"۔

اور آزمایش و امتحان کے لئے وسیلہ کی ضرورت ہے جو کبھی شر ہو تاہے اور کبھی خیر ہوتا ہے:

سورئہ انبیاء میں ارشاد ہوتا ہے:

(ونَبْلُوْکُمْ بِالشَّرِّوَالْخَیْرِفِتْنَةً) [2]

"۔۔۔اور ہم تمہارا برائی اور نیکی کے ذریعہ امتحان لیتے ہیں۔۔۔"۔

معلوم ہواکہ کبھی کبھی سختیاں اورپریشانیاں انسانوں کی آزمائش کا ذریعہ ہوتی ہیں اس کے اعمال کی سزا نہیں ہوتیں۔

اب تک ہم نے الٰہی عذاب کے بارے میں اس عنوان سے گفتگوکی ہے کہ خداوندعالم کی یہ بھی ایک سنّت

1۔سورئہ ہود آیت7۔2۔سورئہ انبیاء آیت35۔

ہے جو انبیاء علیہم السلام کے مخالفوں کے بارے میں جاری رہی ہے لیکن قرآن کریم میں اس بحث کی وسعت اور اہمیت کے پیش نظر بہتر ہے کہ اس بارے میں قرآن کریم کے مختلف سوروں میںذکر شدہ متعدد آیات پر بھی ایک سرسری نظر ڈال دی جائے۔

قرآن کریم کی بعض آیات میں گذشتہ قوموں پر ہونے والے عذاب کا کلی طورپر ذکر ہوا ہے کسی خاص قوم یا اقوام کا ذکر نہیں ہے۔نمونہ کے طورپر سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے

(اَلَمْ يَرَوْاكَمْ اَهْلَكْنَامِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرنٍ مَكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ مَالَمْ نُمَكِّنْ لَكُمْ وَاَرْسَلْنَاالسَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَاراًوَجَعَلْنَاالْاَنْهٰرَتَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُم بِذُنُوبِهِمْ وَ اَنْشَاْنَامِنْ بَعْدِهِمْ قَرْناً ءَ اخَرِيْنَ)[1]

"کیا انھوںنے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی امتوں کو ہلاک کرڈلا؟(وہ امتیں جن کو)ہم نے روئے زمین پروہ وسائل عطا کئے تھے جو تم کو نہیں عطا کئے اور آسمان سے ان پر لگاتار بارش کے ذریعہ ان کے(شہروںکے)نیچے بہتی ہوئی نہریں بنادیں (اور)پھر ان کے گناہوںکی وجہ سے ان کومارڈالااوران کے بعدایک دوسرے گروہ کوپیدا کردیا"۔

جیسا کہ آپ نے ملا حظہ فرمایا آیت میں کچھ گذشتہ امتوں پرخداوندعالم کے عذاب نازل کرنے کا بیان ہے مگر قوموں کے نام نہیں بیان کئے گئے ہیں اسی آیت کی مانند دوسری آیتیں بھی ہیں جو اسی مطلب کو بیان کرتی ہیں ان میں سے کچھ آیات یہ ہیں: سورۂ انعام آیت10۔11، سورۂ انبیاء آیت41، سورۂ ہودآیت40، سورۂ عنکبوت آیت52۔53، سورۂ انفال آیت52۔53،رعد آیت 32، حجر آیت 10۔13 ،روم آیت9،42،47، فاطر25۔26، مؤمن آیت21۔22، فصلت آیت 82۔85، زخرف آیت7۔8، حج آیت 45۔46،مریم آیت 98، محمد آیت 10 و 13، ق آیت 36۔37۔

آیات کاایک سلسلہ اور ہے جس میں مخصوص قوموں پر عذاب کاتذکرہ کیاگیاہے ہم ہر قوم سے متعلق صرف ایک آیت بیان کرنے پر اکتفاء کرتے ہوئے بقیہ آیات کا حوالہ قارئین کرام کے لئے ذکر کررہے ہیں۔

الف)حضرت نوح علیہ السلام کی قوم

سورۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

1۔سورۂ انعام آیت6۔

(فَكَذَّبُوْهُ فَ۩نْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ فِى الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَاالَّذِينَ كَذَّبُوْابِ۩اٰيٰتِنَااِنَّهُمْ كَانُوْاقَوْماًعَمِيْنَ)[1]

"پس انھوں نے ان (نوح)کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں تھے بچالیا اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایاان سب کو غرق کردیا کیونکہ یہ سب کے سب (دل کے) اندھے لوگ تھے"۔

قوم نوح علیہ السلام پر عذاب اور ان کی ہلاکت سے متعلق بقیہ آیات یہ ہیںسورۂ یونس 73،ہود39 ۔40، انبیاء 77، مومنون 27 ،فرقان 37 ، شعراء 120 ، عنکبوت 14 ، صافات 82 ، ذاریات 46 ، قمر11۔15 ، اور سورۂ نوح 25۔

ب) ہود علیہ السلام کی قوم(عاد)

سورۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

(فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّاوَقَطَعْنَادَابِرَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْابِ۩اٰيٰتِنَاوَمَاكَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ)[2]

"پس ہم نے ان (ہود)کو اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے نجات دے دی اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا اور ایمان نہیں لائے تھے ہم نے ان کی جڑ ہی کاٹ دی"۔

قوم عاد پر عذاب سے متعلق اور بھی آیات اس طرح ہیں : سورۂ ہو د59۔60، مومنون 41 ، شعراء 139 ، فصلت 16 ، احقاف 21۔25 ،ذاریات 41۔42 ، قمر 19 ۔20 ۔اور سورۂ حاقّہ 7 ۔

ج) صالح علیہ السلام کی قوم (ثمود)

سورۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے :

(فَاَخَذَ تْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْافِى دَارِهِمْ جٰثِمِينَ)[3]

"تب ان (قوم صالح)کو زلزلہ نے اپنی گرفت میں لے لیا کہ وہ اپنے گھر ہی میں سر بہ زانو بیٹھے رہ گئے "۔

مندرجہ ذیل آیات میں بھی قوم ثمود پر عذاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

سورۂ ہود68، شعراء 158 ، نحل 51۔52 ، فصلت 17 ، ذاریات 44 ، قمر31 ، حاقہ 5 ، اور سورۂ شمس 13 ۔ 15 ۔

1۔ سورۂ اعراف آیت64۔ 2۔ سورۂ اعراف آیت72۔ 3۔ سورۂ اعراف آیت78۔

د) لوط علیہ السلام کی قوم

سورۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَأَمْطَرْنَاعَلَيْهِمْ مَطَرًافَانْظُرْكَيْفَ كَانَ عَٰقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ)[1]

"اور ہم نے ان (قوم لوط) کے سرپر(اولونکا)مینھ برسایا پس ذرا غور توکرو کہ گنہگاروں کا انجام آخر کار کیا ہوا"۔

قوم لوط علیہ السلام پر عذاب کے متعلق مندرجہ ذیل آیات میں بھی اشارہ کیا گیا ہے: سورۂ ہود 82، حجر 73۔74، نحل 58، شعراء 173۔174، عنکبوت 34۔35، صافات 136، ذاریات 32۔27 اور سورۂ قمر 34۔39۔

ہ) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم پر عذاب اور ان کی ہلاکت کے بارے میں صاف طور پر کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔

صرف سورۂ انبیاء میں اس سے متعلق یہ عبارت پائی جاتی ہے:

(وَاَرَادُوْابِهِ كَيْدًافَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ)[2]

"اور ان لوگوںنے ابراہیم کے ساتھ چالبازی کرنا چاہی تھی تو ہم نے ان کو سب سے زیادہ گھاٹا اٹھانے والوں میں قرار دے دیا"۔

یہ آیت اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مخالفوں پر عذاب کی طرف اشارہ کرتی ہے لیکن ان پر عذاب کی کیفیت بیان نہیں ہوئی ہے۔

و: حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم

خداوند عالم سورۂ ہودمیں ارشاد فرماتا ہے:

(وَلَمَّاجَاۤءَ اَمْرُنَانَجَّيْنَا شُعَيْبًاوَّالَّذِ يْنَ آمَنُوْامَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّاوَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْاالصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوا فِى دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ

)[3]

1۔سورۂ اعراف آیت84۔ 2۔سورۂ انبیاء آیت70۔3۔سورۂ ہود آیت94۔

"اور جب ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے شعیب اور ان پر ایمان لانے والوں کو اپنی مہربانی سے بچا لیا اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو ایک چنگھاڑنے ہلاک کر دیا پھر تو وہ سب اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے "۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے کافروں کی ہلاکت کے بارے میں دوسری کچھ آیات میں بھی اشارہ کیا گیا ہے: سورۂ اعراف 91، شعرائ189۔190، عنکبوت 37۔

ز)حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم (آل فرعون)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم(فرعونیوں) کے بارے میں دو قسم کے عذاب کا ذکر ملتا ہے ۔ایک تو وہی عذاب ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے مبعوث ہونے کے بعد ان پر تنبیہہ کے طور پر نازل ہوا تھا کہ شاید وہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر خدا کو یاد کرنے لگیں ۔یہ عذاب مختلف صورتوں میں جیسے قحط ،خشک سالی اورطوفان وغیرہ کی شکل میں نازل ہوا اور بعض آیات میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

(وَلَقَدْاَخَذْنَائَ الَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ)[1]

"در حقیقت ہم نے فرعون کے لوگوں کو برسوں کے قحط اور پھلوں کی پیداوار میں کمی (کے عذاب)میں گرفتار کیا تا کہ وہ لوگ عبرت حاصل کریں"۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :

(فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ والْجَرادوَالقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّم ئَ ايٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُواقَوْماًمُّجْرِمِيْنَ)[2]

"پس ہم نے ان پر طوفان اورٹڈیوں ،جوئوں، مینڈکوں اور خون (کاعذاب)بھیجا جو سب جدا جدا آشکار نشانیاں تھیں پھر بھی وہ لوگ سرکشی ہی کرتے رہے اوران کا ایک گروہ بدکار تھا "۔

موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر دوسرا عذاب، عذابِ استیصال تھا جس کے تحت فرعون کو دریامیں غرق کر دیا گیا:

(فَانْتَقَمْنَامِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِی الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّ بُوْابِئَاآيَاتِنَاوَكَانُوْاعَنْهَا غٰفِلِيْنَ)[3]

"آخرکار ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو دریامیں غرق کردیا کیونکہ انھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا اور

1۔سورۂ اعراف آیت130۔2۔سورۂ اعراف آیت133۔3۔سورۂ اعراف آیت 136۔

ان سے غافل ہو گئے تھے"۔

دوسری بہت سی آیات بھی قوم فرعون کی ہلاکت کے بارے میں اشارہ کرتی ہیں جیسے :بقرہ کی آیت50،یونس91۔92، ہود99، اسراء 203، طہ 78، مومنون48، فرقان 36، شعراء 66۔67، نحل 14 ، قصص 40 ،مومن 45 ، زخرف55۔56، ذاریات 40 ،اور سورۂ نازعات 25 ۔

انبیاء علیہم السلام کی ان قوموں کے علاوہ قرآن کریم کی بعض آیات میں بعض دوسرے گروہوںپر نازل ہونے والے عذاب کاذکر ہے مگر ان کے انبیاء علیہم السلام کے نام بیان نہیں کئے گئے ہیں ۔

ان میں سے بعض گروہ یہ ہیں :

الف)اصحاب سبت

سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے :

(فَقُلْنَالَهُمْ كُوْنُوْاقِرَدَةً خَسِئِينَ) [1]

"تو ہم نے ان (اصحاب سبت)سے کہا تم راندۂ درگاہ بندر بن جاؤ "۔

ب)قوم سب

سورۂ سبمیں ارشاد ہوتا ہے :

(فَاَعْرَضُوافَاَرْسَلْنَاعَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ) [2]

"پھر(قوم سب)نے روگردانی کی اور ہم نے ان پر بڑے زور کا سیلاب بھیج دیا ۔۔۔"۔

ج)اصحاب رسّ

سورۂ فرقان میں ارشاد ہوتا ہے :

(وَعَاداًوَثَمُودَوَاَصْحَابَ الرَّسِّ وَقُرُوناًبَيْنَ ذَلِکَ کَثيراً) [3]

"اور (نیز)عاد اور ثمود اور اصحاب رس اور ان کے درمیان بہت سی جماعتوں کو (ہم نے ہلاک کرڈالا)" ۔

1۔سورۂ بقرہ آیت65۔ 2۔سورۂ سبأآیت16۔2۔فرقان آیت38۔

٥)اصحاب فیل

سورۂ فیل میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَاَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًااَبَابِیْلَتَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِنْ سِجِّیْلٍ فَجَعَلَهُمْ کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ)[1]

"اور ان پر جھنڈکی جھنڈ(ابابیل)چڑیا ںبھیجدیں (جو)ان پر کھرنجوں کی کنکریاں پھینکتی تھیں تو (سرانجام خدانے)انھیں چبائے ہوئے بھوسہ کی طرح کردیا"۔

بعض آیات میں ایک خاص شخص پر نازل ہونے والے عذاب کی داستان بھی بیان کی گئی ہے مثال کے طور پر قارون کے بارے میں سورۂ قصص میں ارشاد خداوندی ہے :

(فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الاَرْضَ فَمَاکَانَ لَهُ مِنْ فِئَةٍ یَنْصُرُوْنَهُ مِنْ دُونِ اللهِوَمَاکَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِیْنَ)[2]

"اسی وقت ہم نے(قارون)کو اس کے گھربار سمیت زمین میں دھنسا دیا اور خداکے(عذاب) کے مقابل کوئی اس کی مدد کرنے والانہ تھا اور (وہ خودبھی)اپنادفاع نہ کرسکا"۔

متعدد آیات میں ایک ساتھ کئی کئی قوموں پر عذاب کاتذکرہ بھی ملتا ہے مثال کے طورپر قوم عاد و ثمودوفرعون کاتذکرہ کرنے کے بعدسورۂ فجرمیں ارشاد ہوتا ہے:

(فَصَبَّ عَلَیْهِمْ رَبُّکَ سَوْطَ عَذَابٍ)[3]

"یہاں تک تمہارے پروردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا دے مارا "۔

عذابِ استیصال کا، کافروں سے مخصوص ہونا

قرآن کریم کی آیات پرتدبر و تفکر سے ایک اور نکتہ جو حقیقت میں خدا کی دوسری سنّت بیان کرتا ہے یہ ہے کہ عذاب استیصال کافرونّسے مخصوص ہے ۔خبر دارکرنے والے عذاب ممکن ہے کافروں اور مومنوں دونوںپرنازل ہوں اور کافرونکے ساتھ مومنین بھی قحط اوربیماری جیسی مصیبتوں میں بتلاہوجا ئینکیونکہ یہ مومن کیلئے امتحان

1۔سورۂ فیل آیت3۔5۔2۔سورۂ قصص آیت81۔3۔سورۂ فجر آیت13۔

وآزمائش ہے اورجو کافر کے لئے تنبیہ ہے لیکن عذاب استیصال جس سے کسی کوہمیشہ کے لئے ہلاک کر دیا جائے صرف کافروں سے ہی مخصوص ہے اور اس عذاب کے نازل ہوتے وقت اگر کوئی مومن یا مومنہ کافروں کے درمیان موجود ہوتو خداوندعالم اس کو نجات دیدیتا ہے۔

یہ بات متعدد آیات میں بیان کی گئی ہے۔ بعض آیات اس عمومی قانون کو بیان کرتی ہیں کہ بالآخر کار انبیاء کی کامیابی ایک سنّت الٰہی ہے۔ البتّہ واضح ہے کہ اس کامیابی سے مراد یہ نہیںہے کہ کوئی پیغمبر اپنی رسالت کی راہ میں شہادت کے درجہ پر فائز نہیں ہوتا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ سرانجام انبیاء علیہم السلام کی رسالت کا مقصد پورا اور ان کی دعوت نتیجہ مطلوب تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کامیابی و کامرانی کی ایک علامت یہ ہے کہ انبیاء اور ان کا اتباع کرنے والے کبھی بھی عذاب استیصال میں گرفتار نہیں ہوتے اس سنّت الٰہی پر مندرجہ ذیل آیات دلالت کرتی ہیں:

(اِنَّالَنَنْصُرُرُسُلَنَاوَالَّذِیْنَءَ امَنُوْافِی الْحَیٰوۃِالدُّنْیَاوَیَوْمَ یَقُومُ الْأَشْهَدُ)[1]

"ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی دنیوی زندگی میں بھی اور جس دن گواہ اٹھ کھڑے ہونگے یقیناًمدد کریں گے"۔

اور سورۂ صافات میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَلَقَدْ سَبَقَتْ کَلِمَتُنَالِعِبَادِنَاالْمُرْسَلِیْنَاِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُوْنَوَاِنَّ جُنْدَنَالَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ)[2]

"اور قطعاً اپنے بھیجے گئے بندوں کے بارے میںہمارا پہلے سے فرمان ہے کہ وہ (اپنے دشمنوںپر) یقینا کامیاب ہوں گے اور ہمارا شکر یقینا غالب رہے گا"۔

بعض آیات میں مومنوں کی مخصوص قوم کے کامیاب ہونے کے بارے میں بھی ذکر ملتا ہے، نمونہ کے طورپر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کی آپ پر ایمان نہ لانے والے بنی اسرائیل کے کافروں پر فتحیابی سورۂ صف میںبیان ہوئی ہے:

(یٰاَیُّهَاالَّذینَ ءَ امَنُواکُونُوْااَنْصَارَاللهِ کَمَاقَالَ عیسَیٰ ابْنُ مَرْیَمْ لِلْحَوَارِیِّیْنَ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللهِقَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُاللهِ فَئَامَنَتْ طَائِفَة مِن بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ وَکَفَرَتْ طَائِفَة فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ)

1۔ سورۂ مومن (غافر) آیت51۔2۔سورۂ صافات آیت171۔173۔

(ۤامَنُوْا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُواظَاهِرِيْنَ)[1]

"اے ایمان دارو خدا کے مددگار بن جائو جس طرح مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں سے کہا تھاکہ خداکی طرف (بلانے میں) میرے مددگار کون لوگ ہیں ؟تو حواریوں نے کہا: ہم خدا کے انصار ہیں پس بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ان پر ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیاتوجو لوگ ایمان لائے ہم نے ان کو ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں مددد ی یہاں تک کہ وہی غالب رہے"۔

اس آخری آیت سے پتہ چلتاہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کے کفّار بھی ایک قسم کے عذاب میںمبتلا ہوئے اوروہ عذاب ان (کفار) پر مومنوںکی فتح تھی۔ایک دوسری آیت میں بھی اس گروہ پر ہونے والے عذاب کاتذکرہ کیاگیا ہے ۔اس آیت سے پہلے کی آیات میںحضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا ذکر ہے پھر ارشاد ہوتا ہے :

(فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْل لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوامِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيمٍ)[2]

"یہاں تک کہ ان کی جماعتیں آپس میں اختلاف کرنے لگیں تو جن لوگوں نے ظلم کیا ان پر دردناک عذاب کے دن کی وائے ہو "

۔

البتہ یہ عذاب دنیا میں آنے والے عذاب کے بارے میںہے، مندرجہ بالاآیت میں صاف طور سے ذکر نہیںہے لیکن یہ احتمال پایا جاتاہے کہ شاید اس عذاب سے وہی کافروں کی شکست مرادہو۔

اب تک ہم نے سنّت عذاب سے متعلق بعض آیات کا مختصر طورپر ذکرکیا ہے ۔اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سنّت الٰہی سے متعلق بحث کی مناسبت سے قرآن کریم میں جو دوسری الٰہی سنتیں بیان ہوئی ہیں ان پر بھی سرسری نظرڈال لی جائے :

1۔ سورۂ صف آیت14۔2۔ سورۂ زخرف آیت65۔

مستضعفین کا حاکم ہونا

قرآن کریم کی آیات میں جن الٰہی سنتوں کا ذکر ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ قوم کے کچلے ہوئے مستضعفین مستکبروں کے تسلّط سے نجات پائینگے اورخدا روئے زمین پر انھیںایک دن حاکم قرار دے گا ۔جیسا کہ ہم "استضعاف و استکبار"کی بحث میں اس چیز کی طرف اشارہ کرچکے ہیں یہ ذکر کرنے کے بعد کہ فرعون نے لوگوں کی ایک جماعت کو بری طرح کچل رکھا تھاقرآن کریم فرماتا ہے :

(وَنُرِیْدُاَنْ نَمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوافِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِیْنَ وَنُمَکِّنْ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُوْدَهُمَامِنْهُمْ مَاکَانُوْایَحْذَرُوْنَ)[1]

"اور ہم تو یہ چاہتے تھے کہ جو لوگ روئے زمین پر کمزور کردئے گئے ہیں ان پر احسان کریں اور ان ہی کو لوگوں کا پیشوا بنائیں اور ان ہی کو اس (سرزمین)کا مالک بنائیں اور ان ہی کو روئے زمین پرپوری قدرت عطا کریں اور (دوسری طرف)فرعون اورہامان اور ان دونوں کے لشکروالوں کو وہ چیزیں دکھادیں کہ جن کی طرف سے وہ ڈرتے تھے "۔

اگرچہ یہ آیت بنی اسرائیل کے بارے میں ہے اور (اَلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوا) سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو فرعون نے کمزور کردیا تھا لیکن قاعدہ (القرآن یجری مجری الشمس والقمر)کے مدنظر خاص طور سے اس لئے کہ آیت میں فصل(نُرِیْدُ) مضارع ہے جو دوام و استمرارپر دلالت کرتاہے لہٰذا اس آیت سے ایک مستقل سنّت الٰہی کو اخذ کیا جاسکتا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کرچکے ہیں ہماری روایات میں آیا ہے کہ آخری زمانہ میں حضرت ولی عصر کے ظہورسے متعلق بھی اس آیت کی تاویل کی جاتی ہے ۔

خداوندعالم نے ایک دوسری آیت میں بھی اہل ایمان اور عمل صالح کرنے والوں سے وعدہ کیاہے کہ سرانجام وہ زمین پر مستقر ہوں گے اور اس وقت خود ان ہی کی حکومت قائم ہوگی۔ ارشاد ہوتا ہے :

(وَعَدَاللّٰهُالَّذِیْنَءَ اٰمَنُوْامِنْکُمْ وَعَمِلُوْاالصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمْ الَّذِیْ ارْتَضَیٰ لَهُمْ وَلَیُبَدِّ لَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِخَوْفِهِمْ اَمْناًیَعْبُدُونَنِی لَایُشْرِکُونَ بِیْ شَیْئاًوَمَنْ کَفَرَبَعْدَذٰلِکَ فَاُوْلٰئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ)[2]

"تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کئے ان سے خدانے یہ وعدہ کیاہے کہ ان کو اس سرزمین پر(اپنا)جانشین مقررکرے گا اور جس دین کو اس نے ان کے لئے پسند فرمایاہے اس پر انھیں ضرور ضرورپوری قدرت دیگا اوران کے خائف ہونے کے بعد امن سے ضروربدل دے گا (تاکہ)وہ میری عبادت کرینگےاور کسی کو ہمارا شریک نہ بنائیں اور جو شخص اس کے بعد بھی کافر رہے گا تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں"۔

1۔سورۂ قصص آیت5۔6۔2۔سورۂ نورآیت55۔

الٰہی امداد آنا

قرآن کریم کی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ خداوندعالم کی بہت سی سنّتیں عام ہیںجو کسی نہ کسی خاص سنّت کے ماتحت ہیں ۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خداوند عالم کی عام سنّتیںخاص حالات اور تقاضوںکے تحت بعض مخصوص سنّتوں کی تابع ہوتی ہیں چنانچہ خداوندعالم کی عام سنّتوں میں سے ایک الٰہی امدادبھی ہے جس کی بنیادپر خداوندعالم لوگوں پر اپنی حجت تمام کرنے کے بعد اس راستہ پر گامزن رہنے کے لئے جسے انھوںنے منتخب کیاہے ان کی مدد کرتاہے اگر آدمی حق کی راہ کا انتخاب کرتاہے تو خداوندعالم اس سیدھے راستہ پر گامزن رہنے کے لئے اس کی مدد کرتا ہے اور اگر کوئی باطل راستہ کی طرف مائل ہو توبھی خداوندعالم کی امداداس کے شامل حال رہتی ہے۔یہی کافرونکی امداد وہ سنّت ہے۔جس کو املاء اور استدراج کانام دیا گیا ہے جس کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ۔چنانچہ املاء اور استدراج کی سنّت الٰہی امدادکی سنّت کی نسبت وہ خاص سنّت ہے جو کفّار کے بارے میں امدادالٰہی کے طریقہ کو مشخص کرتی ہے۔

سورۂ اسراء کی چند آیات میں الٰہی امدادکی اس سنت کی طرف اشارہ ہے :

(مَنْ کَانَ یُرِیْدُالْعَاجِلَةَعَجَّلْنَالَهُ فِیْهَامَانَشَآئُ لِمَنْ نُّرِیْدُثُمَّ جَعَلْنَالَهُ جَهَنَّمَ یَصْلٰیهَا مَذْمُوما مَدْحُوْراًوَمَنْ اَرَادَالآخِرَةَ وَسَعَیٰ لَهَاسَعْیَهَاوَهُوَمُؤْمِن فَاُوْلٰئِکَ کَانَ سَعْیُهُمْ مَشْکُوْراً کُلاًّ نُمِدُّ هٰؤُلَائِ وَهٰؤُلاٰئِ مِنْ عَطَائِ رَبِّکَ وَمَاکَانَ عَطَائُ رَبِّکَ مَحْظُوْراً)[1]

"اور جو شخص اس چند روزہ(دنیا)کا خواہاں ہو ہم اس کو جلدی سے جو کچھ چاہتاہے دیدیتے ہیں پھر اسکے بعد اسکے لئے جہنم ہے جس میں وہ ذلّت و رسوائی کے ساتھ داخل ہوگا،اور جو شخص آخرت کا چاہنے والاہے اور اسکے لئے جیسی چاہیئے ویسی ہی کوشش بھی کرتا ہے اور صاحب ایمان بھی ہے تویہی وہ لوگ ہیں جن کی سعی یقینا مقبول قراردی جائے گی ہم آپ کے پروردگار کی عطا و بخشش سے اِن کی اور ان سب کی مدد کرتے ہیں اور آپ کے پروردگار کی عطا کسی پر بند نہیں ہے"

ان آیات میں پہلے لوگ دو گروہ میں تقسیم کئے گئے ہوئے ہیں :پہلا گروہ دنیا کا خواہاں ہے اورچند روزہ والی زندگی منتخب کرتا ہے اوردوسرا گروہ آخرت اورپائیدار سعادت کاخواہاں ہے۔اسکے بعدتیسری آیت میں اعلام ہوتاہے کہ خداوندعالم دونوں گروہوں کی ان کی منتخب کردہ راہ پر گامزن رہنے کے لئے مدد کرتا ہے۔ البتہ آخرمیں دوسرے

1۔ سورۂ مبارکہ اسراء آیت18۔20۔

گروہ کی برتری کا ذکر ہے ارشاد ہوتا ہے :

(اُنْظُرْكَيْفَ فَضَّلْنَابَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُدَرَجٰتٍ وَاَكْبَرُتَفْضِيْلاً)[1]

"دیکھو ہم نے ان کے بعض کو بعض دوسروںپر کس طرح فضیلت دی ہے اور آخرت کے درجے تو یقینا کہیں برتر اور بہت زیادہ ہیں"۔

ایک دوسری آیت میں بھی الٰہی امداد کو مدّنظر رکھا گیا ہے میں ارشاد ہوتا ہے:

(مَنْ كَانَ يُرِيْدُحَرْثَ الْاَخِرَ ةِنَزِدْلَهُ فِيْ حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُحَرْثَ الدُّنْيَانُؤْتِهِ مِنْهَاوَمَالَهُ فِى الْأَخِرَةِ مِنْ نَصِيْبٍ)[2]

"جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اسکے لئے اس کی کھیتی میں اضافہ کردیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو ہم اس کو اسی میں سے دیں گے اور (لیکن) آخرت میں اس کوئی حصّہ نہ ہوگا"۔

قابل توجّہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں آخرت کے خواہاں اور دنیا کے طلبگاروں کے لئے دو مختلف تعبریں استعمال ہوئی ہیں، طالب دنیا کے لئے صرف ان کا مطلوب دینے کا اعلان ہے لیکن آخرت کے چاہنے والے کے لئے "نزدلہ فی حرثہ" (ہم اسکی کھیتی میں اضافہ کردیں گے استعمال ہوا ہے ،جو ان کی خاص قدر و منزلت کو بیان کررہاہے اور اس بات کی نشاندہی کررہاہے کہ ان پر خداوندعالم کی خاص عنایت ہے۔یقینا یہ فرق حق بجانب ہے کیونکہ انسان کا اصل مقصد معنوی کمال حاصل کرنااور بارگاہ خداوندعالم میں مقرب ہوناہے ۔اوریہ کہ بعض ان افراد کو خداوندعالم کی مددملنا جوان کے لئے ضرررساں ثابت ہو ایک ذیلی مقصد ہے۔

شکران نعمت سے اضافہ اورکفران نعمت سے کمی

الٰہی سنت کے مطابق جو شخص خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے اسکی نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور جو کفران یا ناشکری کرتا ہے اسکی نعمتوں میں کمی ہوجاتی ہے اوریہ قانون مادی نعمتوں میں بھی جاری ہے اور معنوی نعمتوں میں بھی۔ جو شخص فقط مادی نعمتوں کا شکرادا کرتاہے اسکی مادی نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور جو معنوی نعمتوں کا بھی شکر گزار ہے اسکی معنوی نعمتوں میں بھی اضافہ ہوتاہے۔قرآن نے اس سنّت کو کلیہ کی صورت میں بیان کیاہے :

1۔سورہ اسراء آیت 21۔2۔سورۂ شوریٰ آیت20۔

(لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيدَ نَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِيْد)[1]

"اگر تم نے شکر ادا کیا تو ہم نعمتوں میں اضافہ کردیں گے اور اگر کفرانِ نعمت کیا تو ہمارا عذاب بھی بہت سخت ہے"۔

مادی نعمتوں کی ناشکری کے متعلق قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَضَرَبَ اللهمَثَلاًقَرْيَةً كَانَتْ آمِنةً مُطْمَئِنَّةًيَاتِيْهَارِزْقُهَارَغَداًمِنْ كُلّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللهفَاَذَاقَهَاالله لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَاكَانُوْايَصْنَعُوْ نَ)[2]

"اور اللہ نے اس قریہ کی بھی مثال بیان کی ہے جو محفوظ اور مطمئن تھا اور اس کا رزق ہر طرف سے فراواں تھا لیکن قریہ والوں نے اللہ کی نعمتوں کا کفران کیا تو خدا نے بھی انھیں بھوک اور خوف کے کا مزہ چکھادیا ،ان کے ان اعمال کی بناء پر جو وہ انجام دے رہے تھے''۔

اس آیۂ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی انسان مادی نعمتوں کا شکریہ ادا نہ کرنے کی وجہ سے فقر اور خوف جیسے مصائب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ شکر خدا سے نعمتوں میں اضافہ ہونے کے متعلق ایک اور آیت میںفرماتا ہے:

(وَلَوْاَنَّ اَهْلَ الْقُرَیٰ آمَنُواوَاتَّقَوْالَفَتَحْنَاعَلَيْهِمْ بَرَكَٰتٍ مِنَ السَّمَائِ وَالْاَرْضِ وَلَكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنَاهُمْ بِمَاكَانُوْايَكْسِبُوْنَ)[3]

"اگر اہل قریہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرلیتے تو ہم ان کے لئے زمین اور آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انھوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کو ان کے اعمال کی گرفت میں لے لیا"۔

چونکہ تقویٰ اور پرہیزگاری کا لازمہ ،خداوند کریم کی معنوی اور مادی نعمتوں کا شکر ادا کرنا ہے، مندرجہ بالا آیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ معنوی نعمتوں کا شکر ادا کرنا مادی نعمتوں کے اضافے اور دنیاوی زندگی کے وسائل کی وسعت میں بھی مؤثر ہے۔اسی طرح، مادی اور معنوی نعمتوں کا انکار عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونے کا باعث ہوتا ہے۔ بعض آیات میںبھی شکر ادا کرنے سے معنوی نعمتوں میں اضافے کی طرف اشارہ ہوا ہے:

(وَيَزِ يْدُالله الَّذِيْنَ اهْتَدَوْاهُدَیً)[4]

1۔ سورۂ ابراہیم آیت 7۔2۔ سورۂ نحل آیت 112۔3۔ سورۂ اعراف آیت 96۔4۔ سورۂ مریم آیت 76۔

"اور خدا ہدایت یافتہ لوگوں کی رہنمائی میں اضافہ کردیتا ہے"۔

اور سورئہ محمدمیں ارشاد ہوتا ہے:

(وَالَّذِیْنَ اهْتَدَ وْازَادَهُمْ هُدیً وَئَ اتٰهُمْ تَقْوٰیهُمْ)[1]

"اور جن لوگوں نے راہ ہدایت اختیار کی خدا نے ان کی رہنمائی میں اضافہ کردیا اور تقوے کی توفیق عنایت فرمادی"۔

بعض مقامات پر نعمتِ ہدایت میں اضافہ کے مخصوص مصادیق بیان کردیئے ہیں۔ مثال کے طورپر اصحاب ِکہف کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:

(اِ نَّهُمْ فِتْیَة آمَنُوْابِرَ بِّهِمْ وَزِدْ نَاهُمْ هُدیً)[2]

"یہ چند جوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کردیا"۔

مومنین کی ہدایت میں اضافہ ایک طرف سے الٰہی امداد کی سنت کا مصداق ہے اور دوسری طرف سے شکر ان نعمت کا بھی مصداق ہے کیونکہ ایمان لانا اور رہنمائی کو قبول کرنا خود بھی ایک معنوی نعمت کا شکر ادا کرنا ہے۔

البتہ مومنین کے برعکس جو لوگ ناشکری کرتے ہوئے ہدایت قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں ان کی گمراہی میں اور اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ سورئہ مبارکۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے :

(فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَرَض فَزَادَهُمُ اللہ مَرَضاً)[3]

"ان کے دلوں میں بیماری تھی پس خدا نے بیماری اور بڑھا دی"۔

اور یہ وہی الٰہی امداد ہے جو معنوی نعمتوں کی ناقدری میں زیادتی سے حاصل ہوتی ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے :

(فَلَمَّازَاغُوْااَزَاغَ اللہ قُلُوْبَهُمْ)[4]

1۔ سورئہ محمد آیت 17۔

2۔ سورئہ کہف آیت 13۔

3۔ سورئہ بقرہ آیت 10۔

4۔ سورئہ صف آیت 5۔

"جب وہ لوگ (حق سے) مڑ گئے تو خدا نے بھی ان کے دلوں کو اور ٹیڑھا کر دیا" ۔

(اَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوٰيهُ وَاَضَلَّهُ اللهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشٰاوَةً) [1]

"توکیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی ہوس کو خدا بنا لیا اور خدا نے جان بوجھ کر اسے اور گمراہ کردیا ۔ اور اسکے کان اور دل پر مہر لگادی اور اس کی آنکھ پر پردے ڈال دئے"۔

بہت ساری آیات میں اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جن لوگوں نے باطل راستہ اختیار کررکھا ہے اور فسق و فجور کو اپنا لیا ہے کفر سے کام لیتے، ظلم و ستم کرتے ، اوردوسرونکو گمراہ کرتے ہیں خدا ان کی گمراہی کے اسباب بڑھا کر ڈھیل دیدیتا ہے:

(وَيُضِلُّ اللهُ الظّٰالِمِيْنَ وَيَفْعَلُ اللهُ مَايَشَاءُ) [2]

"اور اللہ ظالمین کو گمراہی میںچھوڑ دیتا ہے اور اللہ جو بھی چاہتا ہے انجام دیتا ہے"۔

(كَذَالِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَمُسْرِفٌ مُرْتَابٌ) [3]

"اس طرح خدا زیادتی کرنے والے شکی مزاج انسانوں کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے"۔

(كَذَالِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكَٰفِرِيْنَ) [4]

"اسی طریقہ سے خدا کافروں کو گمراہ کرتا ہے"۔

اللہ کی سنت اضلال کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ حتی قرآن جیسی سب سے بڑی کتاب ہدایت بھی نعمت ہدایت کا کفران کرنے والوں کے لئے ضلالت اور گمراہی کا سبب بن جاتی ہے:

(يُضِلُّ بِهِ كَثِيْرًاوَيَهْدِىْ بِهِ كَثِيْرًاوَمَايُضِلُّ بِهِ اِلَّاالْفَاسِقِيْنَ) [5]

1۔ سورۂ جاثیہ آیت23۔

2۔ سورۂ ابراہیم آیت27۔

3۔ سورۂ مومن آیت34۔

4۔ سورۂ مومن آیت 74۔

5۔ سورۂ بقرہ آیت 26۔

"خدا اس (قرآن) کے ذریعے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں چھوڑ دیتا اور بہت سے لوگوں کی ہدایت کردیتا ہے اور اس سے گمراہ صرف وہی ہوتے ہیں جو فاسق ہیں"۔

البتہ جیسا کہ آیت سے صاف پتہ چلتا ہے ہے کہ یہ خود فاسقوں کا گروہ ہے جس نے اپنے اختیار کے غلط استعمال سے اپنی یہ حالت اور کیفیت بنا لی ہے کہ وہی قرآن جو بہت سے لوگوں کے لئے وسیلۂ ہدایت ہے ان کے لئے اور زیادہ گمراہی کا باعث بن گیا

۔

بہر حال، الٰہی اضلال کے تمام موارد ("وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْد ") اور ("كَلّاًنُمِدُّ هَؤُلَائِ وَهَؤُلَائِ مِنْ عَطَائِ رَبِّک) "کے مصادیق میں شمار ہوتے ہیں، چونکہ یہ گروہ معنوی نعمتِ ہدایت کا کفران کرتا ہے لہٰذا عذاب الٰہی کا مستحق ہے اور ان کا گمراہ ہو جانا ہی ان کے لئے سخت عذاب ہے جو، ان کے قلب کو اندھا اور روح کی بیماری میں اضافہ کردیتا ہے ۔

دوسری طرف ان کی گمراہی اور قلب کی تاریکی کے ساتھ ہی ساتھ مادی نعمتوں میں اضافہ کرتا جاتا ہے کہ وہ اپنا بارگناہ اور وزنی کرتے جائیں اور اخروی عذاب کے اسباب زیادہ سے زیادہ مہیا کرلیں۔

انبیاء علیہم السلام سے اختلاف کی سنت

الٰہی سنتوں میں سے ایک اور سنت جو بحث نبوت کے ساتھ بھی قریبی تعلق رکھتی ہے یہ ہے کہ الٰہی فیصلہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ انسانوں اورجنوں کا ایک گروہ انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں صف آرایی کرے اور مخالفت کا پرچم بلند کرکے لوگوں کو فریب اور دھوکادیتا رہے ۔ اس سلسلے میں بہت ہی واضح بیان ، سورئہ انعام کی آن آیتوں میں ملتا ہے :

(وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَالِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّاشَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِی بَعْضُھُمْ اِلَیٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْراًوَلَوْشَاءَ رَ بُّکَ مَافَعَلُوْہُ فَذَرْھُمْ وَمَایَفْتَرُوْنَوَلِتَصْغَیٰ اِلَیْہِ أَفْئِدَ ةُالَّذِ یْنَ لَاٰیُوْمِنُوْنَ بِالآخِرَةِوَلِیَرْضَوْہُ وَلِیَقْتَرِفُوْامَاھُمْ مُقْتَرِفُوْنَ) [1]

"اور اسی طرح ہم نے ہرنبی کے لئے جنات و انسان میں کچھ شیاطین کو ان کا دشمن قرار دے دیا کہ ان میںبعض ،بعض کو دھوکہ دینے کے لئے چکنی چپڑی باتیںبناتے ہیں اوراگر تمہارا خدا چاہ لیتا تو یہ ایسا نہ کرسکتے لہٰذا اب

1۔ سورئہ انعام آیت112۔113۔

آپ انھیں ان کے جھوٹ اورافتراء کے ساتھ چھوڑدیں اور یہ اسی طرح (مقرر کیا جاچکا ہے)تاکہ جن لوگوں کا ایمان آخرت پر نہیں ہے ان کے دل ان کی (غلط باتوں کی) طرف مائل ہو جائیںؔاور وہ اسے پسند کر لیں تاکہ جو کچھ ان کے ہاتھ کرنا چاہتے، ان کے ہاتھ آجائے"

بظاہرآیۂ مبارکہ سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ ایک الٰہی سنّت کے عنوان سے تمام نبیوںؔاور ان کی امتوں میں جاری اور ساری رہا ہے کہ جب بھی کوئی پیغمبر مبعوث ہوتا ان کے مقابلہ میںجنوں اور انسانو ںکے شیطانی گروہ صف آرائی کرتے تھے اور مخالفت پر اڑجاتے تھے البتہ وہ یہ مخالفت اپنے ارادۂ واختیار سے کرتے تھے الٰہی مشیت و ارادہ ان کے کاموں میں مانع نہیں ہوتا تھاتاکہ اس طرح سے حق و باطل کے دونوں راستے آشکار ہوجائیں اور لوگ دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں۔اگر کوئی ایسا گروہ نہ ہو جو باطل کی تبلیغ کرے اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دے تو انسانوں کی آزمائش کے لئے ماحول فراہم نہیں ہو گاجبکہ خدا کی سنتوں میں سے ایک سنت آزمائش بھی ہے اور بنیادی طورپراس دنیا میں انسان کی خلقت کا مقصدہی اس کا امتحان ہے (لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً) اس میں کوئی شک و شبہ نہیں امتحان کا لازمہ یہ ہے کہ حق و باطل کے دونوں راستے کو انسان کے سامنے کھلے ہوںؔاور ہر ایک کے مخصوص مبلغ بھی ہوں۔ حق کا راستہ دکھانے والے پیغمبر اور (قرآن کی رو سے) باطل کی طرف دعوت دینے والے شیطان صفت انسان اور جنات ۔ معلوم ہوا اس نظامِ احسن میں اس گروہ کا ہونا بھی ضروری ہے ورنہ الٰہی امتحان کے لئے کامل ماحول فراہم نہ ہو سکے گا۔

شیطان صفت انسانوں کی جانب سے ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کے علاوہ اس آیت میں شیاطین کی مخالفت کے طریقوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے (يُوحِىْ بَعْضُهُمْ اِلىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْراً) "یہ شیاطین آپس میںکچھ چکنی چپڑی دل فریب باتیںؔاور اشارے کرتے ہیں"چنانچہ اگر وحی میں لفظ (یوحی) سے چپکے چپکے خفیہ قسم کی گفتگو مرادہو تو اس کا مصداقِ تام جنوں کے وہ شیطانی وسوسے ہوں گے جو غیر محسوس طورپر معصیت کار لوگوں کے دل و جان میںمشغلہ ور ہوجاتے ہیں۔البتہ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ عام معنی مدنظر ہوں اور اس آیت میں (وحی) ہرطرح کی مخفی بات کو شامل ہو۔ اس صورت میں آیت، انسان نما شیطانوں کی کانا پھوسی کو بھی شامل ہو جائے گی یعنی وہ تمام خفیہ باتیں جو لوگوں کو فریب دینے کے لئے آہستہ آہستہ کی جاتی ہیں۔ بہرحال وحی کا واضح مصداق وہی شیطانی وسوسے ہیں اس لئے "وحی" اصل میں چپکے چپکے اسرارو رموز میں بات کرنے کو کہتے ہیںؔاورچونکہ شیطان کا وسوسہ کھلم کھلا نہیں ہوتا اور انسان اس کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوپاتا لہٰذا اس کووحی کہا گیا ہے۔ اس بناءپر وحی کے معنی میں بہت زیادہ وسعت ہے حتی اس میں شیطانی وسوسے بھی شامل ہیں۔

وحی کی حقیقت

یہاں پر وحی کے مفہوم سے متعلق مختصر طور پر ایک اہم بات کی وضاحت کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے؛ ایک گروہ نے انبیاء علیہم السلام پر ہونے والی وحی کو ایک قسم کا انجانا ادراک قرار دیا ہے جس کو صرف نبی محسوس کرتا ہے، اور اسی طرح انھوں نے وحی کی علمی تفسیر کرنے کی کوشش کی ہے ان کی نظر میں انبیاء علیہم السلام پرکی جانے والی وحی کی بالکل اُس وحی کے جیسی ہے جو قرآن کے الفاظ میں شہد کی مکھی پر ہوئی ہے دونوں کی حقیقت ایک ہے لیکن یہ نظریہ غلط ہے اس تاویل کو نہیں قبول کیا جا سکتا؛ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ لغت میں وحی چپکے چپکے گفتگو کرنے کو کہتے ہیں چاہے وہ کسی کے ساتھ ہو، لہٰذا اس آیت میں شیاطین کی مخفی گفتگو اور وسوسے کو وحی کہا گیا ہے۔ اس بناء پر وحی کے مختلف مصادیق ہیں جو حقیقت کے اعتبار سے مکمل طور پر ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ لفظی مشابہت اس بنا پر ہم مختلف مقامات پر استعمال ہونے والے لفظ وحی کی حقیقت و ماہیت کو یکساں خیال نہ کریں اس بات پر توجہ رہے کہ قرآنِ کریم کی تفسیرمیں الفاظ کے لغوی مادوں کو دیکھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ ان کے استعمال کے مقامات پر غور و فکر کے ساتھ ہر ایک کی خصوصیت کو تلاش کرنا چاہئے۔

بہر حال شیاطین چاہے وہ انسان ہوں یا جنات، ایک دوسرے کو اندر سے ورغلاتے ہیں اور لوگوں کو دھوکا دینے کی نیت سے ایک دوسرے کے ساتھ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں اور ان کی گفتگو بھی چکنی چپڑی دلکش اور مؤثر ہوتی ہے۔ خداوند عالم اس آیت میں اپنے پیغمبر کو آگاہ کرنے کے لئے ایک بالا حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے اور اعلان کیا ہے کہ یہ سب کچھ ایک الٰہی سنت کے مطابق ہے اور ان شیاطین کی صف آرائی سے نہیں ڈرنا چاہئے اگرچہ خداوند عالم ان کو روکنے پر قادر ہے مگر اس کی مشیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آزاد رہیں۔ آیت میں آگے بڑھکر جس کی حکمت کی طرف اشارہ موجود ہے (وَلِتَصْغٰىٓ اِلَيْهِ اَفْئِدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ"اور یہ اس لئے ہے کہ جن لوگوں کا ایمان آخرت پر نہیں ہے ان کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں ۔۔۔"یہ کافروں کی وہی آزمائش ہے؛وہ لوگ جو اپنے اختیار سے غلط فائدہ اٹھا کر آخرت پر ایمان نہ لائیں اور دنیا کی محبت ان کے ایمان ینڑ کاوٹ بینمانع بن جائے مزید گمراہی کے مستحق ہیں اور یہ شیاطین ان کی گمراہی کا وسیلہ فراہم کرتے ہیں ان کی یہ پر فریب باتینکا فرقبول کر لیتے اور دل وجان سے مان لیتے ہیں "اَصْغٰى اِلَيْهِ "یعنی اس کو غور سے سننا، لیکن آیت میں "لِتَصْغٰىٓ اِلَيْهِ اَفْئِدَة۔۔۔"کی حسین تعبیر استعمال ہوئی ہے یعنی کافر کانوں سے نہیں اپنے دل کے کانوں سے شیطانی وسوسوں کا استقبال کرتے ہیں، ان پر خوش ہوتے ہیں اور آخر میں اپنے برے انجام تک پہنچنے کی خاطر انھیں شیطانی کاموں کو انجام دیتے ہیں۔

درج ذیل آیت کا مضمون بھی مذکو رہ آیت کے مشابہت رکھتا ہے :

(وَکَذَالِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوّاًمِنَ الْمُجْرِمِیْنَ وَکَفیٰ بِرَبِّکَ هَادِیاً وَ نَصِیْراً) [1]

اور اسی طرح ہم نے ہرنبی کے لئے گنہگا روں میں سے کچھ دشمن قرار دیدئے ہیں اورہدایت وامداد کے لئے تمہارا پر وردگار کافی ہے"۔

اس آیت سے بھی استفادہ ہوتا ہے کہ ہر ایک پیغمبر کے مقابلہ میں مجرموں کا ایک گروہ رہا ہے جونبی کی مخالفت اوردشمنی کرتا چلا آیاہے ۔ہرچند الٰہی ہدایت اور نصرت بندوںکے لئے کافی ہے مگر الٰہی امتحان کی سنت پر عمل در آمد ہو نے کے لئے ضروری ہے کہ ایک گروہ راہ حق کی مخالفت کرنے اورباطل راستے کی طرف راہنمائی کرنے والا موجود ہو ۔

اسی حقیقت کو سورۂ حج کی آیات میں ایک دوسرے طریقہ سے بیان کیا گیا ہے :

(وَمَاَارْسَلْنَامِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَسُوْلٍ وَلَانَبِیٍ اِلَّااِذَاتَمَنّیٰ اَلْقیَ الشَّیْطَانُ فِی اُمْنِیَّتِهِ فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِیْ الشَّیْطَانُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰهُ ئَ اٰیَاتِهِ وَاللّٰهُ عَلِیم حَکِیْم) [2]

"اورہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول اورنبی نہیں بھیجامگر جب بھی اس نے تلاوت کا ارادہ کیاتو شیطان نے اپنے رسولوں کے ذریعہ اس میں رکاوٹ ڈالی تو پھرخدا نے شیطان کی رکاوٹ کو مٹادیا پھر اپنی آیات کو مستحکم بنا دیا کہ وہ بہت جاننے والا اورصاحب حکمت ہے"۔

اس آیت سے واضح ہے کہ جب بھی کوئی پیغمبر دل میں سوچتا تھا کہ کس طرح الٰہی دعوت کو پھیلایا جائے اور اہل دنیا کی ہدایت کی جائے تو شیطان سازش کرتا کہ انبیاء علیہم السلام کی یہ فکر عملی جامہ نہ پہن سکے لیکن خدا اس کے تمام

1۔ سورۂ فرقان آیت31۔

2۔ سورۂ حج آیت 52۔

ارادوں کو ناکام بنا دیتا تھا۔ رہا یہ مسئلہ کہ شیطان کی سازشوں اور وسوسوں سے کیا آثار مرتب ہوتے تھے بعد کی آیت میں اس کی اس طرح وضاحت ہوتی ہے:

(لِيَجْعَلَ مَايُلْقِى الشَيْطَانُ فِتْنَةً لِلَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَرَض وَالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ وَاِنَّ الظَّا لِمِيْنَ لَفِىْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ)[1]

"تاکہ شیطان جو(وسوسہ) ڈالتا ہے تو خدا اسے ان لوگوں کی آزمائش (کا ذریعہ) قرار دے کہ جن کے دلوں میں (کفر کا) مرض ہے اور جن کے دل سخت ہیں اور بیشک (یہ) ظالم (مشرکین) دور دراز کی مخالفت میں (پڑے) ہوئے ہیں"۔

اس بناء پر جن لوگوں کی روح بیمار ہے اور جن کا دل سخت ہو چکا ہے انبیاء کی دعوت کے مقابل کے ذریعے شیطانی وسوسوں کی وجہ سے ان کا امتحان ضروری ہے گمراہی کا راستہ طے کرنے میں ان کی امداد کی جاتی ہے۔ دوسری طرف مومنوں کا بھی الٰہی امتحان ضروری ہے کہ شیطانی وسوسوں سے متأثر نہ ہوں اور یہ جان لیں کہ حق وہی ہے جو پیغمبر پر نازل ہوا ہے اگرچہ شیطان ان کو گمراہ کرنے کے درپے رہے لیکن خدا اپنے اولیاء کو سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے:

(وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوْاالْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّکَ فَيُؤْمِنُوْابِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوْبُهُم وَاِنَّ اللّٰه لَهَادِالَّذِ يْنَ آمَنُوْااِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ)[2]

"اور اس لئے بھی کہ صاحبانِ علم کو معلوم ہو جائے کہ یہ (قرآن) حق ہے(اور) آپ کے پروردگار کی طرف سے ہے اور اس پر وہ ایمان لے آئیں اور پھر ان کے دل اس کی بارگاہ میں جھک جائیں اور یقیناً اللہ ایمان لانے والوں کی سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرنے والا ہے"۔

یہاں تک تو ہم نے قرآن کی رو سے خداوند عالم کی اہم سنتوں کا جائزہ لیا ہے اب علوم سماجیات اور نفسیات کی شناخت کے بعض ایسے اصولوںکے بارے میں مختصر سی بحث مناسب معلوم ہوتی ہے جو مذکورہ آیات سے حاصل ہوتے ہیں۔

ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ کی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ لوگوں کے رویّے اور ان کی امتوں کے ساتھ خدا کے

1۔ سورۂ حج آیت 53۔

2۔ سورۂ حج آیت 54۔

رویّے سے متعلق جو آیات ہیں ان سے علوم سماجیات و نفسیات کے بارے میں اسلامی نقطۂ نگاہ سمجھنے کے لئے مسائل اخذ کیے جا سکتے ہیں اور ظاہر ہے ان تمام مسائل کو اس طرح کی مختصر بحثوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا لہٰذا ہم ان مسائل کی طرف صرف اشارہ پر اکتفاء کرتے ہیں کہ شاید اس سلسلے میں وسیع تحقیقات کے لئے زمین فراہم ہو جائے ۔

سماجیات میں اسلامی طرز تفکر سے متعلق چند نکات

1۔پہلا نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے موجودات عالم کی تشریح اور سماجی تغیرات کی توضیح میں بھی اپنی وہی مخصوص روش اپنائی ہے یعنی اپنے مطالب کو توحید کا رنگ دیا ہے اور ہر مقام پر موجودات عالم کے ساتھ خداوند عالم کے رشتے کو، جو تن تنہا حقیقی مؤثر ہے پیش نظر رکھا ہے، چنانچہ جن آیات میں کسی بھی عنوان سے سماجی واقعات کا ذکر ہے اور ان کا جائزہ لیا گیا ہے اُن پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ ان امور کو خداوند عالم کی طرف منسوب کرنے پر اسلام نے زور دیا ہے ۔

خداوند عالم کی معرفت سے متعلق قرآنی بحثوں میں ہم یہ بیان کر چکے ہیںکہ یہ قرآن کریم کا خاص اور عدیم المثال طریقہ ہے جو تربیت کے قیمتی آثار سے خالی نہیں ہے قرآن جس طرح قوانین ہستی اور موجودات عالم کی تشریح کے وقت ہر چیز کو الٰہی قضا و قدر کی طرف منسوب کرتا ہے اسی طرح معاشرتی واقعات کے جائزوںمیں بھی اسی طریقہ کار کو اختیار کرتا ہے مثال کے طورپراس نے گزشتہ قوموں کے ختم ہو جانے اور جدید قوموں کے ظاہر ہونے کی خداوند عالم کی طرف نسبت دی ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے :

(فَاَ هْلَکْنَا هُمْ بِذُ نُوْبِهِمْ وَاَنْشَأْ نَا مِنْ بَعْدِ هِمْ قَرْناًآخَرِیْنَ)[1]

"پس ہم نے ان کے گنا ہوں کی وجہ سے انھیں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ایک دوسری نسل پیدا کر دی "۔

اوراس سے بھی بڑھکر معاشرہ کے ایک خاص طبقے سے مربوط اعمال جو مکمل طور پر وہ خودانجام دیتے ہیں اوروہی اس کے آغاز و انجام کے ذمہ دار بھی ہیں، ان کو بھی قرآن کریم الٰہی مشیت اور ارادہ سے بے تعلق نہیں سمجھتا ۔ جس عمل کو ایک جگہ کسی خا ص شخص ،گروہ یا قوم سے منسوب کیا گیا ہے دوسری جگہ اسی کو ذرا بلندمرتبہ پر خداوندقدوس سے منسوب کیا گیا ہے ، یہ وہی مسئلہ "امر بین الامرین''ہے یعنی تمام افعال اورموجودات عین اسی وقت کہ جب وہ اپنے قریبی فاعلوں سے نسبت رکھتے ہیں اوروہی ان کے ذمہ دار بھی سمجھے جاتے ہیںاس سے بالاتر سطح پر خدا کے

1۔سورۂ انعام آیت6۔

افعال بھی شمار ہوتے ہیں۔

بہر حال یہ نکتہ قابل غور ہے کہ قرآن کریم نے اجتماعی موجودات کی تحلیل میں ایک بنیادی اصل کے عنوان سے تاریخ اور سماجیات کے میدان میں توحید افعالی اور ارادہ و مشیت الٰہی کے مسئلے کو بیان کیا ہے اور ان امور کو الٰہی سرچشمہ سے الگ اور جدا نہیں سمجھتا۔

2۔ دوسرا نکتہ یہ کہ قرآن کریم نے کبھی بھی معاشرتی تبدیلیوں کا جائزہ لیتے وقت کسی کام کے انجام دینے والے سے اس کی ذمہ داری کو سلب نہیں کیا ہے یعنی اگرچہ قرآن نے کسی بھی سماجی اور نفسیاتی محرک اور سبب سے غفلت نہیں برتی لیکن ان اسباب کو لوگوں کی ذمہ داری ختم ہو جانے کی بنیاد بھی قرار نہیں دیا بلکہ اپنے تمام کاموں کے وہی ذمہ دار ہیں اِس پر تاکید کی ہے۔

سورۂ مبارکہ ٔاسراء میںؔاس بات کو بڑے دلچسپ انداز میںؔبیان کیا گیا ہے:

(مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَايَضِلُّ عَلَيْهَاوَلَا تَزِرُ وَازِرَة وِزْرَاُخْرٰى وَمَاكُنَّامُعَذِّ بِيْنَ حَتّٰى نَبْعَث رَسُوْلاً وَاِذَااَرَدْنَااَنْ نُهْلِک قَرْيَةً اَمَرْ نَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْافِيْهَافَحَقَّ عَلَيْهَاالْقَوْلُ فَدَ مَّرْنٰهَا تَدْمِيْراً)[1]

"جو شخص بھی ہدایت حاصل کرے یہ اس کے اپنے فائدے کے لئے ہے اور جو گمراہی اختیار کرے وہ بھی اپنا ہی نقصان کرتا ہے اور کوئی کسی کا بوجھ اٹھانے والا نہیں ہے اور ہم تو اس وقت تک عذاب نہیں کرتے کہ جب تک (اُن میں) کوئی رسول نہ بھیج دیںؔاور ہم نے جب بھی کسی قریہ کو ہلاک کرنا چاہا تو اس کو خوش حالی کی راہ پر لگا دیا پس انھوں نے وہاں برائیاں پھیلائیںؔاور فسق و فجور سے کام لیا نتیجہ میں اس شہر پر عذاب لازم ہو گیا تو ہم نے اسے مکمل طور پر (زیر و زبر کر کے) تباہ کر دیا"۔

پہلی آیت کے ابتدائی حصہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور کوئی بھی کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا لیکن چونکہ عمل کے سلسلہ میں ذمہ داری علم و آگہی کی بنیاد پر عائد ہوتی ہے لہٰذا آیت میں آگے بڑھکر خداوند عالم فرماتا ہے کہ ہم انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور ان پر حجت تمام کر دینے سے پہلے کسی پر عذاب نازل نہیں کرتے۔ جی ہاں! کسی قوم پر خداوند عالم یوں ہی عذاب نازل نہیں کرتا بلکہ وہ اس وقت عذاب کا فیصلہ کرتا ہے جب حجت تمام ہو جائے اور راہِ ہدایت پوری طرح روشن ہو جائے اور اس کے باوجود

1۔ سورۂ اسراء آیات15۔16۔

لوگ دشمنی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے راہِ حق کو قبول کرنے سے گریز کریں ۔اِس حالت میں لوگ اپنے کفر کے خود ذمہ دار ہیں اور عذاب کے مستحق ہیں پس ہر انسان یا جماعت اپنی رفتار و گفتار کی خود ذمہ دار ہے ۔

دوسری آیت میںٰیہ بیان ہوا ہے کہ کسی کافر اور دشمن حق قوم کی ہلاکت کا الٰہی فیصلہ کس طرح جامۂ عمل پہنتا ہے ۔ اس آیت کی تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے ۔ کیونکہ عبارت "اَمَرْنَا مُتْرَفِیْھَا" کے بارے میں مفسّرین

کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے فعل (اَمَرْنَا) کی میم تشدید کے ساتھ قرائت کی ہے اور اس کے معنی "جَعَلْنَا مُتْرَفِیْھَا امرائَ"یعنی (ثروتمندوں کو رہبر و حاکم قرار دیا) بیان کئے ہیں ۔ایک گروہ نے مذکورہ امر کو شرعی امر سمجھا ہے اور اس کے متعلّق کو محذوف قرار دیا ہے (یعنی ہم نے ثروتمندوں کو اپنی اطاعت کا حکم دیا) لیکن ظاہری طور پر یہ تفسیر آیت کے ظاہری معنی کے ساتھ سازگار نہیں ہیں اور "امر"مذکورسے مراد امر تکوینی ہے ۔ اس بناء پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جب بھی کوئی قوم اپنے غلط انتخاب کی وجہ سے مستحقِ عذاب ہوتی ہے تو ان کا معاشرہ نظام قدرت کے تحت ایسی سمت میں بڑھتا ہے کہ ان کے دولت مند افراد فسق اور فجور میں غرق ہوجاتے ہیں۔اورچونکہ ثروتمندوں کے اعمال اعلیٰ سطح پر خدا سے تعلق رکھتے ہیں ۔ یعنی خدا نے ہی دنیا کا نظام ایسے رخ پر لگایا ہے کہ جس سے ایسے ثروتمند پیدا ہوئے کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے فسق و فجور کرنے لگے ۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ خدا کے امر تکوینی سے یہ کام انجام پایا ہے ۔ پس خدا نے فیصلہ کیا ہے کہ نظام احسن میں لوگوں کا امتحان لیا جائے اور ایک گروہ اپنے اختیار کا غلط فائدہ اٹھا کر غلط راستہ اپنایا اور عذاب نازل ہونے کی زمین فراہم کرلی ۔

المختصر یہ کہ مندرجہ بالا آیت میں خدا کے تکوینی فیصلہ کی طرف اشارہ لگتا ہے تشریعی حکم کی طرف نہیں جیسا کہ ہم خداوند عالم کے اوصاف سے متعلق گفتگو میں بیان کرچکے ہیں کہ خداوند قدوس کے ارادہ کی دو قسمیں ہیں :

1۔تکوینی

2۔تشریعی

اور وہ سب کچھ بھی جو دنیا میں ہوتا ہے اطاعت و نافرمانی ، کفر و ایمان سب خدا کے ارادۂ تکوینی کے تحت الٰہی قضا و قدر کے دائرے میں داخل ہے۔ البتہ اپنے مقام پر یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ اس عقیدہ سے کسی بھی طرح سے جبر لازم نہیں آتا ۔کیونکہ انسان کے تمام اختیاری کام اس کے اپنے اختیار سے انجام پائے ہوتے ہیں اور فاعلِ مختار کا انتخاب عمل اس کے ظہور کی علّتِ تامہ کا ایک جزء ہے ۔

بہر حال امرآیت میں الٰہی امر چاہے تکوینی ہو یا تشریعی دولتمندونکے فسق و فجور کے بعد خدا کا قول ان کے سلسلہ میں متحقق ہو جا تا ہے اور یہ وہ قول یہ ہے کہ گنا ہگاروں کو عذابِ الٰہی میں گرفتار کرکے اُن کا کاروبار سمیٹ دیا جائے گا اس آیت میں ایک قابل توجہ نکتہ یہ بھی ہے کہ دولت پرستونکے فسق و فجور اور ان کی ہلاکت دونونکو خدا وند عالم کے ارادہ و عمل سے منسوب کیا گیا ہے اور یہ وہی بات ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں ۔ یعنی اجتماعی امورکی وضاحت میں توحیدِ افعالی کا ظہور؛قرآن کی نظر میںّیہ تمام امور انسانی اختیار کو سلب کئے بغیر الٰہی ارادہ کے دائرہ میں انجام پائے ہیں ۔

یہی مفہوم سورۂ انعام میں اس طرح بیان ہو ا ہے :

(وَکَذٰ لِکَ جَعَلْنَافِیْ کُلِّ قَرْیَۃٍ اَکَابِرَمُجْرِمِیْھَالِیَمْکُرُوْافِیْھَاوَمَایَمْکُرُوْن اِلَّا بِاَنْفُسِہِمْ وَمَایَشْعُرُوْنَ) [1]

"اسی طرح ہم ہر قریہ میں بڑے بڑے مجرمین کو مقرر کرتے ہیں کہ وہ مکر و فریب سے کام لیںلیکن (در اصل) مکاری کا اثر خود ان کے علا وہ کسی اورپر نہیں ہوتا ہے اور انھیں اس کا بھی شعور نہیں ہے"۔

اس آیت میں بھی (جَعَلْنَا) سے مراد تکوینی طورپر قرار دینا ہے اور اس لحاظ سے یہ بھی آیت (کَذٰ لِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِيٍّ عَدُوّاً) کی مانندہے ۔ پس اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کا مکر و فریب کوئی اچھا اور پسندیدہ کام ہے یا یہ کہ وہ لوگ اپنے کاموں کے ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ آیت میںّاس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یہ امور خدا کی مشیت اور ارادہ کے دائرے سے باہر نہیں ہیں اور خدا کا ارادہ ان کاموںسے مغلوب بھی نہیں ہوا ہے ۔ وہ خود یہ چاہتا ہے کہ یہ انسان آزاد اور مختار رہیں اور انھوں نے یہ اپنے ارادہ و اختیار سے غلط فائدہ اٹھا کر اس طرح کے برے کام انجام دیئے ہیں لہذا وہ خودہی ان کے ذمہ دار بھی ہیں ۔

مختصریہ کہ ہر شخص اورہر معاشرے کا اپنے کام کے سلسلہ میںخود،ذمہ دار ہونا قرآن مجید کے سماجی اور معاشرتی اصولوں میں سے ایک بنیادی اصول ہے ۔

3۔تیسرا نکتہ جو بعض ماہرین سماجیات کے نظریہ کے برخلاف ان آیات سے پتہ چلتا ہے یہ ہے کہ قرآن کریم کی نظر میں معاشرے کے طبقات بندھے ہوئے یا ان کی راہیں بند نہیںہیں جیسا کہ بعض معاشروںمیں اس طرح کے افکار پائے جاتے ہیں کہ قدرت نے معاشرہ کو مخصوص طبقوں میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ ایک طبقہ کے

1۔ سورۂ انعام آیت 123۔

افراد دوسرے طبقہ میں نہیںنّجا سکتے اور اس طرح کی طبقہ بندی جو عام طور سے ذات پات، نسل و قوم یا اقتصادی حیثیت وغیرہ پر استوار ہوتی ہے قرآن کی رو سے غلط ہے البتہ انسانوں کے درمیان تکوینی اور پیدائشی اختلافات جو دنیا کے نظامِ احسن کا ایک جزء ہے موجود ہیں اور قرآن کریم نے اس کی تائید بھی کی ہے لیکن اس کو سماجی اور معاشرتی طبقہ بندی کا معیار قرار نہیں دیا ہے۔

بعض معاشروں میں نسلوں یا رنگوں کی بنیاد پر طبقہ بندی ہوتی ہے ۔ نسل پرست یا نسلی امتیاز کے قائل معاشروں میں عام طور پر سفید فاموں کو رنگین فاموں کے مقابلے میں سماجی حیثیت سے ممتاز مقام حاصل ہے ۔ قرآن ان نسلی اختلافات کو قبول تو کرتا ہے لیکن اس کو مقام و حیثیت کے تعین کا معیار قرار نہیں دیتا :

(یَاأَیُّھَاالنَّاسُ اِنَّاخَلَقْنَاکُمْ مِنْ ذَکَرٍوَاُنْثٰی وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوباًوَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوااِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقَیٰکُمْ اِنَّ اللّٰہ عَلیمخَبیر) [1]

" اے انسانو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تم کو قوموں اور قبیلوںمیں تقسیم کر دیا تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے اور اللہ ہر شئ کا جاننے والا اور ہر بات سے باخبر ہے "۔

فطری عوامل کی بناء پر لوگوں کے درمیان نسلی اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور طرح طرح کے قبیلے بن جاتے ہیں ۔ ان اختلافات کی بنیاد حکمت الٰہی پر استوار ہے اور نظام عالم میں اس چیز کا ہونا ضروری ہے لیکن جیسا کہ آیت میں آیا ہے یہ اختلافات کبھی بھی لوگوں کے ایک دوسرے پر برتر ہونے کا سبب نہیں ہوسکتے بلکہ حقیقی برتری اور فضیلت کا سبب تقوی اور پرہیزگاری ہے۔

دوسرے گروہ نے معاشرے کو لوگوں کی اقتصادی حیثیت کے معیار پر تقسیم کیا ہے ۔ یہ مسئلہ خصوصاً مارکسزم میں خاص مقام رکھتا ہے ۔ اس نظریہ کے مطابق ہر معاشرے میں اس کے مخصوص معاشرتی نظام کے تحت ہمیشہ دو اصلی طبقے پائے جاتے رہے ہیں ایک حکمراں طبقہ جو سرمایہ اور اقتصادی وسائل سے بہرہ مند ہوتا ہے اور ایک رعایا اور عوام کا طبقہ ہے جو اقتصادی اور مالی وسائل سے محروم ہوتا ہے ۔ کیا اسلام اس طرح کی طبقاتی تقسیم کو قبول کرتا ہے؟ قرآن کریم کی آیات اور اسلامی تعلیمات معمولی آشنائی اس سوال کا نفی میں جواب دینے کے لئے کافی ہے ۔

1۔ سورۂ حجرات آیت 13۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایک گروہ نے نادانی کی بناء پر یہ خیال کر لیا ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیات میں اس طرح کی طبقاتی تقسیم کو قبول کیا گیا ہے اور بعض منحرف اور گمراہ کن فکر رکھنے والوں نے یہ کوشش کی ہے کہ اپنے غلط تصور کے تحت اس طرح کے افکار پر اسلام کی تائیدی مہر لگادیں اور بعض آیات کی معاشرے اور تاریخ کے بارے میں مارکسسٹ طرز فکر کے مطابق تطبیق کریں۔ان کے اس طرح کے دعووں میں سے ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ مستضعف اور مستکبر کی تعبیر جو قرآن میں استعمال ہوئی ہے، یہ معاشرے کے دو ثروتمند اور فقیر طبقوں کی حکایت کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ اسلام اقتصاد کو ایک تاریخی اور سماجی تغیرات کا سبب سمجھتا ہے۔

ہم نے جو آیات استضعاف اور استکبار کی بحث میں نقل کی ہیں ان پر غور و فکر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس طرح کا نتیجہ نکالنا کسی بھی اعتبار سے قرآنی آیات کے ساتھ میل نہیں کھاتا جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا، قرآن کریم نے مستضعفین کے کئی گروہ نقل کیئے ہیں۔ مستضعفین کا ایک گروہ وہ ہے جن کی مدد کرنا چاہیے اور قرآن کریم نے مومنین کو ان کی حمایت کی دعوت دی ہے:

(وَمَالَكُمْ لَاتُقَاتِلُونَ فِيْ سَبِيلِ الله وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاء وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُولُونَ رَبَّنَااَخْرِجْنَامِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا)[1]

"مستضعفین کا یہ گروہ ان سب ناتوان ،مردوں، عورتوںا ور بچوں پر مشتمل ہے جو کافر معاشرے میں گرفتار ہیں اور ہجرت کی طاقت نہیں رکھتے۔یہ لوگ مومن اور خدا شناس ہیں اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اس سے رہائی کی درخواست کرتے ہیں تاکہ کافروں سے الگ ہوجائیںا ور ایک مسلمان معاشرے ینںزندگی گزاریں"۔

مکہ کے کمزور مومنین جو مشرکوں کے ظلم کا شکار تھے ور ہجرت کی طاقت بھی نہیں رکھتے تھے اسی گروہ سے ہیں۔ خدا نے ان کی دعا قبول کی اور مومنوں کو حکم دیا کہ کافروں کے ساتھ جنگ کریں اور ان مستضعفین کو ان کے چنگل سے نجات دیں یہ گروہ اگرچہ مستضعف بنادیا گیا مگر اس نے خود کو معاشرے کے رنگ میں نہیں ڈھالاا اور کفر کے آیندہ عقائد سے خود کو دور رکھا اپنے فکری استقلال اور خود مختاری کو محفوظ رکھا اگرچہ وسائل کی کمی کے سبب امداد اور حمایت کے مستحق تھے۔

اس گروہ کے ذکر کے ساتھ بھی قرآن کریم نے مستضعفین کے ایک اور گروہ کی (مذمت) کی ہے چنانچہ موت کے بعد فرشتوں کے ساتھ ان کی گفتگو ان کے سخت انجام کی حکایت کرتی ہے:

1۔ نساء آیت75۔

(اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰئِکَۃُظَالِمِی اَنْفُسِھِمْ قَالُوْافِیْمَ کُنْتُمْ قَالُوْاکُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْااَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللہ وَاسِعَۃًفَتُھَاجِرُوْافِیْھَافَاُولٰئِک مَاوٰیھُمْ جَھَنَّمُ وَسَائَ تْ مَصِیْراً)[1]

"جن لوگوں کی ملائکہ نے اس حال میں روح قبض کی کہ انھوںنے اپنے نفس پر ظلم کررکھا تھا اور جب ان سے پوچھا کہ تم کس حال میں تھے ؟انھوں نے کہا ہم زمین میں کمزور بنا دئے گئے تھے ملائکہ نے کہا کہ کیا زمین خدا میں گنجائش نہیں تھی کہ تم وہاںسے ہجرت کر جاتے؟!پس ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کس قدربد ترین ٹھکانا ہے"

مستضعفین کا یہ گروہ ہجرت نہ کرنے کے کی بناء پر مجرم قرارپایا اور خدانے ان سے جواب طلب کیا ہے۔ پس ایسا نہیں ہے کہ اسلام ہر مستضعف اور کمزورکی تائید اور تمجید کردے یہ حقیقت ان آیات سے مزیدروشن ہوجاتی ہے کہ جن دوزخ میں مستکبرین اور مستضعفین کے درمیان بحث وجدل کا ذکر ہے۔

مستضعفین کا یہ گروہ، دوزخ میں مستکبرین کا ہمنشین ہے اور یہ دونوںگروہ ایک ساتھ معذب ہوں گے، ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نگاہ میں عنوان استضعاف بذات خودکسی مثبت پہلو کا حامل نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ معاشرے میں مستضعف طبقہ تمام اہمیتوں کامالک ہو۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکالاجاسکتا ہے کہ مستضعفین سے امامت اور رہبری کا وعدہ صرف ان کے مستضعف ہونے کی وجہ سے نہیںہے بلکہ یہ وعدہ انکے ایمان کی وجہ سے کیا گیا ہے اور آیت (وَنُرِیْدُاَن نَمُنَّ عَلَیَ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْ ا)[2]کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس گروہ پرصرف اس کے مستضعف ہونے کی وجہ سے خدا نے احسان کیا ہے بلکہ امامت کی لیاقت کا معیارانکا ایمان ہے۔ اس دعوے پر شاہد وہی مطلب ہے کہ جس کی طرف ہم نے اشارہ کیااور وہ یہ کہ خدا مستضعفین کے ایک گروہ کو دوزخ میں بھیجے گا۔ بہت ممکن ہے ان لوگوں نے اپنی تمام عمر استضعاف میں گزاری ہو اورپھر ان کا انجام بھی دوزخ ہو اگرصرف استضعاف کا عنوان ہی فضیلت اور برتری کا معیار ہوتا تو یہ لوگ کبھی بھی دوزخ میں نہ جاتے۔ یہ لوگ اگراپنی محرومیونکے ساتھ با ایمان ہوتے اور خدا کے احکام پر عمل کرتے تو جنت کے مستحق ہوتے۔ معلوم ہوا کہ مستضعفین کے ایک گروہ کی رہبری کا وعدہ کہ جس کی طرف آیت میں اشارہ ہوا ہے ان کے ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے ہے صرف ان کے استضعاف کی وجہ سے نہیں ہے۔

1۔ سورۂ نسا آیت97۔

2۔ سورۂ قصص آیت5۔

یہاںاس سوال کا امکان ہے کہ اگر مذکورہ بات صحیح ہے تو اس آیت میں(الَّذِیْنَ استضعفوا) کے بجائے (الذین آمنوا) کیوں استعمال نہیں ہوا ؟ اس سوال کے جواب میں کہاجاسکتاہے کہ آیت میں استضعاف کی صفت کا استعمال ایک خاص نکتہ کے تحت ہے ۔زیر بحث آیت سے پہلے آیت میں آیا ہے کہ فرعون نے لوگوں کے ایک گروہ کو ضعیف و محروم کردیا تھا یا ان کو ضعیف شمار کرتا تھا اور اس کے بعد آیت میںاس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے ان ہی ضعیف اور ناتوان لوگوں کو کہ جنھیں فرعون ضعیف شمار کرتا تھا اپنی مخصوص نعمتوں سے نوازا اور ان کو سرداری اور حاکمیت تک پہونچادیا ۔ حقیقت میں اس آیت کا پیغام یہ ہے کہ خداکی قدرت اور ارادہ عالم فطرت اورمعاشرتی اسباب وعلل سے برتر ہے۔ اور طاغوتی معاشروں پرحاکم معیارات کھوکلے اور بے قیمت ہیں؛ مادی طاقت وثروت سرداری کا معیار نہیں ہے ۔

اسی آیت کے مشابہ سورۂ اعراف میں آیاہے:

(وَاَوْرَثْنَاالْقَوْ مَ الَّذِیْنَ کَانُوْایُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا)[1]

"اور ہم نے مستضعفین کو(سرزمین فلسطین کے)بعض مشرقی اور مغربی حصے (کہ جس میں برکت قراردی تھی)میراث کے عنوان سے عطاکردیئے "۔

قرآن یہ بات سمجھانا چاہتا ہے کہ اس گروہ کا ضعیف ہونا اس بات سے مانع نہیں ہے کہ خداوندقدوس ان کو رفعت وبلندی عطاکرے اور انھیں حکومت تک پہنچائے اور ان کو زمین کی نعمتوں کا وارث بنائے ۔

مختصریہ کہ لوگوں کی اقتصادی حالت کی بناء پر معاشرے کی دوطبقوںمیں تقسیم اور مستضعفین اور مستکبرین کو ایک دوسرے کے مقابل معاشرے کے طور پر دو بنیادی طبقوںمیں تقسیم کردینا قرآن کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہے۔یہاں پر ایک بنیادی نکتہ پر توجہ ضروری ہے کہ اصولی طورپر غربت اور ثروت قرآن کی نگاہ میں ایمان اور کفریا حق اورباطل کے برابر نہیں ہے ۔بہت ممکن ہے کچھ فقراء و مستضعفین قرآن کی نگاہ میںبے وقعت ہوں اورکچھ دولتمند قرآن کریم کی نگاہ میں تائیدواحترام کے لائق ہوں ۔اب اگرہم مارکسزم کی اصطلاح سے استعمال کرنا چاہیں تو ایسا نہیں ہے کہ جو شخص بھی حکمراں طبقہ سے تعلق رکھتا ہو وہ اسلام کی نگاہ میں برااور قابل مذمت ہے ۔

ہمارے اس دعوے کا شاہد، جیساکہ ہم پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں یہ ہے کہ مستضعفین کا ایک گروہ جو دنیا میں بھی مادی امکانات سے محروم رہاہے آخرت میں بھی وہ جہنم میںداخل ہوگا اور اس پر عذاب کیا جائیگا

1۔سورۂ اعراف آیت137۔

دوسری طرف قرآن نے بعض دولتمندوں اور معاشرہ میں بلند مقام رکھنے والوں کی تعریف و تحسین کی ہے ، بعض الٰہی انبیاء علیہم السلام جیسے حضرت سلیمان ، داؤد ، اوریوسف علیہ السلام درجۂ نبوت ، امت کی رہبری اور عصمت کی مانند معنوی مقامات پر فائز ہونے کے ساتھ ہی ساتھ سلطنت و حکومت کے بھی مالک تھے اور ممکن ہے یہ دعویٰ بھی صحیح ہو کہ بعض اولوا العزم انبیاء بھی درجۂ حکومت پر فائز رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک ایسے گھرانے میں پیدا

ہوئے تھے جو دربار حکومت سے وابستہ تھایا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے گھر میں پرورش پائی اور جوانی تک فرعون کے دربار میں رہے اسی طرح اصحابِ کہف حاکم وقت کے درباریوں میں سے تھے لیکن دربار سے بھاگ نکلے ، خدا نے ان پر احسان کیا اور ان کو منفرد امتیازات سے نوازا ، " مومنِ آل فرعون " فرعون کے درباریوں میں سے تھے اوراس کے باوجود ایسا مستحکم ایمان رکھتے تھے کہ قرآن کا ایک سورہ (سورۂ مومن) کا ان ہی کے نام پر رکھا گیا ہے ۔

بنا بر این، قرآن کی رو سے دولت مطلق طور پر عظمت و بلندی کی مخالف نہیں ہے جیسا کہ فقر و محرومی بھی بالذات بلندی کا معیار نہیں ہے بلکہ حقیقی معیار وہی ایمان و کفر اور اطاعت و عصیان ہے مومن چاہے فقیر ہو یا امیر، خدا کے نزدیک ذیقدر ہے جیسا کہ آیت میں آیا ہے:

(اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقٰکُمْ)

"بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار رہے "۔

اور کافر چاہے فقیر ہو یا امیر ،مردود بارگاہ ہے ۔

4۔چوتھا نکتہ یہ ہے کہ کسی فرد یا معاشرے پر خدا کی نعمتوں کا نزول بذات خود، خدا کے نزدیک نہ اس فرد یا معاشرہ کے تقرب اور بلندی کی دلیل ہے اور نہ ان کی پستی اور ذلت کی نشانی ہے بلکہ مادی نعمتوں کے ذریعہ طرح

طرح کی الٰہی سنتیں جاری ہوتی ہیں کبھی نعمت مومنوں اور کافروں کے امتحان کے لئے ملتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے :

(وَنَبْلُوکُمْ بِالشَّرِّوَالْخَیْرِفِتْنَةً وَاِلَیْنَاتُرْجَعُوْنَ)[1]

1۔ سورۂ انبیا 35۔

"اور ہم تو اچھائی اور برائی کے ذریعہ تم سب کو آزمائیں گے اور تم سب پلٹا کر ہماری ہی بارگاہ میں لائے جاؤ گے "

ایک دوسری آیت میںبھی یہی مفہوم بیان ہوا ہے

(فَاَمَّاالْاِنْسَانُ اِذَامَاابْتَلٰهُ رَبُّهُ فَاَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُوْلُ رَبِّیْ اَكْرَمَنِوَاَمَّآاِذَامَاابْتَلٰهُ فَقَدَرَعَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُوْلُ رَبِّیْ اَهَانَنِ)[1]

"لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کے پروردگار نے اس کو آزمانے کے لئے عزت اور نعمت دیدی تو کہنے لگا کہ میرے رب نے مجھے باعزت بنایا ہے اور جب آزمائش کے لئے روزی کو تنگ کردیا تو کہنے لگا کہ میرے پروردگار نے مجھے ذلیل و رسوا کر دیا ہے"۔

جیسا کہ آیت سے پتہ چلتا ہے نعمت سے مالا مال لوگوںکے لئے نعمت اور فقراء کے لئے فقر و غربت ایک الٰہی امتحان کا ذریعہ ہے؛ جناب سلیمان علیہ السلام جب خدا کی طرف سے مستحق انعام قرارپائے اور عظیم سلطنت اور حکومت پر فائز ہوئے تو قرآن کہتا ہے :

(قَالَ هٰذامِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لِيَبْلُوَنِیْئَ اَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ)[2]

"کہنے لگے :یہ میرے پروردگار کا فضل و کرم ہے وہ میرا امتحان لینا چاہتا ہے کہ میں شکریہ ادا کرتا ہوں یا کفران نعمت کرتا ہوں "۔

پس دنیا کی مادی نعمتوں کے سلسلے میں خدا کی عام سنتوں میں سے ایک سنت نعمت سے سرشار دولتمندوں کی آزمائش اور امتحان ہے اورپھر ان کا چھن جانا بھی ایک طرح کی آزمائش ہے ۔

اس کے علاوہ کہاجا سکتا ہے جیسا کہ پہلے بیان شدہ آیات میں آپ نے ملاحظہ کیا ، کبھی کبھی ممکن ہے کہ پریشانیاں ، مفلسی ،خشکسالی اوردنیا کی دوسری سختیاں حقیقت میں نعمت الٰہی ہوںجوانسان کو خدا کی یاددلانے اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول کر نے کا ذریعہ بن جاتی ہیں سورۂ انعام کی آیت 42 اور سورۂ اعراف کی آیت 94 میںاس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد کہ خدا پیغمبروں کی بعثت کے ساتھ ساتھ لوگوں کے لئے سختیاں اورپریشانیاں

1۔ سورۂ فجر آیت15۔16۔

2۔ سورۂ نمل آیت40 ۔

ہی نازل کردیتا ہے۔تاکہ (لَعَلَّھُمْ یَتَضَرَّعُونَ) " شاید ہمارے سامنے گڑگڑائیں"(لَعَلَّھُمْ یَضَّرَّعُوْنَ) "شاید ہمارے سامنے گریہ وزاری کریں"اس تعبیر سے یہ واضح ہوتاہے کہ ان سختیوں اور دشواریوں کا باطن دراصل نعمت ہے چونکہ یہ انسان کی روح میں تضرع کی حالت اور خدا کی طرف متوجہ ہونے کی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔

دوسری طرف کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایک چیز ظاہر میں تو نعمت نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں خدا کے قہر اور عذاب کے علاوہ کچھ نہ ہوتی سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَھُمْ خَیْر لِاَنْفُسِھِمْ اِنَّمَا نُمْلِیْ لَھُمْ لِیَزْدَادُوْا اِثْمًا وَلَھُمْ عَذَاب مُّھِیْن)[1]

"اور خبردار یہ کفار یہ نہ سمجھیں کہ ہم جس قدر راحت و آرام دے رہے ہیںتو ان کے حق میں کوئی بھلائی ہے ،ہم تو یہ بس اس لئے دے رہے ہیں کہ وہ جتنا گناہ کرنا چاہیںکرلیں ورنہ ان کے لئے رسوا کن عذاب ہے"۔

چونکہ خدا نے کافروں کے اس گروہ سے اپنی عنایت کو دور کردیا یہ لوگ پستیوں میں چلے گئے۔خدا ان کو دنیا سے زیادہ استفادہ کی مہلت دیتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ پستی اور انحطاط کے راستے میں قدم بڑھائیں اور سخت ترین عذاب کے مستحق قرار پائیں۔

الٰہی نعمتوں کے سلسلے میں ایک اور سنت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی معاشرہ ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرے تو خدا کی حکمت تقاضا کرتی ہے کہ اس معاشرے میں مادی نعمتوں کا نزول بڑھا دے کہ یہ لوگ مادی وسائل کے ذریعے معنوی ترقی اور کمال کی طرف زیادہ سے زیادہ قدم بڑھاسکیں ارشاد ہوتا ہے:

(وَلَوْاَنَّ اَھْلَ الْقُرَیٰ ئَ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکَاتٍ مِنَ السَّمَائِ وَالْاَرْضِ)[2]

"اور اگر اہل قریہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرلیتے تو ہم زمین اور آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔۔۔"۔

اسی طرح سے اہل کتاب کے بارے میںارشاد فرماتا ہے:

(وَلَوْاَنَّھُمْ اَقَامُوْا التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَااُنْزِلَ اِلَیْھِمْ مِنْ رَبِّھُمْ لَاَکَلُوْا مِنْ فَوْقِھِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِھِمْ)[3]

"اور اگر یہ لوگ توریت و انجیل اور جو ان کی طرف پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اُن سب پر قائم ہوتے تو اوپر(آسمان) سے اور قدموں کے نیچے (زمین) سے سیر ہوکر رزق حاصل کرتے۔۔۔"۔

جی ہاں! اگر کسی معاشرے نے تقوائے الٰہی اختیار کیا اور خدا سے لو لگائی تو اُس پر مادی نعمتوں کی فراوانی خدا کے اکرام کی دلیل ہوسکتی ہے لیکن یہ کوئی عام قاعدہ نہیں ہے کہ ہر انعام و نعمت عزت و احترام اور ہر سختی و مصیبت خدا کے نزدیک ذلت اور خواری کی دلیل ہو۔

1۔سورۂ آل عمران آیت178۔ 2۔سورۂ اعراف آیت96 ۔3۔سورۂ مائدہ آیت66۔

چند نفسیاتی پہلو

1۔ انبیاء علیہم السلام کی قوموں سے مربوط آیات سے کچھ اور نکات جو معلوم ہوتے ہیں ان میں نفسیاتی رنگ زیادہ پایا جاتا ہے در اصل انسان اپنی طبیعت کے اعتبار سے ایسا ہے کہ نعمتوں کی فراوانی اور آسایش و آرام پاکر آہستہ آہستہ مست ومغرور ہوجاتا ہے اور اس قدر خوشی میں غرق ہوجاتا ہے کہ اپنے پروردگار کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے قرآن کریم کی بعض آیات میں اس طرح کے لوگوں کے بارے میں ایک دلکش تعبیر استعمال ہوئی ہے؛سورۂ قصص میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَکَمْ اَهْلَکْنَامِنْ قَرْيَةٍبَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا) [1]

"اور ہم نے کتنی ہی بستیوں کو ان کی معیشت کے غرور کی بناء پر ہلاک کر دیا "۔

(بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا) یعنی وہ اپنی زندگی میں مست تھے(روٹی روزی کی فروانی کے نشہ میں چور ہو کر زندگی بسر کر رہے تھے) اور عام طور سے اس طرح مستی مادی نعمتوں کی فراوانی سے ہی وجود میں آتی ہے۔

اسی طرح سورۂ مبارکۂ علق میں ارشاد ہوتا ہے :

(کَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغَیٰ اَنْ رئَ اهُ اسْتَغْنَیٰ) [2]

1۔ سورۂ قصص آیت58۔

2۔ سورۂ علق آیت6۔7۔

اس سرکشی اور غفلت کا ہی نتیجہ ہے کہ انسان حق سے منحرف ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی وہ حق سے دشمنی اور انبیا ئے الٰہی سے جنگ کرنے پر آمادہ نظر آنے لگتا ہے ۔پس بہت سے لوگ نعمتوںکی فراوانی اور آرام کی وجہ سے نفسیاتی طور پر انبیاء اور ان کی دعوت کی مخالفت کرنے لگتے ہیں جو ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

البتہ یہاں اس بات کو مدّ نظر رکھنا چاہئے کہ اس نفسیاتی عمل کا مطلب انسان کو سرکشی پر مجبور کرنا اور اس کا اختیار سلب کر لینا نہیں ہے ۔قرآن کریم نے اگرچہ ان کے مضر اثرات کا انسانوں پر مؤثر ہونا قبول کیا ہے مگرجن کے نفوس مادیت سے متاثر ہو کر مغرور اور مست ہو جاتے ہیں ان کی مذمت بھی کی ہے، دوسرے لفظوں میں، قرآن ان چیزوں کو گمراہی کا اصل سبب نہیں سمجھتا اگرچہ یہ اسباب لوگوں کی گمراہی کے لئے راستہ ہموار کرتے ہیں ۔

اس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ مادی نعمتوں سے انسان منحرف تو ہو سکتا ہے مگر یہ انحراف کے لئے علت تامہ نہیں ہیں یہ آیات نعمتوں سے متعلق ایک نفسیاتی پہلو سے پردہ اٹھانے کے علاوہ ایک تربیتی پہلو کو بھی بیان کرتی ہیں یعنی جن آیات میں ان مطالب کی طرف اشارہ ہے اور جو تعبیریں دولتمندوںاور مجرموں کی جانب سے انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کے سلسلہ میں استعمال ہوئی ہیں وہ سب انسان کو یہ درس دیتی ہیں کہ وہ متوجہ رہیں کہ کہیں مادی فائدے اس کو راہِ حق اور خدا کی یاد سے منحرف نہ کردیں ارشاد ہوتا ہے:

(يٰأَيُّهَاالَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوٰلُكُمْ وَلَااَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِاللهِ) [1]

"ایمان والو خبردار تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمھیں یاد خدا سے غافل نہ کردے"۔

2۔قرآن کریم نے ایک اور نفسیاتی پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو خود اپنے مقام پر مؤثر اور اہم اثرات رکھتا ہے اورقرآنِ کریم نے اس کے اثر کو قبول بھی کیا ہے لیکن اس کو ذمہ داری بر طرف ہوجانے کا بہانا یا جبر و اکراہ کا باعث نہیں سمجھتا ۔البتہ اس نفسیاتی پہلو کی وضاحت سے پہلے ایک بات تمہید کے عنوان سے بیان کرنا ضروری ہے ۔

1۔ سورۂ منافقون آیت9۔

عالم خلقت کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ انسانوں کی تخلیق میںمختلف قسم کے فرق پائے جاتے ہیں، اس حقیقت کا انکا ر نہیں کیا جا سکتا کہ تمام انسان مختلف اعتبار سے جسم، رنگ، جنس اور عقل و شعور وغیرہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ خدا وند قدوس نے اپنی حکمتِ بالغہ کی بنیاد پر یہ فرق رکھا ہے اور یہی فرق خلقت کے نظامِ احسن کا ایک حصہ ہے البتّہ کسی بھی انسان کو ان تخلیقی اختلافات پر اعتراض کرنے کا حق نہیں کیونکہ کسی کا کوئی حق خدا کے ذمہ نہیں ہے کہ وہ اس حق کے تلف ہونے کو مد نظر رکھ کر پروردگا رعالم پر اعتراض کر سکے۔ مثال کے طور پر کوئی انسان خدا وند عالم پر یہ اعتراض نہیں کر سکتا کہ مجھے ایسا کیوں بنایا اور ویسا کیوں نہیں بنایا؟! اس "کیوں" کا کوئی مطلب نہیںہے اس لئے کہ انسان خلقت سے پہلے معدوم تھا اور ظاہر ہے کہ ایک معدوم چیزوجود کے بعد موجدپر اعتراض کی قدرت نہیںرکھتی اور نہ ہی اسے اعتراض کا کوئی حق ہے۔ خلقت کے بعد بھی جو کچھ اس کے پاس ہے وہ سب خدا وند عالم کا عطیہ ہے اور جو کچھ اس کے پاس نہیں ہے اس کی نسبت بھی اعتراض کا حق نہیں رکھتا ورنہ حقیقت میںیہ اعتراض حکمتِ الٰہی پر اعتراض ہوگا اور اگر جان بوجھ کر کیا جائے اور عملی صورت اختیار کر لے تو یہ ایک طرح کا کفر ہے۔

یقیناً خدا وند قدوس نے جب انسانوں کو پیدا کیا اور ان میں سے ہر ایک کو مخصوص استعداد کا مالک بنا دیا اور اُن پر اُن کی استعداد اور توانائیوں کے مطابق احکام عائد کر دیئے تو اس مقام پر خدا وند عالم نے خود اپنے ذمہ بندوں کے کچھ حقوق رکھے ہیں اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص اپنی استعداد سے فائدہ اٹھا کر اطاعتِ خدا کی راہ میں قدم بڑھائے تو خدا اس کو اپنے لطف و کرم سے جزا دے گا۔ پس انسان کا خدا وند عالم پر اولاً جو حق ہے خود خدا نے اپنے ذمہ لیا ہے نہ یہ کہ انسان اپنی طرف سے اس پر کوئی حق رکھتا ہے دوسرے یہ کہ یہ حق صرف فرائض کی ادائیگی کے مرحلہ اور نیک اعمال کی جزاء کے عنوان سے ہے تکوینی مرحلہ اور انسانوں کو وجود عطا کرنے کے موقع سے تعلق نہیںرکھتا جیسا کہ خداوند عالم سورۂ روم میں ارشاد فرماتا ہے:

(وَكَانَ حَقًّاعَلَيْنَا نَصْرُالْمُؤْمِنِيْنَ)[1]

"اور صاحبانِ ایمان کی مدد کرنا تو ہمارا فرض تھا"۔

1۔ سورۂ روم آیت 47۔

جی ہاں، خدا وند عالم نے حقیقی مومنوں کی مدد اپنا حق قرار دیا ہے اور یہ ذمہ داری اپنے ذمہ میں لی ہے لیکن تکوینی نظام کے تحت مخلوقات میں فرق غیر قابلِ انکار ہے اور نظامِ احسن کے اسباب میں سے ہے قرآنِ کریم نے بھی اس حقیقت پر تائید کی مہر لگاتے ہوئے سورئہ زخرف میںاعلان کیا ہے:

(وَرَفَعْنَابَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضاًسُخْرِيّاً) [1]

"اور ہم نے درجات میںبعض کو بعض سے اونچا بنایا ہے تاکہ ایک دوسرے سے کام لے سکے"۔

سورئہ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَاۤ اٰتَيٰكُمْ) [2]

"اور بعض کے درجات کو بعض سے بلند کیا تاکہ تمھیں جو کچھ دیا ہے اس کے ذریعے آزمائے''

البتہ چونکہ یہ اختلاف حکمتِ الٰہی کے مطابق ہے لہٰذا قرآن اس کو ایک مطلوب حالت سمجھتا ہے اور انسان کو دوسروں کو دی گئی نعمتوں کی آرزو دل میں پالنے سے منع کرتا ہے۔ سورئہ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَ لَا تَتَمَنَّوْامَافَضَّلَ اللہ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَيٰ بَعْض) [3]

"اور خبردار جو خدا نے بعض افراد کو بعض سے کچھ زیادہ دیا ہے اس کی تمنّا اور آرزو نہ کرنا"۔

بہر حال یہ تکوینی اختلافات فطری طور پر معاشرتی زندگی میں اثر انداز ہوتے ہیں جو شخص جسمانی طاقت، ذہانت اور خلاقیت کی دوسروں سے بہتر صلاحیت رکھتا ہے جب اس استعداد و قابلیت سے صحیح استفادہ کرتا ہے، مادی نعمتوں سے زیادہ بہرہ مند ہوتا ہے البتہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ مادی نعمتیں انسان کی سعادت اور کرامت کی علامت نہیں ہیں، بزرگی تواس وقت آتی ہے کہ جب انسان اپنے اختیار سے راہِ راست کا انتخاب کرے۔ قرآن یہ نہیں کہتا "اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللہ اَعْلَمُكُمْ" ممکن ہے کسی کے پاس بہت زیادہ علم ہو لیکن اس کے باوجود وہ جہنمی ہو، بزرگی کا معیار تو تقویٰ ہے اور کچھ نہیں۔

اس تمہید کے بعد آیئے اصل بحث کا جائزہ لیتے ہیں؛ مادی نعمتوں کی فراوانی کبھی بھی فضیلت اور بزرگی کا سبب

1۔ سورئہ زخرف آیت 32۔

2۔ سورئہانعام آیت 165۔

3۔ سورئہ نساء آیت 32۔

نہیں ہوتی مگرقرآنِ کریم اس بات کو بھی قبول کرتا ہے کہ جب معاشرے کے کچھ افراد مادی وسائل کے سہارے مخصوص مقام اور عہدہ حاصل کر لیں تو وہ معاشرے کے دوسرے افراد پر مؤثر ہو سکتے ہیں۔ہر شخص کے اندر ایک کمزوری ہے جو عام طور سے پائی جاتی ہے اور وہ بزرگوں کی اندھی تقلید کرنا ہے؛ لوگونکے اندر یہ بچکانہ صفت پائی جاتی ہے کہ وہ بڑے آرام سے معاشرے کی ممتاز شخصیتوں کی پیروی کرتے ہیں اور خود کو ان ہی کے کردار میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ پس جس طرح دولت اور معاشرتی مقام و حیثیت خودصاحبِ دولت و منصب کے غرور اور سرکشی کا سبب ہے اسی طرح دوسروں کو اندھی تقلیدپر بھی ابھارتی ہے یہ جھکاؤ ایک نفسیاتی امرہے اور قرآن نے بھی اس کو ایک حقیقت کے عنوان سے قبول کیا ہے؛ اسی حقیقت کی بنا پر اہلِ دوزخ کے ایک گروہ کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

(وَقَالُوْارَ بَّنَااِنَّآاَطَعْنَاسَادَتَنَاوَکُبَرَآئَنَافَاَضَلُّوْنَاالسَّبِیْلاَ رَبَّنَآئَ اٰتِهِمْ ضِعْفَیْنِ مِنَ الْعَذَ ابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْناًکَبِیْراً)[1]

" اور وہ لوگ کہیں گے کہ ہم نے اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت کی تو انھوں نے ہمیںرٓاستہ سے بہکا دیا اب ان پردوہرا عذاب نازل کر اور اور ان پر بہت بڑی لعنت کر"۔

مگر قرآن کی طرف سے اس حقیقت کی تصدیق کا مقصدہرگزیہ نہیں ہے کہ ہم اس کو جبراور مجبوری قرار دے کر ذمہ داری کا سبب قرار دیدیںکیونکہ جو لوگ اپنی گمراہی کی ذمہ داری قوم کے بڑے لوگوں کی گردن پر ڈالتے ہیں ان کا عذر قابلِ قبول نہیں ہے۔ اگرچہ انسان میں تقلید اوربڑوں کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کا عنصرپایا جاتا ہے اور اس کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن تاریخی تجربات کی روشنی میںخدانے انسان کوان امورکا مقابلہ کرنے کی قوت و صلاحیت بھی دی ہے۔

ہماری اس گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ اسلام انسان کے ارادہ اور اختیار کے سلسلہ میں بہت زیادہ اہمیت قائل ہے اور اسی کو اصل سمجھتا ہے لہٰذا اختیاری کاموں کے دائرہ وحدود میں کسی بھی عذر کو قبول نہیں کرتا۔ اس بات کا شاہد کہ "اس طرح کے نفسیاتی پہلو انسان پراس کے اختیارات کے راستہ سرے سے بند نہیں کرتے"یہ ہے کہ بہت سے مستضعفین اگرچہ سماجی اعتبار سے ایک دم نچلے درجہ پرتھے مگر اس کے باوجود معاشرے کی بڑی شخصیتوں سے متاثر

1۔ سورۂ احزاب آیت67۔68۔

ہوئے بغیر انبیاء پر ایمان لے آئے۔ مثال کے طور پر حضرت نوح کی قوم کے سر کردہ افراد آپ سے کہا کرتے تھے :

(قَا لُوْٓاَنُؤْمِنُ لَکَ وَ اتَّبَعَکَ الْاَرْذَلُوْنَ)[1]

" ان لوگوں نے کہا ہم آپ پر کس طرح ایمان لائیں؟! جب کہ آپ کے تمام پیر و طبقہ کے لوگ ہیں"۔

اور سورۂ ہود میں ارشاد ہوتا ہے :

(وَمَانَرٰیکَ اتَّبَعَکَ اِلاَّالَّذِیْنَ ھُمْ اَرَاذِلُنَابَادِیَ الرَّأْیِ) [2]

"اور ہم تمہاری اتباع کرنے والوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے پست طبقہ کے سادہ لوح افراد ہیں"۔

معلوم ہوا اس زمانہ کے غلط رسم و رواج کی بنا پر جو لوگ "اراذل"(نیچے طبقہ والے) کہے جاتے تھے وہ خدا کے پیغمبر پر ایمان لا کر اور قوم کے سرداروں کی تقلید کے خلاف اقدام کر کے نجات پا گئے پس ایسا نہیں ہے کہ اگر معاشرہ کا کوئی گروہ "ارذلین" (یعنی پست طبقے) کے زمرہ میں آتا ہو تو وہ معاشرہ کی فضا سے اتنا گھٹ جائے کہ اس سے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی قوّت ہی نہ رکھتا ہو۔ مختصر یہ کہ انسان ایسے مستقل ارادہ کا مالک ہے جس سے وہ ان تمام نفسیاتی اسباب کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتا ہے۔

فلسفۂ تاریخ کے بارے میں ایک نکتہ

زیر بحث آیات سے ایک اور نتیجہ جو حاصل ہوتا ہے وہ فلسفۂ تاریخ کی ایک بحث سے تعلق رکھتا ہے۔ فلسفۂ تاریخ سے آشنا ایک گروہ کا خیال ہے کہ تاریخی تغیرات ہمیشہ ترقی کی طرف گامزن ہوتے ہیں اور جبر تاریخ اس چیز کا تقاضا ہے کہ معاشرے ہمیشہ ترقی کرتے رہیں اور تاریخ کا ہر دور پہلے والے دور سے ممتاز اور زیادہ کامل ہو۔

قرآنِ کریم کی آیات کے تحقیقی جائزے سے یہ بات واضح و روشن ہو جاتی ہے کہ مندرجہ بالا عقیدہ قرآن کی رو سے درست نہیںہے ؛ایسا نہیں ہے کہ ہر نیا معاشرہ قدیم معاشرہ سے معنوی اورمادی لحاظ سے زیادہ کامل ہو۔ مثال کے طور پر قرآن کریم معاشروں کی مادی ترقی کے متعلق سورۂ روم میں ارشاد فرماتا ہے :

(اَوَلَمْ یَسِیْرُوْافِیْ الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْاکَیفَ کَانَ عٰقِبَةُ الَّذِیْنَ مِن قَبْلِھِمْ کَانُوْااَشَدَّ مِنْھُمْ قُوَّةً وَاَثَارُوْاالْاَرْضَ وَعَمَرُوْھَآ اَکْثَرَمِمَّاعَمَرُوْھَا) [3]

"کیا یہ لوگ روئے زمین پر چلے پھرے نہیں ہیںکہ دیکھتے جو لوگ ان سے پہلے گذر گئے ان کا انجام کیا ہوا؟

1۔ سورۂ شعراء آیت111۔ 2۔ سورۂ ہود آیت 27۔3۔ سورۂ روم، آیت9۔

حالانکہ وہ لوگ قوّت میں ان سے کہیں زیادہ قوی تھے اور جس قدر زمین اُن لوگوں نے گوڑکرزراعت کے ذریعہ آباد کی ہے اس سے کہیں زیادہ زمین ان لوگوں نے آباد کی تھی ۔۔۔"۔

اس آیت سے یہ پتہ چلتاہے کہ پہلے کے بعض معاشرے اور تہذیبیں علم اور مادی صنعت کے اعتبار سے جدید معاشروں سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے ۔ بنیادی طورپرتاریخ بشریت میں بہت سی ایسی درخشاں تہذیبیں تھیں جو کچھ اسباب کی وجہ سے ختم ہو گئیں اور بعدمیّں آنے والے معاشرے مدتوں تک ان کے علمی آثار اورفنی وسائل سے محروم رہ گئے اس بنا پریہ لازم نہیں ہے کہ انسانی تمدن ہمیشہ مادی ترقی کی راہ پرہی گامزن رہاہو۔

روحانی ترقّیوں کے اعتبارسے بھی یہ بات روشن ہے ممکن ہے کہ ایک معاشرہ اپنے اختیار و انتخاب سے صحیح فائدہ اٹھاکرمومن ہو اوراس کی آئندہ نسلیں اپنے غلط انتخاب کی بناپرکفرکا راستہ اختیارکرلیں ۔ لہٰذا کوئی ایسی دلیل موجود نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ جبرتاریخ کی بنا پرہرمعاشرہ اپنے پہلے کے معاشروں کی ثقافت سے بالاترہو اور اس سے زیادہ روحانی اور اخلاقی اقداررکھتا ہو ۔

البتہ اسلام کی پیشینگوئی کی بنیادپرزمین پرظاہرہونے والا سب سے آخری معاشرہ مادی اورمعنوی لحاظ سے تاریخِ انسانیت کا سب سے بہتر اوربلند معاشرہ ہوگا لیکن یہ معاشرہ جبرتاریخ کی اساس و بنیادپر نہیںبلکہ اپنے زمانہ کے لوگوں کے ذریعہ اختیار و انتخاب کے صحیح استعمال کے سبب مادی اور معنوی ترقیاتحاصل کرے گا اور خداوند عالم بھی اپنے انعام و اکرام سے ان کی نعمتوں میں اضافہ کردے گا ۔ اس نکتہ کو بھی یادرکھنا چاہیئے کہ سماجیات اور فلسفۂتاریخ سے متعلق قوانین و ضوابط کہ جن میں جبراور ایک دم سے انسان کے ہاتھوں سے اسکے اختیارات سلب کرلئے جانے کی باتیں ہیں یہ سب قرآن کے نزدیک ہرگزقابل قبول نہیں ہیں۔

خاتمیت

نبوت کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ کیا خدا کی جانب سے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا یا کسی خاص زمانہ میں ختم بھی ہو سکتا ہے اسلام کے نقطۂ نگاہ سے اس سوال کا جواب بالکل واضح و روشن ہے اور کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے؛ اسلام کے ضروریات میں کہ جن کا ماننا ہر مسلمان کا فریضہ ہے ایک یہ ہے کہ رسول اسلام ﷺ انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ کے آخری نبی ہیں اور آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی پیغمبر مبعوث نہیں ہوا اور نہ ہی اب مستقبل میں مبعوث کیا جائیگا۔ یہ اسلامی عقیدہ اتنا مشہور و معروف ہے کہ دوسرے مذاہب والے بھی بخوبی جانتے ہیں کہ اسلام خاتمیت کا قائل ہے۔ اسلامی تعلیمات سے معمولی آشنائی رکھنے والا بھی اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ مسلمانوں کے نظریہ کے مطابق پیغمبر اکرم ﷺ (خاتم الانبیاء) اور آپ کا دین (خاتم الادیان) ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا قرآن کریم میں اس عقیدہ کے شواہد موجود ہیں یا نہیں؟

ہم گذشتہ ایک بحث میں (پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت کے عالمی ہونے) سے متعلق کچھ آیات پیش کر چکے ہیں جن سے اِس بحث میں بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے؛

سورۂ فرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

(تَبَارَکَ الَّذِی نَزَّلَ الفُرْقَانَ عَلَٰی عَبدِہِ لِیَکُونَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْراً)[1]

"بابرکت ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے پر فرقان (حق کو باطل سے جدا کرنے والی کتاب) نازل کی تاکہ وہ سارے جہان کے لئے عذاب الٰہی سے ڈرانے والا بن جائے"۔

اس آیت سے (ایک کامل آخری دین کی حیثیت سے) خاتمیت اسلام کا استفادہ کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ عالمین کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہیں ہے جب تک دنیا قائم ہے ہر ایک امت چاہے وہ کہیں بھی ہو (عالمین)

1۔ سورۂ فرقان آیت 1۔

کا جزء شمار ہوگی اور رسول اسلام ﷺ بھی ان کے لئے (نذیر) یعنی ڈرانے والے ہوں گے اور اس کا لازمہ یہ ہے کہ آخر الزماں تک کوئی دوسرا رسول و نبی مبعوث نہیں کیا جائیگا ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

(۔۔۔ (وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَاالقُرآنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ) [1]

" اور یہ قرآن مجھ پر وحی کے ذریعہ اس لئے نازل کیا گیا کہ میں تمہیں اور جس جس تک (اسکی خبر پہنچے) اسکے ذریعہ اُسے ڈرائوں "۔

لفظ (مَن بَلَغ)رسول اسلام ﷺ کے دور حیات میں موجود تمام انسانوں کے ساتھ آئندہ زمانے کے بھی تمام انسانوں کو شامل ہے اور اس کا مطلب وہی خاتمیتِ دین اسلام ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: (وَمَااَرْسَلْنَاکَ اِلَّاکَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِیْرًاوَّنَذِیْرًا) [2]

" اور ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لئے خوشخبری دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۔"

مفسرین کے کہنے کی بنیاد پر لفظ "کافةً""ناس" کے لئے حال کے طور پر استعمال ہوا ہے اس لئے کہ اولاً "تائے تانیث '' کے ساتھ آیا ہے دوسرے یہ کہ قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر بھی اسی عام معنی میں استعمال ہوا ہے۔[3]

اس بیان کے اعتبار سے آیت کا مدلول یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے ہم عصر افراد اور جو لوگ بعد میں آئیں گے سب انذار کے مخاطب ہیں، اور دعوت اسلام ان کو بھی شامل ہے۔ اس صورت میں دوسرے نبی کا کوئی تصور ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

اس طرح کی تمام آیات کے علاوہ بھی جن میں سے ہر آیت کسی نہ کسی عنوان سے ہمارے مدعا کو ظاہر کرتی ہے، ایک آیت اور بھی ہے جو خاتمیت پر صاف صاف دلالت کرتی ہے ارشاد ہوتا ہے:

(مَاکَا ن مُحَمَّدَ اَبَآ أَحَدٍ مِنْ رِّجَا لِکُمْ وَلٰکِنْ رَسُوْ لَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ) [4]

1۔ سورۂ انعام آیت 19۔

2۔ سورۂ سبأ آیت 28۔

3۔ لفظ "کافۃً" زیر بحث آیت کے علاوہ بھی اور دوسری چار آیتوں میں استعمال ہوا ہے کہ ان سب مقامات پر عمومیت کے معنی پر دلالت کرتا ہے"۔

4۔ سورۂ احزاب آیت 40۔

"محمد تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول اورخاتم انبیاء ہیں"۔

اگرچہ یہ آیت اپنے منہ بولے بیٹے زید کی طلاق شدہ سے پیغمبر اسلام ﷺ کی شادی کے جواز کو بیان کررہی ہے لیکن اس میں ضمناًخاتمیت کامسئلہ بھی بیان کیا گیاہے۔

قبل از اسلام اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے بھی شادی نہ کرنے کا دستور تھا خداوند عالم نے اس غلط رسم کو منسوخ کرنے کی خاطر رسول اسلام ﷺ کو حکم فرمایا کہ زید کی مطلقہ سے شادی کرلیں۔ اس کے بعد آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے دورحیات میں کوئی ایک بھی آنحضرت ﷺ کا حقیقی بیٹا نہیں ہے اور زید بھی صرف آنحضرت ﷺ کے منہ بولے بیٹے ہیں(حقیقی بیٹے نہیںہیں)۔ اس بناء پر زید کی مطلقہ سے شادی کرنے میںپیغمبر کے لئے کوئی مانع نہیں ہے۔

اس بناء پر صدرِ آیت ایک فقہی اور تاریخی مسئلہ سے مربوط ہے لیکن آیت کے ذیل میں"خاتم النبیین"کا لفظ رسول اسلام ﷺ کی خاتمیت پر نص ہے۔ قرائت مشہور کے مطابق

"خَاتَمْ"تاء پرزبر انگشتری(انگوٹھی) کے معنی میں ہے لیکن انگشتری کے لئے ایک لفظ "ختم" کے مادہ سے کیوںبنا یاگیا اس کی دلیل یہ ہے کہ گذشتہ زمانہ میں عام طور سے خطوط کے آخرمیںپیغامات کو لپیٹ کر اُن کے لفافہ پر انگوٹھی کی مہر لگادیتے تھے چونکہ خطوط کی انتہا اسی پر ہو اکرتی تھی لہذا اس کو خاتم کہا کرتے تھے۔ اہل زبان کے بقول "خاتم"کا مطلب"مایُختَمُ بِہِ"ہے یعنی جس کے ذریعہ کوئی چیز ختم ہو۔ اس بنیادپر "خاتم النبیین"یعنی "مَنْ یَختَمُ بِہِ النُبُوَۃ"(وہ کہ جس پر نبوت ختم ہو جائے) اور اس معنی کو تمام اہل لغت نے بیان کیا ہے، کسی نے بھی اس میں شبہ نہیں کیا ہے پس آیہ شریفہ کے اس حصّہ کا واضح مدلول یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے مبعوث ہونے کے بعد انبیاء کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی لائق ذکرہے کہ خاتمیت اسلام کی بات صرف قرآن سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ اس مسئلہ پر متعدد روایات بھی دلالت کرتی ہیں جو ہماری کتب احادیث میں موجودہیں۔ مثال کے طورپر پیغمبر اسلام ﷺ سے

مروی ہے: نبوت ایک محل کی مانند ہے جس کی آخری اینٹ میں ہوں اور میرے آنے کے بعد اس محل کی عمارت مکمل ہو گئی ہے۔[1]

خلاصۂ کلام یہ کہ قرآن اور اسلامی روایات کی رو سے خاتمیت کے مسئلہ میں کسی قسم کا شک و شبہہ نہیں پایا جاتا البتہ اس بارے میں بے شمار شبہات پیدا کئے گئے ہیںجن کا ایک جائزہ پیش کردیناقارئین کرام کے لئے ضرورمفید ثابت ہوگا۔

1۔ موجودہ دور کے ایک دانشمند نے کتاب (معالم النبوۃ) میں 45 حدیثیں اس باب میں جمع کی ہیں اور اس سے بڑھکر یہ کہ خاتمیت کے اثبات میں بسوط بیان قلمبند کیا ہے۔ رجوع فرمائیے: جعفر سبحانی معالم النبوۃ فی القرآن الکریم بیروت دار الاضواء 405ھ صفحہ 148سے180۔

خاتمیت سے متعلق شکوک کا جائزہ

خاتمیت اسلام پر قرآنی دلالت کے بارے میں جو اہم ترین شکوک و شبہات بیان ہوئے ہیں اس حصہ میں ہم انھیں بیان کرنے کی کوشش کریں گے:

1۔ عربی زبان میں"خَاتَم"کے معنی انگشتری کے ہیں اور سورۂ مبارکہ احزاب کی چالیسویں آیت میں یہ مجازی طور پر زینت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس بناء پر"خاتم النبیین"کا مطلب (انبیاء کی زینت) ہے اور مسئلہ خاتمیت پر کسی طرح دلالت نہیں کرتا۔

جواب: عربی زبان میںلفظ خاتم کامجازی معنی میں زینت کے لئے استعمال ہونا عام طریقہ پر رائج نہیں ہے اور لغت زبان کے ماہرین میں کسی نے بھی اس آیت کے بارے میں اس طرح کا احتمال بیان نہیں کیاہے۔ ظاہر ہے آیت کا ایک غیر مشہور معنی بیان کرنا جو اس کے ظاہر کے برخلاف ہو کوئی قیمت نہیں رکھتا اور اس سے خاتمیت پر آیت کی دلالت میں کوئی ضرر پیدا نہیں ہوتا۔

2۔ اس آیت میں"خاتم النبیین"کالفظ استعمال کیاگیاہے"خاتم الرسل"کا نہیںہے اور چونکہ "نبی"اور"رسول"میں فرق ہے لہٰذا اس آیت سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد کوئی خدا کا رسول مبعوث نہیں ہوگا؟

جواب: ہم "نبی"اور"رسول"کے مفہوم کی بحث میں یہ بات واضح کرچکے ہیں کہ ان دونوں کے مفہوم چاہے کتنے ہی ایک دوسرے سے مختلف ہوں لیکن مصداق کے لحاظ سے ان دونوں کے مابین عام خاص مطلق کی نسبت پائی جاتی ہے یعنی ہر رسول نبی بھی ہوتا ہے (لیکن ایسا نہیں ہے کہ تمام انبیاء رسول بھی ہوں) اس بنیاد پر یہ کہنا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا یہ رسول کو بھی شامل ہے لہٰذا ختم نبوّت کا لازمہ ختم رسالت ہے۔ (چونکہ نفی عام مستلزم نفی خاص ہوتی ہے)

3۔ قرآن کریم کی بعض آیات سے یہ نتیجہ نکلتاہے کہ خداوند عالم نے زمانۂ مستقبل میں انبیاء علیھم السلام مبعوث کرنے پر بنا رکھی ہے۔ مثال کے طور پر ارشاد ہوتا ہے:

(يَابَنِيْ آدَمَ مَّایَ ْتِيَنَّكُمْ رُسُل مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ آيَاتِيْ) [1]

"اے بنی آدم اگر تم میں تمہارے ہی درمیان سے کچھ رسول آئیں اور تم سے ہمارے احکام بیان کریں ۔۔۔"

ظاہرہے کہ یہ آیت حضرت رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نازل ہوئی ہے اور اس میں اسی دور کے بنی آدم سے خطاب بھی ہے اب اس واقعیت و حقیقت کے مد نظر اور اس اعتبار سے کہ فعل "یاتینّکم "صیغۂ مضارع ہے اور لفظ "رُسُل "جمع ہے یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت رسول خدا ﷺ کے بعد، دوسرے انبیاء علیہم السلام بھی مبعوث ہوں گے ۔ لہٰذا اس طرح کی آیات کی موجودگی میں پیغمبر اسلام ﷺ کی خاتمیت کو کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے ؟

جواب :معترض کے اس شبہہ میں کوئی استحکام نہیں پا یا جاتا لگتا ہے وہ عربی زبان کی لطافت اور اس کے قوانین سے بالکل آشنا نہیں ہے :

اولاً فعل مضارع تمام مقامات پر فعل کے زمانۂ مستقبل میں واقع ہونے پر دلالت نہیں کرتا ۔

دوسرے یہ کہ اس آیت میں لفظ "اِمّا "حرف شرط "اِنۡ "اور "مائے "زائدہ سے مرکب ہے۔ اس بناء پر آیت کا مضمون جملۂ شرطیہ کی صورت میں بیان کیاگیاہے۔یعنی اگر تمہاری طرف انبیاء علیہم السلام بھیجے جائیں تو ان کی اطاعت و پیروی کرنا اورہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جملۂ شرطیہ شرط کے محقق ہونے کا ضامن نہیں ہے اس بنا ء پر یہ آیت اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ آخری نبی کے بعد قطعاً اور انبیاء علیہم السلام مبعوث کئے جائیں گے۔

اس کے علاوہ اس سے پہلے کی آیات کے سیاق سے یہ پتہ چلتاہے کہ اس آیت میں بنی آدم علیہ السلام کے مخاطب اس وقت کے لوگ ہیں کہ جب حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کو زمین پر بھیجا گیا تھا۔ اس آیت سے پہلے کی آیات میں حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت ، ان کے بہشت میں آنے اورروئے زمین پر ان کے اتارنے کی داستان بیان کی گئی ہے اور اس کے بعد بنی آدم سے خطاب کر کے کچھ مطالب بیان کئے گئے ہیں اوریہ آیت بھی ان

ہی سے متعلق ہے۔تو معلوم ہواکہ اس آیت میں تمام لوگوں سے خطاب کیاگیاہے اور ان کو یہ حکم دیا گیاہے کہ جب کبھی بھی کوئی نبی تمہاری طرف بھیجا جائے تو اس کی اطاعت کرنا ۔رہا یہ مسئلہ کہ یہ انبیاء علیہم السلام کس زمانہ میں مبعوث ہونگے اور ان میں آخری نبی کون ہوگا آیت اس چیز کو بیان نہیں کررہی ہے۔

1۔ سورۂ اعراف آیت35۔

قرآن کریم کے بعض سوروں میں زیر بحث آیت کی مانند اور بھی آیات ہیں جن پر غور وفکر کرنے سے یہ مفہوم اور بھی واضح اور روشن ہوجاتا ہے۔

سورۂ بقرہ میں خداوندعالم ارشاد فرماتا ہے:

(قُلْنَااهْبِطُوْامِنْهَاجَمِيْعًافَاِمَّایَاْتِيَنَّكُمْ مِنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْف عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ)[1]

"ہم نے کہا: سب نیچے اتر جائو۔ پس اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو لوگ میری ہدایت پر چلیں گے ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہونگے"۔

(فَاِمَّایَاْتِيَنَّكُمْ مِنِّیْ هُدًی فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلا يَضِلُّ وَلَايَشْقٰی)[2]

"۔۔۔پس اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا نہ تو وہ گمراہ ہوگا اور نہ مصیبت میں پھنسے گا"۔

ان آیات کا سیاق ایک ہے فرق بس یہ ہے کہ آخری دو آیات میں ہدایت اور راہنمائی بھیجے جانے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور زیر بحث آیت (سورۂ اعراف35)میں خداوندعالم کے فرستادہ ہادیوں یعنی انبیاء علیہم السلام کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

4۔ قرآن کریم میں ہے: (يُلْقِی الرُّوحَ مِنْ اَمْرِهِ عَلَیٰ مَنْ يَشَائُ مِنْ عِبَادِهِ) [3]

"۔۔۔وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے روح (فرشتہ)نازل کرتا ہے۔۔۔"۔

اس آیت کا صاف طور پر مدلول یا کنایہ یہ ہے کہ خداوندعالم جس شخص کو چاہے نبی بنا کر بھیج سکتا ہے حالانکہ یہ آیت رسول اکرم ﷺ کے دور حیات میں نازل ہوئی ہے۔

یہ آیت صاف دلالت کرتی ہے کہ آپ کے بعد بھی دوسرے انبیاء علیہم السلام مبعوث کئے جائینگے۔

جواب: یہ آیت بھی اس سے پہلے کی آیت کی طرح زمانۂ مستقبل کے بارے میں نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ کسی بھی شخص کو پیغمبری کے لئے منتخب کرنا مشیّت الٰہی کے تابع ہے اور وہ کافرونکے مادی معیاروں

1۔ سورۂ بقرہ آیت38۔ 2۔ سورۂ طہ آیت123۔3۔ سورۂ غافر آیت15۔

کی اتباع نہیں کرتا۔خداوندعالم جس شخص کے لئے مصلحت دیکھتاہے اس پر وحی نازل کردیتا ہے اور اس کو رسالت کے لئے منتخب کرلیتا ہے ۔بنا بر این زیر بحث آیت بھی مندرجہ ذیل آیت کے مضمون سے مشابہت رکھتی ہے جس میں کہا گیا ہے :

(اللهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ) [1]

"۔۔۔اللہ بہتر جانتا ہے کہ کہاں اپنی پیغمبری قرار دے ۔۔۔"۔

مورد بحث آیت بھی اس آیت کی طرح اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ خداوند عالم زمانۂ مستقبل میں کسی نبی کو مبعوث کرے گا بلکہ اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ انسانوں کو رسالت کے لئے منتخب کرنا کچھ مصلحتوں کا تابع ہے جن کو خداوندعالم بہتر جانتا ہے ۔لہٰذا ان آیات میں فعل مضارع "یلقی"یا "یجعل"کسی طرح سے بھی مستقبل کے معنی میں نہیں ہے۔

بہر حال عربی زبان اور اس کے قواعد سے آشنا شخص بخوبی جانتاہے کہ مندرجہ بالا آیات میں کسی بھی عنوان سے خاتمیت کا انکار نہیں ہے یقیناً ہمارا مدّعایہ بھی نہیں ہے کہ"یلقی الروح" خاتمیت کو بیان کرتا ہے بلکہ بات صرف یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد آئندہ زمانہ میں کوئی اور پیغمبر ضرور مبعوث ہوگا اس پر آیت دلالت نہیں کرتی۔اب اگر رسول اسلام ﷺ کے بعد کسی اور دوسرے پیغمبر کے مبعوث ہونے کی بات ہوتی تو مذکورہ آیت میں وہ بھی شامل ہوتا لیکن "خاتم النبیین"صاف طور پر ختم نبوت پر دلالت کرتاہے اور یہ بھی بیان کرتا ہے کہ رسول اسلام ﷺ کے بعد کوئی اور پیغمبر مبعوث نہیں ہوگا۔

خاتمیت سے متعلق کچھ اور شکوک و شبہات پیش کئے گئے ہیں جن کو مربوط کتابوں میں تلاش کیاجاسکتاہے لیکن ان کے اندر کسی قسم کی پائیداری نہ ہونے کی وجہ سے ہم ان سے صرف نظر کررہے ہیں ۔

اختتام نبوّت کی وجہیں

ختم نبوّت کے متعلق ایک اہم سوال یہ کیا جاتا ہے کہ :جب خداوندعالم انسانوں کی ہدایت کے لئے یکے بعد دیگرے پیغمبر بھیجتارہا تو اب ایک معین زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کا یہ سلسلہ منقطع کیوں ہوگیا؟ اس سوال کا قطعی جواب تویہی ہے کہ

(اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ)خدواند عالم اپنی حکمت بالغہ اور اپنے علم مطلق کی بنیادپر جانتاہے کہ

1۔ سورۂ انعام آیت124۔

انبیاء علیہم السلام کو کہاں کب اور کس طرح مبعوث کرے؟ اور ہم اس مسئلہ کے راز سے کامل طور پر آگاہ نہیں ہیں ۔ حکمت الٰہی یہی ہے کہ رسول اسلام ﷺ کے بعد کوئی دوسرا نبی نہ بھیجا جائے ۔

لیکن قرآن کریم کی آیات سامنے رکھ کر کچھ ایسے نکات معلوم کئے جاسکتے ہیںجو کسی حد تک ختم نبوت کی وجہوں کو واضح کرتے ہیں ۔اس کے باوجود توجہ رہے کہ یہ ان ہی پر بات تمام نہیں ہوتی اور جیسا کہ ہم نے اشارہ کیاکہ اس مسئلہ کی اصل وجہ علم کے دائرے سے کہیں بالاترہے اور ہم قرآن کے بعض مطالب کے ذریعہ اس مسئلہ کی حکمت کے محض بعض حصّوں تک رسائی حاصل کرسکے ہیں جو کچھ اس طرح ہیں :

1۔انبیائے الٰہی خدااور لوگوں کے درمیان واسطہ رہے ہیں تاکہ لوگوں کی ابدی سعادت کی طرف رہبری کریںلیکن کچھ عرصہ بعد انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں تحریف ہوجایا کرتی تھی یا اس کو معاشرہ کے درمیان بالکل ہی ختم کردیا جاتا تھا ۔اس بناء پر انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں تحریف یا ان کی دعوت کے اثرات زائل ہوجانے کے بعد حکمت الٰہی تقاضا کرتی تھی کہ کوئی دوسرا نبی مبعوث کیاجائے تاکہ وہ دوبارہ دعوت الی اللہ کو زندہ کرے ،اور تحریفات کی اصلاح کرے اور رسالت الٰہی کو اس کے اصل راستہ پر پھر سے گامزن کردے :قرآن میں ارشاد ہوتا ہے :

(وَمَااَنْزَلْنَاعَلَیْکَ الْکِتَا بَ اِلَّالِتُبَیِّنَ لَھُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْافِیْہِ) [1]

"اور ہم نے تم پر(اس)قرآن کو نازل نہیں گیا مگر اس لئے کہ جن باتوں میں یہ لوگ آپس میں جھگڑا کرتے ہیں ان کو تم صاف صاف بیان کرو۔۔۔"۔

اس بنیادپر نئے نبی مبعوث کرنے کی ایک حکمت یہ تھی کہ اس سے پہلے والے نبی کی شریعت میں تحریف اور ختم ہونے سے بچاناتھا لیکن یہ مسئلہ دین اسلام اور اس کی آسمانی کتاب کے بارے میں صادق نہیں آتا چونکہ خداوندعالم نے اس کی ضمانت خود اپنے ذمہ لی ہے :

(اِنَّانَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَوَاِنَّالَہُ لَحَافِظُوْنَ) [2]

"بیشک ہم نے قرآن نازل کیا اور ہم ہی اسکے محافظ بھی ہیں"۔

تو معلوم ہوا کہ خاتمیت اسلام کی ایک حکمت یہ ہے کہ خداوندعالم نے اسے ہرطرح کی تحریف اور تغیر و تبدّل سے محفوظ رکھا ہے

1۔سورۂ نحل آیت64۔2۔سورۂ حجر آیت9۔

2۔دوسرے پیغمبر کو مبعوث کرنے کی ایک دوسری وجہ زمانہ مستقبل کے معاشروں اور امتوں کے لئے پہلے نبی کی شریعت کا کافی نہ ہونا تھا۔ مثال کے طور پر ایک نبی ایک ایسے معاشرہ میں مبعوث ہو جس میں بہت سادہ قوانین و ضوابط رائج ہوں یا ان کی فکری سطح پست ہو۔ظاہر ہے ایسے معاشرہ میں دین کے اجتماعی احکام وسیع طور پر یا دین کے بلند و بالا اور عمیق معارف کا پیغام نہیں پہنچایا جاسکتا ہاں اگر آہستہ آہستہ، زمانہ گذرنے کے ساتھ معاشرہ کا ڈھانچا کچھ پیچیدہ ہوجائے اور لوگ فکر و ثقافت کے لحاظ سے ترقی کرلیں تو ایسے میں ان کو نئے نبی کی ضرورت پیش آئیگی کہ وہ ان کے حالات کے مناسب زیادہ کامل شریعت پیش کرسکے۔ لہٰذا نئے نبی کو بھیجنے کی ایک اوروجہ یہ ہے کہ پہلی شریعت کی تکمیل کی جائے چاہے گذشتہ احکام کی تفصیل بیان کرنے یا نئے احکام پہو نچا نے کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن قرآن کریم نے اسلام کے بارے میں اس ضرورت کی بھی نفی کردی ہے کیونکہ یہ دین کامل ہے اور آنے والی نسلوں کو جن چیزوں کی ضرورت پیش آسکتی ہے وہ سب اپنے ساتھ لیکر آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

(اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ) [1]

"۔۔۔آج میں نے تمہارے دین کو کامل کردیا۔۔۔"۔

اور پیغمبر اسلام ﷺ سے بھی مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ہے:

(مَامِنْ شَيٍ يُقَرِّبكُمْ اِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَعِّدكُمْ مِنَ النَّارِ اِلَّاوَقَدْاَمَرْتُكُمْ بِهِ وَمَا مِنْ شَيءٍ يُقَرِّبكُمْ مِنَ النَّارِ وَ يُبَعِّدكُمْ مِنَ الجَنَّةِ اِلَّاوَقَدْ نُهِيتكُمْ عَنْهُ

"جنّت سے قریب اور دوزخ سے دور کرنے والی ہر چیز کا حکم میں نے تم تک پہنچادیا اور ہر وہ چیز جو تم کو دوزخ سے قریب اور جنّت سے دور کرتی ہے میں نے اس سے تم کو منع کردیا ہے۔۔۔"۔

اس نص و دلیل سے استفادہ ہوتا ہے کہ اسلام دین کامل ہے اور اس کو پھر سے تکمیل تک پہنچانے کی کوئی ضرورت باقی نہیں ہے لہٰذا کسی نئے نبی و رسول کے بھیجے جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

3۔قرآن کریم میں بھی گذشتہ کتابوں کے مثل یہ مسئلہ موجود ہے کہ خداوندعالم نے کلی مسائل مختلف آیات کے ضمن میں بیان فرمادیئے ہیں اور ان کی تفصیل بیان کرنا پیغمبر کی ذمّہ داری قرار دی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن نے

1۔ سورۂ مائدہ آیت 3۔

نماز کو واجب کیا ہے لیکن اس کے جزئی احکام بیان نہیں کئے ہیں، یہ ذمہ داری پیغمبر کو سونپ دی ہے سورۂ نحل میں ارشاد ہوتا ہے: (وَاَنْزَلْنَااِلَیْکَ الذِّکْرَلِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْھِمْ) [1]

"۔۔۔اور ہم نے اس قرآن کو تم پر نازل کیا ہے تاکہ جو احکام لوگوں کے لئے نازل کئے گئے ہیں تم اسے صاف صاف بیان کرو۔۔۔"۔

حضرت رسول خدا ﷺ نے بھی اپنے دور حیات میں اسی الٰہی نظام کے مطابق اپنا فرض ادا کیا، احکام و معارف کی تفصیل امت کے سامنے بیان فرمادی اور اپنے اصحاب پر یہ اقوال و احادیث آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کرنا فرض قرار دیدیا۔ اس سے بھی بڑھکر پیغمبر کی دعوت تبلیغ جاری اور باقی رکھنے، اور امت اسلامیہ کی دینی ضرورتوں، کو پورا کرنے اور ان کے سوالوں کے جوابات دینے کے لئے وصایت اور امامت کا سلسلہ جاری کردیا جس کی بنیاد پر، رسول اسلام ﷺ کے بعد لوگوں کے درمیان معصوم اماموں کا ایک گروہ موجود ہے جو اگرچہ عہدۂ نبوت نہیں رکھتا اور ان پر (انبیاء کی طرح) وحی نہیں نازل ہوتی لیکن وہ عالم غیب سے تعلق رکھتے ہیں اور حقایق الٰہی ان پر الہام ہوتے رہتے ہیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد احکام کی توضیح و تشریح اور قرآن کی تفسیر کرنا اس گروہ کی ذمہ داری ہے اور یہ امامت کا سلسلہ قیامت تک باقی رہے گا یہاں تک کہ اگر روئے زمین پر صرف دو آدمی زندہ رہیں تو ان میں سے ایک خدا کی حجت ہوگا۔

خلاصہ کلام یہ کہ نئے پیغمبر کو مبعوث کئے جانے کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ اگر شریعت کے احکام کی تفصیل بیان کرے اور اس کے ذریعے حجت خدا اور لوگوں کے مابین رابطہ برقرار رہے اور اسلام میں یہ مسئلہ رسول خدا اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے ذریعہ پورا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے بھی نئے پیغمبر کو مبعوث کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ پیغمبر اسلام ﷺ کے مبعوث ہونے کے بعد ختم ہوگیا اور دین اسلام قیامت تک استوار و محکم رہے گا۔ نہ اس میں کوئی تحریف کی جاسکے گی اور نہ ہی اس کے احکام میں نسخ کے ذریعہ کوئی تغیر تبدل واقع ہوگا۔ قرآن کریم کی دوسری آیات بھی اس مدعا کی تائید کرتی ہیں:

(۔۔۔ (وَ اِنَّہُ لَکِتَاب عَزِیْزٌلَا یَاتِیْہِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَلَامِنْ خَلْفِہِ تَنْزِیْل مِنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ) [2]

"اور یہ قرآن تو یقیناً ایسی گراں بہا کتاب ہے کہ باطل نہ تو اس کے سامنے آسکتا ہے اور نہ پیچھے سے حملہ

1۔ سورۂ نحل آیت 44۔ 2۔ سورۂ فصّلت آیت 41۔42۔

کر سکتا ہے یہ تمام خوبیوں والے عالم و دانا (خدا) کی بارگاہ سے نازل ہوا ہے"۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم میں کسی قسم کی بھی کوئی باطل (بات) رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میںٰیا آپ کے بعد راہ نہیںٰپا سکتی ہے۔ قرآن کریم میں باطل کے راہ پانے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اس طرح کوئی چیز کم کر دی جائے یا کوئی بات بڑھا دی جائے کہ اس کو پہچانا نہ جا سکے یا اس کے احکام منسوخ ہو جائیں اور آیت میں جملہ "یَا تِیۡہِ الۡبَاطِلُ" کی عمومیت کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک احتمال بھی قرآن کریم کے بارے میں محقق نہیں ہو سکتا پس اس آیت سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم کو نسخ کرنے والی کوئی کتاب اس کے بعد نازل نہیں ہوگی اور نتیجہ میں ایسی کوئی کتاب لیکر آنے والا بھی مبعوث نہیں ہوگا۔ البتہ اس آیت اور اس سے پہلے والی آیات کے مفاد میں فرق ہے۔ اس لئے کہ اس آیت میں کسی نئے پیغمبر کے نئی آسمانی کتاب کے ساتھ مبعوث ہونے کے فرض کی نفی کی گئی ہے لیکن اس آیت سے اس احتمال کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خدا کسی ایسے پیغمبر کو مبعوث کرے جو اسی قرآن کی تبلیغ و ترویج میں مشغول ہو جائے۔ کیونکہ گزشتہ زمانہ میں کچھ ایسے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے ہیں جنھوں نے دوسرے نبی کی کتاب کی تبلیغ کی ہے (مثال کے طور پر حضرت لوط، حضرت ابراہیم کی کتاب[1] و شریعت کے مبلغ تھے)۔ اس بناء پر آخری آیت سے صرف خاتمیت قرآن کے اعلان اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد کسی دوسرے پیغمبر کے آسمانی کتاب لیکر مبعوث ہونے کے احتمال کی نفی کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال آیت کے ذریعہ اپنے مدعا کو پوری طرح صاف صاف ثابت کرنے کے لئے صرف سورۂ احزاب کی وہ آیت کافی ہے کہ جس کا ذکر ہم نے کیا ہے۔

خیال رہے کہ قرآن کریم کی آیات کے علاوہ تواتر سے متعدد روایات بھی موجود ہیں جن کو تمام اسلامی فرقوں نے نقل کیا ہے۔ نمونہ کے طور پر "حدیث منزلت" کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ حدیث تواتر کے ساتھ پیغمبر اکرم ﷺ سے نقل ہوئی ہے کہ آپ نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا:

"اَنۡتَ مِنِّی بِمَنۡزِلَۃِ ھَارُوۡنَ مِنۡ مُوۡسَیٰ اِلَّا اَنَّہُ لَا نَبِیَّ بَعۡدِیۡ"[2]

"تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے ہے مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا"۔

ہم نے خاتمیت سے متعلق جو قرآنی دلیلیں پیش کی ہیں وہ صرف ایک علمی بحث کی حد تک ہے ورنہ مسئلہ خاتمیت اسلام کے ضروریات میں سے ہے اور ضروری اعتقادات کے لئے استدلال کی ضرورت نہیں ہے۔

1۔ قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کتاب کو (صحف) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

2۔ علامہ مجلسی نے (منزلت) کے متعلق تمام روایات کتاب "تاریخ امیر المومنین" باب 53 سے نقل کی ہیں رجوع کیجئے بحار الانوار جلد 37 (طبع جدید) صفحہ 254۔289۔

انبیاء علیہم السلام کے دوسرے منصب

مقام نبوت و رسالت کے علاوہ قرآن کریم میں انبیائے الٰہی کے دوسرے اوصاف و کمالات و منصب بھی بیان ہوئے ہیں۔ ان اوصاف و کمالات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1۔وہ معنوی اور روحانی اوصاف جو خود ان ہی کی ذات سے متعلق ہیں اور ان کی مخصوص صلاحیت و استعداد، ذاتی خصوصیات اور ان کی عبادتوں کے پیش نظر ان کو عطا کئے گئے ہیں۔

1۔انبیاء علیہم السلام کے وہ منصب جو سماجی اور معاشرتی پہلو اور عوام الناس کے ساتھ ان کے خاص روابط کی عکاسی کرتے ہیں۔

پہلی قسم میں صفت مخلَص ہے یعنی وہ جس کو خداوند عالم نے اپنے لئے خالص بنا لیا ہو۔ مثال کے طور پر قرآن کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرماتا ہے:

(وَاذْكُرْ فِيْ الْكِتَا بِ مُوْسَىٰ اِنَّهُ كَا نَ مُخْلَصاًوَكَا نَ رَسُوْلاً نَبِيّاً)[1]

" اور اس کتاب میں موسیٰ کا تذکرہ کرو اس لئے کہ وہ مخلَص اور خدا کے فرستادہ پیغمبر تھے"۔

اس آیت میں حضرت موسیٰ کے نبی اور رسول ہونے کے علاوہ ان کے (مخلَص) ہونے کی صفت بھی بیان کی گئی ہے، اور یہ وہی صفت اور مقام ہے جس کے لئے شیطان ابتداء سے ہی ایسے بندوں کو گمراہ کرنے سے عاجزی کا اعلان کر دیا ہے۔قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَلَاُ غْوِ يَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبا دَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ)[2]

1۔سورئہ مریم آیت51۔

2۔سورئہ حجر39۔40۔

"اور سب کو گمراہ کرونگا مگر ان میں سے تیرے خالص بندے میرے بہکانے میں نہیں آئینگے "۔

یعنی کچھ نیک بندے ایسے ہیں جن کو خداوند عالم نے اپنے لئے خالص قرار دیا ہے ان کا وجود ہراس چیز سے صاف اور پاکیزہ ہے جو خدا سے بیگانہ کردیتی ہے، قرآن کریم نے کچھ انبیاء علیہم السلام سے متعلق اس مقام و منزلت کا تذکرہ کیا ہے ۔ مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے ارشاد ہوتا ہے :

(اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ)[1]

"بیشک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھے "۔

انبیاء علیہم السلام کا ایک اور روحانی مرتبہ صدّیق ہونا ہے ۔قرآن کریم حضرت ادریس علیہ السلام کے سلسلے میں ارشاد فرماتا ہے :

(وَاذْكُرْ فِيْ الْكِتَابِ اِدْرِيْسَ اِنَّهُ كَانَ صِدِّيْقاً نَبِيّاً)[2]

"اور قرآن میں ادریس کا تذکرہ کرو بیشک وہ بڑے سچّے نبی تھے "۔

لفظ" صِدّیق "کا روایات میں بھی تذکرہ ہے ۔ یہ "صدق "کا صیغۂ مبالغہ ہے یعنی صدیق اس کو کہا جاتا ہے جس کی رفتار و کردار مکمل طور پر اس کی گفتار کے مطابق ہو اور اس کی گفتار و کردار میں کوئی تناقض نہ ہو وہ تمام حقایق پر عقیدہ رکھتا ہے اور ان سب پر عمل بھی کرتا ہے ۔ یہ صفت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ میں بھی سورۂ مریم (آیت 41) میں بیان ہوئی ہے ۔ اور اس (صدیق)کی مونث (صدیقہ) سورۂ مائدہ آیت 75۔ میں حضرت مریم علیہا السلام کے لئے استعمال ہوئی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی دوسری قسم کی خصوصیات کے تذکرہ میں نمونہ کے طورپر مقامِ (امامت) کو پیش کیا جاسکتا ہے خداوند عالم قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلے میں ارشاد فرماتا ہے :

(وَ اِذِ ابْتَلَىٰ اِبْرَاهِيْمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَاماً)[3]

"اور جب ابراہیم کا ان کے پروردگار نے کچھ کلمات کے ذریعہ امتحان لیا اور انھوں نے ان سب کو پورا

1۔ سورۂ یوسف آیت 24۔

2۔ سورۂ مریم آیت 56۔

3۔ سورۂ بقرہ آیت 124۔

دکھایا تو خدا نے فرمایا میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں"۔

امامت وہ عہدہ اور مقام ہے جو نبوت و رسالت کے بعد حضرت ابراہیم کو عطا کیا گیا ہے ۔یہ ایک سماجی اور معاشرتی عہدہ ہے جس کا رابطہ لوگوں سے ہے: (لِلنَّاسِ اِمَاماً) اس بناء پر اس عہدے اور مقام کی وجہ سے لوگوںپر کچھ فرائض عائدہوجاتے ہیں جیسے سیرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتداء اور ان کے احکام پر عمل کرنا۔

یہاں یہ بھی واضح کردینا مناسب ہوگا کہ زیر بحث اوصاف صرف انبیاء علیہم السلام سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بہت سے اوصاف انبیاء علیہم السلام کے علاوہ دوسرے افراد میں بھی مشاہدہ کئے جاسکتے ہیں۔اس بات کی تائید سورۂ نساء کی اس آیت سے ہوتی ہے :

(وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰئِکَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَائِ وَالصَّالِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰئِکَ رَفِيْقاً)[1]

"اور جن لوگوںنے خدااور رسول کی اطاعت کی تویہی وہ لوگ ہیں جو انعام یافتہ حضرات کے ساتھ ہونگے یعنی جو انبیائ، صدیقین ،شہداء اور صالحین میں سے ہیں اور یہ لوگ کیا ہی اچھے رفیق ہیں"۔

اس آیت میں صدیقین ،شہداء اور صالحین کا انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ذکر کیا گیاہے۔اس بناء پر آخری تین گروہوں سے مراد غیر انبیاء ہیں اوریہیں سے یہ بات بھی روشن ہوجاتی ہے کہ یہ تین منصب انبیاء علیہم السلام سے مخصوص نہیں ہیں(اس آیت میں شہدا سے مراد وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے اعمال کے شاہدہیں) بعض آیات میں صالحین کی صفت اہل کتاب کے مومنین کے لئے استعمال کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے :

(۔۔۔ وَيُسَارِعُوْنَ فِی الْخَيْرَاتِ وَاُوْلٰئِکَ مِنَ الصَّا لِحِيْنَ)[2]

"۔۔۔ اور نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں اوریہی لوگ نیک بندوںمیںسے ہیں"۔

بہر حال ہم اس بات کی طرف اشارہ کرچکے ہیں کہ قرآن کریم نے (صدیقہ)کی صفت کو حضرت مریم کی شان میں استعمال کیا ہے البتہ اس مقام پر ہماری بحث انبیاء علیہم السلام کے انفرادی اوصاف کے متعلق نہیں ہے جو ممکن ہے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ دوسرے افراد میں بھی پائے جاتے ہوں بلکہ ہم توانبیاء علیہم السلام کے اجتماعی اور معاشرتی منصب و مقام کے بارے میں بحث کررہے ہیں۔

1۔ سورۂ نساء آیت69۔2۔ سورۂ آل عمران آیت114۔

1۔ وحی کی توضیح وتفسیر

انبیاء علیہم السلام کی نبوت اور رسالت کا تقاضا اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے کہ وہ خداوند عالم کے پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں اور خالق و مخلوق کے درمیان ایک امانت دار کا کردار ادا کریں ۔ انبیاء علیہم السلام کے مبعوث کئے جانے کا لازمہ اور اس پر عقلی دلیل بھی یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ پیغام خدا (وحی کی صورت) حاصل کریں اور لوگوں تک پہنچادیں ، نبوت ورسالت کا اصل کام اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور لوگوں کا بھی یہ فریضہ ہے کہ وہ پیغامِ خدا کو انبیاء علیہم السلام سے لیں اور اس پر ایمان لائیںاور خداوند عالم کے قوانین پر عمل کریں۔ در حقیقت ان پیغامونکے سلسلے میں انبیاء علیہم السلام کی پیروی کرنا ہی خدا کی اطاعت کرنا ہے ۔ چونکہ اس مقام پر ان کا کام پیغام پہنچانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

(وَمَاعَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبلَاغُ) [1]

"(خدا) کے پیغمبر کی پیغام خدا پہنچانے کے علاوہ (اور) کوئی ذمہ داری نہیں"۔

اِن باتوں کے با وجود قرآن کریم کی آیات سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام مقام نبوت و رسالت کے علاوہ وحی کی توضیح و تفسیر کے بھی ذمہ دار تھے یعنی ان دونوں باتوں میں فرق ہے کہ کوئی شخص پیغام حاصل کرے اور اس کو بالکل اسی طرح اپنے مخاطب تک پہنچادے اور یہ کہ اس پیغام کی اپنے مخاطب کے سامنے تفسیر کرے ۔ اصلِ نبوت کا تقاضا بس یہ ہے کہ خداکا رسول پیغام خداوندی کو اپنی امت تک پہنچادے ۔ مثال کے طورپر رسول اکرم ﷺ تک قرآن کریم کی جو آیات کو وحی کے ذریعہ پہنچتی تھیںلوگوں کے سامنے تلاوت فرمادیا کرتے تھے ۔ پیغمبر اکرم ﷺ کا کام لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچانا تھا لیکن لوگوں کو کبھی کبھی مزید وضاحت کی ضرورت ہوتی یعنی بہت سے مقامات پر لوگوں کے لئے وحی کے مطالب تفسیر کے محتاج ہوتے تھے اس میں مجمل باتوں کو بیان کرنا ضروری تھا۔ ضرورت تھی کہ جزئی مسائل کی بھی ان کو تعلیم دی جائے ، مثال کے طور پر قرآن کریم فرماتا ہے : (اَقِيْمُوْا الصَّلٰوۃَ) (نماز قائم کرو) اگرچہ اس جملہ سے نماز کا اصلی وجوب سمجھ میں آتا ہے لیکن نماز پڑھنے کا طریقہ معلوم نہیں ہوتا لہٰذا ایسے مقام پر خداوند عالم کی طرف سے کسی ایسے شخص کو معین ہونا چاہئے جو نماز کی شرطیں، احکام اوراس کے پڑھنے کا طریقہ بھی بیان کرے۔

اس بناء پر انبیاء علیہم السلام (رسالت اور نبوت کے علاوہ) وحی کی توضیح و تشریح کرنے کے منصب پر بھی فائز

1۔ سورۂ مائدہ آیت99۔

تھے اور بعض آیات سے پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کو اس مرحلہ میں بھی انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کرنی چاہیئے اور وحی سے متعلق جن چیزوں کو انبیاء علیہم السلام بیان فرمائیں انھیں تسلیم کرنا چاہیئے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

(وَمَاارْسَلْنَامِنْ رَسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللہ) [1]

"اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس واسطے کہ لوگ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کریں"۔

آیت میں مطلق طور پر حکم کے انداز سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام چاہے اصلِ وحی پہنچا رہے ہوں یا اس کی تشریح و تفصیل بیان فرما رہے ہوں ہر حال میں ان کی اطاعت و پیروی کرنی چاہیئے دوسرے لفظوں میں اگر ہم لوگوں پر اصل وحی کی اطاعت سے بڑھکر کسی اور چیز کی اطاعت کو واجب کرنا چاہیں تو پہلے مرحلہ میں انبیاء علیہم السلام جو وحی کی تفسیر کر یںاس میں ان کی اطاعت کرنی چاہیئے۔

اصولی طور پر تمام انبیاء علیہم السلام کے درمیان یہ مرحلہ مشترک ہے۔ اس لئے کہ خداوند عالم کی طرف سے پیغام لانے والا شخص فطری طور پر اس کی حقیقت جاننے کے بعد اس وحی کے بھیجنے والے کے اصل مقصود کو سمجھ لیتا ہے لہٰذا ایک ایسا شخص (پیغمبر) خداوند عالم کے کلام کی تفسیر کرے گا تو یقیناً اس کی تفسیر واقعے کے مطابق ہوگی اور اسی لئے لوگوں پر بھی اس کی باتوں پر اعتماد کرنا اور ان کی پیروی کرنا ضروری ہے۔

البتہ لوگوں کی ضرورتیں اسی مرحلہ پر تمام نہیں ہوتیں بلکہ ان کی کچھ دوسری ضرورتیں بھی ہیں اگرچہ یہ ضرورتیں اس حد تک نہیں ہیں کہ عقلی دلیلوں کے ذریعہ خداوند عالم پر ان ضرورتوں کا پورا کرنا لازم ہو بلکہ خداوند عالم اپنے فضل و کرم اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ان ضرورتوں کو برطرف کرتا ہے۔ یہ ضرورتیں انبیاء علیہم السلام کے دوسرے سماجی عہدوں کے اسباب فراہم کرتی ہیں۔

2۔قضاوت اور فیصلے کرنا

عوام الناس کو اختلافات کے وقت کسی ایسے مرجع کی ضرورت پڑتی ہے جو قوانین الٰہی کی روشنی میں فیصلہ کرکے ان کے اختلافات دور کردے اور ایک قطعی حکم صادر کرے دوسرے الفاظ میں لوگوں کا احکام اور قوانین کی معرفت حاصل کرنا انھیں اس قاضی سے بے نیاز نہیں کرسکتا جو اُن احکام کو ان کے خاص مصادیق پر مطابقت کردیتا ہے اور اسی مقام پر لوگ قاضی کی ضرورت کا احساس کرتے ہیں۔ قاضی کلّی حکم سے آگاہ ہوتا ہے اور دلائل، شواہد اور

1۔ سورۂ نساء آیت 64۔

معتبر گواہوں کی بنیاد پر ان کے مصادیق کو معین کرتا ہے البتہ قاضی کو ایسا ہونا چاہیئے کہ جھگڑا کرنے والے طرفین اس کے حکم کو دل و جان سے تسلیم کریں اور اس کی رائے کے مطابق عمل کریں تا کہ اختلاف ختم ہو جائے ۔ یہ ایسی چیز ہے جس کی ضرورت تمام معاشروں کو تھی اور آئندہ بھی اس کی ضرورت باقی رہے گی ۔

خداوند عالم نے اپنے بندوں پر لطف و کرم کے طور پر اپنے انبیاء علیہم السلام کو عہدہ قضاوت عطا کیا ہے ۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تمام انبیاء علیہم السلام کو یہ مقام عطا کیا گیا تھا ؟ اس مسئلہ کو صاف طور پر کسی آیت میں بیان نہیں کیا گیا ہے ۔ صرف بعض آیات کے مطلق ہونے کی بنیاد پر اس عہدے کو تمام انبیاء علیہم السلام سے منسوب کیا جاسکتا ہے :

(مَن يُطِعِ الرَّ سُولَ فَقَدْ اَطَاعَ اللَّهَ) [1]

"جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی ۔۔۔"۔

ان آیات کے مطلق ہونے کے علاوہ کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جو صاف طور پر اس چیز کے اوپر دلالت کرتی ہو کہ تمام انبیاء علیہم السلام مقام حکم و قضاوت کے حامل تھے ۔ بعض آیات میں یہ مقام صرف خاص انبیاء علیہم السلام کو عطا کئے جانے کی بات کی گئی ہے ۔ مثال کے طور پر خداوند عالم حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے :

(يَادَاوُوْدُاِنَّاجَعَلنَاکَ خَلِيْفَةً فِي الاَرْضِ فَاحْکُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ) [2]

" اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں (اپنا خلیفہ اور جانشین) قرار دیا پس لوگوں کے درمیان بالکل حق سے فیصلہ کرلیا کرو اور خواہشات نفسانی کی پیروی نہ کرو"۔

اس آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عہدۂ حکم و قضاوت نبوّت کے لوازمات میں سے نہیں ہے اس لئے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو پہلے نبوت عطا کی گئی اور اس کے بعد ان کو مسندِ قضاوت پر بیٹھنے اور اپنی امت کے درمیان فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ۔ تو معلوم ہوا کہ قضاوت ایسا منصب ہے جو انبیاء علیہم السلام کے لئے جداگانہ طور پر قرار دیا گیا ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام اس منصب پر فائز تھے ۔

1۔ سورۂ نساء آیت80۔

2۔ سورۂ ص آیت 26۔

3۔ حکومت

لوگوں کی دوسری بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ان کا کوئی ایسا قائدو رہبر ہو جو معاشرہ کے امور کی لگام اپنے ہاتھوں میں تھامے اور ان پر حکومت کرے اسی بنیاد پر خداوند عالم نے اپنے بعض انبیاء کو عہدۂ (حکومت) پر فائز کیا تاکہ لوگوں کی بنیادی اور اصل ضرورت بھی بغیر جواب کے نہ رہ جائے اور زمین پر انبیاء علیہم السلام کی حکومت نمونہ کے طور پر سب سے اچھی حکومت قرار پائے البتہ قضاوت جس کو ہم پہلے بیان کرچکے ہیں حکومت کی ایک ضرورت شمار کی جاسکتی ہے لیکن ہر حال میں یہ دونوں مقام ایک دوسرے سے جُدا ہیں۔ قضاوت ان مقامات پر کی جاتی ہے کہ جہاں دو یا چند افراد کے درمیان حقوقی مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف پیدا ہو جائے لیکن کبھی معاشرہ کو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ ایک صاحب منصب کی طرف سے حکم واقعی اور یقینی اس طرح صادر ہو کہ متفاوت آرا کے لئے ایک حتمی اور اٹل فیصلہ ہو اور تمام لوگ اس کی پیروی کرنا بذات خود لازم سمجھتے ہوں اور اسی مقام پر مسئلہ حکومت کی ضرورت پیش آتی ہے۔

مثال کے طور پر ملک کی لائن آف کنٹرول (سرحد) پر دشمن کے حملہ کرنے کے موقعوں اور ان سے دفاع کی خاطر مختلف نظریات بیان کئے جائیں۔ کبھی کبھی ان مسائل کے بارے میں بہت زیادہ اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر کوئی قطعی رائے یا مشورہ نہ ہو تو خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جس فوج میں ہر فوجی اپنی رائے پر عمل کرتا ہو تو اس فوج کے سر پر کامیابی کا سہرا نہیں بندھ سکتا۔ البتہ حکومت کی ضرورت صرف مسئلہ جنگ اور دفاع سے مخصوص نہیں ہے بلکہ جنگ کے موقع پر اس کی ضرورت اور آشکار ہو جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ متعدد دلیلوں کی بنیاد پر معاشرہ کو ایک اچھی اور طاقتور حکومت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب ایسی صورت میں کیا ہر نبی کے لئے منصبِ حکومت پر فائز ہونا بھی ضروری ہے؟ ظاہری طور پر اس مطلب کو ثابت کرنے کے لئے نہ تو عقلی دلیل ہی ہمارے پاس ہے اور نہ ہی نقلی دلیل ہے جو اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہو سکے۔ قرآن کریم سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام عہدۂ حکومت پر بھی فائز تھے اور اپنی امت کے درمیان حکمرانی بھی کرتے تھے لیکن قرآن میںکوئی ایسی آیت نہیں ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام کے اس مقام پر فائز ہونے پر باقاعدہ سے دلالت کرتی ہو بلکہ اس بات کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یقیناً بعض انبیاء علیہم السلام اس منصب پر فائز نہیں تھے۔

مثال کے طور پر قرآن کریم میں بیان کی گئی (طالوت) کی داستان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ کے پیغمبر منصب حکومت پر فائز نہیں تھے ۔بنی اسرائیل کے بڑے بڑے افراد نے اپنے انبیاء علیہم السلام سے آکر کہا کہ خداوند عالم کی بارگاہ میں عرض کیجئے کہ وہ ہمارے لئے کوئی حاکم معین فرمادے ۔قرآن کریم یہّار شاد ہوتا ہے :

(۔۔۔ (اِذْقَا لُوْا لِنَبِیٍّ لَھُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِکاً نُقَاتِلْ فِی سَبِیْلِ اللہِ) ۔۔۔۔ (وَقَالَ لَھُمْ نَبِیُّھُمْ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ بَعَثَ لَکُمْ طَالُوتَ مَلِکاً) [1]

"جب انھوں نے اپنے نبی سے کہا : ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کیجئے تا کہ ہم راہ خدا میں جہاد کریں ۔۔۔، اور ان کے نبی نے ان سے کہا : بیشک اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا "۔

اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پیغمبر بذات خود حاکم نہیں تھے اور اگر وہ خدا کی طرف سے منصب حکومت پر فائز ہوتے تو ان کے جواب میں کہہ سکتے تھے : میں خود خدا کی جانب سے منصب حکومت پر فائز ہوں اور کسی دوسرے شخص کو بادشاہ یا حاکم معین کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن قرآن کے نقل کے مطابق انھوں نے بنی اسرائیل سے کہا : اگر خدا کوئی حاکم معین فرمادے تو کیا تم اس کی پیروی کروگے ؟ اور چونکہ انھوں نے مثبت جواب دیا تھا تو خداوند عالم نے طالوت کو ان کا حاکم قرار دیا ۔ معلوم ہوا کہ ان آیات یہّمذکورہ پیغمبر منصب حکومت پر فائز نہیں تھے اور کوئی ایسی ظاہری دلیل بھی نہیں ہے جو اس بات پر دلالت کرے کو طالوت پیغمبر تھے بلکہ خداوند عالم نے کسی دوسرے شخص کو بنی اسرائیل پر سلطنت اور حکومت کے لئے منتخب کیا تھا ۔

پس کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جو نبوت کے لئے حکومت کا ہونا ثابت کرسکے بلکہ قرآن کریم کی بعض آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ ان دونوں منصبوں کے الگ الگ ہونا ممکن ہے ۔ بعض آیات اور روایات سے یقینی طور پر آشکار ہوتا ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام منصب حکومت پر بھی فائز تھے ۔

گذشتہ مطالب سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام منصب نبوت ورسالت پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ وحی، قضاوت اور حکومت جیسے منصبوں پر فائز تھے ۔ ان منصبوں میں سے بعض معاشرتی منصب تمام انبیاء میں پائے جاتے تھے اور بعض دوسرے منصب صرف انبیاء علیہم السلام کے ایک گروہ سے ہی مخصوص ہوتے تھے ۔

1۔ سورۂ بقرہ آیت246، 247 ۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے عہدے

اب دیکھنا یہ ہے کہ مندرجہ بالا سوشل سماجی عہدوں میں سے کونسا عہدہ پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں صادق آتا ہے ۔ اکثر آیات سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ مذکورہ بالا تمام منصبوں پر فائز تھے ۔ وحی کی تفسیر کرنے میں آپکا کلام حجت تھا ، آپ کی قضاوت و داوری بھی حجت تھی، آپ لوگوں پر حکومت بھی کرتے تھے اور آپ کے تمام حکومتی احکام کی اطاعت لوگوں پر واجب تھی۔

1۔وحی کی تفسیر کا منصب

خدا وند عالم ارشاد فرماتا ہے :

(مَنْ یُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ) [1]

"جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی ۔۔۔"۔

اس آیت میںلفظ "الرسول"میں "ال"عہد ہے جنس نہیں ہے اور "رسول" سے مراد بھی پیغمبر اسلام ہیں: البتہ اگر "ال"معنای جنس کے لئے بھی ہو تو بھی استدلال میں کوئی خلل نہیں پڑے گا چونکہ پیغمبر اسلام ہر حال میں اس کے مطلب میں شامل ہونگے ۔ بہر حال آیت میں بیان کیاگیاہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ (یاتمام انبیاء علیہم السلام)کی اطاعت کرنا خداکی اطاعت کرناہے اور آیت کے اطلاق سے یہ پتہ چلتاہے کہ وحی کی تفسیر کرنے میں بھی پیغمبر اسلام ﷺ حجت ہیں اور آپ کی اتباع کرنا واجب ہے۔یہی معنی سورۂ نساء آیت64سے بھی حاصل ہوتے ہیں :

(وَمَااَرْسَلْنَامِنْ رَسُوْلٍ اِلَّالِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ)

"اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجامگر اسلئے کہ خداکے حکم سے لوگ اسکی اطاعت کریں۔۔۔"۔

یہ آیت بالعموم پیغمبر اسلام ﷺ کو بھی شامل ہوتی ہے اور مطلق اطاعت ،اوروحی کی تفسیر کی اطاعت کرنے کو بھی شامل ہے ۔اس بناء پر ان آیات کے مطلق ہونے سے یہ واضح ہوجاتاہے کہ پہلا منصب (یعنی وحی کی تفسیر کرنا اور اس کو بیان کرنا)پیغمبر اسلام ﷺ کے لئے ثابت ہے ۔مندرجہ بالاآیات کے علاوہ دوسری آیات بھی ہیںجواس مدعا کوصاف طریقہ سے ثابت کرتی ہیں ۔مثال

کے طورپر خداوندعالم ارشاد فرماتاہے: (وَاَنْزَلْنَااِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ) [2]"۔۔۔اور ہم نے تمہاری طرف قرآن نازل کیا تاکہ جو احکام لوگوں کے لئے نازل کئے گئے ہیں تم ان کو صاف صاف بیان کرو "۔

1۔سورۂ نساء آیت 80۔ 2۔سورۂ نحل آیت44۔

اور ظاہر ہے کہ وحی بیان کرنے کا مقام اس کے اصل متن کو پہنچانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور خداوندعالم ارشاد فرماتا ہے:

(يَتْلُوْاعَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ) [1]

"۔۔۔جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھے اور ان کو پاک کرے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے ۔۔۔"

یہ آیت پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں ہے اور آیات کی تلاوت اور کتاب کی تعلیم دینے کے درمیان فرق رکھا گیا ہے اور اسکا ظاہری مطلب یہ ہے کہ دوسرے منصب سے تفسیر وحی کا منصب ہی مراد ہے۔

اس اعتبار سے قرآن کریم کی آیات اس بات کی شاہد ہیں کہ وحی الٰہی کی تفسیر اور دینی قوانین اور احکام کی تفصیل بیان کرنے میں پیغمبر اسلام ﷺ کا کلام سب کے لئے حجت ہے اور اس بارے میں بھی لوگوں کو ان کے کلام کی پیروی کرنا چاہیے۔

ب۔پیغمبر اسلام ﷺ اور قضاوت کا عہدہ

دوسرا منصب مسئلہ قضاوت (فیصلہ کرنے) سے مربوط تھا۔قرآن کریم کی بعض آیات کی شہادت کی رو سے پیغمبر اکرم ﷺ کیلئے یہ منصب بھی ثابت ہے:

(وَاَنْزَلْنَااِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًالِّمَابَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِناًعَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَاتَتَّبِعْ اَهْوَائَ هُمْ عَمَّاجَائَ كَ مِنَ الْحَقِّ) [2]

"اور ہم نے تم پر یہ کتاب (قرآن) برحق نازل کی جو کتاب (اس کے پہلے سے) اس کے وقت میں موجود ہے اسکی تصدیق کرتی ہے اور ان پر حاکم ہے۔پس ان کے درمیان جو کچھ خدا نے تم پر نازل کیا ہے اسکے مطابق تم بھی حکم دو اور حق بات جو خدا کی طرف سے آچکی ہے (اس سے کترا کے) خواہشات نفسانی کی پیروی نہ کرو۔۔۔"۔

اس آیت کی بنیاد پر ایک طرف تو قرآن کریم اپنی ما سبق آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور دوسری طرف ان پر حاکم بھی ہے یعنی ان کے احکام کو منسوخ کردیتا ہے اس کے بعد قرآن کریم میں فرماتا ہے: اب جبکہ ہم نے تم پر یہ کتاب نازل کردی ہے تو لوگوں کے درمیان احکام الٰہی کی اساس و بنیاد پر فیصلہ کرو۔یہیں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ خداوندعالم کی جانب سے منصب قضاوت پر بھی فائز تھے۔خاص طور سے یہ کہ

1۔ سورۂ جمعہ آیت 2۔2۔ سورۂ مائدہ آیت 48۔

خداوند عالم اسکے بعد بلافاصلہ یہ فرماتاہے : اے پیغمبر لوگوں کی ناحق خواہشات نفسانی اور ہوا و ہوس کی اتباع کرکے قضاوت نہ کرنا"یہ تعبیر اس چیزکی حکایت کرتی ہے کہ قضاوت کا حکم ایسا نازک مرحلہ ہے کہ اس میں خواہشات نفسانی اور شیطانی ہوا و ہوس کی بنا پر لغزشوںکا زیادہ امکان پایاجاتا ہے ۔

البتہ اس میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ بھی گذشتہ انبیاء علیہم السلام کی طرح ہرگناہ سے معصوم تھے لیکن قرآن کریم کی یہ تعبیر اور اس کے مانند دوسری تعبیریں جن میں پیغمبر اکرم ﷺ کو مخاطب قرار دیا گیاہے یہ پیغمبر کے بجائے تمام انسانوں کی تربیت کے لئے ہیںاور عام طورپر خطرناک اور اہم لغزشوں کی پہچان کرانے کے بارے میں استعمال کی گئی ہیں تاکہ لوگ پہلے سے ہی ان سے بچنے کے لئے آمادہ ہوجائیں ۔بہرحال مذکورہ آیت (فَاحْکُم بَیْنَھُمْ کی تعبیر کے مدنظر پیغمبر اسلام ﷺ کے منصب قضاوت کی طرف اشارہ کرتی ہے اوردوسری آیت میں اس طرح ہے

(اِنَّااَنْزَلْنَااِلَیْکَ الکِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَااَرَاکَ اللہُ وَلَاتَکُنْ لِلْخَآئِنِینَ خَصِیْمَاً)[1]

"ہم نے تم پر بر حق کتاب اسلئے نازل کی ہے کہ جس طرح خدانے تمہاری ہدایت کی ہے اسی طرح لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو ہرگز خیانت کرنے والوں کے طرفدار نہ بنو"۔

یہ آیت بھی (لاتَکُن لِلْخائنین خصیما) جملہ کے مدنظر صاف طورپر پیغمبر کے منصب قضاوت پر فائزہونے اور عدالت کے ساتھ فیصلہ کرنے پر دلالت کرتی ہے ۔اسی طرح سورۂ مبارکہ احزاب میںخداوندعالم ارشاد فرماتاہے :

(وَمَاکَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَامُؤْمِنَةٍ اِذَاقَضَیَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہُ اَمْرااَنْ یَکُونَ لَھُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِھِمْ وَمَنْ یَعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہُ فَقَدْضَلَّ ضَلَٰلاً مُّبِیْناً)[2]

"کسی مومن اور کسی مومنہ کے لئے یہ مناسب نہیںہے کہ جب خدا اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیں تو ان کو اپنے اس کام (کے کرنے نہ کرنے)کا اختیار ہواور جس شخص نے خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ شخص کھلم کھلا گمراہی سے دوچار ہوچکا ہے"۔

اس آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خداو رسول ﷺ اگر کسی چیز کا فیصلہ کردیں یا کسی کام سے منع کردیں توکسی

1۔سورۂ نساء آیت105۔2۔سورۂ احزاب آیت36۔

کو اس کی مخالفت کرنے کا حق نہیں ہے ۔(قضی) کی تعبیر اگر چہ قضاوت اور مشاجرہ کے دور کرنے میں منحصر نہ بھی ہو تب بھی یقینا اس کو شامل ہو گی۔

قرآن کریم کے سورۂ نساء کی آیت پیغمبر اکرم ﷺ کے منصب قضاوت پر فائز ہونے پر صاف طور سے دلالت کرتی ہے :

(فَلَاوَرَبِّکَ لَایُؤْمِنُوْنَ حَتَّیٰ یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَاشَجَرَبَیْنَهُمْ ثُمَّ لَایَجِدُ وْافِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجاًمِّمَّاقَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً)[(1)]

"لیکن ایسانہیں ہے، تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ کو اپنے باہمی جھگڑوں میں اپنا حاکم (نہ)بنائیں، اور پھر جب آپ فیصلہ کردیں تو اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی کا احساس نہ کریںؑاور آپ کے فیصلہ کے سامنے سراپا تسلیم ہو جائیں"۔

آیت صاف دلالت کررہی ہے کہ اس وقت تک لوگ حقیقی ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ تم کو اپنے اختلافات اور لڑائی جھگڑوں میں اپنا حَکَم (قاضی) قرار نہ دیں اور اسکے بعد آپ جو بھی حکم صادر فرمائیں اسکو تسلیم کریں۔ لوگوں کے مومن ہونے کے لئے صاف طور سے یہ شرط لگانا اس چیز کی حکایت ہے کہ خداوند عالم نے لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے پیغمبر اکرم ﷺ کو منصب قضاوت عطا کیا ہے ۔

مال غنیمت سے مربوط بعض آیات سے بھی پیغمبر اکرم ﷺ کے لئے منصب قضاوت ثابت کیا جاسکتا ہے۔ نمونہ کے طور پر سورۂ حشر میں مال غنیمت تقسیم کرنے کے طریقوں کو بیان کرنے کے بعد مسلمانوں سے یہ کہا گیا ہے کہ مال غنیمت کو تقسیم کرنے اور حصے معین کرنے میں پیغمبر اسلام ﷺ کے مشورہ کی عزت و توقیر کریں اور ان کے حکم کی پیروی کریں :

(وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَانَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا)[(2)]

"۔۔۔اور جو کچھ رسول تم کو دیں اس کو لے لو اور جس سے منع کریں اس سے ہاتھ کھینچ لو ۔۔۔"۔

البتہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت (غنائم جنگی) سے مخصوص نہیں ہے بلکہ "ما اٰتاکم" میں حرف "ما" شرعی امور اور احکام و قوانین کو بھی شامل ہوتا ہے یعنی جس چیز کا بھی پیغمبر ﷺ حکم دیں اس کو انجام دو اور جس چیز سے منع کریں اسکو چھوڑدو لیکن آیت سے پہلے اور آیت کے بعد والے قرینوں کے مد نظر آیت کے پہلے معنی ہی مناسب

1۔ سورۂ نساء آیت 65۔ 2۔ سورۂ حشر آیت 7۔

ہیں ۔یعنی مال غنیمت میں سے جو کچھ رسول ﷺ تم کو تمہارے حصّہ کے طور پر تم کو دیںتو لے لو اور اگر عملاًیا زبانی طور پر منع کریںتو اس کو چھوڑدو ۔

بہر حال اس آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان مال غنیمت تقسیم کرنے میں آپ کے حکم کا اتباع کرنا لازم و ضروری ہے۔

3۔پیغمبر اسلام ﷺ کا منصب حکومت

قرآن کریم کی بعض آیات پیغمبر اسلام ﷺ کی حکومت اورولایت کے منصب کو بیان کرتی ہیں۔مثال کے طور پر قرآن کریم سورئہ مبارکہ احزاب میں پیغمبر اسلام ﷺ کے مومنوںکے ساتھ قریبی اورگہرے رابطہ کے بارے میں فرماتاہے :

(اَلنَّبِیُّ اَوْلَیٰ بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ) [1]

"نبی تو مومنین پر خود ان کی جانوں سے بڑھکر حق رکھتے ہیں ۔۔۔"۔

اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کا یہ ایک ایسا عہدہ اور منصب ہے کہ آپ کا فیصلہ یا تجویز دوسروں کے فیصلوں اور تجویزوں حتی کہ ان کی ذات کے اوپر بھی مقدّم ہے اور یہ وہی منزلت ہے جس کو "ولایت امر" سے تعبیر کیاجاتاہے ۔

اس کے علاوہ جس آیت کے ذریعہ حکومتی امور میں پیغمبر اکرم ﷺ کی اطاعت کرنا لازم ہے وہ سورئہ مبارکہ نساء میں ہے :

(یٰاَیُّهَاالَّذِیْنَ ئَ امَنُوْااَطِیْعُوْااللّٰهَ وَاَطِیْعُوْاالرَّسُوْلَ وَأُولِی الْاَمْرِمِنْکُمْ) [2]

"اے ایمان لانے والواللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور اولی الامر کی (بھی)اطاعت کرو" ۔

اس آیت میں لفظ "اَطِیْعُوْا"کی دو مرتبہ تکرار ایںایک بار خدا کی اطاعت اور دوسری مرتبہ پیغمبر اور صاحبان امر کی اطاعت کیلئے ہے اوردوسری طرف یہ ظاہرہے کہ" اُولوا الامر" اسے کہتے ہیں جو حکومتی معاملوں میں دخالت کر سکتا ہو اور بنیادی طور پر"اُولوا الامر" "رسول" ﷺ کے ساتھ میں آیاہے اوردونوں کو ایک ہی "اطیعوا" سے مخاطب کیا گیاہے یعنی یہاںپیغمبر کی اطاعت سے مراد وہ امورہیں جن میں عام طور سے میں "اولوا الامر"کی

1۔سورئہ احزاب آیت6۔2۔سورئہ نساء آیت59۔

طرف رجوع کیا جاتا ہے یعنی جو امور حکومت سے تعلق رکھتے ہیں۔

البتہ آیت کا بعد والاحصہ (فَاِنْ تَنَٰزَعْتُمْ فِى شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ)

"اور اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اس امر میں خدا اور رسول کی طرف رجوع کرو۔۔۔" بھی اسی مطلب کے صحیح ہونے پر شاہد ہے اور اس کی تائید بھی کرتا ہے۔کہ اس آیت میں اطاعت کا مطلب، وحی کے مضامین کو قبول کرنا یا تفسیر وحی کے مقام میں پیغمبر کے کلام پر عمل کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہاں پر پیغمبر ﷺ کی اطاعت سے مراد آپ کی حکومت کے احکام و قوانین ہیں اس وجہ سے آنحضرت ﷺ اور "اولوا الامر" کی شان ایک ہے۔

اس مختصر سی بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ قرآن کریم پیغمبر اکرم ﷺ کے لئے منصب تبیین و تفسیر وحی، قضاوت اور حکومت کی تائید کرتا ہے۔

معصوم اماموں کے منصب

شیعہ حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ نبوت اور رسالت کے علاوہ پیغمبر ﷺ کے تمام منصب بارہ معصوم اماموں کے لئے بھی ثابت ہیں اور یہ عقیدہ شیعہ مذہب کے ضروری عقائد میں شمار ہوتا ہے اور اس مدعا کو سورئہ نسا کی اسی انسٹھویں آیت سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ آیت کا مدلول مطابقی "اولوالامر" (صاحبان امر) کے لئے حکومت اور ولایت کا منصب ثابت کرنا ہے۔جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ اس آیت کے ظاہر کے مطابق صاحبان امر کی اطاعت کی ضرورت مملکت کے اندر اس طرح ہے کہ وہ اس میں حق دخالت رکھتے ہیں یعنی حکومتی معاملات کے اعتبار سے اور "اولوا الامر" کا عنوان بھی اساسی اور بنیادی طور پر اسی معنی سے مناسبت رکھتا ہے اس بناء پر صاحبان امر من جانب اللہ منصب ولایت و حکومت پر فائز ہیں اور حکومتی معاملات میں ان کی اطاعت کرنا واجب ہے

دوسری طرف اسلام میں قضاوت کا منصب حکومت کی فرعوںمیں سے ایک فرع ہے۔پیغمبر اکرم ﷺ جو لوگوں پر ولایت کے منصب پر فائز تھے آپ قضاوت کے معاملات بھی انجام دیتے تھے اور آپ قاضیوں کو اس منصب پر تقرر کرنے کا حق بھی رکھتے تھے۔

اصولی طور پر اسلام میں قابل اعتماد قاضی کا انتخاب اور تقرر اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ جبکہ اس آیت کے مطابق صاحبان امر کے لئے حکومت کا منصب ثابت ہے تو قضاوت کا منصب بھی جو اسی کی ایک فرع ہے وہ بھی اسی کے ضمن ینٓان کے لئے ثابت ہوجاتا ہے۔

صاحبان امر کے منصب قضاوت کے مد نظر ان کا تیسرا منصب یعنی قرآن کریم کی آیات کی تفسیر میں بھی ان کے کلام کا معتبر ہونا ثابت ہوجاتا ہے۔ جو شخص من جانب اللہ مسند قضاوت پر جلوہ افروز ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ وحی کے تمام مطالب کو صحیح طریقہ سے سمجھ سکتا ہو اور معاشرے اور اسلامی قضاوت سے مربوط قوانین (جن کو قرآن میں تفصیلی طور پر بیان نہ کیا گیا ہے) ان کی صحیح معرفت رکھتا ہو۔ اس بناء پر قرآن کریم کی آیات اور پیغمبر اسلام کی سنّت سے ایسا شخص امت کے لئے معتبر اور حجت ہوگا۔

اس وجہ سے اس آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ صاحبان امر من جانب اللہ منصب حکومت پر بھی فائز ہیں اور منصب قضاوت پر بھی اور نیز تفسیر وحی اور سنّت نبوی میں بھی ان کی رائے معتبر ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صاحبان امر کون لوگ ہیں ؟

ہم گذشتہ بحثوں میں یہ اشارہ کرچکے ہیں کہ شیعہ اور سنّی حضرات کی تائیدشدہ روایات کے مطابق صاحبان امر وہی بارہ امام علیہم السلام ہیں ۔ اہل سنّت سے نقل ہوا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض اصحاب (منجملہ جابر بن عبداللہ انصاری) نے پیغمبر اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کرنے کا مطلب تو سمجھ گئے لیکن یہ فرمائیے کہ اولواالامر سے مراد کون ہیں؟ اسی مقام پر پیغمبر اکرم ﷺ نے بارہ اماموں کے ناموں کے ساتھ اولواالامر کے عنوان سے انھیںٓمعین فرمادیا۔

البتہ اگر پیغمبر ﷺ اور اولواالامر بذات خود کسی شخص کو معین کردیں تو خداوندعالم کی اطاعت کی بنا پر اس کی اطاعت کرنا بھی واجب ہوگی۔ جس طرح پیغمبر اکرم ﷺ جب بھی کوئی لشکر اسلام روانہ کرتے تھے تو کسی فوجی افسر کو معین فرماتے تھے تو امت پر اس کی اطاعت کرنا واجب ہوجاتی تھی اسی بنیاد پر آپ نے اسامہ کے بارے میں فرمایا : "لَعَنَ اللہ مَنْ تَخَلَّفَ عَنْ جَیْشِ اُسَامَۃ" "جس نے بھی اسامہ کے حکم سے سرپیچی کی اس پر خدا کی لعنت ہے "اس لئے کہ اسامہ کی اطاعت رسول خدا کی اطاعت کی بنا پر واجب قراردی گئی تھی پس جو بھی پیغمبر ﷺ یا اولواالامر کی جانب سے منصوب ہو اس کی اطاعت کرنا واجب ہے ۔ ولایت فقیہ کی دلیل بھی اسی سے حاصل ہوتی ہے۔

معصوم امام جو صاحبان امر ہیں انھوں نے غیبت کے زمانہ میں جامع الشرائط فقہاء کو اپنا نائب قرار دیا ہے اور مسلمانوں پر ان کی اطاعت واجب کی ہے اور حتیٰ کہ انھوں نے فرمایا ہے کہ ان (فقہائ) کے قول کو رد کرنا ہمارے قول کو رد کرنا ہے اور جس نے ہمارے قول کو رد کیا وہ مشرک ہے۔پس اسی بنیاد پر ولی فقیہ کی اطاعت کرنا واجب ہے ۔

یہ مطلب بیان کردینا بھی مناسب ہے کہ اس آیت سے اصل ولایت فقیہ کو ثابت نہیں کیا جاسکتا ۔یہ حق بات ہے کہ ہم پہلی ہی نظر میں اولواالامر کے مصادیق کو نہیں پہچان سکتے لہٰذا ہمیں اولواالامر کو مشخّص و معین کرنے کے لئے وحی کے مفسر یعنی پیغمبر اکرم ﷺ کے دامن سے متمسّک ہونا چاہئے جیسا کہ متعدد روایات کی بنیاد پر آنحضرت ﷺ نے معصوم اماموں کا اولواالامر کے عنوان سے تعارف کرایاہے اور ائمہ علیہم السلام نے بھی اسی بات پر زور دیا ہے۔ حضرت امام محمدباقراور امام صادق کے زمانہ میں بنی امیّہ اور بنی عباس کے درباری علماء ان کی غاصبانہ حکومت کو ثابت کرنے اور اس کی شرعی حیثیت ثابت کرنے کے لئے اسی آیت سے استدلال کیا کرتے تھے ۔جیسا کہ آج بھی بعض مسلم حکمرانؔاپنی حکومت کو قانونی اور شرعی ثابت کرنے کے لئے اسی آیت کا سہارا لیتے ہیں ۔

ائمہ معصومین علیہم السلام نے اپنے اصحاب کو اسی طرح کے اشخاص سے بحث کرنے کی تعلیم دی تھی۔ اسی تعلیم کی اساس و بنیاد پر اس طرح کے باطل دعوئوں کے جواب میں یہ کہنا چاہئے :کہ جس طرح نماز،زکاۃ،حج وغیرہ ۔۔۔سے متعلق آیات کے نازل ہونے کے بعد ان آیات کے معانی کو سمجھنے ،ان عبادات کے انجام دینے کے طریقہ کو سمجھنے اورہر ایک عبادت کے خصوصیات کو جاننے کے لئے پیغمبر اسلام ﷺ سے رجوع کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔اسی طرح آیۂ اولواالامر کے بارے میں بھی تمہارا وظیفہ و فریضہ یہ ہے کہ تم رسول خدا ﷺ سے رجوع کرو۔جس فعل کو آنحضرت ﷺ کے چند اصحاب نے عمل کیااور آپ سے سوال کیااورآپ نے بھی ان کے جواب میں اولواالامر کے مصادیق کی تعیین فرمائی اور جہاں وحی کی تفسیر کرنے میںپیغمبر اکرم ﷺ کافرمان حجت ہے، آپ نے اولواالامر کے مصداق کو بارہ معصوم اماموں میں منحصر فرمادیا ہے اور اولواالامر سے خداوندعالم کی مراد بھی وہی بارہ معصوم امام ہیں لہٰذاتمام مسلمانوں پر ان کی اطاعت و پیروی کرنا واجب ہے۔

اس بناء پر آیۂ اولواالامر براہ راست ولایت فقیہ پر دلالت نہیں کرتی اگرچہ یہ اصل اپنی جگہ معتبرہے اور فقہا کا ائمہ کی طرف سے منصوب ہونا ثابت ہے۔اگر غیر معصوم کو بھی اولواالامر قرار دیا جائے (جیسا کہ اہل سنّت نے

پہلے ایسا کیا) تو اس سے سوء استفادہ کا راستہ صاف ہوجائیگا اور ممکن ہے کہ اس سے اصل ولایت فقیہ کے متعلق بھی خدشہ ہونے لگے۔ اولواالامر کے معنی میںتوسیع ہوجانے کے بعدیہ امکان ہے کہ کوئی یہ کہے کہ فقیہ کو مسلمانوں کا ولی فقیہ ہوناچاہئے اس مطلب پر ہمارے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ یہ لازم ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے آشنا ہو اگرچہ یہ تقلید کی حد تک ہی ہو نہ کہ اجتہاد کے ذریعہ۔

نتیجتاً آیۂ اولواالامر سے اصل ولایت فقیہ کا استفادہ کرنا درست نہیں ہے البتہ ولایت فقیہ کی مشروعیت امام معصوم کے منصوب کرنے کی وجہ سے ہے:

"۔۔۔والرادعلیھم کالراد علیناوالراد علینا والراد علی اللّٰہوھوعلی حد الشرک"

ان (فقہائ) کے قول کو رد کرنا ہمارے قول کو رد کرنا ہے اور جس نے ہمارے قول کو رد کیا اس نے اللہ کے قول کو رد کیا وہ مشرک ہے۔

معارف قرآن کے مجموعہ میں سے "رہنما کی معرفت" کی بحث تمام ہوگئی ہم خداوند قدوس سے معارف قرآن کریم کے تمام حصّوں کے اتمام کے بارے میں مدد چاہتے ہیں۔

امید ہے کہ ہم خداوندعالم کی خاص عنایتوں کے ذریعہ اس راہ پر گامزن رہیں گے جس راہ کو اہل بیت علیہم السلام عصمت و طہارت نے ہمیںقرآن اور احکامات کو سمجھنے کے لئے اچھی طرح ہمیں دکھلایا ہے۔

پہلے ہم قرآن کریم کے معارف صحیح طرح سمجھیںاس کے بعد اپنی اور دوسروں کی سعادت و رستگاری کے لئے ان پر عمل کریں۔

الحمد اللّٰہرب العالمین

فہرست

حرف اول 4

مقدمہ 6

حسی اور عقلی ادراک 7

احساسات کا دائرہ 7

عقل کا دائرہ 8

تجربہ کی راہ 9

اہم بات 13

نبوّت قرآن کی نگاہ میں 17

بعثت انبیاء علیہم السلام کے مقاصد 17

تشریعی ہدایت (الٰہی رہنمائی) 17

لوگوں کی تعلیم 24

تحریفات کی اصلاح 24

دینی اختلاف کا برطرف کرنا 25

قضاوت 29

حکومت 30

یاددہانی 32

ڈرانا اور خوشخبری دینا 33

ظلم اور برائی سے مقابلہ 34

لوگوں کو توحید اور معاد کی طرف متوجہّ کرنا 35

پیغمبروں کا بشر ہونا 39
معجزہ.. 51
معجزہ کی ضرورت 51
معجزہ کی حقیقت 52
کچھ سوالوں کے جوابات 55
1۔سوال : کیا معجزہ نبوت کے دعوے سے وابستہ ہے یا نہیں ؟.. 55
2۔کیا معجزہ عقلی طور پر ممکن ہے یا نہیں ؟... 56
صحیح جواب کیا ہے؟!.. 57
3۔کیا انبیاء علیہم السلام کا صاحب اعجاز ہونا ضروری ہے ؟ 60
معجزہ قرآن کی روشنی میں 68
آیت 68
انبیاء علیہم السلام کے معجزات 78
معجزہ کی کیفیت 80
معجزہ کا دائرۂ حدود.. 90
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات 92
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ.. 95
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معجزات 95
حضرت مریم کی کرامت 99
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی کرامت 101
طالوت کی کرامت...102

ارمیا اور حضرت یونس علیہ السلام کے معجزات 102
حضرت دائود علیہ السلام کے کرامات 103
حضرت سلیمان علیہ السلام کے کرامات.. 104
اصحاب کہف 107
عقلی نکتہ 107
نتیجہ 108
دائمی اعجاز 109
اہل کتاب کے نزدیک پیغمبر اسلام ﷺ کی نشانیاں 110
چیلنج، قرآن کے معجزہ ہونے کا ثبوت 112
قرآن کریم معجزہ کیوں ہے ؟.. 118
1۔صَرف و انصراف.. 118
2۔بلاغت:.. 119
3۔ اختلاف نہ ہونا :.. 122
4۔پیغمبر امی کی جانب سے ہے 124
5۔جا معیت :.. 125
6۔ علمی نکات کا اظہار : 126
7۔غیبی خبریں :.. 126
ایرانیوں پر رومیوں کا غلبہ.. 127
فتح مکہ.. 127
پیغمبر اسلام ﷺ کے بقیہ معجزات 128

شقّ القمر...128
لوگوں کے ادراک میں تصرف...130
"القاء رُعب "اور" نزول سکون و اطمینان"..133
عصمت 140
ملائکہ کی عصمت 142
کیا انبیاء علیہم السلام وحی میں کسی چیز کا اضافہ کر سکتے ہیں ؟.....................................145
مقامِ عمل میں انبیاء علیہم السلام کی عصمت...148
مقامِ عمل میں انبیاء کے معصوم ہونے پر کیا کوئی قرآنی دلیل ہے ؟ 150
کیا عصمت "جبر" ہے ؟...153
عصمت انبیاء علیہم السلام سے متعلق شبہات 155
حضرت آدم علیہ السلام 156
حضرت ابراہیم اور حضرت یوسف علیہما السلام 158
حضرت یونس علیہ السلام 161
حضرت موسیٰ علیہ السلام..162
حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام 164
حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ 166
پہلی آیت...166
دوسری آیت 170
تیسری آیت 174
چوتھی آیت : 177

پانچویں آیت 181
غیر انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا 186
آئمہ علیہم السلام کی عصمت..189
آئمہ علیہم السلام کی عصمت پر قرآنی دلیل..190
اولی الامر کی شان کیا ہے ؟..193
اہل بیت علیہم السلام کون ہیں ؟ 198
ادیان کا اشتراک اور امتیاز..200
اسلام ،دعوت انبیاء علیہم السلام کی روح 200
ادیان کے اختلاف کی وجہیں..212
1۔بغاوت و سرکشی...212
2۔ تحریف 217
احکام کے جزئیات یہ ّادیان ایک نہیں ہیں...219
رہنما کی پہچان..222
انبیاء علیہم السلام...222
قرآن میں تاریخی مباحث کا محور..222
قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام سے متعلق آیات کی تقسیم..............................223
قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے اوصاف...224
رسول ،نبی اورنذیر 224
رسول اورنبی کا فرق..226
انبیاء علیہم السلام کی تعداد..228

کلمۂ امت کی وضاحت..228
انبیاء علیہم السلام کی کثرت..230
انبیاء علیہم السلام کی جنس..233
اپنی قوم کا ہم زبان ہونا 234
دعوتِ توحید..235
معاشرہ میں رائج برائیوں اور بدعنوانیوں سے جنگ 235
فضیلت کے اعتبار سے مراتب کا فرق..236
اجر طلب کرنے سے پرہیز..237
اولوا العزم انبیاء علیہم السلام 241
کیا اولوا العزم انبیاء علیہم السلام ہی صاحبانِ کتاب و شریعت ہیں ؟ 242
صاحبانِ کتاب اولوا العزم انبیاء علیہم السلام کی رسالت کا دائرہ..243
ادیان الٰہی ایک ہیں یا کئی؟ 245
دین کے اندر اختلافات..248
عالمی رسالت کا مفہوم..250
تمام الٰہی انبیاء علیہم السلام پر ایمان ضروری ہے 251
انبیاء علیہم السلام کی رسالت کا عالمی ہونا..255
پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت کا عالمی ہونا..256
مخالفین کی دلیلوں پر ایک نظر..260
تبلیغ اسلام کے تئیں جنوں کا کردار..262
ظہور اسلام کے بعد بقیہ تمام ادیان کا غیر معتبر ہونا 263

انبیاء علیہم السلام کی امتیں.......... 265
موجودہ بحث کا علوم سماجیات ونفسیات سے رابطہ !.......... 266
خود امتوں کے ذریعے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب.......... 267
انبیاء علیہم السلام سے جنگ کرنے والے سرداروں کی پہچان.......... 271
انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کے نفسیاتی اسباب.......... 274
استکبار (خود کو بڑا سمجھنا).......... 274
احساس برتری.......... 277
ظلم.......... 277
نفسانی خواہشات.......... 278
گناہ میں آلودہ ہونا.......... 279
بے نیازی (بے فکری) کا احساس.......... 280
انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کے چند نمونے.......... 281
مستکبر اور مستضعف قرآن کی نگاہ میں.......... 285
استضعاف اور استکبار کے لغوی معنی.......... 285
مستکبروں اور مستضعفوں کی گفتگو.......... 287
قرآن میں مستکبر اور مستضعف کا مطلب.......... 290
مستضعفین سے متعلق آیات کا ایک جائزہ.......... 293
نتیجۂ بحث.......... 300
استکبار اور استضعاف کی اہمیت.......... 301
عوام کا انبیاء علیہم السلام کے ساتھ برتاؤ.......... 303

مذاق اڑانا 304
تہمت..306
بہانہ تلاش کرنا 311
ڈرانا اور دھمکانا 317
امتوں کے ساتھ خدا کا طریقۂ کار (الٰہی سنّتیں)..321
مشکلات کے ذریعہ ہدایت 325
املاء اور استدراج کی روش...326
الٰہی جال اور اخلاقی اقدار کی ہم آہنگی 328
سنّت عذاب 331
خدا کی سنّتوں کا ایک دوسرے میں مؤثر ہونا 332
الف)حضرت نوح علیہ السلام کی قوم 340
ب) ہود علیہ السلام کی قوم(عاد) 341
ج) صالح علیہ السلام کی قوم (ثمود) 341
د) لوط علیہ السلام کی قوم 342
ہ)حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم 342
و:حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم 342
ز)حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم (آل فرعون) 343
الف)اصحاب سبت 344
ب)قوم سب...344
ج)اصحاب رسّ 344

ہ)اصحاب فیل 345
عذابِ استیصال کا، کافروں سے مخصوص ہونا 345
مستضعفین کا حاکم ہونا 348
الٰہی امداد آنا 349
شکران نعمت سے اضافہ اور کفران نعمت سے کمی 350
انبیاء علیہم السلام سے اختلاف کی سنت 355
وحی کی حقیقت 357
سماجیات میں اسلامی طرز تفکر سے متعلق چند نکات 360
چند نفسیاتی پہلو 371
فلسفۂ تاریخ کے بارے میں ایک نکتہ 376
خاتمیت 378
خاتمیت سے متعلق شکوک کا جائزہ...381
اختتام نبوّت کی وجہیں..384
انبیاء علیہم السلام کے دوسرے منصب 389
1۔وحی کی توضیح وتفسیر...392
2۔قضاوت اور فیصلے کرنا 393
3۔ حکومت 395
پیغمبر اسلام ﷺ کے عہدے..397
1۔وحی کی تفسیر کا منصب...397
ب۔پیغمبر اسلام ﷺ اور قضاوت کا عہدہ 398

3۔پیغمبر اسلام ﷺ کا منصب حکومت 401
معصوم اماموں کے منصب 402
فہرست 406